"1970ء کے بعد اردو مرثیہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ"

مقالہ نگار

الماس فاطمہ سید قائم رضا رضوی

(ایم اے' نیٹ' ایم فل)

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو

HaSnain Sialvi

زیر نگراں

ڈاکٹر مسرت فردوس

اسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی' اورنگ آباد

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی' اورنگ آباد

ستمبر 2017ء

1970 KE BAAD URDU MARSIYA NIGARI KA TANQIDI MUTALEA

For Degree of Ph.D Urdu in
Faculty of Arts

Submitted By

Almas Fatma Syed Qayem Raza Rizvi

(M.A., Net, M.Phil)

HaSnain Sialvi

Under the Guidance of

Dr. Masarrat Firdos

Associate Professor Dept. of Urdu

Dr. Babasahab Ambedkar Marathwada University,Aurangabad

Dr. Babasahab Ambedkar Marathwada University

Aurangabad

Sep 2017

(I)

Certificate

I certify that the thesis entitled **"1970 Ke Baad Urdu Marsiya Nigari Ka Tanqeedi Mutalea"** is an original and genuine piece of research Work carried out by, **Almas Fatma Syed Qayem Raza Rizvi** under my guidance and supervision for the degree of Ph.D. Urdu of the Dr. Babasaheb Ambedkar Marathwada University, Aurangabad.

Date: / / 2017.

Place: Aurangabad.

Dr. Masarrat Firdos

Associate Professor Department of Urdu

Dr. Babasaheb Ambedkar Marathwada

University, Aurangabad

(II)

Declaration

I, undersigned hereby declare that the Ph.D. thesis entitled **"1970 Ke Baad Urdu Marsiya Nigari Ka Tanqeedi Mutalea"** is written by me under the guidance **Dr. Masarrat Firdos** Associate Professor Department of Urdu, and submitted to the Dr. Babasaheb Ambedkar Marathwada University, Aurangabad for the award of Ph.D. degree in Urdu. The present work is of original nature to the best of my knowledge. This piece of work has not been submitted for the award of any degree of any university.

Date: / / 2017.

Place: Aurangabad.

Almas Fatma

Syed Qayem Raza Rizvi

(Research Scholar)

پیش لفظ

عربی لفظ 'رثاء' سے ماخوذ 'مرثیہ' کی صنف اردو ادب میں اس وقت رائج ہوئی جب دکن کی سلاطین سے پذیرائی حاصل ہوئی۔ رفتہ رفتہ ایک صنف سخن کی حیثیت سے مرثیہ نے انیسؔ و دبیرؔ کے عہد تک پہنچ کر اپنی منفرد تاریخ رقم کی۔ یہ وہ صنف ہے جس نے اردو ادب کے دامن میں ہر لحاظ سے وسعت پیدا کی۔ چاہے موضوع کے متعلق ہو یا اسالیب کے لحاظ سے، کردار یا زبان و بیان کے متعلق۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مرثیہ ایک شعری المیہ ہیں جو دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک شخصی مرثیہ اور دوسرا کربلائی مرثیہ۔

کربلائی مرثیے دراصل اقدار کا معرکہ آرائی پر مبنی ہوتا ہے۔ لہذا اس کا پلاٹ امام حسینؑ کے میدان جنگ میں آمد سے لیکر امام حسینؑ اور ان کے اصحاب و انصار کی شہادت اور اس کے بعد اہل بیت کے لٹنے، تشہیر ہونے، قید ہونے اور پھر مدینہ واپسی تک کے واقعات کے بیان سے پیش ہوتے ہیں۔ جبکہ شخصی مرثیہ ان اشخاص پر لکھا جاتا ہے جو سب سے قریبی ہوتا ہے، یا کوئی سیاسی شخصیت یا کوئی قابلِ احترام ہوا ہے۔ جیسے کہ غالب کا مرثیہ وغیرہ۔ دیکھا جائے تو ہر دور میں مرثیہ نگاری میں تجربے ہوتے رہے اور ہر دور میں مرثیہ نگاری نے عروج پایا ہے۔ لیکن بعد انیسؔ و دبیرؔ اس کی رفتار میں سست روی آ گئی۔

انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری کے بعد مرثیہ نگاری میں زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔ اور لوگوں میں یہ رائے قائم ہو گئی کہ اب مرثیہ میں کسی بھی طرح کے تجربات نہیں کئے جا سکتے۔ حتیٰ کہ ان کے معاصرین جو کہ انیس و دبیر کی پیروی کرتے تھے ان میں بھی یہی رائے تھی کہ مرثیہ میں اب کسی طرح کے تجربہ کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے وقت بدلا، ماحول بدلا، اور معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل اس کے اثرات نے نئی تہذیب کو جنم دیا جس کے ساتھ ہی نئے مرثیہ گو نے بھی مرثیہ میں نئے تجربات کرنے شروع کر دئے۔ مرثیہ میں موجودہ حالات اور اسکے مسائل کے ساتھ ساتھ مقصد شہادت امام حسینؑ بھی بیان کیا جانے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مرثیہ نے جدید دور میں داخل ہوا۔ لیکن جوں جوں زمانہ کی رفتار بدلتی گئی اس صنف کی طرف لوگوں کا رجحان کم ہوتا گیا۔ اور آج عام رائے یہ بن گئی کہ مرثیہ نگاری زوال پذیر صنف ہو گئی ہے۔ ریسرچ کے لئے موضوع تلاش کرتے وقت یہی وہ باتیں تھیں جو مجھ کو اس موضوع کے انتخاب تک لے آئیں۔ اور اس موضوع کے انتخاب کا مقصد بھی میرے نزدیک یہی تھا کہ جدید مرثیہ کو لے کر عوام الناس میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، کسی حد تک ان کو دور کیا جائے اور جدید مرثیہ نگاری پر بات کی جائے۔

مرثیہ نگاری کے تعلق سے جب میں نے استاد محترمہ ڈاکٹر مسرت فردوس صاحبہ سے بات کی تو انھوں نے نہ صرف اس کے لئے حامی بھری بلکہ مقالے کی تیاری کے لئے انھوں نے میرے ساتھ الگ الگ کالجوں اور یونیورسٹی میں جا کر مواد کی فراہمی میں مدد بھی کی۔ مجھے اپنے مقالے کی تکمیل کے لئے حیدر آباد، مدراس، ممبئی، دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ اور بنارس تک جانا پڑا۔ جہاں مجھے اپنے مقالے کے لئے نہ صرف مواد فراہم ہوئے بلکہ وہاں کے اساتذہ نے بھی میری کافی رہنمائی

کی۔ میں اپنے مقالے میں ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مرثیہ نگاروں کو بھی شامل کرنا چاہتی تھی۔لیکن استاد محترمہ نے حکم دیا کہ صرف ہندوستانی مرثیہ نگاروں کو مقالے میں شامل کیا جائے۔اوراس کی وجہ یہ کہ موجودہ دور میں تخلیقات اور موضوع کے متعلق معلومات حاصل کرنا ایک دوسرے ملک کے لئے نہایت ہی مشکل کام ہو گیا ہے۔جس میں وقت بھی لگتا ہے اور کامیابی کہاں تک حاصل ہوتی ہے، کہانہیں جاسکتا۔

میں نے اپنے مقالے''۱۹۷۰ کے بعد اردو مرثیہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ'' کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔جس میں یہ کوشش کی ہے کہ مرثیہ کی پوری تاریخ کو سمیٹ سکوں۔تا کہ ریسرچ کرتے وقت جن دقتوں کا سامنا مجھے کرنا پڑا وہ آگے آنے والے اسکالرز کو نہ کرنا پڑے۔اوراپنے رسوخ کے مطابق میں نے کوشش بھی کی ہے۔پہلے باب میں اردو مرثیہ کی تعریف، تاریخ، روایت اور اسکے فن کو بیان کیا گیا۔جس میں مرثیہ کی تعریف کے ساتھ ساتھ وہ کب سے وجود میں آیا اور کس طرح اسکی تشکیل ہوئی۔اور کیسے وہ سفر کرتا ہوا عربی سے فارسی اور پھر اردو میں پہنچا، ان سب کا بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اردو کے اہم مرثیہ نگاروں کا فنی جائزہ پیش کیا ہے۔جس میں اُن مرثیہ نگاروں کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے جو کہ مرثیہ نگاری کے فروغ میں اہمیت رکھتے ہیں۔اس میں قلی قطبؔ شاہ وجہیؔ، غواصیؔ، نصرتیؔ سے لیکر میر ضمیرؔ، میر خلیقؔ، میر انیسؔ اور دبیرؔ تک کی مرثیہ نگاری کے سفر کو بیان کیا گیا ہے۔اس باب میں دکن، دہلی اور لکھنؤ کے مرثیہ نگاری کی تاریخ کا بیان الگ الگ کیا ہے۔

تیسرے باب میں میر انیسؔ و دبیرؔ کے بعد کے مرثیہ نگاروں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔جس میں انیسؔ اور دبیرؔ کے بعد کے مرثیہ نگاروں کے مختصر جائزے کے ساتھ ساتھ ان کے فن کو بھی مختصر انداز میں بیان کیا ہے۔جس میں تقسیم سے پہلے سے لیکر موجودہ دور میں لکھنے والے مرثیہ نگاروں کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ان میں وہ مرثیہ گو بھی شامل ہیں جو باحیات ہیں اور رثائی ادب کی لگاتار خدمت کر رہے ہیں۔ان میں میر انسؔ، مونسؔ، تعشقؔ سے لیکر طیبؔ کاظمی، مہدیؔ نظمی، امیدؔ فاضلی اور نظیرؔ باقری وغیرہ شامل ہیں۔اس باب میں ان مرثیہ نگاروں کے فن کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تیزی سے بدلتی ہوئی تہذیب، سیاسی وسماجی صورتوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں ۱۹۷۰ کے بعد کے صرف آٹھ مرثیہ نگاروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔اس باب میں مرثیہ نگاروں کا فن اوران کے مرثیوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں ان کے اسلوب، زبان وبیان کے ساتھ اسکے تمام اجزاء پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس باب کو میں نے دوحصوں میں تقسیم کیا ہے۔جس میں ۱۹۷۰ء کے بعد آٹھ منتخب مرثیہ گو شعراء کو چار چار کر کے دوحصوں میں تقسیم کیا ہے۔اوورانکے مرثیوں کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ان کی دیگر تصانیف کا بھی مختصر جائزہ بیان کیا گیا ہے۔حصہ (الف) میں ۱۹۷۰ سے ۱۹۹۰ء تک کے منتخب چار مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔جن میں احسن داناپوری، وحید اختر، عظیم امروہوی اور ظہیر جعفری کا تذکرہ کیا ہے۔احسن داناپوری جنکا تعلق بہار سے ہے انھوں نے بہت ہی عمدہ مرثیہ نگاری کی ہے۔انھوں نے چودہ مرثیوں کی تخلیق کی ہے جو کہ ان کے آخری دور کا سرمایہ ہے۔ان مرثیوں کو ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مشہور رضوی نے مجموعہ''مطلع حیات'' کے نام سے شائع

کروایا۔اس مجموعہ کے سارے مرثیہ قدیم رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔اپنی مرثیہ نگاری کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

''احسؔن قدیم رنگ یہ ابتک کلام کا

اونچا علم کئے ہے بزرگوں کے نام کا''

احسؔن کے بعد وحیؔد اختر کے مرثیوں کے تجزیہ کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر تصانیف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے ۱۶ مرثیوں کی تخلیق کی ہے۔جب کہ ان کے مراثی کے مجموعہ میں آٹھ مرثیے ہی شامل ہیں۔باقی کے آٹھ مرثیہ شاید ضائع ہو گئے ہیں۔اور مجھے بہت تلاش کرنے پر بھی دستیاب نہیں ہوئے۔وحید اختر کے مرثیوں میں کہیں کہیں دبیؔر کے مرثیے کی جھلک نظر آتی ہے۔عظیؔم امروہوی نے بھی چوبیس مرثیوں کی تخلیق کی ہے جس میں انھوں نے ہر مرثیہ میں قرآن کے حوالہ سے اپنی بات کو قارئین و سامعین تک پہنچایا ہے۔ظہیؔر جعفری جو کہ مدراس سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل حیدر آباد میں مقیم ہیں۔انھوں نے بھی بہت اچھے مرثیے لکھے ہیں۔

اس باب کے دوسرے حصہ (ب) میں ۱۹۹۱ء سے ۱۹۱۴ء تک کے منتخب چار مرثیہ نگار ناشؔر نقوی، باقؔر محسن، گوہؔر لکھنوی اور احسن شکار پوری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ناشؔر نقوی جو کہ پنجاب میں مقیم ہیں، ان کے اب تک تین مرثیوں کے مجموعے 'آفاقیت'، 'لالہ زار صبح' اور 'دیدہ وری' منظر عام پر آچکے ہیں۔جس میں سے اس مقالے میں صرف مجموعہ 'دیدہ وری' کے مرثیوں کا ہی تجزیہ کیا ہے۔باقر محسن حیدر آبادی کے صرف تین مراثی مطبوعہ ہیں اور چھ مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔گوہؔر لکھنوی کے دس مراثی ملتے ہیں جو کہ غیر مطبوعہ ہیں۔ان کے علاوہ احسؔن شکار پوری کے بھی چار مرثیے ملتے ہیں جو کہ مرثیہ نگاری کے دیار میں اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔

اپنے مقالے کے پانچویں باب میں منتخب مرثیہ نگاروں کے ایک ایک مخصوص مرثیہ کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔اور ان مرثیوں کے موضوع، اسلوب، کردار، زبان و بیان کے ساتھ ساتھ ان کا تقابل انیسؔ و دبیؔر سے کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ اس مقالے میں میں ہندوستان اور پاکستان کے تمام مرثیہ نگاروں کو شامل کرنے کا ارادہ تھا مگر ضخامت کے خوف سے اور استاد محترمہ کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے میں نے صرف ہندوستان کے مرثیہ نگاروں کو ہی شامل کیا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے لئے میں سب سے پہلے خداوند کریم کی بارگاہ میں شکریے کا نذرانہ پیش کرتی ہوں جس نے مجھے اتنی عنایتیں عطا کی کہ آج پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے قابل ہوگئی ہوں۔میں ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی کے منتظمین کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے مجھے اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت دی۔میں میرے نگراں ڈاکٹر مسرت فردوس صاحبہ کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر تکمیل تک قدم قدم پر میری رہنمائی و مدد فرمائی۔صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد غیاث الدین صاحب کی میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔شعبۂ اردو کے اساتذہ اکرام میں جناب ڈاکٹر صدیق محی الدین اور محترمہ کیرتی مالنی جاوٗلے صاحبہ کی بھی بہت بہت

شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی۔

میں اپنے والدین کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم دی اور ہر مشکل وقت میں میری حوصلہ افزائی کی اور نہ صرف مجھے آگے پڑھنے کی تاکید کی بلکہ ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ میں شکرگزار ہوں جناب نورالحسنین صاحب کی کہ انھوں نے مجھے مقالے کی تکمیل کے لئے اپنے قیمتی مشوروں کے ساتھ مجھے مقالے کے متعلق جتنی بھی کتابیں فراہم ہوسکتی تھیں سب مہیا کیں۔ میں اپنے ماموں جناب عاجل عباسی صاحب اور مومانی محترمہ راعنا عباسی کی بھی بے حد شکرگزار ہوں جنھوں نے نہ صرف مجھے اپنے پاس رکھ کر پڑھایا بلکہ اپنے قیمتی اور بے نظیر مشوروں سے مجھے نوازہ بھی کرتے ہے۔ میں میری سبھی عزیز دوستوں کی بھی بے حد شکرگزار ہوں جنھوں نے میرا ہر قدم پر ساتھ دیا اور مقالے کی تکمیل میں کسی نہ کسی شکل میں میری معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی کی لائبریرین کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں اور اس کے علاوہ میں نے دیگر لائبریریوں سے بھی استفادہ حاصل کیا۔ ان میں مولانا آزاد ریسرچ سینٹر، کارپوریشن لائبریری، ڈاکٹر رفیق ذکریا کیمپس کی لائبریری کے منتظمین کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ جنھوں نے مجھے اپنے مقالے کے متعلق کتابیں فراہم کی۔ اس کے علاوہ میں حیدرآباد کے باقر محسن صاحب، ڈاکٹر مجید بیدار صاحب، مدراس کے ڈاکٹر حبیب نثار صاحب، لکھنؤ کے ڈاکٹر عباس نیّر صاحب کی بھی بے حد شکرگزار ہوں کہ انھوں نے میری نئے شہر ہر طرح سے مدد کی۔

میں نے موضوع کی مناسبت سے معلومات فراہم کرنے اور حقائق کی نشاندہی میں بساط بھر کوشش کی۔ اور اردو مرثیہ نگاری آج کس موڑ پر ہے اور موجود عہد میں اس کا مقام کیا ہے، اس کی تحقیق کی ہے۔ یہ مقالہ میری ایک حقیر طالب عالمانہ کوشش ہے جو آپ دانشوروں کے سامنے ہے۔

الماس فاطمہ

فہرست

بابِ اوّل

مرثیہ نگاری کا فن، ابتداء اور اس کی روایت

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اردو شاعری کی تحریک سمندر پار سے آئی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی وہی اُنیس بحریں عربی کی موجود ہیں۔ صرف اہل فارسی اور اہل ہندی نے ان بحروں میں زحافات کا اضافہ کیا ہے۔ جیسا کہ علمائے ادب نے لکھا ہے کہ اہل عرب نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی ہے، قصیدہ، غزل، مثنوی اور مرثیہ۔ اس طرح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مرثیہ بھی سمندر پار سے آیا ہے۔ ویسے تو مرثیہ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس کے آثار ہمیں زمانہ جاہلیت سے ملتے ہیں۔ جب ہابیل کو قابیل نے قتل کیا تو حضرت آدمؑ نے اپنے بیٹے کے غم میں جو اشعار کہے اسے بے شک ہم پہلا مرثیہ کہہ سکتے ہیں۔

ظہور اسلام سے بہت پہلے عرب میں قصیدہ کی طرح مرثیہ نگاری کو بھی اہمیت حاصل تھی۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ عربی شاعری کی ابتداء ہی مرثیہ نگاری سے ہوئی تو غلط نہ ہوگا۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص دنیا سے رخصت ہو جاتا تو اشعار میں اس کے اوصاف بیان کئے جاتے اور اسکے مرنے پر غم کا اظہار کیا جاتا۔ شعراء دلگداز اشعار کہہ کر سناتے تھے، جس قبیلے میں کوئی شاعر نہ ہوتا وہ دوسرے قبائل کے شاعروں کو اپنے یہاں بلواتے اور ان سے اپنے عزیزوں متوفی کا مرثیہ لکھواتے تھے۔ حُزن وملال کا یہ سلسلہ فطری ہے۔ ظہور اسلام کے بعد بھی شاعر مرثیہ لکھتے رہے ہیں۔

اس طرح مرثیہ مختلف تجربوں سے گزرتا رہا، یہاں تک کہ صحرائے عرب میں جب علم و دانش کے چشمے پھوٹے اور تمام علوم وفنون نے ترقی کی تو مرثیہ کو بھی ترقی کا موقع فراہم ہوا۔ عرب کی تقلید کرتے ہوئے اہل فارسی نے بھی مرثیے لکھے اور خوب لکھے۔ لیکن اتنی ترقی کے بعد بھی قصائد اور غزل کے جیسا مقام مرثیہ کو حاصل نہ ہوسکا، شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس زمانے تک مرثیہ صرف وہ لوگ کہتے تھے جن پر کوئی غیر معمولی حالت طاری ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد جب شاعری اصلی حالت سے بدل کر کسب معاش کا ذریعہ بنی تو مرثیہ گوئی کے زوال میں خود بخود اضافہ ہوا۔ کیونکہ قصائد کی طرح مرثیہ سے کچھ صلہ نہیں مل سکتا تھا۔ اسی زمانہ میں کربلا کا قیامت انگیز واقعہ پیش آیا، یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ اگر اہل عرب کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اس زور کے مرثیے لکھے جاتے کہ دنیا میں آگ لگ جاتی۔ لیکن ادھر تو عرب کے پرزور جذبات میں کمی آ چکی تھی۔ اور پھر بنی امیہ کی ظالمانہ سطوت نے شعراء کی زبان بند کر دی تھی۔ یہی سبب ہے کہ رثائی ادب نے وہ ترقی نہیں کی جو اسے کرنی چاہئے تھی۔

جب سمندر پار سے قافلے ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ وہاں کی تہذیب اور زبان بھی ساتھ لے کر آئے۔ اس طرح ہندوستان میں عربی و فارسی کا دور دورہ ہوا، پھر رفتہ رفتہ ایک نئی زبان وجود میں آئی، جسے اردو کہا گیا۔ اردو شاعری

کی ابتداء بھی مرثیہ سے ہی ہوئی۔ ہندوستان میں مرثیہ کی تعریف مختلف نقاد نے مختلف طریقے سے کی ہے۔

مرثیہ کی تعریف کرتے ہوئے شمشاد حیدر زیدی لکھتے ہیں کہ

''مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص کی موت پر اظہار رنج وغم کیا جائے اور اس کے اوصاف بیان کئے جائیں۔''[1]

نورالحسن نقوی مرثیہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

''مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے اور رثٰی سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی کی موت پر رونا۔ عربی میں صنف مرثیہ کے معنی 'متعین' ہوئے۔ کسی کی موت پر غم کا اظہار اور مرنے والے کے اوصاف کا بیان۔ لیکن یہ معنی شخصی مرثیہ تک محدود رہے، آگے چل کر مرثیہ کی ایک ایسی قسم وجود میں آئی جو شخصی مرثیہ سے بہت مختلف ہے اور جس کا دامن شخصی مرثیہ سے بہت مختلف ہے۔''[2]

ڈاکٹر سید صفدر حسین نے بھی مرثیہ کی تعریف کچھ یوں کی ہے۔

''ایک متین درد انگیز اور موثر زبان میں اس انداز سے ان کے کارنامے بیان کئے جائیں کہ جذبات کے ساتھ ساتھ واقعات کی شاعرانہ تصویریں بھی شامل ہوں اور اس کا مجموعی اثر ہمارے ہیجانات کی صحت واصلاح کرے۔''[3]

ابتداء میں جو مرثیے ملے ہیں وہ سب الگ الگ ہیئت میں لکھے ہوئے ہیں، اور اگر دیکھا جائے تو آج بھی لازمی طور پر مرثیہ کی کوئی ہیئت نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسدس اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں فارم ثابت ہوئی۔ ابتدائی مرثیہ کا اگر معائنہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس وقت کے زیادہ تر مرثیہ غزل کی شکل میں لکھے گئے۔ اور بہت بعد تک لکھے جاتے رہے۔ غالبؔ کا مرثیۂ عارف ''لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور'' غزل کی شکل میں ہے۔ منفرد اشعار کے علاوہ عہد حاضر میں ایسی غزلیں مل جاتیں ہیں کہ حادثۂ کربلا موج تہ نشیں کی طرح جاری وساری ہے۔ مرثیہ میں مثنوی کی ہیئت کا بھی رواج ملتا ہے۔ چاہے وہ کربلائی مرثیہ ہو یا شخصی مرثیہ۔ اقبال کا مرثیہ ''والدہ مرحوم کی یاد میں'' مثنوی کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ مرثیہ نگاری میں ترکیب بند بھی مقبول رہا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ نے غالب کا مرثیہ ترکیب بند میں کہا ہے۔ اس کے علاوہ مرثیہ کی تاریخ میں قطعہ، رباعی اور مخمس کے شکل کے بھی مرثیہ ملتے ہیں۔ لیکن ابتداء میں جو ہیئت سب سے زیادہ مقبول تھی وہ ''مربع'' تھی، اس کی صورت یہ تھی کہ پہلے بند کے چاروں اور اس کے بعد ہر بند کے تین مصرعے یکساں قافیہ (ردیف) میں اور چوتھا ٹیپ کا مصرع پہلے بند کے قافیہ (ردیف) میں ہوتے تھے۔ لیکن بعد میں مسدس مرثیہ کے موزوں ترین شکل ٹھہری۔ اس میں چھ چھ مصرعوں کے بند ہوتے ہیں، چار مصرع ایک قافیہ (ردیف) میں اور باقی دو جدا قافیہ (ردیف) میں۔ مرثیہ کو مسدس کی شکل میں پیش کرنے کا سہرا سوداؔ کے سر باندھا جاتا ہے۔ لیکن

شجاعت علی سکندری کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ شمالی ہند میں مسدس کی شکل میں مرثیہ لکھنے والا پہلا شاعر سکندر کو بتاتے ہیں۔ اس بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

''سودا کے ہم عصر میاں سکندر پنجاب کے رہنے والے تھے۔ اور لکھنؤ میں آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے ایک نہایت دردناک مرثیہ مسدس کی شکل میں لکھا جو آج تک مقبول ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان میں یہ پہلا مسدس ہے۔''۴

نورالحسن نقوی بھی سودا کے پہلے مسدس مرثیہ لکھنے سے انحراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

''مرثیہ کو مسدس کی شکل میں پیش کرنے کا سہرا سودا کے سر باندھا جاتا ہے۔ مگر یہ خیال درست نہیں۔ سودا سے بہت پہلے بعض دکنی مرثیے مسدس کی ہیئت میں لکھے گئے۔ مگر ان کے پہلو بہ پہلو دوسری شکلیں بھی مروّج رہیں۔ اس لئے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ مرثیہ کی شناخت موضوع سے ہوتی رہی ہیئت سے نہیں۔''۵

مرثیہ نگاری کے فن کا اصل تقاضہ یہ ہے کہ مرثیہ میں جذبات نگاری اور واقعات کی تصویر کشی پر خاص طور پر زیادہ زور دیا جائے۔ واقعات میں سب سے زیادہ اہمیت رزم آرائی کو حاصل ہے۔ اور مرثیہ نگاری میں اس پر خاص توجہ بھی کی ہے، لیکن اگر سانحۂ کربلا کے سلسلے میں پیش آنے والے واقعات کو دیکھا جائے تو ان واقعات کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ اور یہ واقعات بھی ایک خاص ترتیب سے پیش آئے ہیں۔ اس لئے مرثیہ نگاری میں اس ترتیب پر خاص طور پر توجہ دی گئی ہے۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ مرثیہ کے اجزاء متعین ہوتے گئے۔ میر ضمیر کے زمانے تک جب مرثیہ نگاری پہنچی تو مرثیہ کے اجزاء حسب ذیل قائم ہو چکے تھے۔ چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادت اور بین۔

یہاں ایک بات واضح کرنی ضروری ہے کہ میر ضمیر تک جو اجزاء بنے، وہ اجزاء تمام مرثیوں میں استعمال بھی ہو یہ ممکن نہیں ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ یہ تمام اجزاء آگے چل کر قائم بھی رہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ امام حسین کی شہادت کے بعد جو واقعات پیش آئے مثلاً امام حسین کی شہادت کے بعد ان کی مستورات کو قید کر کے کوفہ وشام کے بازار میں لے جانا، انہیں قید خانے میں قید رکھنا، دربار کو سجا کر انکو ننگے سر پھرانا وغیرہ ایسے واقعات ہیں جہاں ان اجزاء کا استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مرثیہ نگاروں نے بھی طوالت سے بچنے کے لحاظ سے اس سے پرہیز کیا ہے۔ خود میر ضمیر کے بھی ایسے کئی مرثیے موجود ہیں جن میں پورے اجزاء استعمال نہیں ہوئے ہیں۔

اجزاء مرثیہ کی تعریف ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادت اور بین۔

☆ چہرہ۔

اسے مرثیہ کی تمہید بھی کہا جا سکتا ہے۔ اکثر مرثیوں کے آغاز میں شاعر حمد، نعت، منقبت اور مناجات سے کرتے ہیں۔ کچھ مرثیہ نگار اپنے کلام کی خوبیوں سے بھی مرثیہ کا آغاز کرتے ہیں تو کچھ مرثیہ کی شروعات کسی منظر کے بیان سے بھی

کرتے ہیں،کوئی آغاز خدا کے شکر سے کرتا ہےتو کوئی ہیرو کی تعریف کر مرثیہ کی شروعات کرتا ہے۔مرزا دبیؔر کے مرثیہ کا آغاز ی بند ملاحظہ ہو۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے ہر قصرِ سلاطین زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

☆ سراپا۔

مرثیہ میں جس بہادر یا جن بہادروں کے کارناموں کے ذکر کئے جانے والے ہوتے ہیں ان کی قد وقامت اور اطوار وخصائل کا بیان اس جز میں کیا جاتا ہے۔مثال دیکھئے۔

سوکھے لبوں پہ حمد الٰہی 'رخوں پہ نور خوف وحراس ورنج وکدورت دلوں سے دور
فیاّض ،حق شناس، اولوالعزم، ذی شعور خوش فکر و بزلہ سنج و ہنرپرور و غیور
کانوں کو حسن صوت سے حظ بر ملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

☆رخصت۔

جب ہیروامام حسین سے اجازت لیکراپنے عزیز واقارب سے آخری ملاقات کے لئے آتا ہے پھر ملاقات کر کے جنگ کے لئے رخصت ہوتا ہےتو اس وقت کی منظر کشی شاعر اس جز میں پیش کرتا ہے۔مثلاً

حرؑ نے رو کر سر تسلیم جھکایا بہ ادب شہ نے رومال رکھا آنکھوں پہ رونے لگے سب
جب چڑھا گھوڑے پہ وہ عاشق سلطان عرب شاہ بولے کہ عجب دوست چھٹا ہائے غضب
دم بدم یاں سے جو آواز بکا جاتی تھی
گریۂ آلِ محمد کی صدا آتی تھی

☆ آمد۔

شاعر اس جز میں یہ بیان کرتا ہے کہ کسی مجاہد کا میدان جنگ میں وردو کیسے ہوتا ہے۔ایسے موقع پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہیرو کے میدان میں پہنچنے سے دشمن کی فوج میں کس طرح خوف و ہراس پھیل جاتا ہے۔جب امام حسین میدان جنگ

میں پہنچتے ہیں اس وقت کی منظر کشی ملاحظہ ہو۔

پہنچا جو اس شکوہ سے خیرالورا کا لال
کانپے جبل ،لرزنے لگا عرصۂ قتال
ٹوٹے جو مورچے تو پکارے یہ بدخصال
بھاگو کہ آئے شیرِ الٰہی پئے جدال
دیکھا جو رعب قبلۂ عالی مقام کو
علموں نے جھک کے ہاتھ بڑھائے سلام کو

☆رجز۔

عرب میں جنگ کا قاعدہ تھا۔ پہلے کسی طرف سے ایک بہادر جنگ میں نکل کر فوج مخالف سے کسی کو اپنے مقابلے کے لئے بلاتا تھا، اس کو مبارز طلبی کہتے ہیں۔ دونوں مقابلے میں آ کر اپنی جرأت وشجاعت اپنے کارنامے اور فخریہ طور پر اور اپنے بزرگوں کے مجاہدانہ کارناموں کا ذکر کرتا ہے۔ جب حضرت عباؔس میدان جنگ میں رجز پڑھتے ہیں اس وقت کا بیان ملاحظہ ہو۔

تم کیا پہاڑ بیچ میں گر ہو تو ٹال دیں
شیروں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں
مہلت نہ ایک کو دم جنگ وجدال دیں
پانی تو کیا ہے آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں
منھ دیکھتے رہیں جو نگہباں ہیں گھاٹ کے
لے جائیں گھر پہ تیغ سے دریا کو کاٹ کے

☆رزم۔

یہ مرثیہ کا سب سے اہم جز ہوتا ہے۔ جنگ کی تصویر کشی مرثیہ کو عروج بخشنے کا سبب بھی ہوتی ہے۔ شاعر بڑی مہارت کے ساتھ جنگ کے جیتے جاگتے مناظر کو پیش کرتے ہیں۔ اور فنِ سپہ گری سے گہری واقفیت کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ اس جز میں اکثر مرثیہ نگار گھوڑے اور تلواروں کی تعریف بھی کرتے ہیں مثلاً۔

ابر ڈھالوں کا اٹھا، تیغ دو پیکر چمکی
برق چھپتی ہے، یہ چمکی تو برابر چمکی
سوئے پستی کبھی کوندی، کبھی سر پر چمکی
کبھی انبوہ کے اندر کبھی باہر چمکی
جس طرف آئی وہ ناگن اسے ڈستے دیکھا
مینھ سروں کا صف دشمن میں برستے دیکھا

اس جز میں شاعر کو جنگ کا ذکر کرتے ہوئے شکست وفتح کے ہزاروں مناظر دیکھانے کا موقع ملتا ہے۔ شاعر اپنا ہنر سب سے زیادہ اس جز میں دیکھاتا ہے۔

☆شہادت۔

اس جز میں مجاہد کا بہادری کے ساتھ لڑتے لڑتے دشمنوں کے نرغے میں گھر جانا، مجروح ہونا، اور پھر آخر کار معبود حقیقی سے جا ملنے کا بیان کیا جاتا ہے۔مرثیہ نگار کو یہاں مرقع کشی اور جذبات نگاری کا ہنر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔

گرتے ہی خاک پہ شہ دیں کو غش آ گیا　　پھر بھی نہ کوئی پیاسے کو پانی پلا گیا
خنجر لگا گیا کوئی نیزا لگا گیا　　کھولی جو آنکھ شہ نے جگر تھر تھرا گیا

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

کیوں کر کہوں قطاول شمر ستم شعار　　پیاسے گلے پہ شہ کے رکھی تیغ آب دار
گھر سے ادھر نکل پڑی زینب جگر فگار　　چلائی منھ نجف کی طرف کر کے ایکبار
حلق حسین کٹتا ہے خنجر کی دھار سے
یا مرتضٰی علی نکل آؤ مزار سے

☆بین۔

بین مرثیہ کا آخری جز مانا جاتا ہے۔شہادت کے بعد شہید کے اہل وعیال، عزیز واقارب اس کی میّت کے گرد بین کرتے ہیں۔مرثیہ کا یہ جز بہت پر اثر ہوتا ہے، اور مرثیہ سننے والوں کے لئے بھی ضبط گریہ محال ہو جاتا ہے۔

اے شمر میں گلے سے لگا لوں تو ذبح کر　　بھائی سے مل کے خیمہ میں جا لوں تو ذبح کر
کچھ درد اپنے دل کا سنالوں تو ذبح کر　　سیّد کو قبلہ رو میں لٹا لوں تو ذبح کر
پانی تو بھوکے پیاسے کو اےئ بدخصال دے
ہے وقت ذبح آنکھوں پہ کپڑا تو ڈال دے

یہ کہتے کہتے سست ہوئی دم الٹ گیا　　سر پیٹتی یہ رہ گئی سر شہ کا کٹ گیا
یوں لاش پر گری کہ جگر سب کا پھٹ گیا　　باہیں گلے میں ڈال کے لاشہ لپٹ گیا
ماں کی طرح تھی عاشق شاہ زمن بہن
یہ بھائی بھائی کہتی تھی لاشہ بہن بہن

مرثیہ کی ابتداء اور روایت۔

☆ عربی میں مرثیہ کی ابتداء :

مرثیہ کی ابتداء کس نے کی یہ جاننے کے لئے اگر ہم تاریخ شاعری پر نگاہ ڈالے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ کی بنیاد پہلے ابوالبشر حضرت آدمؑ نے کی تھی۔ اس طرح حضرت آدمؑ باعتبار تخلیق اور شاعر پہلے مرثیہ گو ہیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے ہابیل کی موت پر مرثیہ کہا، ہابیل کی موت ارض الٰہی پر پہلا خون تھا اور آدمؑ کے دل پر اولاد کا غم تھا۔ جہاں وہ اپنی بے اختیاری اور لاچاری پر بے ساختہ رو پڑے۔ اور دلی جذبات اور فطری کیفیات کے تحت جو فقرے زبان سے نکلے وہی اول مرثیہ قرار پایا گیا۔

تغیّرت البلاَ دو من علیھاَ	دَوجہ الارض مقیر قبیح
معفیر ہو گئے شہر اور ان کے رہنے والے	اور روئے زمین خراب اور گرد آلود ہے
تغیر کُل زی طعام ولون	وقُل بشاشۃ الوجہ اطلیح
بدل گئی ہر مزے دار اور رنگ والی چیز	اور کم ہوگئی تازگی خوبصورت چہرے کی
فواسفا علی ھابیل البنی	قُتلا قد تغمنہ الفریح
افسوس ہے میرے بیٹے ہابیل پر	جو مقتول ہے اور قبر نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا
وجاورنا عدولیس یفتی	لبیغن لا یموت قستبریح
اور ہمسایہ ہو گیا ہے ہمارا وہ دشمن جو فنا نہیں ہوتا	تا کہ ہم راحت پائیں

(بحر الفصاحت۔ از نجم الغنی رامپوری۔ ''حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت آدمؑ نے غم و رنج کے مرثیے کو
زبانِ سریانی میں نثر کے انداز میں کیا تھا کیوں کہ ان کی زبان سریانی تھی۔ پھر اس کا
ترجمہ زبانِ سریانی سے زبانِ عربی میں شعر میں موزوں ہوا، چنانچہ یہ اشعار ترجمہ کئے
ہوئے ہیں) ۶

ایاّم جاہلیت میں جن شعراء کے مراثی قابل توجہ ہیں ان میں خنساؔء اور جرؔیر کا نام سرفہرست ہے۔ خنساء کی مرثیہ نگاری کا ذکر شبلی نعمانی نے بھی اپنی کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' میں کیا ہے۔ خنساء اپنے بھائی سے بہت محبت کرتی تھی ۔ ایک جنگ میں اس کا بھائی مارا گیا، جس کا غم خنساء کو اتنا لگا کہ وہ ہر وقت اس کا مرثیہ پڑھتی پھرتی تھی۔ اس کی مرثیہ نگاری سے خلیفہ ثانی بہت متاثر ہوئے تھے۔ یہ خلیفہ ثانی کا عہد تھا، خنساء ایاّم حج میں خانہ کعبہ کا طواف کرتی ہوئی، سینہ پہ ہاتھ

مارتی اوراپنے بھائی کا مرثیہ پڑھ رہی تھی تو خلیفہ ثانی نے اسے دیکھا اور ڈانٹا تو وہ بیتاب ہوگئی اوراس وقت حالت اضطراب میں اس کی زبان سے مرثیہ کے کچھ اشعار جاری ہوئے۔خلیفہ ثانی سے خنسا نے اپنے بھائی کے متعلق سارا واقعہ بیان کرتے ہوئے آخر میں یہ کہتی ہے۔

هریقی من د'موعک و استفیقیـــ

وَصبـرااَن اَطـقتـــ الَـم تـطیـقی

(یعنی اپنے نفس سے مخاطب ہوکر آنسو بہااوراس سے تسّلی حاصل کراور صبر کرا گر تجھ سے کیا جائے)

ظہور اسلام سے قبل عربی مراثی کا جو نقوش ملتا ہے، وہ ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اردو مرثیوں کی طرح عربی مرثیہ کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں، مثلاً....ندف، تابین اور عزا۔

☆ **ندف**۔اس کے معنی گریہ، آہ و بکا اور نوحہ کے ہیں۔مرثیہ کی اس قسم میں مرنے والے کی یاد میں رنج اور غم کا ذکر کیا جاتا ہے۔دعاے ندبہ اسی ذیل میں آتی ہے۔

☆ **تابین**۔عربی میں تابین کے معنی کہا کے ہیں۔اس میں رنج وغم مقصود ہے لیکن مرنے والے کے اوصاف کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

☆ **عزا**۔عزا کے معنی ماتم پرسی اور مصیبت میں صبر کرنے کے ہیں، لیکن اس میں تعزیت کا پہلو غالب رہتا ہے۔جس سے مراد صبر وضبط کی تلقین سے ہے۔

عربی مرثیہ کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس طرح کے مرثیے عربوں کے سالانہ اجتماع اور میلوں میں بھی پڑھے جاتے تھے۔چنانچہ خنساء کے مراثی بھی میدان عکاظ میں پڑھے جاتے اور مجمع بڑے شوق سے اسکو سنتا تھا اور متاثر بھی ہوتا تھا۔مرثیہ میں جو کچھ بھی فروغ ہوا وہ عرب کی قبائلی زندگی میں ہوا، اس وقت تک کے عربی کے مراثی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔یہ مراثی پشت در پشت لوگوں کو زبانی یاد تھے۔اسلام کے ظہور کے بعد جب کتابوں کے لکھنے کا باضابطہ رواج بنا تو وہ مرثیے جو قبل اسلام کہے گئے تھے، اور وہ مراثی جو بعد ظہور اسلام کہے گئے تھے وہ سب نقل کئے گئے اور چھاپے گئے۔

ظہور اسلام کے بعد جو سب سے بڑا سانحہ پیش آیا، جس نے لوگوں کو مرثیہ لکھنے پر مجبور کر دیا، وہ سرکار دو عالم کی رحلت کا تھا۔حضورﷺ کی وفات پر جو پہلا مرثیہ ملتا ہے وہ ان کی بیٹی حضرت فاطمہؑ زہرا کا ہے۔ظاہر ہے کہ جناب فاطمہؑ اپنے والد کی رحلت پر جتنی مغموم تھیں اتنا کوئی نہیں ہوسکتا۔روایت میں ملتا ہے کہ باپ کی موت پر آپ اتنی غم زدہ اور رنجیدہ ہوئیں کہ باپ کی جدائی برداشت نہ کرسکیں اور والد کی رحلت کے ساٹھ دنوں میں آپ اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئیں۔

باپ کے غم میں آپ دن رات گریہ وزاری میں مشغول رہتی تھیں۔حضورﷺ کی قبر جو کہ مسجد نبوی میں ہے،آپ کو وہاں رونے سے منع کیا گیا تو جنت البقیع میں ایک حجرہ بنوا کر آپ وہاں جا کر رونے لگیں۔ان کے مرثیہ کے درجہ ذیل اشعار بہت زیادہ مشہور و معروف ہیں۔

صُبّت علیّ مَصائبُ لَو انّھا

صُبّت عَلَیّالایّام صِرن لیالیا

ترجمہ۔(میرے اوپر ایسے مصائب کے پہاڑ گر پڑے کہ اگر یہ دنوں پہ پڑتے تو وہ تاریکی میں تبدیل ہو جاتے)

حضرت فاطمہؓ نے اپنے پدر کی فراق میں جو اشعار کہے ہیں،اس سے ان کی رنج و غم کی گہرائی اور حضورﷺ کی فصاحت و بلاغتِ اور زبان کی بلندی اچھی طرح سے نمایاں ہوتی ہے۔

اِذا ماتَ یوم میت قل زکرہ

وزکرابی ند مات واللہ ازید

ملوکانت الد نیا یدوم بقا ئھا

لکان رسول اللہ فیھا مخلد

فزکرت لما فوق الموت بیننا

فعزیت نفسی بالنبی محنؤمدیً

فقلت لھا ان الممات سبیلنا

وَمَن لم یمت فی یوم مات غدا ؎

ترجمہ۔(جب کوئی مرتا ہے تو مرنے والے کا غم اور اس کی یاد اسی دن سے کم ہونے لگتی ہے،لیکن بخدا میرے والد کی یاد جس دن سے ان کی رحلت ہوئی ہے روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔جس دن سے موت نے ہمارے درمیان تفرقہ ڈال دیا اسی دن سے میں یاد کرتی ہوں اور اپنے جی کہ یہ کہکر تعزیت کرتی ہوں کہ ''موت تو ہم سب کا راستہ ہے جو آج نہیں مرا وہ کل ضرور مرے گا)

اس سلسلے میں ایک دوسرا مرثیہ حضرت علی ابن ابی طالبؓ کا بھی ملتا ہے۔اس مرثیہ کے دو اشعار انہدام جنت البقیع کے بعد ضائع ہو گئے۔

ھزاالنبی و لم تخلدہ متہ

لو خلد اللہ حلقا قلہ خلدا

للموت فینا سھام غیر خاطیتہ

من ماتــه اليـوم سهم لم لفتـه غدا

لِـكُـلّ اجتـمـا ع مـن خليلين فرقة

و كُـلّ الـّزی دون الـفـراق قـلـيـل

و ان افتـقـاری فـاطـمـا بعد احمدً

دليــل عـلـــی ان لايـدوم خـلـيـل

(دوستوں کے ایک جگہ جمع ہونے کے بعد فرقت ضرور ہوتی ہے۔فراق کے علاوہ جو زمانہ ہوتا ہے وہ بہت ہی قلیل ہوتا ہے۔میرے دوستوں یعنی فاطمہؑ اور احمدﷺ کا ایک کے بعد دیگر کا کھویا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ دوست ہمیشہ نہیں رہتا۔)

عربی مرثیہ گوئی میں متّمم بن نویرہ کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔خنساء کے بعد متّمم نے بھی اپنے بھائی کا مرثیہ کہا ہے،اس کا زمانہ عہد اسلام کے آغاز کا ہے،اس نے بھی بڑے دردانگیز اور دل دوز مرثیے کہے ہیں۔عربی ادب کی قدیم درسی کتاب ''کتاب الحماسہ''میں بھی ان کے مراثی کے اشعار درج ہیں۔متّمم بن نویرہ اپنے بھائی سے شدید محبت کرتا تھا۔خالد بن ولید نے اس کے بھائی کو قتل کر دیا۔متّمم اس کے غم میں اس قدر غمگین ہوا کہ وہ دیوانہ ہوکر صحرا صحرا گھومنے لگا۔متّمم اپنے بھائی کا مرثیہ اتنے دردناک انداز میں پڑھتا تھا کہ قبائل عرب کے عورتوں اور مردوں کا ہجوم لگ جاتا تھا،اور مرثیہ سننے والے بھی اس کے ساتھ گریہ وزاری میں مشغول ہوجاتے تھے اور ایک کہرام مچ جاتا تھا۔عرب کے لوگوں نے اس کی حالت زار دیکھ کر اسکی شادی کروانے کا مشورہ دیا۔متّمم نے شادی بھی کر لی مگر وہ اہلیہ کی طرف ملتفت نہیں ہوسکا۔اسی پریشان حالی کی حالت میں وہ مسجد نبوی میں آیا اور اپنے بھائی کے مرثیہ کے اشعار پڑھنے شروع کردیئے۔یہ عہد خلیفہ ثانی کا تھا۔کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ثانی نہایت مضبوط دل کے شخص تھے مگر وہ بھی اس کا مرثیہ سن کر رودئے۔

عربی مرثیہ نگاری میں مرثیہ کو عروج سب سے زیادہ عہد اسلامی میں ملا۔جس کا اثر یہ ہوا کہ اس دور میں ہر صاحب وفضل کمال کے مرثیے لکھے گئے۔شہروں اور سلطنتوں کی بربادی پر بھی مرثیہ لکھے جاتے تھے۔اندلس کی بربادی اور تاراجی پر بھی بڑے دردناک مرثیہ ملتے ہیں۔واقعہ کربلا کی روح فرسا پہلوں پر جو دردناک مراثی لکھے گئے وہ عربی مرثیہ کی تاریخ میں نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔مراثی اہل بیت رسولؐ کائنات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔جو اثر آفرینی اور شدت جذبات اور فصاحت وبلاغت ان کے مرثیہ میں ملتے ہیں وہ دوسرے مراثی میں نہیں ملتے ہیں۔

جناب زینب اور امّ کلثوم جو کہ واقعہ کربلا کی عینی گواہ ہیں،انھوں نے اس واقعہ کو جس طرح پیش کیا ہے وہ کوئی دوسرا پیش نہیں کرسکتا۔جناب امّ کلثوم اور اہل بیت رسولؐ جب زندان کی رہائی کے بعد مدینہ میں داخل ہونے لگے اور مدینہ کی دیواریں نظر آنے لگیں تو امّ کلثوم نے ایک نہایت دردآمیز مرثیہ جناب حسینؑ کی شہادت پر کہا،جو حسب ذیل ہے۔

مــدیــنتــه جــدّنــا لَا تــقبَــلِیــنــا　　　فَبِـلِـحَسَـرَاتِ وَالَا حــزَانِ جِئـنَـا

ہمارے نانا کے مدینہ تو ہمیں قبول نہ کر کیوں کہ　　　ہم حسرتیں اور رنج و غم لے کر آئے ہیں۔

اَلَا اَ خبِــــر رَسُــولَ الـلّــهِ فِیـنــا　　　بِــاَنّـــا قَــد فُـجِـعـنٰــافِـی اَبِیــن

ہاں رسول خدا کو ہمارے متعلق خبر کر دے کہ ہمارے باپ کی جدائی کا صدمہ پہنچا یا گیا

وَاَنَّ رِجَــلِـنَــا بِـــا الـطـفِـصَـرعٰ　　　بَلَا رُوُسِ وَقَـــدذَبَــحُــوااَلبَــنِیــنــا

یہ بھی خبر کر دے کہ ہمارے خاندان کے مرد زمین طف میں مقتول پڑے ہوئے ہیں جن کے جسموں پر سر نہیں ہیں۔اور دشمنوں نے ہمارے بچوں کو ذبح کر ڈالا۔

وَاَخبِــر جَــدّنــا اَنّـــا اُسِــرنَــا　　　وَبَــعــدَاَلَا ســرِیَــاجَــدًّا سُبِینَــا

ہمارے نانا کو یہ خبر بھی دیدے کہ ہم گرفتار کیے گئے اور گرفتار کر کے قیدی بنا کر لے جائے گئے۔

وَرَهــطُکَ یَــارَسُـولَاللّــهِ ضُحُــوا　　　عَــرَایَــا بِــاِالـطُــفُــوفِ مُسلبِینــا

اے رسول خدا آپ کی جماعت زمین طف میں برہنہ پڑی ہے۔اوران کے جسم کا لباس لوٹ لیا گیا ہے

وَقَــد زَبَـحُــوالـحُسَیـنَ وَیُــرِاعُــو　　　جَـنَــابِک یــاَ رَسُـولَاللّـــهِ فِینَــا

دشمن نے حسین کو ذبح کر دیا ہے،اور ہمارے بارے میں اے رسول خدا آپ کی کوئی رعایت یا مروت نہیں کی

فَـلَـو نَـظَـرَت عُیُونُکَ لِلاسَارِی　　　عَلـیٰ اَقتـابِ الـجِمـاَلِ مُحَـمّـلِیناَ

کاش آپ کی آنکھیں ہم قیدیوں کو دیکھتیں کہ پالان شتر پر سوار کئے گئے۔

رَسُولَ اللّــهِ بَعدَ الصَونِ صَارَت　　　فُیُـونُ الـنّــاسِ نَــاظِـرَةَ اِلَیـنَـا

اے رسول خدا پردہ داری کے بعد ہمیں نامحرموں کی نگاہوں نے بے تامل دیکھا۔

وَکُـنـتَ تَـحـو طـنـا حتّی تولت　　　عیـونک ثــارت الا عـدا عــلینــا

آپ تو ہماری بڑی حفاظت کرتے تھے،لیکن اِدھر آپ کی آنکھیں بند ہوئیں اور اُدھر دشمن ہم پر حملہ کر بیٹھے

افــاطـم لـو نـظـرت الی الحیـاری　　　ولـو ابـصـرت زیـن الـعــابـدینـا

اے فاطمہ کاش آپ اپنی قیدی بیٹیوں کو دیکھتیں کہ شہر بہ شہر تشہیر کی گئیں۔

افــاطـم لـو راایــت بـنـا سهــاری　　　و مــن سهــر الـلیــالـی قد عـمـلـنـا

اے فاطمہ کاش ہمیں دیکھتیں کہ کس طرح راتیں بیداری میں گزاری ہیں، یہاں تک کہ نابینائی کو پہنچ گئیں

افــاطــم مــا لـقیــت من عـدالک　　　ولا قیــراط مـمـــا قـد لـقیـنــا

اے فاطمہ آپ نے اپنے دشمن کے ہاتھوں وہ مصیبتیں بلکہ ان کا ایک ذرہ بھی نہ دیکھا جو ہم پر نازل ہوئیں

دلو دامت حیاتک لم تزالی　　　الی یوم القیٰمتہ تند بینا

اگر آپ اس وقت زندہ ہوتیں اور ہمیشہ زندہ رہتیں تو قیامت تک ہم پر روتی رہتیں

وعرج بالبقیع وقف وناد　　　وابن حبیب رب العالمینا

اے خبر پہنچانے والے بقیع کی طرف متوجہ ہو، اور وہاں ٹھہر اور پکار کر اے حبیب رب العالمین کے فرزند

وقل یا عم یا الحسن المزکی　　　عیال اخیک اضحوا ضائعینا

اور ان سے کہہ کہ اے چچا اے حسنِ پاکیزہ سرشت آپ کے بھائی کے اہل بیت ضائع ہو گئے

ایا عمّاہ ان اخاک اضحی　　　بعیداَعنک بالرَمضار هینا

اے چچا آپ کے بھائی حسین آپ سے دور جلتی ریت میں سپردلحد کر دیے گئے۔

بلا راس تنوح علیہ جهراً　　　طیورَ والوُحوش الموحشینا

مگر اس طرح کہ جسم پر نہ سر تھا، اور ان پر حوش وطیور چیخ چیخ کر نوحہ کر رہے تھے۔ کاش آپ دیکھتے کہ دشمن آپ کے گھرانے کی ان محذرات عصمت کو قیدی بنا کر لے گئے جن کا کوئی مدد گار نہیں تھا۔

علی متن نیاق بلا وطاہ　　　و شاهدت العیال مکشفینا

آپ کی اولاد اونٹوں کی برہنہ پیٹھ پر بٹھائی گئی۔ اور وہ عورتیں کھلے منہ پھرائی گئیں، کاش آپ ان کی یہ حالت دیکھتے۔

مدینتہ جدنا لا تقبلینا　　　وبالحسرات والا حزان جینا

اے نانا کے مدینہ تو ہم کو قبول نہ کر کیوں کہ ہم حسرتوں اور رنج و آلام کے ساتھ آئے ہیں۔

حرجنا منک بالاهلینجمعا　　　رجعنا لا رجالولا بنینا

جب تجھ سے ہم نکلے تھے تو گھر بھرا تھا، اور اب واپس آئیں ہے تو نہ مرد ساتھ ہیں اور نہ بچے۔

وکنا فی الخروح بجمیع شملی　　　رجعنا خاسرین مسلبینا

جب نکلے تھے تو پوری جماعت کے ساتھ، اور جب واپس ہوئے تو برہنہ سر اور لٹے ہوئے۔

وکنافی الا مان اللّہ جهراً　　　رجعنا باقطیعتة ما ئفینا

اس وقت ہم علانہ خدا کی امان میں تھے اورآج خوفزدہ اور بے پناہ آرہے ہیں۔

ومولانا الحسین لنا انیس　　　رجعنا والحسین بہ رهینا

اس وقت ہمارے آقا امام حسین مونس تھے اور آج میں انہیں اسی جنگل کے سپرد کر آئی ہوں۔

فنحن اضائعات بلا کفیل　　　ونحن الناحات علی اخینا

اب ہم وہ تباہ شدہ ہیں جن کا کوئی کفیل نہیں اور ہم اپنے بھائی پر نوحہ کر رہے ہیں ۔

وعرج بالبقیع وقف وناد　　　وابن حبیب رب العالمینا

اب ہم وہ تباہ شدہ ہیں جن کا کوئی کفیل نہیں اور ہم اپنے بھائی پر نوحہ کر رہے ہیں ۔

ونحن السائرات علی المطایا　　　نشال علی جمال المغضینا

ہم ہی وہ ہیں جو اونٹوں پر دیار بدیار پھرائے گئے، اور وہ بھی ان دشمنوں کے اونٹ جو ہمارے بغض اور کینہ سے بھرے ہوئے تھے۔

ونحن بنات یاسین وطاھا　　　انحن الباکیات علی ابینا

ہم یٰسین و طٰہٰ کی بیٹیاں ہیں ،اور ہم اپنے باپ کی جدائی پر گریاں ہیں۔

ونحن الطاھرات بلا خفاء　　　ونحن المخلصون المصطفونا

ہم بیشک و شبہ طاہرہ اور پاکیزہ عورتیں ہیں اور ہم خدا کے مخلص وبرگزیدہ بندے ہیں۔

ونحن الصابرات علی البلایا　　　ونحن الصارقون الناصحونا

ہم مصیبتوں پر صبر کرنے والے ہیں ،اورہم سچے لوگوں کو نصیحت کرنے والے ہیں۔

الا یا جد نا قتلوا حسینا　　　ولایرعوا جناب اللہ فینا

اے نانا دشمنوں نے حسین کو قتل کر دیا ،اور ہمارے بارے میں ذات خدا کی رعایت نہ کی۔

الا یا جدنا بغت عدانا　　　مناھا واشقی الاعداء فینا

اے نانا ہمارے دشمن اپنی آرزو کو پہنچ گئے اور ہمیں ستا کر شقی بن گئے۔

لقد ھتکو النساء وحملوھا　　　علا الاقطال قھرا اجمعینا

عورتوں کی بے پردہ دری کی اور ان سب کو پالان شتر پر سوار کرکے پھرایا۔

وزینب اخرجوھا من خباھا　　　وفاطما والہ تبدی الا نینا

زینب علیا مقام کو ان کے پردہ سے نکالا اور فاطمہ دختر امیرالمومنین سرگرداں و نالہ کناں تھیں۔

مکینۃ تشتکی من حرو جد　　　تنادی الغوث رب العالمینا

سکینہ آتش جدائی سے فریاد کرتی تھیں اور بار بار پکارتی تھیں ،اے رب العالمین فریاد ہے فریاد ہے۔

وزین العابدین بقید ذل　　　ورامو اقتلہ اھل الخئونا

زین العابدین ذلت کی قید میں گرفتار تھے ،اس پر بھی دشمنوں نے کئی باران کے قتل کر دینے کا قصد کیا۔

فبعدھم علی الدنیا تراب　　　فکاس الموت فیھا قد سقینا

شہدائے کربلا کے بعد اس دنیا پر خاک ہے،ہمیں اسی دنیا کے لئے جام مرگ پلایا گیا۔

وھـذی قـصتـی مـع شـرحـالـی　　　الا یـا سـامـعـون ابـکـوا عـلـیـنـا

یہ میرا واقعہ ہے اور یہ میرا مفصل حال ہے۔اے سننے والوہم پر گریہ کرو۔

اس وقت کا ایک اور مرثیہ بشیرابن جذلم کا ملتا ہے۔یہ مدینہ کا رہنے والا تھا اور شاعر بھی تھا۔زین العابدین ابن حسین جب مدینہ میں میں آئے تو بشیر کو حکم دیا کہ میرے آنے کہ خبر پورے مدینہ میں کر دو۔وہ بنا کسی سے کچھ کہے مسجد رسول ﷺ میں آیا اور وہاں نہایت بلند آواز میں یہ مرثیہ کے شعر پڑھے........

یـا اھـل یثـرب لا مـقـام لـکـم بھـا　　　قـتـل الـحسیـن فـا دمـعـی مـدرارُ

اے اہل یثرب اب مدینہ میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں (یعنی اب تمہارا یہاں رہنا بے سود ہے) کیوں کہ حسین قتل ہوئے اور میرے آنسو لگا تار بہہ رہے ہیں۔

الـحسـم مـنـہ بـکـر مبـلاۃٗ مُـضـرّ جُ　　　والـرّاس مـنـہ علـی الـقـنـاۃ یـدارُ

ان کا جسم کربلا میں خون سے سرخ کیا ہوا (خون آلودہ) پڑا تھا،اور ان کا سر نیزہ پر پھرایا گیا۔

جناب زینب کا ایک مرثیہ جو کہ انھوں نے شام کی مجلس میں پڑھا تھا۔درجہ ذیل حاضر ہے،

امـا شـجـاک یـا سـکـن　　　قـتـل الـحسیـنـو الـحسـن

ظـمـان مـن طـول الـحـزن　　　وکـل وغـدنـا ھـل

صاحب مدینہ،اے رسول خدا ﷺ،کیا آپ کو حسن وحسین کا قتل رنجیدہ نہیں کرتا۔وہ حسین کو پیاسا قتل کیا،طویل حزن وغم میں گرفتار رہا۔اورسب سیر وسیراب تھے۔

یـا قـوم یـا قـوم ابـی　　　عـلـی الـبـر الـو صـی

وفـاطـم امـی الـتـی　　　لھـا الـتـقـی والـتـقـی والـنـائـل

اے قوم اے قوم میرے باپ علی مرتضٰی خدا کے بڑے نیک بندے اور وصی رسول تھے۔میری ماں فاطمہ زہرا ہیں جن کے حصّے میں تقویٰ آیا ہے۔

مـنـو عـلـی ابـن الـمـصـطـفٰے　　　بشـر بۃ یـعـی بھـا

اطـفـا لـنـا مـن الـظـمـا　　　حیـث الـفـرات سـائـل

ابن مرتضٰی پر ایک گھونٹ پانی دے کر احسان کرو جس سے ہمارے بچے پیاس کی موت سے بچ جائیں۔نہرِ

فرات بہہ رہی ہے۔

قـــا لـــو الـــــه لا مـــآء لا　　الا السيـــوف والـــقـــنـــا

فـــانـــزل بـــحـــكـــم الادعيـــنـــا　　فـــقـــال بـــل افـــا ضـــل

اس سوال کے جواب میں انہوں نے جواب دیا کہ پانی تو ہرگز نہ دیں گے ہاں تلواریں اور نیزے ہیں۔اگر ان سے بچنا چاہتے ہو تو ابن زیاد و یزید کا حکم مانو۔امام نے فرمایا بلکہ میں اس ننگ و عار کو اپنے سے دور کردوں گا۔

حتـــــى اتـــــاه مشـــقـــنـــص　　رمـــــــاه وغـــــدابـــــرض

مـــن ســـقـــر لا يـــخـــلـــص　　رجـــــــس دعـــــى واعـــل

آخرکار ایک تیر آپ کو لگا جسے ایک سفید داغ والے کمینے نے مارا تھا، جو ہمیشہ سقر میں رہیگا۔جو ناپاک حرامزادہ اور کمینہ تھا۔

فهـــلـــو ابـــختـــلـــه　　واعـــصـــو صبـــوالـــقتـــلـــه

ومـــوتـــه فـــى نـــصـــلـــه　　قـــد اقـــحـــم الـــمـــنـــاضـــل

لوگوں نے امام کے ساتھ دغا کر کے تکبیر کہی،ان کے قتل پر مضبوط ہو کر آئے۔آخر آں جناب کی موت اس تیر سے ہوئی۔

وغـــفّـــروا جبيـــنـــه　　اخـــضـــو عثـــنـــو نـــه

بـــالـــدم يـــا مـــعيـــنـــه　　مـــا انـــت عـــنـــه غـــافـــل

آں جناب کی پیشانی دشمنوں نے خاک آلودہ کردی۔ریش مبارک کو خون سے رنگین کر دیا۔اے مددگار حسین تو ان سے غافل نہ ہونا۔

وهـــكـــواحـــريـــمـــه　　وذبـــحـــو اقـــطيـــمـــه

واســـرواكـــلـــثـــومـــه　　وسيـــقـــت الـــجـــلائـــل

ان لوگوں نے امام کی ہتک حرمت کی اور ان کے بچوں کو ذبح کر ڈالا۔ان کی بہن امّ کلثوم کو قید کیا اور ان کی بیویوں کو دیار بہ دیار پھرایا۔

يســـفـــن بـــالتـــنـــائف　　بـــضـــحة الهـــواتف

واد مـــــع زوارف　　عـــقـــولهـــازوائـــل

وہ مخدرات صحراؤں میں تشہیر کی گئیں ان پر ہائف گریہ کر رہے تھے۔ان کی بیویوں کے آنسوں نہ تھمتے تھے اور عقلیں بجا نہ تھیں۔

یقلن یا محمد یا جدنا یا احمد
قد اسرتنا الاعبد وکلنا ثواکل

وہ بیبیاں پکار رہی تھیں،اے محمد ہمارے نانا اے احمد ہمیں غلاموں نے قید کرلیا۔حالانکہ ہم سب کے عزیز مردہ تھے۔

تھدی سبایا کربلا الی الشام والبلاع
قد انتعلن بالدمآء لیس اھن ناعل

کربلا کے قیدی شام کے دیار بلا میں جبراً لے جائے گئے ہیں اور بجائے پاپوش ان کے پیروں میں خون کے موزے ہیں۔

الی یزیدالطاغیہ معدن کل واھیہ
من نحو باب الجابیہ فجاحدوخال

یزید سرکش مخزن مکروفریب کے دربار میں اب جابیہ سے داخل کی گئی جہاں منکرین حق ودین میں خلل ڈالنے والے موجود تھے۔

حتی دنابہ رالدجی راس الامام المرتجی
بین یدی شرالوری ذاک اللعین القاتل

مخدرات کے پاس اندھیرے کا چاند یعنی بیکس امام کا سر لایا گیا۔اور بدترین خلق،ملعون اور حقیقی قاتل کے پاس رکھا گیا۔

یظل فی بنانہ قضیت خیزرانہ
ینکت فی اسنانہ قطعت الال

اس ملعون کے ہاتھ میں خیزران کی چھڑی تھی جس سے لب ودندانِ حسین کو چھیڑنے لگا۔خدا اس کے ہاتھ قطع کرے۔

انامل بجاحد وحافد مراصد
مکائد معاند فی صدرہ غوائل

اس منکرِ حق کے ہاتھ قطع ہوں جو کینہ پرورگھات میں رہنے والا مکار اور دشمن خبیث ہے، جس کا سینہ کینہ سے مملو تھا۔

طوائل بدریة غوائل کفریة
شوھاء ھاھلیه ذلت لھاالافاضل

جو بدر کے غصوں کفر کے کینوں اور جاہلیت کی برائیوں کا مالک ہے جس کت سامنے صاحبانِ فضل ذلیل ہو رہے تھے۔

فیا عیوفی اسکبی علی بنی بنتالنبی
بفیض دمع ناضب کذالک یبکی العاقل

اے میرے آنکھوں، بنت نبی کے فرزند پر آنسو بہاؤ۔ عاقل اسی طرح روتا ہے۔

بنوامیہ کے عہد میں اہل بیت رسول اور خاص طور سے حضرت حسینؑ سے زمانہ اتنا پھر گیا تھا کہ حسین اور ان کی اولادوں کے چاہنے اور ماننے والوں کو سزا دی جاتی تھی۔ اور ان سے متعلق نوحہ یا مرثیہ کہے جانے پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی۔ اس کے متعلق علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب 'موازنہ انیس و دبیر' میں لکھتے ہیں۔

''نبوامیہ کی ظالمانہ سطوت اور جباری نے تمام شعراء کی زبانیں بند کر دی تھیں۔ فرزدقؔ بنوامیہ کے پایۂ تخت کا شاعر تھا لیکن جب اس نے ایک موقع پر حضرت امام زین العابدین کی مدح میں چند شعر کہے تو عبدالملک بن مروان نے اس کو جیل خانے بھیج دیا۔'' ۸؎

فرزدق نے کثیر تعداد میں مرثیہ کہے ہیں جو کہ امام حسینؑ اور واقعہ کربلا سے متعلق ہے۔ بنوامیہ کے عہد کا ایک اور شاعر کمیتؔ بن یزید تھا جو کہ اس عہد کا صاحبِ جرائت و ہمت والا تھا۔ جو سخت پابندی کے باوجود بھی اہل بیت رسول اور بنو ہاشم سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے بھی کافی تعداد میں مراثی کہے ہیں جو کہ ہاشمیات کے نام سے مشہور ہے۔

کہتے ہیں کہ مرثیہ کی دنیا میں ایک مثالی کردار کی ضرورت تھی جسے حضرت حسینؑ نے پوری کی۔ واقعہ کربلا کے بعد مرثیہ صرف حضرت حسینؑ اور ان کے اہل وعیال کے لئے ہی مخصوص ہو گیا تھا۔ اور عام طور پر لفظِ مرثیہ سے شہادت اہل بیت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ لیکن مرثیہ کو واقعات کربلا یا شہادت اہل بیت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ مرثیہ کا مطلب صرف شہدائے کربلا سے نہیں بلکہ ہر مرنے والے سے ہے۔ شہدائے کربلا کے علاوہ لکھی جانے والی مرثیہ کو 'شخصی مرثیہ' کہتے ہیں۔

حکیم اجمل خان جو کہ بیسوں صدی کے بڑے طبیبوں میں آتے ہیں۔ ان کی وفات پر بھی بہت سے مرثیے لکھے

گئے ۔ایک بہت ہی بوسیدہ ورق ان کا ایک مرثیہ مجھے ملا، جس کے شاعر کا بھی پتا نہیں ہے۔مگر پھر بھی میں اس کو یہاں پیش کر رہی ہوں صرف اس غرض سے کہ کہیں یہ ضائع نہ ہو جائے۔

یَـا مـعُشـرالاِخـوانِ اِبـکُـوا مُبـکِـیاَ

دوستوں! سوزِ جُدائی میں کرو ماتم بپا

خسفـت بُـدُوُرکـمَـالِ شَیُـخَ السّینـا

گہہ گیا بدر جہاں تابِ کمالِ بو علی

اَطَـفَـتُ سِـرَاجَ مُـنِیـرَهـارِیخُ الـزَّمَن

چھا گئی ہر سمت دنیا پر مصائب کی گھٹا

وَهِیَـالِّتـی ظَـلَـمَت عَـلَیُـنَـا یَـقِینـا

شمع بزم افروزعلم ومعرفت گل ہوگئی

اَفَـلَـتُ شُـمُـوُسُ عُـرُوُجِهَـافِـی یَوُمِنـا

ہو گیا وہ آفتاب علم رو پوشِ فنا

هَیُهَـاتَ عِـلُـمُـالـطِّبّ کـاَنَـت فَیُـنـا

طب کی دنیا جس کی تابانی سے رشک طور تھی

مَـاتَـالُـمسِیـحُ فَـمَـوُتُـهٗ مَـوُتُ الُورَیٰ

اب کہاں وہ حاذقِ دوراں،مسیحاے زماں

اَیُـنَ الـطبّیـبُ بِـطِبِّـه یَشُـفِیـنَـا

یک بیک دنیا ے علم وفضل ویراں ہو گئی

فـی شـمّـه لـمَـاالُعَیُـنُ عَهُـنُ جَـارِیَـه

ماتمِ اجمل میں چشمے چشم سے جاری ہوئے

عـنهـا یَسیـلُ د.مُـالُقُـلُوُبِـمَتِیُـنَـا

ان سے نہریں ہیں رواں خونِ دل بیتاب کی

قـد سَـکّـنَـتُ عَـطَشَـا فـنِعُمَ الحَـارِیَـه

ذرّہ ذرّہ کی زباں پر تھی صدائے العطش

هِـی عَـن شَـرَابِ دُمُـوُعِـنَـا تَسُـقِیُـنَـا

بادۂ خُونابۂ دل نے بجھادی تشنگی

مَــا کَــانَ قَیُــسُ هَــلَکَ هَــلُــکَــاوَاحِدُ

موت مجنوں کی نہیں دنیا میں اک انساں کی موت

الــکِــنّــــهُ بُــنُیَــانَ قَــوُمِ تَهَــدِ مَــا

بلکہ بنیاد جہاں مہرواُلفت گر گئی

عربی میں جتنے بھی شعراء نے مرثیہ لکھے یا پڑھے وہ زیادہ تر وہ شعراء ہوتے تھے جن کا اس واقعہ کے ساتھ تعلق ہوتا یا وہ ہوتے جنکے سامنے وہ واقعہ پیش آیا ہوتا تھا۔خواہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا،خواہ ان کے زمانے میں وہ واقعہ ہوا تھا۔مگر اردو مرثیہ میں ایسا نہیں ہے۔

فارسی میں مرثیہ کی ابتداء۔

ایران میں ایک لمبے عرصے تک غزل اور قصیدہ کا بول بالا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شعرائے کرام کو قصیدہ گوئی کے بدلے انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔سلاطین صفویہ کے عہد میں فارسی مرثیہ نگاری کا رجحان پروان چڑھا۔شاہ طہماسپ صفوی نے جس کا دور ۱۵۱۴ء سے ۱۵۷۲ء تک رہا۔اسکے عہد میں قابلِ تعریف مرثیہ نگاروں کا ذکر ملتا ہے۔جس میں محتشم کاشانی،محسن کاشی،ظہوری،ملاّ مقبل وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔فارسی مراثی قصیدہ کے طور پر ترکیب بند یا ترجیع بند کی شکل میں ملتے ہیں۔جن میں حضرت امام حسینؑ،ان کے اصحاب،انصار اور اعوان کے مصائب اور شہادت کا کہیں کہیں ذکر ہوتا تھا۔ان مرثیوں میں کسی شہید کا حال تفصیل سے ارکان اور اجزائے مرثیہ نگاری کے طور پر نہیں لکھا جاتا تھا۔جیسا کہ اردو مرثیہ نگاری میں مروّج ہوتا ہے۔

فارسی میں مرثیہ کی ابتداء کب اور کسنے کی اس کا پتہ لگانا مشکل ہے۔فارسی کے مورخین ادبیات کا خیال ہے کہ سب سے پہلا شاعر رودکی ہے جس کے رثائی اشعار تذکروں میں ملتے ہیں۔یہ اشعار قطعات کی شکل میں ہیں جس میں شاعر نے اپنے کسی عزیز،دوست یا ہمعصر شاعر کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔

مُرد مُرادی نہ ہمانا کہ مُر

مردن آں خواجہ نہ کاریست خُرد

جان گرامی بہ پدر باز داد

کالبُد تیرہ بہ مادر سپُرد

کاہ بندہ وکہ ببادی پرید

آب بند اوگر بسر مافرد

شہید بلخی کی موت پر:۔

کاروان شہید رفت از پیش
وآں مارفتہ گیردمی اندیش

ازشمار دو چشم یک تن کم
وز شمار خرد ہزاراں بیش

اس سلسلے کے بعد دو اشعار سامانیہ دور کے ایک بہت مشہور شاعر عمادہ مروزی کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ جو سامانی شہزادہ اسمائل بن نوح کی جواں مرگی پر کہے گئے تھے۔

از خونِ او چو روی زمی لعل نام شد
روی وفاسیہ شد و چشم امید زرد
تیغش بخواست خوردہمی خون مرگ را
مرگ ازنہب خویش مراں شاہ رابخو در

فارسی ادب کی تاریخ میں فردوسی اور فرخی نے بھی بہترین اور اہم مرثیہ کہے ہیں۔ جن میں شدت جذبات کے اچھوتے نمونے ملتے ہیں۔ فردوسی نے سہراب کا مرثیہ جو کہ اس کی ماں کی زبانی کہلوایا ہے، بڑا رقّت اور دردانگیز ہے۔ یہ مرثیہ درجہ ذیل ہے جسکو پڑھنے سے شدت جذبات کا اندازہ ہو سکے گا۔

بمادر خبر شد سہراب گرد زتیغ پدر خستہ گشت وبُرد
خرشیدو جوشید وجامہ درید بزاری، بران کودِک ناسید

بزوچنگ وبدریدپیرا ہنش درخشان شد آن لعلِ زیباتنش
بر آورد بانگ وغریووخروش زمان تازمان زوہمیرفت ہوش

فروبرد ناخن ،دو دیدہ بکند برآور دبالادرآتش فگند
مرآن زلف چون تاب دادہ کمند بہ انگشت پیچید وازبن بکند

روان گشت ازروی اوجوی خون زمان تازمان اندرآمدنگون
ہمہ خاک تیرہ بسربر فگند بدندان زبازوی خود گوشت کند

بسر برفگند آتش وبر فروخت ہمہ موی مشکین بآتش بسوخت
ہمی گفت کای جان مادر !کنون کجایی سرشتہ بخاک وبہ خون

دو چشم براہ بودگ فتم مگر ز سہراب ورستم بیابم خبر
گمانم چنا ن بو دگفتم کنو ن بگشتی بگردِ جہان اندرون

پدر راہی جستی و یافتی کنون بآمدن نیز بشتافتی
چہ دانستم ای پور! کاید خبر کہ رستم بہ خنجر دریدت جگر

دریغش نیامد ازان روی تو وزان بروبالا وبازوی تو
بہ پرورده بودم تنش رابناز برخشنده روزو شبان دراز

کنون آں بخوں اندرون غرقہ گشت کفن برتن پاک اوخرقہ گشت
کنون من کرا گیرم اندر کنار کہ خواہد بدن مر مراغم گسار

کرا گویم این درد وتیمار خویش کرا خانم اکنون بجای تو پیش
پدر جستی ،می گر دلشکر پناہ بجای پدر،گورت آمد براہ

از امید نا میدگشتی تو زار بخفتی بخاک اندرون زار وخوار
اذان پیش کو دشنہ رابرکشیده جگر گا ه سیمیں تو بردریده

چرا آن نشانیکہ مادرت داد ندادی بروبر نکر دیش یاد
نشان داده ء بداز پدر مادرت زہر چہ نامد ہمی بادرت

کنون مادرت ما ندبی تو اسیر پراز درد وتیمار ورنج وزحیر
چرنا مدم باتو اندر سفر کہ گشتی بگردان گیتی سمر

مرارستم ازو دور بشناختی ترابا من ای پور بنواختی
بینده ختی تیغ آن سرفراز نکردی جگر گاہت ای پور باز

ہمی گفت ومی خست ومیکند موی ہمی زدکفِ دست برخودی بروی
ہمی گفت : مادرت بیچاره گشت بہ خنجر جگر گاه تو پارهِ گشت

اس عہد کا ایک ممتاز شاعر فرّخی بھی ہے،جس نے سلطان محمود کی وفات پر لکھا ہے جو نہایت پراثر،دردانگیز اور دل دوز ہے۔پیش ہیں اس مرثیہ کے چند اشعار۔

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دید پار چہ فتاد است ؟ کہ امسال دگر گون شد کار
کو یہا بینم پر شورش وسرتاسرکوی ہمہ پر جوشن وجوشن درو پر خیل و سوار
ملک امسال وگر باز نیامد زغز دشمنی روی نہاداست درین شہر ودیار
آہ ودرداکہ بیک باره تہی بینم ازو کاخ محمودی وآن خانۂ پرنقش و نگار
سیر می خورده مگر دی وتخفستت ،امروز دیر تر خاست ، مگر رنج رسیدش زخماز

خیز شاہا کہ رسولان شہان آمدہ اند	ہدیہ ہا دارند آوردہ فراوان ونثار
کہ تواند؟ کہ برانگیز وازیں خواب ترا	خفتنی خفتی،کز خواب نہ گردی بیدار
خفتن بسیارای خسرو !خوی تو نہ بود	ہیچ کس خفتہ ندید است ترازین کردار
یک دمک باری درخانہ بیایست نشست	تا بدید ندی روی تو عزیزان و تبار
بہ حصار از فزع وبیم تو فرتند شہاں	تو شہا از فزع وبیم کہ رفتی بکنار
شعرار ا بتو بازار بر افروختہ بود	رفتی و باتو بیکبارہ برفت آن بازار

اس عہد کے بعد فارسی ادب میں بہت کم مرثیہ لکھے گئے۔اور جوتھوڑے لکھے گئے ہیں وہ برائے بیت ہیں۔البتہ شیخ سعدیؔ اورامیر خسروؔ کے دومرثیہ ملتے ہیں جو بہت مشہور ہیں۔اور چونکہ یہ مرثیے دل سے کہے گئے ہیں اس لئے یہ پرسوز اوردردانگیز بھی ہیں۔لیکن ان کے زمانے میں عیش وطرب کی محفلیں غزل سے گونج رہی تھیں اسلئے اس کا اثر عام نہیں ہوا۔

فارسی میں جس نے پہلا مرثیہ سانحۂ کربلا کے متعلق لکھا وہ شیخ آذریؔ کا ہے۔اس بارے میں شمشاد حیدر زیدی لکھتے ہیں۔

> ''سانحۂ کربلا سے متعلق سب سے پہلا مرثیہ جس کوایران میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی وہ شیخ آذریؔ کا کہا ہوا ہے۔ایران میں مرثیہ گوئی کا عام رواج صفویوں کے عہد میں ہوا۔صفوی خاندان کے بانی شاہ اسمٰعیل کے عہد میں ملاحسین واعظ کاشوی نے مجالس عزاپڑھنے کے لئے''روضۃ الشہداء''لکھی جو بے حد مقبول ہوئی۔بعض لوگوں نے اس کا پڑھنا اپنا پیشہ بنالیا اور یہ لوگ روضہ خاں کہلاتے تھے۔''[9]

صفویہ اور تیموریہ کے دور میں فارسی شاعری نے ایک نیا قالب اختیار کیا،نظیریؔ اور عرفیؔ کی زود آوریوں نے پرانی بنیادیں گرا کر نئی عمارتیں کھڑی کیں۔اس زمانے میں محتشم کاشی نے عام دستور کے موافق شاہ طہماسپؔ صفوی کی شان میں ایک قصیدہ لکھا۔شاہ طہماسپ صفو چونکہ خاندان رسالت سے گہری عقیدت رکھتا تھا اسلئے اس نے کہا کہ میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ میری مدح میں قصائد لکھے جائیں۔شعراء کوائمہ اہل بیت میں طبع آزمائی کرنی چاہئے۔جس کا اصل صلہ خدا کے دربار سے ملے گا۔اور دنیوی تمتعات میرے دربار شاہی سے حاصل ہوں گے۔چنانچہ محتشم کاشی نے دس بندوں کا ایک مرثیہ لکھا۔،جبکہ علامہ شبلی نعمانی اس کی تعداد آٹھ دس بندوں کی بتائی ہے۔شمشاد حیدر زیدی نے اس کی تعداد بارہ بتائی ہے۔اپنی کتاب'اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات'میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''محتشم کاشی کا مشہور مرثیہ ایک ترتیب بند نظم ہے،جس میں آٹھ آٹھ شعروں کے بارہ بند ہیں۔اسی سبب سے عام طور پر یہ مرثیہ''دوازدہ بند''کے نام سے مشہور ہے۔''[10]

یہ مرثیہ دردوغم کی مجسم تصویر ہے۔اور جس کا جواب آج تک فارسی مرثیہ نگاری میں نہیں مل سکا ہے۔چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔

چون خون زحلق تشنۂ او بر زمین رسید جوش از زمین بہ زردۂ عرش برین رسید
نخل بلند اوچوخسان بر زمین زدند طوفان بہ آسمان زغبار زمین رسید
بادآن غبار چون بمزار نبی رساند گرداز مدینہ بر فلک ہفتمین رسید
کرداین خیال وہم غلط کارکان غبار تا دامن جلال جہان آفرین رسید
ہست ازملال گرچہ بری ذات ذوالجلال
اودر دل است وہیچ ولی نیست بے ملال

ترسم جزای قاتل او چون رقم زنند یک بار بر جریدۂ رحمت قلم زنند
ترسم کزین گناہ شفیعانِ روز حشر دار ند شرم کز گنہِ خلق دم زنند
دست عتاب حق بدر آید زآستین چون اہل بیت دست بر اہل ستم زنند
آہ ازومیکہ با کفن خون چکان زخاک آل علی چو شعلۂ آتش علم زنند
از صاحب حرم چہ توقع کنند باز آن ناکستان کہ تیغ بصیدِحرم زنند
بس برسنا کنند سری راکہ جبرئیل
شوید غبار گیسویش از آبِ سلسبیل

بر حر بگاہ چون رہِ آن کاروانِ فتاد شور نشور داہمہ را در گمان فتاد
ہم بانگ نوحہ ،غلغلہ درشش جہت فگند ہم گریہ بر ملائک ہفتِ آسمان فتاد
چندان کہ برتن شہدا چشم کار کرد برزخمہای کاری تیغ وسنان فتاد
ناگاہ چشم دخترِ زہرا دران میان بر پیکرِ شریف امام زمان فتاد
بے اختیار نعرۂ ہذا حسین ازد سرزد چنان کہ آتش ازو در جہان فتاد
پس با زبان پر گلہ آں بضعتہ البتول
رو درمدینہ کرد کہ یا ایھا الرسول

این کشتۂ فتادہ بہ ہامون حسین تست وین صیددست وبازردہ درخون حسین تست
این غرقۂ محیط شہادت کہ روے دشت از موج خون اوشدہ گلگون حسین تست
این خشک لب فتادۂ ممنوع از فرات کز خون اوزمین شدہ جیحون حسین تست

این شاه کم سپاه که باخیل اشک و آه | خرگاه ازین جهان زده بیرون حسین تست
این قالبِ تپان که چنین مانده برزمین | شاہِ شہید نا شده مدون حسین تست

پس روی دربقیع بہ زہرا خطاب کرد
وحش ِ زمین و مرغ ہوا را کباب کرد

کای مونس شکستہ ولان! حال مابین | ماراغریب و بے کس و بے آشنا ببین
تنہای کشتگان ہمہ درخاک و خون نگر | سر ہای سروران، ہمہ بر نیز ہا ببین
آن سرکہ بود برسر دوشِ نبیؐ مدام | یک نیزہ اش زدوشِ مخالف جدا ببین
واں تن کہ بود پرورش در کنار تو | غلطان بہ خاکِ معرکۂ کربلا ببین
در خلد بر حجاب دو کون آستین فشان | واندر جہان مصیبت ما بر ملا ببین
نے نے،در آچو ابر خروشان بکر بلا | طغیانِ سیل فتنۂ و موج بلا ببین

یا بضعۃ البتول ! زابن ِ زیاد داد
و خاکِ اہل بیت رسالت بباد داد

محتشم کاشی کے بعد مقبلؔ نے مرثیہ نگاری میں اپنا ایک منفرد اور بلند مقام بنایا۔اور کثیر تعداد میں مراثی کہے جو بہت تفصیلی اور دل گداز ہے۔اور ایک طرح سے کربلا کی منظوم تاریخ بھی ہے۔ یہ مرثیہ کربلا کے تمام واقعات یعنی ابتدائے سفر سے لے کر کربلا میں شہادت،اہل حرم کے قید ہونے اور رہائی پا کر مدینہ میں آنے تک واقعات سادہ ترین لیکن تفصیل کے ساتھ ان مرثیوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ان مرثیوں کو مرثیہ کی بہ نسبت ایک تاریخ کہنا زیادہ درست ہوگا۔مقبل نے یہ مرثیے مثنوی کی ہیئت میں لکھے ہیں۔ان مرثیوں میں قصیدہ نگاری کا رنگ و آہنگ ملتا ہے۔مقبلؔ کے مرثیوں میں اگرچہ وہ زور اور بندش کی چستی نہیں ہے، جو اس دور کا خاصہ تھا لیکن یہ درد اور تاثر سے بھرا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ مراثی ایران میں آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔مقبل کے مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

مخدّرات بہ عباس درسخن بودند | برای رفتن اُو در گریستن بودند
کہ از درون سرا پردہ با فغان وخروش | سکینہ آمد دیک مشکِ خالی بردوش
دواں بہ خدمتِ عمؔ بزرگوار آورد | چنانکہ اہل حرم رابہ زار زار آورد
بگر یہ گفت کہ ای عمؔ خوش قرینۂ من | رسید جان بلب از تشنگی زسینۂ من
چہ واقع است کہ رحمی بخلق دوران نیست | چہ شد کہ جرعۂ آبی درین بیابان نیست
چو دید حضرت ِعباس بے قراری او | گسیخت بند دلش ازفغان وزاری او

مقبلؔ نے اپنی مرثیہ نگاری سے پوری ایک نسل کو متاثر کیا جس نے پورے ذوق وشوق سے مرثیوں کو وسعت دی اور کئی اقسام بھی پیش کئے مثلاً سلام نوحہ وغیرہ۔

ہندوستان میں مرثیہ کی ابتداء۔

مرثیہ عرب سے ایران اور ایران سے ہندوستان کی سرزمین پر اپنی تمام تر اہم اور روایات لے کر آیا۔ مورّخ بیان کرتا ہے کہ ظہوریؔ جو کہ فارسی کا شاعر تھا عادلؔ شاہ کے دور میں ہندوستان آیا اور دکن میں ہی قیام کیا۔ اس نے فارسی میں مرثیے بھی لکھے جو اصطلاحی مفہوم میں ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں پہلے فارسی مرثیہ گوئی کی بنیاد پڑی، پھر اردو کا ظہور ہوا، اور ساتھ ہی اردو مرثیہ گوئی بھی وجود میں آئی۔ ڈاکٹر فضل امام رضوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ.......

> ''اس طرح دکن کی سرزمین پر فارسی مرثیہ نگاری کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ ان قصائد پر فارسی قصیدہ نگاری کا بھرپور اثر چھایا ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی تاریخ مرثیہ نگاری کا دلچسپ باب ہے کہ یہاں کی سرزمین پر ہی اردو مرثیہ نگاری کی بنیاد پڑتی ہے۔ اور اردو مرثیہ عربی اور فارسی مرثیہ نگاری سے مختلف، اپنا جادہ قائم کرتا ہے۔''[۱۱]

اردو مرثیہ گوئی کی ابتداء کے بارے میں سید سبط حسین نقوی اپنی کتاب 'انیس الشعراء' میں لکھتے ہیں کہ....

> ''اردو زبان بنتے ہی یا یوں کہئے کہ آغاز اردو ادب ہی رثائیہ شاعری یعنی (مرثیہ) سے ہوا کیوں کہ اردو ہندوستان کی زبان اور پیداوار ہے، جو دکن سے پھیلی۔ دکن میں پہلے محتشمؔ کاشانی کا کلام مرثیے پڑھے جاتے تھے جو فارسی میں تھے۔''[۱۲]

دکن میں مرثیہ کی ابتداء کس نے کی اس میں بھی ناقدین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اشرفؔ کو جنوبی ہندوستان کا پہلا مرثیہ گو شاعر تسلیم کیا ہے اور ان کی مثنوی ''نوسرہار''، جس کا سن تصنیف ۹۰۹ھ ہے، پہلا مرثیہ قرار دیتے ہیں، جب کہ موسوی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے 'نوسرہار' کو مرثیہ ہی نہیں قرار دیا ہے، بلکہ مثنوی بتایا ہے۔ اور موسویؔ کے ہم خیال مسیح الزماں بھی ہیں۔ ان دونوں کا خیال ہے کہ شہادت نامہ اور مرثیہ دو الگ الگ صنف ہے۔ شہادت نامے ایک وسیع تجویز کے تحت لکھے جاتے ہیں، اس کے لئے مثنوی مخصوص ہوگی جبکہ مرثیہ اس کے مقابل میں مختصر اور قصیدہ کی شکل میں لکھے جاتے تھے۔ اور بعد میں مثلث، مربع مخمس اور بعد میں مسدس کی شکل میں لکھے جانے لگے۔

دکن میں مرثیہ گوئی کے اولین نمونے ملاّ وجہیؔ اور محمد قلی قطبؔ شاہ کے یہاں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید موسوی نے برہان الدین جانمؔ کو پہلا مرثیہ نگار قرار دینا چاہا لیکن بعد میں وجہیؔ کو انھوں نے پہلا مرثیہ گو شاعر مانا ہے۔ وجہیؔ اور قلی قطب

دونو ہم عصر ہیں لیکن ان میں سے مرثیہ نگاری میں کسے تقدم زمان حاصل ہے یہ کہنا مشکل ہے۔ برہان الدین جانمؔ، ملاّ وجہیؔ اور محمد قلیؔ قطب کے مرثیوں کا انداز تقریباً ایک ہی ہے۔ ان کے مرثیے غزل یا قصیدے کی شکل میں اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ان میں واقعہ کربلا کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ وجہیؔ کے مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حسینؑ کا غم کرو عزیزاں انجوا نین سوں جھڑو عزیزاں
بنا جو اول ہے غم کا عرش گگن ہور دہرت ہلایا
قضا میں جوں جوں لکھیا ابھی گریا حسینؑ پر ادھی سمایا
نبیاں ولیاں کے انجوں ہوں کلڑے یوں غمِ حسینؑ کا جنم دھولا یا [۱۳]

محمد قلی کے کلیات میں غزل، مثنوی کے علاوہ کچھ نوحے، سلام اور مرثیے بھی شامل ہے۔ یہ مرثیے غزل کی ہیئت میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان مرثیوں میں سوز و گداز کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ محمد قلی کے مرثیے کے چند اشعار دیکھئے۔

لہو روتی ہے بی بی فاطمہ اپنے حسیناں تیئں اور لہو لالی کا رنگ سا تو گگن اپرال چھایا ہے
کیا ہے مہمان، یوں اماماں کا محرم توں جنگل میں کربلا کے سب بلایاں کو بلایا ہے
مسلمانوں کوں نہیں ہے اس برابر کوئی بلا جگ میں کہ انجھواں کے لہوتیں پیالے بھر پلایا ہے
کیے ہیں مومنان کسوت حسنؑ کے زہر تھے ہریا سواس کے چھاؤں تھے اساں اپنا رنگ بھرایا ہے
خدایا قطب شہ کوں بخش توں خرمت اماماں کی کہ ان کی مدح کا حلقہ مرے کن میں سہایا ہے [۱۴]

مرثیہ نگاری کے لئے گولکنڈا کی حکومت میں سب سے سازگار عہد ابوالحسن شاہ کا مانا جاتا ہے۔ اس دور کے مرثیہ نگاروں میں فائزؔ، سیوکؔ، نوریؔ، لطیفؔ، کاظمؔ، شاہیؔ، افضلؔ وغیرہ شامل ہیں۔ سیوک، لطیف اور نوری نے مرثیہ نگاری پر خاص توجہ نہیں کی اور نہ ہی انھوں نے کوئی نئی بات پیدا کی۔ لیکن ان کے مقابلے میں افضل، کاظم اور شاہی نے مرثیوں میں کچھ نئے اجزاء کا استعمال کیا ہے۔ ان شعراء نے مربع اور مخمس کی شکل میں مرثیہ لکھے ہیں۔ ان مرثیوں میں ہر بند کے چوتھے یا پانچوں مصرعے مطلع کے ہم قافیہ ہیں، اور کبھی کبھی ان میں تھوڑی تبدیلی کر دی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ مخمس کا آخری مصرعہ جو ٹیپ کہلاتا ہے ایک ہی ہوتا ہے۔ جسے ہر چار مصرعوں کے بعد دوہرایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر افضل کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

حسینؑ کا دلبر و دلدار قاسم حسینؑ کا مونس و غمخوار قاسم
کشیدہ رنج و غم بسیار قاسم جہاں سوں دیدۂ خونبار قاسم
گیا از بدعت کفار قاسم

زمیں اس غم سوں درجوش افضل فلک گردید نیلی پوش افضل
ملائک سب ہوئے بیہوش افضل کنول زیں داستاں خاموش افضل
گیا از بدعت کفار قاسم

بیجا پور کی عادل شاہی سلطنت میں بھی اردو مرثیہ نگاری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اس عہد میں نوریؔ، مرزاؔ، نصرتیؔ، قادرؔ اور یاغیؔ کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان سب میں اولیت کا سہرا جس کے سر باندھا جاتا ہے وہ مرزاؔ ہیں۔ انھوں نے کوئی اور صنف سخن پر خیال آفرینی نہیں کی، صرف مرثیہ نگاری ہی کی ہے اور اتنی کثیر تعداد میں مرثیے لکھے ہیں کہ یہ مرثیہ گو شاعر کے نام سے ہی مشہور ہوئے۔ حتیٰ کہ بادشاہ نے اپنی مدح لکھنے کی خواہش کی تو انھوں نے انکار کر دیا۔

مرزا نے کئی طرح کے مرثیے لکھے ہیں، مثلاً مختصر اور طویل مرثیے۔ ان کا دو دو شعر کا مرثیہ بھی ملتا ہے۔ ان کے مرثیہ مسدس کی شکل میں بھی ہیں اور غزل نما بھی۔ انھوں نے اکثر مرثیے عنوان کے تحت لکھے ہیں، مثلاً قاسم کی شادی، علی اصغر کا مرثیہ، قصہ امام حسین، قصہ قاسم اور قصہ حُر وغیرہ۔

شریعت اساسے پہ اتنا ستم حقیقت شناسے پہ اتنا ستم
نبی کے نواسے پہ اتنا ستم سب امت کے آسے پہ اتنا ستم
دیا زہر پانی ملا ظالماں سو لاگا کلیجے کوں جا کر ندہاں
جگر گوشہ حسن کا پڑا بے گماں مدینہ کے باسی پہ اتنا ستم
حسین ابن حیدر خدا کا ولی جگر گوشۂ فاطمہ اور علی
بروج دہ و دہ کا یک جلی شہ کر گھراسے پہ اتنا ستم
مبارک بدن سوں ہوا سر جدا اسی غم سوں کہتا ہے مرزا سدا
کیا کیا وہ بدبخت نے اے خدا شہنشاہ پیاسے پہ اتنا ستم [۱۶]

بیجا پور کی عادل شاہی سلطنت کے اہم مرثیہ نگاروں میں ہاشمیؔ اور خود عادلؔ شاہ ثانی کا نام آتا ہے۔ جب گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت ۱۶۸۷ء اور بیجا پور کی عادل شاہی سلطنت ۱۶۸۶ء اورنگ زیب کے ہاتھوں ختم ہوگئیں اور اورنگ زیب نے اپنا صدر مقام اورنگ آباد کو بنایا تو شعر و ادب کی سرگرمیاں بھی دھیرے دھیرے منتقل ہوگئیں۔ سلطنت مغلیہ کا تسلط جنوبی ہند پر ۱۶۸۷ء تا ۱۷۲۲ء تک رہا مگر اس دور میں بھی قابل ذکر اور اچھے شعراء کا پتہ ملتا ہے۔ جس میں سید حسن شاہ ذوقیؔ، سید اشرفؔ، ندیمؔ اور تبسمؔ احمد کافی مشہور ہیں۔ آصف جاہی سلطنت کے قیام کے بعد بھی اچھے اور کامیاب مرثیہ نگاروں میں رضی، قادر، روحی، امامی، قائم، نظر، سیدین اور ہاشم علی ہیں۔ ان مرثیہ نگاروں نے اپنے مرثیے کے لئے مربع اور قصیدہ دونوں ہیئت اختیار کی ہیں۔ درگا، کاظم، شیدا اور احسان نے مسدس کی طرز میں بھی مرثیے لکھے ہیں۔ ہاشم برہان

پوری نے مرزا بیجاپوری کی بے نظیر مرثیہ نگاری کی روایت کو وسعت دی ہے۔ ہاشم برہان پوری کے مرثیہ کے چند بند ملاحظہ کیجیے۔

قاسم کہے دکھاوٗ شتابی لگن مرا — مجھ ہاتھ میں لے آگے بندھاوٗ کنگم مرا
آئی قضا مقابل دلائی لگن مرا — اس وقت کا ہے باب سروپر چمن مرا
جلوہ میں سیس اٹھ کے رن کو چلا تب کہی دلہن — دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھاروتم اس حال میں ہمن — تم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھون مرا
قاسم کھڑا تھا روتے نین سن دلہن کی بات — غم ناک اپنا دیکھ کے دامن دلہن کے ہاتھ
تب آہ دردناک سوں بولا دلہن کے ساتھ — ایے بوستان راحت و سرو چمن مرا
ہاشم علی یو غم کی حکایت کوں کیا کہوں — اس درد، اس الم روایت کوں کیا کہوں
دلہن کی بے کسی و شکایت کوں کیا کہوں — محشر تلک کہیں گے محبان بچن مرا

مرثیہ کے نمونے کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مرزؔا نے شہدائے کربلا اوران کی شہادت کی تفصیل علیحدہ علیحدہ پیش کی ہے اسی طرح ہاشؔم نے بھی ہر شہید کی شہادت کی تفصیل تسلسل کے ساتھ پیش کی ہے۔ان کے مرثیوں میں رجز اور رزم کے حالات زیادہ بیان نہیں کئے گئے ہیں مگر رخصت کی کیفیات تفصیل اور پرسوز انداز میں ملتی ہیں۔

عادل شاہی سلطنت کا تیسرا اور اہم مرثیہ نگار جس نے اردو مرثیہ نگاری کی نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا وہ درگاہ قلی خاں درگؔاہ ہے۔انھوں نے آصف جاہ اول کی سرپرستی میں بیت وادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔درگؔاہ فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے،لیکن مرثیہ صرف اردو میں ہی لکھتے تھے۔سالار جنگ کے کتب خانہ میں ان کے اُنیس مرثیے اوراکیس سلام محفوظ ہیں۔ان کے مراثی مربع،مخمس،مفردہ،مثمن،دہرہ بند،مسدس اور ترجیع بند کی روپ میں ہیں۔ہاشم اور درگؔاہ کا عہد ایک ہونے کے باوجود دونوں کے مرثیے میں بہت فرق نمایاں ہے۔اس فرق کی واضح وجہ درگاہ کا دہلی کا دورہ ہے۔دہلی میں درگؔاہ تقریباً تین سال رہے۔اور وہاں کے ادبی،علمی،ثقافتی اور معاشرتی مرکز میں رہ کر ترک وقبول کے عمل سے اپنے شعروادب کو توانا اوراستوار بنایا۔چند بند ملاحظہ ہوں۔

ہے آج کربلا کا بیاباں لہو لہو — صحرائے دل نگار کا داماں لہو لہو
ہے دشت کوہ جنگل و میداں لہو لہو — وہ رزم گاہِ شاہِ شہیداں لہو لہو
بے اختیار ہوکے کہے یا علی ولی — کیوں بیکسوں کے حال سے اتنی تغافلی
خنجر کی دھار حلق پہ پیاسے کے جب چلی — وا حسرتا ہوا لبِ و دنداں لہو لہو
حضرت سکینہ رو کے کہیں مہرباں پدر — چھوٹے بڑے لہو میں تڑپتے ہیں سر بسر
کیا کشت وخوں ہوا ہے ترے اہل بیت کا — طفلاں لہو لہو وجواناں لہو لہو

شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کی روایت جنوبی ہندوستان سے تقریباً تین ساڑھے تین سو سال بعد ہوئی۔ چنانچہ مرثیہ نگاری کا آغاز بھی کم از کم اتنی ہی مدت بعد ہوا۔شمالی ہندوستان میں عزاداری کا آغاز وارتقاء بادشاہ ہمایوں کے عہد سے ملتا ہے۔ جب ہمایوں ایران کے سفر سے واپس ہندوستان آیا تو اسکے ساتھ بہت سے ایرانی امراء اور علماء بھی تھے۔ اور اسی وقت سے ایران و ہندوستان کے تعلقات کا آغاز بھی ہوا۔اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تہذیب میں تو رانی اور عرب کے اثرات سے بھی زیادہ ایرانی اثرات نمایاں ہوئے۔ایران سے آئے ہوئے مہمان افراد ایّام عزا کے دوران مجلس عزا حضرت امام حسینؑ میں مشغول رہا کرتے تھے۔اور اس کا اثر دہلی والوں کی زندگی پر بھی پڑا۔مجالس عزا کا انعقاد بھی ہونے لگا۔محرم کا جلوس اور مجالس عزا کا رواج اورنگ زیب کے عہد تک آتے آتے عام ہو گیا تھا۔اور اس عہد میں اردو مرثیے بھی لکھے جانے لگے تھے۔لیکن شمال میں فارسی اور دکن کے مرثیے ہی پڑھے جاتے تھے۔شمالی ہند میں مجلس پڑھے جانے کے متعلق نصیر حسین خاں اپنا خیال بیان کرتے ہیں۔

”دکنی یعنی قطب شاہی شہزادے اور امیر زادے ادھر سے لائے اور وہ یہاں رواج پا گئی۔ان مجلسوں میں یا تو دکنی اردو کے مرثیے پڑھے جاتے تھے یا فارسی نوحے۔“ [17]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں برپا ہونے والی مجلسوں میں جو مراثی پڑھے جاتے تھے وہ فارسی اور دکنی میں ہوا کرتے تھے۔ پھر دہلی شعراء بھی مرثیہ نگاری کی طرف فطری اور ضرورتوں کے پیش نظر متوجہ ہوئے۔ان شاعروں میں صلاؔح،شاہ مبارکؔ اور مصطفیٰ خاں کا نام اہم ہے جنھوں نے مرثیہ نگاری میں طبع آزمائی کی۔صلاؔح کے تقریباً ۶۸ مراثی ملتے ہیں۔یہ مراثی مثنوی،مخمس،غزل اور قصیدہ کی شکل میں ہیں۔پیش ہے صلاؔح کے مرثیہ کا مختصر نمونہ۔

زاری کرو اے مومناں شاہِ جہاں کا کوچ ہے
شوراست در کون و مکاں صاحب قراں کا کوچ ہے
از ماتمِ آں گل بدن نیلا ہوا ہے یا سمن
نالم چو قمری در چمن سروِ رواں کا کوچ ہے
جب اقربا سارے گئے جب شاہِ دیں مارے گئے
چند اگر اتارے گئے، عرش آشیاں کا کوچ ہے
اہل حرم راچوں گزر افتاد اس جنگاہ پر
گفتند اے خیر البشر ہم بے کساں کا کوچ ہے
رو، اے صلاؔحِ مبتلا از بہر شاہِ کربلا
امروز باصد ابتلا اس کارواں کا کوچ ہے

اسی زمانے میں جب مرثیہ خوانی اور سوز خوانی اپنے عروج پہ تھی تو فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب ''روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ اردو زبان میں ''کربل کتھا'' کے نام سے کیا۔اس کتاب کا سنِ تصنیف ۱۷۴۵ء ہے۔یہ کتاب خالص ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس میں چوبالے اور مراثی کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔اس میں مسکینؔ کے مراثی کے اقتباس ملتے ہیں اس کے علاوہ فضلی نے 'روضۃ الشہداء' کے بعض اشعار کا ترجمہ اردو میں مثنوی کی شکل میں کیا ہے۔اور اپنے مرثیوں کے اقتباسات بھی 'کربل کتھا' میں حسب موقع شامل کئے ہیں جو مفردہ اور مربع کی شکل میں ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شہ کے جب حلق پر چلا خنجر　　بد بہا ہوئے کربہا خنجر
گھوڑا دیکھا کہ کیا کیا خنجر　　کیا خواوند کا سر جدا خنجر
لاشے کے گرد تب تصدق ہو　　چاٹ تھوتھنی سے لوہُو کو
آنکھیں مل شہ کے تلوؤں پر رورو　　کہتا بیری میرا ہوا خنجر
میں یہ گھوڑا ہو انگوڑا اب　　کس کا کہلاؤں گا میں گھوڑا اب
شیشۂ دل میرے کوں پھوڑا اب　　سنگ دل ہائے شمر کا خنجر

دہلی میں جب مرثیہ نگاری کا رواج عام ہوا تو مسکینؔ،حزیںؔ،غمگینؔ،محبؔ،سوداؔ،اور میر تقی میرؔ وغیرہ نے بھی اس میں طبع آزمائی کی۔مسکینؔ محمد شاہ کے عہد کے مشہور مرثیہ گو تھے۔جب درگاہ قلی خاں دہلی پہنچے تو اس شہر میں ان کی مرثیہ گوئی کا شہرہ تھا۔ان کے مراثی متعدد بیاضوں اور نسخوں میں قلمی شکل میں محفوظ ہیں۔ان مرثیوں کی کثیر تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ساری عمر مرثیہ گوئی میں ہی بسر کی ہوگی۔مسکین نے مرثیے غزل،قصیدے کی شکل میں نہ پیش کر کے مربع،مخمس اور مسدس میں لکھے ہیں۔غمگینؔ مسکین کے بھائی تھے یہ بھی دور محمد شاہ کے مرثیہ گو تھے۔ان کے مرثیے نئی نئی طرزوں میں کہے گئے ہیں،یہ مراثی نہایت دردانگیز اور پراثر ہیں۔

محبؔ مسکین کے کم عمر معاصرین اور سودا کے ہم عصروں میں آتے ہیں۔یہ اپنے آخری دنوں میں دہلی سے حیدرآباد چلے گئے تھے۔ان کے مراثی کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں موجود ہیں۔یہ مرثیے مربع،مخمس اور مسدس کے روپ میں ملتے ہیں۔جو مرثیے مسدس کی شکل میں ہیں وہ دراصل ترکیب بند کی نوعیت کے ہیں۔ٹیپ کا بند کبھی فارسی میں ہے اور کبھی اردو میں۔لیکن بند کے چاروں مصرعے ہم قافیہ نہیں ہیں،صرف تین مصرعے ہی ہم قافیہ ہوتے ہیں ،لیکن ایک بند کے بعد بدل جاتے ہیں۔ہر بند کے چوتھے مصرعے باہم ہم قافیہ لیکن پہلے تینوں مصرعے سے مختلف ہوتے ہیں۔چوتھے مصرعے کے ہم قافیہ ہونے کی قید روانی میں شاید مخل ہوتی رہی ہو،اس لئے بعد میں ہٹا دی گئی اور چاروں مصرعے ہم قافیہ ہونے لگے۔مثال دیکھئے۔

روتے ہیں محبّ شاہ کے سب تعزیہ داراں　　نت ابر کی آنکھوسیں کریں اشک کی دھاراں
ہے آتش دوزخ کے بجھانے کا یہ باراں　　فرماتے ہیں دو تشنہ لب ساقیٔ کوثر

سردر سر راہ تو فدا شد چہ بجا شد
ایں بار گراں بود ادا شد چہ بجا شد

اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل کے مرثیہ نگاروں میں قیام الدین قائم ،مرزا ہوشؔ دار،محمد تقی تقیؔ، عاصمیؔ، اشرفؔ الدولہ،نظرؔعلی،نعیمؔ،جعفرعلی حسرتؔ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔انھوں نے بھی مرثیے کی روایت کوآگے بڑھانے میں اہم کردارادا کیئے ہیں۔مگرسوداؔاور میر تقی میرؔ نے مرثیہ نگاری کو جو وسعت بخشی ہے وہ نا قابل فراموش ہے۔اردوشاعری میں دونوں شاعروں نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔قصیدہ نگاری میں سوداؔاورغزل کی دنیا میں میر تقی میرؔ نے جو مقام حاصل کیا ہے اس کا کوئی منکر نہیں ہے۔لیکن مرثیہ نگاری میں بھی انھوں نے اپنی طبیعت کے جو جو ہر دیکھائے ہیں اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ سوداؔاور میرؔ مرثیہ نگاری کی طرف برائے تفریح متوجہ ہوئے بلکہ دلی جذبات کے تحت ہوئے۔اور مرثیہ نگاری کوایک نئی فکر بخشی۔انھوں نے مرثیہ کوایک مشکل ترین صنف سخن قرار دیا اور وجہ یہ بتائی کہ واقعات کربلا ایک بہت اہم ہستیوں سے متعلق ہے۔یعنی شہدائے کربلا کا بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ایک بات کومختلف انداز سے پیش کرنا دشوار ہوتا ہے۔سوداؔنے مرثیے مربع مخمس اور مسدس کی شکل میں لکھے ہیں۔ملاحظہ ہوں

ماں اصغر کی دن اور رین رو رو کرتی ہے یہ بین
ہائے رے اصغرؑ ابن حسین کس کو دیکھیں گے یہ نین
تجھ بن میرے نور العین
کیوں کر ہو اس دل کو چین

میر تقی میرؔ کے مرثیہ کے مطالعہ سے ان کے عہد کی عزاداری کے رسوم ورواج کا علم ہوتا ہے اور ساتھ ہی گریئہ و ماتم کے طورطریقوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ان کے مراثی میں مقصدِ شہادت کا بھی احساس ملتا ہے۔میرؔ نے اپنے مرثیوں میں صرف شہادت کا بیان ہی نہیں کیا ہے بلکہ حضرت امام حسینؑ کی امن پسندی، جاہ وثروت سے بے نیازی کو بھی ظاہر کیا ہے۔ان کے مرثیے مسدس،مربع،ترجیع بند ترکیب بنداورمفردہ کی شکل میں مراثی کہیں ہیں۔مگر مربع کی شکل میں مرثیے زیادہ ملتے ہیں۔

اصغر کوخیمہ گاہ سے لایا تھا تشنہ کام
سو کام ایک تیر میں اس کا ہوا تمام
پانی کا پھر حسین نے ہرگز لیا نہ نام

دیکھا کہ طفل شیر کو لو ہا چٹا دیا

اودھ میں مرثیہ کی ابتداء فیض آباد کے بعد ہوئی۔اور لوگوں کی عام رائے بھی یہی ہے کہ جب نواب آصف الدولہ ۵ے۷اء، ۱۱۸۹ھ کے پائے تخت فیض آباد سے لکھنو منتقل کرنے پر جہاں بہت سی تہذیبی وتمدنی سرگرمیاں شروع ہوئی وہیں مرثیہ اور عزاداری کا رواج بھی قائم ہوا۔حالانکہ مورخین کا ماننا ہے کہ برہان الملک سید محمد امین نیشاپوری کے دور سے ہی اودھ میں ایرانی اثر عروج پر تھا اور شجاع الدولہ کے عہد میں عزاداری باقائدہ ہونے لگی تھی۔شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نے لکھنؤ کو پائے تخت قرار دیا۔ان کے عہد میں عزاداری کا رواج پہلے سے زیادہ عام ہو گیا تھا۔ان کے دور میں حیدریؔ،سکندرؔ، گداؔ، احساںؔ اور افسردہؔ وغیرہ شاعروں کی مرثیہ گوئی نے عزاداری کے رواج کو عام کرنے میں ناقابل فراموش کام انجام دیا۔

حیدریؔ نے مسدس کے روپ میں مرثیہ لکھا ہے،گداؔ،افسردہؔ اور احساںؔ وغیرہ نے بھی اپنے مراثی کے ساتھ انصاف کیا ہے۔سکندر کے ’’مرثیۂ روایت‘‘ کا اثر احساںؔ نے قبول کیا ہے اور تھوڑے بہت ردوبدل کر کے نظم بھی کئے ہیں۔لیکن جو تاثرات اور محسوسات سکندر کے مرثیہ میں ملتا ہے وہ ان کے مراثی میں موجود نہیں ہیں۔لیکن اگر دیکھا جائے تو لکھنؤ دبستان شاعری کی صنعتیں اور رعایتیں احساںؔ اور افسردہؔ کے مراثی میں نظر آتے ہیں۔جس پر اودھی، برج اور بھوجپوری، علاقائی زبانوں کا اثر نمایا ہے۔خلیقؔ،ضمیرؔ اور دلگیرؔ وغیرہ تک آتے آتے اودھ کے مرثیوں پر علاقائی اور مقامی رنگ بہت گہرا چڑ چکا تھا۔اس لئے ان مرثیہ نگاروں نے مرثیہ نگاری کے مطالبات،غرض اور علّت ومعلول سبھی کو پیش نظر رکھا ہے۔

اس طرح دھیرے دھیرے مرثیہ نگاری پروان چڑھتے ہوئے میر انیسؔ اور دبیرؔ کے ہاتھوں میں آئی، اور ان دونوں نے مرثیہ کی عمارت کو اس قدر بلند کیا کہ آج مرثیہ نگاری ان کے ذکر کے بغیر نامکمل سی محسوس ہوتی ہے۔ان سبھی مرثیہ گویوں کا ذکر آگے چل کر تفصیل سے پیش کیا جائیگا۔

☆☆☆

حواشی :

۱) اردو مرثیہ میں ہیئت اور موضوع کے تجربات : شمشاد حیدر زیدی، ص ۱۔

۲) اردو مرثیہ نگاری : 'امّ ہانی اشرف ایجوکیش بک ہاوس، ص ۲۴۔

۳) مرثیہ بعد انیسؔ' ڈاکٹر صفدر حسین'۔

۴) تعارف مرثیہ : شجاعت علی سکندر' ص ۱۸۔

۵) اردو مرثیہ نگاری' 'امّ ہانی اشرف'' ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ص ۳۱۔

۶) انیس شخصیت اور فن' ڈاکٹر فضل امام رضوی' ص ۸۲.

۷) انیس شخصیت اور فن' ڈاکٹر فضل امام رضوی' ص ۲۰۔

۸) موازنہ انیس و دبیر: علامہ شبلی نعمانی، ص ۳۔

۹) اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات، شمشاد حیدر زیدی، ص ۲۰ ۔

۱۰) اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات: شمشاد حیدر زیدی، ص ۲۰۔

۱۱) انیس شخصیت اور فن' ڈاکٹر فضل امام رضوی' ص ۸۸۔

۱۲) انیس الشعراء' سید سبط حسین نقوی' ص ۱۹۔

۱۳) دکن میں اردو' نصیر الدین ہاشمی' چھٹی اشاعت ص ۲۹۱۔

۱۴) سلطان محمد قلی قطب شاہ' ڈاکٹر محی الدین قادری زور' ص ۴۵۲۔

۱۵) دکن میں اردو' نصیر الدین ہاشمی' چھٹی اشاعت ص ۳۰۰۔

۱۶) دکن میں اردو' نصیر الدین ہاشمی' چھٹی اشاعت ص ۳۰۹۔

۱۷) داستان اردو، مغل اور اردو' نصیر حسین خاں' ص ۴۷۔

☆☆☆

بابِ دوّم

اردو کے اہم مرثیہ نگاروں کا فنّی جائزہ

دکن کے اہم مرثیہ نگار :

جس طرح اردو شاعری کی باضابطہ ابتدا دکن سے ہوئی اسی طرح ہندوستان میں مرثیہ نگاری کی ابتداء بھی دکن میں ہی ہوئی۔ دکن میں مرثیہ نگاری کی بنیاد بہمنیوں کے آخری زمانے میں پڑی۔اس دور میں ایران سے کئی علماء دکن آئے ،ان علماء کی وجہ سے سلطنت میں شیعت کا اثر بڑھنے لگا۔بہمنیوں کی درباری وسرکاری زبان فارسی تھی۔اس لئے یہاں ان علماؤں کی بڑی قدر ومنزلت کی جاتی تھی۔اورانھیں دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ایران سے آئے یہ علماء اثنائے عشری مذہب کے پیرو تھے۔یہی وجہ ہے کہ بہمنیوں میں بھی شیعت بڑھنے لگی،اور دھیرے دھیرے یہاں مجلس ومیلاد کا رواج بڑھنے لگا۔لیکن معاصرین کا کہنا ہے کہ مجلس کا آغاز بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت سے ہوامگر اس کے ساتھ ہی قطب شاہوں اور نظام شاہوں نے بھی اس کو رواج دیا۔

دکن میں ابتداً مجلسوں میں فارسی مرثیے پڑھے جاتے تھے اوران مرثیوں میں محتشم کاشی کے مرثیے زیادہ تر پڑھے جاتے تھے۔مگر چونکہ دکنی زبان عام طور سے مروّج تھی اور فارسی گویا رخصت ہوچکی تھی،اس لحاظ سے مرثیوں کا دکنی زبان میں لکھا جانا ناگریز تھا۔اسی وجہ سے ایک خاص گروہ مرثیہ گویوں کا پیدا ہوا،اور کثرت سے مرثیے لکھے جانے لگے۔خاص مرثیہ گو نگاروں کے علاوہ دیگر شعراء بھی اس صنف میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

اولاً دکنی مرثیے کب اور کہاں سے لکھے گئے اس امر کا صحیح پتا لگانا دشوار ہے۔کیوں کہ عادل شاہی اور قطب شاہی دونوں سلطنتوں کے بانی امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔اوراپنی اپنی سلطنتوں کا مذہب شیعت قرار دیا تھا۔نظام شاہی کا دوسرا بادشاہ اسمٰعیل شیعہ ہو چکا تھا۔رعایا کے خیالات اوراعتقادات میں یکسانیت پیدا کرنے کا خیال تینوں سلطنتوں کو تھا۔تاریخ سے اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ بیجاپور اور گولکنڈا میں شاہی عاشور خانے موجود تھے اور یہاں مرثیہ خوانی بھی ہوا کرتی تھی۔

بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی اور گولکنڈہ میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں خاص طور سے اس پر زیادہ توجہ کی گئی تھی۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں جہاں جشنِ میلادِ مبارک کے جلوس ہوا کرتے تھے وہیں محرم میں مجلسوں کے ساتھ ساتھ تعزیہ داری کو بھی رواج تھا۔تمام رعایا ایامِ عاشورہ تک نوبت ونقارہ موقوف رکھتے، گوشت اور پان کی دکانیں بند ہو جاتیں اور تمام مسلمان اور ہندو ماتم میں شریک ہو جاتے تھے۔اس وقت گولکنڈہ میں دو شاہی عاشور خانے ہوا کرتے تھے۔جہاں چودہ علم چودہ معصومین کے کھڑے کرائے جاتے اور روشنی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔سوسو، دو، دوسو چراغ کا

ایک ایک مثنوی درخت بنایا جاتا تھا۔ جو اپنی روشنی سے عاشور خانے کو منوّر کرتا تھا۔ یہاں مرثیہ خوان اور مدّاح شہراء ہر شب کو جمع ہوتے اور اردو میں مراثی اور مناقب پڑھے جاتے تھے۔ جب سب مراسم تعزیہ داری ادا ہو جاتے تو حکومت کی جانب سے سب کی دعوت ہوتی تھی، مگر اس دعوت میں گوشت سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ یعنی بے گوشت کی غذائیں نوش فرمائی جاتی تھیں۔ چھٹی تاریخ کو عاشور خانے کے باہر علم اٹھائے جاتے اور اور ان کے ساتھ محبان ائمہ اطہار ہاتھوں میں مشعل لئے ہوئے اور ذکر و مدّاح مرثیہ خوانی اور مداحی اشعار پڑھتے ہوئے طواف کرتے تھے۔ دسویں تاریخ کو خود سلطان عبداللہ سیاہ لباس میں برہنہ پا علموں کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ مرثیہ خوان آگے آگے مرثیہ پڑھتے جاتے تھے اور واقعات شہادت اور احوال گرفتاری حرم محترم بھی سنائے جاتے تھے۔

گولکنڈہ کی طرح بیجاپور میں بھی شاہی عاشور خانے ہوا کرتے تھے۔ یہاں کے ایک شاہی عاشور خانے کا نام ''حسنی محل'' تھا۔ بیجاپور کا ایک درباری شاعر نصرتی نے اپنے قصیدہ میں اس کی تزئین اور اس کی آراستگی کی پوری تفصیل پیش کی ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ علی عادل شاہ نے منت مانی تھی کہ اگر جنگ سے فتح یاب ہو جائے گا تو علم بٹھا کر مرثیہ خوانی کرے گا۔

اس وقت تک قدیم سے قدیم کتاب جو دستیاب ہوئی اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظام شاہی سلطنت کی اول مرثیہ نگار اشرف ہیں اور اس کے بعد گولکنڈہ کے مشہور شاعر ملاّ وجہی ہیں۔ پیش ہے دکن کے مشہور مرثیہ نگاروں کا مختصر جائزہ۔

۱۔ اشرف :

نظام شاہی دور کا اشرف پہلا شاعر تھا جس کا کلام ہمدست ہوا ہے۔ اس کا نام شیخ اشرف اور یہ اشرفؔ ہی تخلص کرتا تھا۔ یہ ملک احمد نظام الملک کے زمانے میں موجود تھا۔ اور اسی کے عہد میں اسکی مثنوی ''نوسرہار'' تصنیف ہوئی۔ بعض اصحاب کو اشرف کے احمد نگر کے شاعر ہونے سے اختلاف ہے۔ وہ اس کو بیجاپور سے متعلق کرتے تھے۔ مگر زیادہ تر قارئین اپنی تخلیق سے یہ بتاتے ہیں کہ اشرف کا تعلق احمد نگر سے ہی ہے۔

یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ نظام شاہی دور میں مرثیہ گوئی کی محفلیں منعقد کی جاتی ہوگی لیکن اس سوال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کا پہلا مرثیہ نگار کسے قرار دیا جائے؟ نصیرالدین ہاشمی نے نوسرہار کو اردو کا پہلا مرثیہ اور اشرف کو پہلا مرثیہ نگار بتایا ہے۔ مگر مسیح الزماں اور رشید موسوی دونوں کی یہ رائے ہے کہ مرثیہ اور شہادت نامہ دونوں الگ الگ اصناف ہیں۔ شہادت نامے ایک وسیع تجویز کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی اس کے لیے مخصوص ہوگئی۔ اس کے مقابلے میں مرثیے مختصر اور قصیدے کے روپ میں لکھے جاتے تھے۔ بعد میں مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کی شکل میں لکھے جانے لگے۔ اس کو مدّ نظر رکھتے ہوئے نصیرالدین ہاشمی کے قول سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

اشرف کی مثنوی 'نوسر ہار' میں دکنی مثنویوں کی طرح کسی بادشاہ کی مدح نہیں کی گئی ہے، بلکہ اس میں حمد ونعت اور منقبت کے بعد حضرت امام حسینؑ کے مصائب اور حالات کر بلا منظوم کئے گئے ہیں۔ دکنی زبان کی یہ پہلی مثنوی ہے جس میں واقعات کربلا کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی نو باب میں منقسم ہے، اس لئے اس کو نوسر ہار سے موسوم کیا گیا ہے۔ واقعات شہادت دوسرے شہادت ناموں یا مرثیہ کے طرز کے نہیں ہیں بلکہ اس کو ایک داستان کے طرز پہ لکھا گیا ہے۔ اشرف کے کلام کا نمونہ پیش ہے۔

ر ورو کے کہے یوں حسینؑ   اب کسے پچپوری کد ملین
وہ تون جانا مجہ وک دہر   یوں در ماندا بلکے گہر
تجہ تھیں سرہا ہوں ما باپ   اب کیوں انون طاقت تاب
تیری پیاروں ہوں تھا شاد   ما باپ ناوتے کدھیں یاد
اب یہ دکہ ہوں کیوں سہوں   کس پکاروں کس کہوں
اب بچھورا ہوا جسم   تجہ بن تھا کی بوں پر کم
اب کہ ہوں کس کا نانوں   کس پکاروں کہد ہر جاؤں

اشرف کے اس کلام میں صاف طور پر مرثیہ پن ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا اصل مقصد حضرت امام حسینؑ اور اہل بیت رسالت کا غم والم تازہ کرنا اور ان کی یاد میں آنسوں بہانا تھا۔

۲ ۔ اسداللہ وجہی :

وجہؔی قطب شاہی دور کے ایک مشہور شاعر تھے۔ ان کا نام اسداللہ تھا، اور اس کے اجداد خراسان سے دکن آئے تھے اور دکن میں ہی ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے تخلص میں کبھی وجہؔی لکھا تو کبھی وجہیؔ، اور کبھی وجہؔ قرار دیا تھا۔ ان کی زندگی ایک عرصہ تک عشرت سے بسر ہوئی۔ وجہی نے قطب شاہی دور کے چاروں بادشاہوں یعنی سلطان محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور حکومت کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اس کو تصنیف بھی کیا ہے۔ وجہؔی کی تصنیفوں میں اس کی دو کتاب کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک 'قطب مشتری' جو کہ ایک مثنوی ہے اور اس کا ہیرو محمد قلی قطب شاہ ہے۔ اور دوسری ان کی نثری تصنیف 'سب رس' ہے۔ سب رس ایک داستان ہے جس کو عبداللہ قطب شاہ کے دور تصنیف کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وجہی نے غزل، قصیدہ اور مرثیہ بھی لکھا ہے، ان کا ایک مرثیہ ہمدست ہوا ہے۔

حسین کا غم کر و عزیزاں   انجوا نین سوں جھڑو عزیزاں
بنا جو اول ہے غم کا   عرش گگن ہور دہرت ہلایا

قضا میں جوں جوں لکھیا ابھی	گریا حسینؑ پر ادھی سمایا
نبیاں ولیاں کے انجوں ہوں کلڑے	یوں غمِ حسینؑ کا جنم دھولا یا
دلاں میں دو لگی چھوہ نے چٹکیاں	یو غم نے سلگا ابرک لگایا
یو کیا ملا تھا یو کیا جفا تھا	مگر قضا تھا سو حق دکھایا
محبّ دلاں کوں اجل کا ساقی	پیالہ غم کے سو بھر پلایا
یو کیا اندیشہ اندیش کیتا	فلک شہاں پر ستم خدایا
حسینؑ پو یاران درود بیجو	کہ دین کا یو دیوا جلایا
تمہارے وجہی کوں یاں اماماں	نہیں تمن بن یو اس کو ستایا

دس اشعار کا یہ مرثیہ دکنی مرثیہ کے ابتدائی نمونوں میں اتّم درجہ کا ہے۔اس کی زبان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بولی سطح سے اوپر اٹھ کر ابتدائی سیڑھیوں سے آگے بڑھ چکی ہے۔ یہ مرثیہ اپنے شاعرانہ حسن کی آئینہ دار ہے۔مرثیہ کے چوتھے اور ساتویں شعر میں شاعر کے فن کے احساس اور بیان کی قدرت پر روشنی ڈالتا ہے۔نویں شعر میں شاعر اپنا عقیدہ ہی بیان نہیں کرتا بلکہ مرثیہ گوئی کے مقصد کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔مرثیہ کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وجہی کا درجہ شاعری کی اور صنفوں کی طرح مرثیہ گوئی میں بھی اونچا ہے

۳۔ سلطان محمد قلی قطبؔ شاہ :

قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان محمد قلی قطبؔ شاہ اپنے عہد اور اردو ادب کا ایک بلند پائیہ کا شاعر گزرا ہے۔ان کا ایک کلیات بھی ملتا ہے۔جس کو ان کے داماد اور بھتیجے قطب شاہ نے مرتب کیا تھا۔کلیات محمد قلی میں سارے اصناف سخن جیسے مثنوی،قصیدہ،غزل،مرثیہ،ترجیع بند اور رباعیات شامل ہیں۔سلطان محمد قلی قطب شاہ اپنا تخلص معانؔی اور قطبؔ شاہ کرتے تھے۔ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات صاف طور سے ظاہر ہوتی ہے کہ قلی قطب شاہ ایک فطری شاعر تھے۔اور ہر موضوع پر نہایت ہی خوبصورتی اور کامیابی سے طبع آزمائی کرتے تھے۔قلی قطب شاہ نے زبان کے فروغ میں بڑی خدمت انجام دی۔ان کے دور میں بڑے بڑے شاعروں نے ان کی نظر دیکھ کر دکنی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔خود سلطان کا کلیات بھی کافی ضخیم ہے۔ان کے کلیات میں سخن کی ہر صنف موجود ہے۔ ہر تذکرہ لکھنے والا ان کی تعریف کرتا ہے۔ان کے بارے میں ''سفارش حسین''اپنی کتاب'اردو مرثیہ'میں لکھتے ہیں۔

> '' قطب شاہ اردو شاعری کا بادشاہ ہے۔اور سچ پوچھئے تو اس کا مرتبہ اس سے بھی بلند ہے۔ وہ اورنگ نشین سلطنت ہی نہیں،مسند نشین ادب بھی تھا۔ادب کی مسند نشینی اسے شعر کے فن میں کمال حاصل ہونے سے ملی۔اس کے تقلید نے حلقے سے باہر قدم نکال

کر شعر کے فن میں نئی راہیں بنائی۔ اگر اس کی راہ ترک نہ کی گئی ہوتی تو اردو شاعری کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔"[1]

پیش ہے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے مرثیہ کا ایک نمونہ۔

دو جگ اماں دو کہہ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے
تن روں کی لکڑیاں جال کر کرتے ہیں خواری وائے وائے

ساتو گگن، آٹھو جنت، ساتو دریا، ساتو دہرت
ایکس تھے ایک، اپس میں اپ، دو کہہ کرتے کاری واکئے وائے

کالا کیا کسوت مکا ،دیکھو اما ماں دو کہہ تھے
ظلمات بی کالا ہوا، اس دو کہہ تھے بہاری وائے وائے

لوح ہو ، قلم،کرسی عرشی ،قدسیاں ملک، غلماں سب
بجلیاں بدل اڑ رواتے ہیں، رات ساری وائے وائے

آسمان چھج جالا ہوا، سورج اگن والا ہوا
چندر سوجل کالا ہوا، ہے دو کہہ اپاری وائے وائے

پنکھی سٹے ہیں سب پراں ،رو رو پھرائے سمدراں
چھوڑے ہیں سب اپنے گھراں دیکھو تو زاری وائے وائے

کالے ہوئے دو کہہ تھے منگل، سر پر سٹیں ماٹی سِگل
تو پکڑے اس دو کہہ تھے جنگل، ہے بے قراری وائے وائے

پھولاں سکے سب دو کہہ ستی، مکھہ موندے بلبل جھکہ ستی
کوئل حسینا دو کہہ ستی ،بن بن پکاری وائے وائے

دیکھو تمھیں اے انساں دانے چریں نہ پنکھیاں
دھرتی ہے ماتم کی دکھاں دھرتی بچاری وائے وائے

دو جگ خراباں ہو رہے،جیواں کیاباں ہو رئے
سمدر سراباں ہو رہے،نا ہوئے جاری وائے وائے

حضرت علیؑ کے دو پتاں ، کاندھے نبی کراٹنیاں
تس پر چڑھے دو شہ جواں ، اس دہات ساری وائے وائے

شہزادے کئے سب کے اونٹاں نمنے پکارے اس زباں
عف عف بنی تنکوں سناں، گئے دوئی باری وائے وائے

جبریل تب آکر کئے تسری براں جوعف کئے
اس عف تھے جگ پائے گا سب رست گاری وائے وائے

دونور دیدے بی بی کے آخر دیکھو کیوں دو کہہ دکھے
لہو میں لڑے پیاسے بھکے، دیکھو یہ خواری وائے وائے

یک پوت کو دیتے زہر، یک پوت پر کھینچے خنجر
کافر کئے کیسے قہر، یو زخم کاری وائے وائے

دو کہہ بات کو تو جیب جلے، لکھنے قلم بھی نا چلے
دل جوں شمے جل تلملے سدکی ہماری وائے وائے

قطبؔا کیے دل کے بچن، ہر دم مدد من پنجتن
راکھے خدا منج کوں جتن، دشمن کوں خواری وائے

قطبؔا کو ہے اللہ مدد، بستا ہے اس دل میں احد
تو منج مدد حیدر ولد بیریاں کوں زاری وائے وائے

قلی قطب شاہ کے شاعری کا اسلوب بیان سادہ ہے۔اوراس کی زبان دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ دکنی شاعروں کی اولین پیداوار سے ہوگی۔انیس شعر کے اس مرثیہ کو کافی پسند کیا گیا ہے۔اوراس کی وجہ یہ ہے کہ قلی قطب شاہ نے پالنے میں جھولنے والے بچے کو اپنی طبیعت کے زوراورفن کی طاقت سے بچے کو گھٹنیوں چلادیا۔ان کا یہ مرثیہ بیان کے انداز اور کلام کے معیار میں کافی اونچا ہے۔خیالات میں بھی ندرت ملتی ہے اور ساتھ ہی روایتیں نظم کی گئی ہیں جس سے بیان وسیع ہوگیا ہے۔اس مرثیہ میں حسن کلام بھی ہے اور سوز و گداز بھی،اوراس میں لفظوں کو ڈھالنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔

۴۔غواصی :

وجہی ہی کی طرح غواصی بھی دکن کے ایک مشہور شاعر تھے۔مگر عمر میں وجہی سے چھوٹے تھے۔دربار میں رسائی کے بعد انھوں نے اپنے فن کے بناپر''ملک اشعراء'' کے مرتبہ کو بھی حاصل کیا۔انھوں نے بھی وجہی کی طرح چاروں بادشاہوں کے عہد تک شاعری کی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں ان کو شاہی تقریب حاصل ہوئی۔ساتھ ہی بڑی عزت وشہرت بھی حاصل ہوئی۔انھوں نے سخن کی مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی کلیات سے ان کے قصیدہ،غزل،مثنوی اورمرثیہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔غواصی ایک غزل گو شاعر تھے غزل کے ساتھ ساتھ انھوں نے کئی مثنویاں

بھی لکھی ہیں جس میں ''سیف الملک وبدیع جمال'' اور ''طوطی نامہ'' کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔مثنوی کی طرح انھوں نے مرثیہ بھی عمدہ لکھے ہیں۔لیکن مرثیہ میں ان کا انداز بیان وجہؔی سے جداگانہ نہیں ہے، پھر بھی ان کے مرثیے میں انفرادیت ہے۔اور فن کی ندرت صاف طور سے جھلکتی ہے۔ان کی زبان وجہی کی زبان سے زیادہ صاف ہے۔مرثیہ میں لفظوں کی تراش خراش اور بناوٹ بھی اوروں سے جداگانہ ہے۔ان کے فن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر سال مرثیے لکھتے تھے۔ان کا یہ شعر نظر فرمائیے۔

''بولے غواصؔی مرثیہ سن روئے دکن کے اولیا
ہر سال کا یو مرثیہ کیا کام کیتا ہائے ہائے''

غواصی کا ایک مرثیہ دیکھیے۔

دستا نہیں کروں کیا اُو بیان کربلا کا — پھرتا ہوں، زار ہوں میں، حیران کربلا کا
اسمان تے خدایا جبریل اوتر کے آیا — روتا اوپر تے لایا، فرمان کربلا کا
کمر باندھ کربلا میں ،کرشام ہر بلا میں — کیوں ہے یہ کربلا میں سلطان کربلا میں
ہے دوکھہ بڑا یہ سب تے ، میں کس قرار تب تے — پکریا حسین جب تے میدان کربلا کا
وہ کہہ سب ملک لیے ہیں، ماتم زدہ ہوئے ہیں — رو رو دریا کیے ہیں اسمان کربلا کا
چنداسکھ سوں سوتا،اس دوکھ سوں عمر کھوتا — تاریاں سوں روز روتا فرمان کربلا کا
جلتا ہے سور جوتی،دنیا کھری ہے سوتی — کاں تے ہوا یو کوفی مہمان کربلا کا
منج سُکھہ نیں دوکہہ تے،ہوں ندہاں چھن — لا گیا ہے رات ہور دن منج وہیان کربلا کا
رو رو کرو بسارا منج شاد کرنے ہارا — سو ہے حسین پیارا ، شہ جان کربلا کا
غواصؔیا معطّر عالم کوں سب کیا ہے — گویا یو مرثیہ ہے ریحان کربلا کا

غواصؔی کے کلام کے نمونے سے ان کی فنّی قابلیت اور بیان کی قدرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس میں جذبات کے اظہار کی صداقت اور شدّتِ بیان کا زور اور خیال کی ندرت سب کچھ صاف طور سے نظر آتی ہے۔ان کے کلام میں سادگی ، بیان میں دلکشی ، بندش میں بڑی حدتک صفائی اور خیال کا اظہار تصنع سے پاک ہے۔یہ سارے وہ جوہر ہیں جو غواصؔی کے کلام کی خوبیاں ہیں۔اور اسی کی وجہ سے مرثیہ کہنے میں بھی ان کا مرتبہ اونچا قرار دیا جاتا ہے۔

۵۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ :

عبداللہ قطب شاہ قلی قطب شاہ کے نواسے اور اپنے دور کے مشہور شاعر تھے۔اپنا تخلص یہ عبداللہؔ ہی کرتے تھے۔انکی پیدائش ۱۰۲۳ء اور وفات ۱۰۸۳ء میں ہوئی۔مرنے کے بعد ان کی قبر گولکنڈہ میں بنائی گئی ہے۔سلطان عبداللہ

قطب شاہ بچپن سے ہی اپنے نانا قلی قطب شاہ کے نقش قدم پر گامزن تھے ۔اور انہیں کی طرح شاعری کرتے تھے ،اور شاعروں اور موسیقی دانوں کے بھی قدر دان تھے ۔ یہ صاحب علم بھی تھے ،میر قطب الدین جیسے بڑے مولانا سے انھوں نے تعلیم پائی تھی ۔ان کے دربار میں ہمیشہ عرب وعجم کے علماء اور اہل فن جمع رہتے تھے ۔ برہان قاطع جیسی مشہور نعت انھیں کے عہد میں تالیف ہوئی تھی ۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کو فارسی اور اردو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی ۔انھوں نے ان دونوں زبانوں میں اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔سالار جنگ کے کتب خانہ میں ان کے کلیات کا ایک مخطوطہ موجود ہے،جسکو اب شائع کروادیا گیا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے ۔قصیدہ ،مثنوی ،غزل اور مرثیہ میں ان کو مہارت حاصل تھی ۔سلطان قلی قطب کی طرح انھوں نے بھی مرثیے ،سلام ،نوحے تصنیف کئے ہیں ۔اس کے کلام میں لفظی شان وشوکت اور زبان میں سلاست خاص طور سے پائی جاتی ہے ۔ان کے ایک مرثیے کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ۔

علی ہور فاطمہؑ کرتے ہیں دونوں آج زاری بھی
حسن ہور حسین کا دوکھہ لے آیا جگ پوخوری بھی

حسینا جب چلے لڑنے سراں پر لگے پڑنے
شہیداں ہر طرف چرنے لگیاں یودوکھ پیاری بھی

وصیت یو کئے جاتے نکورو تم آپ بھاتے
نہیں تو پھر کونیں آتے اجل آئی ہماری بھی

یتیما کوسنبھالو ہور تمر بھی میں سکھالو ہور
بہت میراں سوں پالو ہور رہیں گے یادگاری بھی

حسین کا دوکہ دل میں آن لگا یک چٹ سوں دائم وہاں
کرے قطب عبداللہ سلطاں دوکھولوں شہریاری بھی

عبداللہ قطب شاہ کا یہ مرثیہ زبان اور بیان کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتا ہے ۔اس دور تک دکنی زبان صاف ہو چلی تھی مگر لفظوں کی تراش خراش اور بناوٹ کا سلسلہ جاری تھا۔اس مرثیہ میں فارسی ترکیبیں اور محاورے بھی اردو کے قالب میں ڈھالے گئے ہیں ۔

شاہیؔ :

شاہی کا نام شاہ قلی خاں اور شاہیؔ تخلص تھا۔گولکنڈہ کے رہنے والے اور ابوالحسن ،تاناشاہ ،آخری سلطان گولکنڈہ کی فوج میں ملازم تھے ۔لیکن اپنے علم ،قابلیت اور ذہانت کی بنا پر وہ جلد ہی بادشاہ کا ہم نشیں اور خاص درباری بن گئے تھے ۔

بادشاہ نے ان سے مرثیہ کہنے کی فرمائش کی،شاہی نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جلدی ہی عمدہ مرثیہ کہنے لگے۔یہ مرثیے اتنے مشہور ہوئے کہ دکن سے نکل کر شمال میں بھی پڑھے جانے لگے۔جب عالمگیر نے گولکنڈہ فتح کیا تو ان کے سپاہیوں نے ان کے مرثیے کو زبانی یاد کرلیا اور اس طرح یہ مرثیے دکن سے شمالی ہند میں پہنچے۔جہاں ان کے کلام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اس واقعہ کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"شاہ قلی خاں شاہیؔ تخلص از ساکنان بھاگ نگر بود،مدّتے برتوصل نوکری بادشاہی در بلدۂ حیدرآباد بسرمی برود،آخر بہ منصب ندیمی،تاناشاہ،معزز گردید،بیشتر مرثیہ میں گفت،درولایت ہندوستان دست بہ دست اوردند"۔[۲]

لیکن خاص طور سے ان کے مراثی حیدرآباد میں مشہور ہوئے۔ان کا ایک مرثیہ بہت مشہور ہے،جس میں اس وقت کے سفر کا بیان کیا گیا ہے جب بعد شہادت حسین ان کے قافلہ کو کربلا سے دمشق لے جایا جاتا ہے۔اس واقعہ کا صحیح بیان اس مرثیہ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

ہائے غریب یتیم نمائے عابد تری زاری ہے — باپ کا مرنا،دکہ بہر ناتس پہ یو بیماری ہے
تیغ کھڑی لے دشمن سر پر واویلا دکہ بھاری ہے — درد،مصیبت عابد تم پر آج کے دن بسیاری ہے
جبرئیل کئیں بتاؤ مجہ کوں نام ہے کیا اس وادی کا — سنا جب کربل،یہی ہے مقتل،حسین علی سے ہادی کا
کٹیا بہشت سے پیام لیا یا عابد تیری دادی کا — کٹھن گھڑی ہور پوتے میرے تجھ پر کیا سنگباری ہے
کلثوم،زینب ہور سکینہ بندی ہو تجھ بندوے سات — سر پدر کا نیزے اوپر کھاتے جاویں مُکّی لات
کریں محصل سختی ایسی کہہ نا سکیں دل کی بات — چمکے بجلی،گرجے بادل،مینہ کی رات اندھاری ہے
ٹھنڈے تپ اور تن برہنا سندھوں سند سب اکڑے ہیں — ننگے پانوں پا کھڑا بیڑی طوق گلے میں جکڑے ہیں
بے گنہہ نبی کے فرزند بن تقصیروں پکڑے ہیں — بھوکے پیاسے کئی کئی دن کے مدّت سے بیداری ہے

شاہیؔ کے اس مرثیہ میں جذبات کی شدت صاف طور سے محسوس کی جاسکتی ہے۔زبان صاف،سادہ اور شاعرانہ ہے۔واقعہ نگاری کی ترجمانی صحیح کی گئی ہے۔سفارش حسین رضوی شاہی کے طرز بیان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس کا طرز بیان اس واقعے کی حد تک انیسؔ کے انداز بیان کے مماثل ہے۔"[۳]

٦۔مرزا :

مرزا علی عادل شاہی دور کے ایک ایسے مشہور شاعر تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں سوائے مرثیہ کے کسی اور صنف سخن پر خیال آفرینی نہیں کی۔ایسا کرنا ان کے نزدیک اچھا کام نہ تھا۔مرثیہ گوئی ان کے لئے مذہبی فریضہ اور مقدس کام تھا۔ان کی رسائی بادشاہ کے دربار تک تھی۔بادشاہ ان پر مہربان تھا،اس کے باوجود مرزا نے ایک بھی شعر بادشاہ کی مدح

میں نہیں لکھا۔حتیٰ کہ بادشاہ نے اپنی مدح میں شعر لکھوانے کی کوشش کی تو انھوں نے انکار کر دیا۔مگر جب زیادہ اصرار کیا گیا تو انھوں نے بادشاہ کی مدح میں مرثیہ تو لکھا مگر اس میں اپنے تخلص کی جگہ بادشاہ کا نام لکھ دیا۔مرزا کا تذکرہ مؤتف بساتین السلاطین نے کیا ہے۔اور اسکی وضاحت کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں موجود تھے۔ یہ مرثیہ گوئی کو مذہبی فرض خیال کرتے تھے۔اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اکثر خوابوں میں بھی تلقین ہونے لگی۔مرزا کے عقیدے کی شدّت کا بیان اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار مرزا نے مرثیہ کے لئے ایک مصرعہ کہا۔

''دلاں پا کہاں اناراں کرر کھو سینہ طبق میانے''

اس مصرعہ کے لئے اس کو دوسرے مصرعہ کی تلاش تھی جو ان کو موزوں نہیں ہو رہا تھا۔اسی خیال میں ان پر مدہوشی طاری ہوئی اور حضرت رسول اکرمؐ تشریف لائے اور ارشاد فرمایا۔

'' نبی آویں گے محشر کوں یو تحفہ کر لے جانا ہے''

مرزؔا کی وفات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شہید ہوئے تھے اور ان کی شہادت یوم عاشورہ کو ہوئی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مرزؔا تمام رات مرثیہ خوانی کرتے رہے اور صبح کو کسی ظالم نے خنجر سے ان کو ہلاک کر دیا۔ان کی تدفین بیجاپور میں شاہ مرتضٰی قادری کی درگاہ میں ہوئی۔علی عادل شاہ کے حکم سے تمام تازیے اور علم ابراہیم پور کے دروازے جو کہ اُس وقت فتح دروازہ کے نام سے موسوم تھا، لے جائے گئے اور اس کے پیچھے پیچھے مرزا کا جنازہ تھا۔اور اس طرح بڑے مجمع کے ساتھ مرزا کو دفنایا گیا۔

مرزا کے مرثیے دکن میں بہت مشہور تھے۔حتیٰ کہ عالمگیر کے فوجیوں کو بھی ان کے مراثی زبانی یاد تھے۔مرزا نے مرثیے طویل بھی لکھے ہیں اور مختصر بھی۔دو دو شعر کے مرثیے بھی لکھے ہیں اور مسدس کی شکل میں بھی اور غزل کے روپ میں بھی ان کے مراثی ملتے ہیں۔مرثیے کے علاوہ مرزا نے سلام اور نوحے کی بھی تخلیق کی ہے۔لیکن جو کامیابی ان کو مرثیہ نے بخشی اور کسی نے نہیں دی۔ان کے مراثی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے مجالس عزا کو اشکبار بنانے کے لئے مرزا نے اپنے مرثیوں میں مرثیہ پن پہ زیادہ زور دینے کے علاوہ واقعہ نگاری کا بھی استعمال کیا ہے۔شہدائے کربلا کی شجاعت، بہادری، ہمّت اور استقلال، گھوڑوں اور تلواروں کی تعریف، جنگ کا نقشہ وغیرہ امور کی بڑی خوبصورتی سے منظر کشی کی ہے۔اس کے مرثیہ کا نمونہ پیش ہے۔

شریعت اساسے پہ ایتا ستم ... حقیقت شناسے پہ ایتا ستم
نبی کے نواسے پہ ایتا ستم ... سب امّت کے آسے پہ ایتا ستم
دیا زہر پانی میں با ظالماں ... سو لا گا کلیجہ کوں جا کر تدہاں
جگر ٹوٹ حسن کا پڑا بے گناں ... مدینہ کے باسے پہ ایتا ستم

حسین ابن حیدر خدا کا ولی جگر گوشئہ فاطمہ ہور علی
بروج دو ودھ کا جلی شہ کر گہراسے پہ ایتا ستم
مبارک بدن سوں ہوا سر جدا اسی غم سوں کہتا ہے مرزؔا سدا
کیا کیا وہ بدبخت نے اے خدا شہنشہ پیاسے پہ ایتا ستم

مرزا کا یہ مرثیہ، اردو مرثیہ نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس عہد تک مرثیہ منفرد شکل میں لکھا جاتا تھا۔ انھوں نے مربع مرثیہ کہہ کر مرثیہ گوئی میں وسعت پیدا کی۔اس طرح یہ مرثیہ ترقی کا پہلا قدم مانا جا سکتا ہے۔مرزا کے اس مرثیہ کی زبان پہلے کے مرثیہ نگاروں کی زبان سے صاف ہے، اس میں بیان کی سادگی، صفائی اور روانی صاف طور سے ظاہر ہوتی ہے۔

۷۔سلطان علی عادل شاہ :

علی عادل شاہ کے عہد پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات صاف طور سے واضح ہوتی ہے کہ اس کے عہد میں شعر و شاعری کا دور دورہ تھا۔شعراء اور ادیبوں کی دستگیری اور سرپرستی ہوتی رہتی تھی۔اس عہد میں خصوصیت سے دکنی شاعری کو بڑی ترقی ہوئی۔علی عادل شاہ کا شمار خود بہت بڑے شعراء میں ہوا کرتا تھا اور یہ اپنا تخلص ''شاہؔی'' کرتے تھے۔یہ نصرتی کے نہ صرف مربی اور سرپرست تھے بلکہ نصرتی ان کا شاگرد بھی تھا۔ان کے عہد میں بہت سے نامور شعراء ہوئے، جس میں نصرتی ایک ہے۔

سلطان علی عادلؔ شاہ نے کئی صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔غزل، قصیدہ اور مرثیہ کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔سلطان کا ایک قصیدہ دستیاب ہوا ہے، جس میں انھوں نے امام حسینؑ کا ماتم کیا ہے۔قصیدہ کا چند شعر پیش ہے جس میں امام حسینؑ کی شجاعت بیان کی گئی ہے۔

سارے جہاں میں نیں ہوا تج سار کا شمشیر زن
جس پر کیا یک وار توں دو دھڑ برابر ہو پڑے
تج کہرک ہور غلم کی تعریف میں کیوں کر سکوں
حق کی عنایت تھے او یک یو دو وصفت تج ٹپ پڑے

اب سلطان علی عادلؔ شاہ کا ایک مرثیہ بھی ملاحظہ ہو۔

شہ کے غم سوں دل ہے نالاں ہائے ہائے
جگ برستی جوں ابھالاں ہائے ہائے
جگ کے سرور دل لہو سوں بھرے چلے

پھور کر پلکھاں کے بالاں ہائے ہائے

یک شگفتہ گل نہ اس غم سوں رہیا

ہیں خزاں میں نونہالاں ہائے ہائے

دم ترے کے دل میں دک سوں لہو جمیا

تو بن چھتے کہن میں سلاں ہائے ہائے

اس شدیاں کوں کھول انکیاں دیک توں

ہے بروشہ کے رو دہالاں ہائے ہائے

کربلا کی سب زمیں رنگیں ہوئی

لہو برے دُل دُل کے نالاں ہائے ہائے

تن گگن کا پھور کر مجمر کیا

آہ کے تیراں کے بھالاں ہائے ہائے

میں لاشے زمین کے پیت پر

حیف او صاحب جمالاں ہائے ہائے

گہر خوشی ہور خرمی کے گر پرے

آہ کے چھنے میں نالاں ہائے ہائے

اس دکھوں بہر کے امتی سب تن منے

نت جلیں انکیاں ہلالاں ہائے ہائے

نت کرے عادل علی یک دل ستی

شہ کا ماتم و سالاں ہائے ہائے

اس مرثیہ کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''شاہی'' نے اردو زبان اور اردو شاعری کی خدمت ہی نہیں کہ بلکہ اس کی سرپرستی بھی کی ہے۔ اور اس معاملے میں اس کا انداز بالکل قلی قطب شاہ جیسا ہے۔ علی عادل شاہ مرثیہ میں ویسی ہی روانی ملتی ہے جیسی قلی قطب شاہ کے مراثی میں ملتی ہے۔ سلطان کے اس مرثیہ میں سوز اور حسن دونوں موجود ہے۔ تیسرے، ساتوں اور آٹھوں شعر میں شاعرانہ رنگ آمیزی ملتی ہے جو کہ دکنی مرثیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس مرثیہ میں زبان بہت ہی صاف اور سادہ استعمال کی گئی ہے۔

۸۔ نصرتی :

نصرتی بیجاپور کے ناموراور ذی مرتبہ شاعر تھے۔ان کا نام محمد نصرت اور تخلص نصرؔتی تھا۔ان کے والدشاہی دربار میں سلحدار تھے اور پورے دربار میں ان کی بہت عزت تھی۔ان کا شمار سلطنت کے خیرخواہ اور جاں نثاروں میں کیا جاتا تھا۔اسی وجہ سے نصرؔتی کی تعلیم وتربیت سلطان علی عادلؔ شاہ کے ساتھ شاہی محل میں ہوئی۔علی عادل شاہ کے بادشاہ بننے کے بعدنصرتی نہ صرف شاہی مصاحبوں میں داخل ہوئے بلکہ انکوملک الشعراء کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔نصرتی ہروقت بادشاہ کےساتھ ان کے رزم وبزم میں شریک رہتے تھے۔انھوں نے بادشاہ کواپنا استاد تسلیم کیا تھا۔

نصرؔتی نے قصیدہ اورمثنوی دونوں صنفوں میں طبع آزمائی کی لیکن جس نے ان کوشہرت بخشی وہ مثنوی ہے۔ان کی تین تصنیفوں کا پتہ چلتا ہے۔پہلی ’’گلشن عشق‘‘،جس میں کنورمنوہراور مدمالتی کا قصّہ بیان کیا گیا ہے،دوسری تصنیف ’’علی نامہ‘‘ ہےجس میں علی عادلؔ شاہ کی سوانح مرقوم ہےاورقصائدومرثیہ بھی شامل ہے۔تیسری کتاب ’’تاریخ اسکندری‘ ہے۔ ان تینوں مثنویوں میں زیادہ شہرت ’علی نامہ‘اور ’گلشن عشق‘ کوملی۔مثنویوں کے علاوہ مرثیہ نے بھی ان کوکافی شہرت بخشی۔ اس کے علاوہ ایک قصیدہ بھی ملتا ہےجس میں بیجاپور کےمحرم اور عاشورخانہ کا تذکرہ بھی ہے۔پیش ہےنصرؔتی کے مرثیہ کے کچھ شعر۔

اے وائے ظالم کیوں دکھا ایسے جگر گوشیاں کوں تس

جگ جگ جوانی پرغضب راجب کہا قہار کا

یوسرو بالا کاٹ کرسب خانداں کے باغ سیں

بہوائی، لہوکیاں ندیاں،طوفان اچیا احبار کا

تب فاطمہ زاری میں آبولے جب کوئی یاں نہ ہوئے

اے وائے کن ماتم کرےاس پرسروخوش رفتار کا

اتنے میں جبریل امیں بی آ نبی کے پاس یوں

بولے کہ نہ کچ غم دھرواس ساعتِ دشوار کا

ماتم یو مظلوماں کی پھرتازہ ہوکرتا ہربرس

ہوئے جوں عنایت حشر تک دل جل کوں سب ابرار کا

اس مرثیہ کودیکھنے سے نصرتی کےفن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نصرتی نے الگ سے مرثیہ نہیں لکھا لیکن یہ کہاجاسکتا ہے کہ اگروہ مرثیہ لکھتے تواس کی مرثیہ بھی مثنوی کی طرح بہت مشہور ہوتی۔

۹۔ذوقی :

ذوقی بھی علی عادل شاہ کے زمانے کے شاعر تھے۔نام شاہ حسین اور تخلص ذوقیؔ تھا۔ یہ بڑے مذہبی اور مشہور شاعر تھے۔ان کے مرشد شاہ خان محمد نے اس کو بحرالعرفان کا خطاب دیا تھا۔شعروشاعری میں ان کو کافی دستگار حاصل تھی ۔ذوقیؔ اپنی شاعری پر بڑا فخر کرتے تھے اور خود کو نصرتیؔ سے بلند اور حسان تصور کرتے تھے۔انھوں نے نصرتیؔ کی طرح کافی مثنویاں لکھیں ہیں۔وصال العاشقیں، غوث نامہ، وفات نامہ اور منصور نامہ ان کی مثال ہے جس نے ذوقی کو ایک بلند پایہ کا شاعر بنا دیا۔ذوقیؔ نے مثنویوں کے علاوہ غزل اور مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے منفرد مراثی لکھے ہیں اور واقعہ نگاری کے سہارے کلام کو طولانی بنایا ہے۔ان کا ایک مرثیہ ملتا ہے جس میں انھوں نے جناب شہربانو اور امام حسین کی گفتگو کو بڑے خوبصورت اور پراثر انداز میں بیان کیا ہے۔اس مرثیہ کے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

تب ہزاراں درد و غم سوں شہربانو نے کہا — مجہ کوں کس کوں سونپ کر جاتے ہوائے سرورتمن
تم بنا ں اے جان جاناں کیوں کروں میں زندگی — تم بناں کس کوں کہوں میں یہ اپس کا دکھ کٹھن
تم بناں ہرروز مجہ سینے منے یک سال ہے — تم بناں ہررات غم سوں مجہ اوپر ہے یک قرن
شہ نے فرمایا کہ کچھ نہیں چارہ جزصبروشکیب — ہے تمارا یاور اس غم میں خدائے ذوالمنن
تم کوں روتے سوں نہیں کرتا منع اے غم گسار — موں پریشاں مت کرو اور پارہ پارہ پیرہن
گرچہ اے ذوقیؔ ترے بے حد گناہاں ہیں ولے — شکر اللہ ہیں شفیع روز محشر پنجتن

اس مرثیہ کے مطالعہ کے بعد ذوقیؔ کی قادرالکلامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کلام میں جگہ جگہ محاسن شعری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔جس سے شاعر کے فن کا اندازہ بخوبی لگا جا سکتا ہے۔ان کے کلام میں تسلسل اور ربط کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔مرثیہ کی زبان سادہ اور سوز و درد سے بھرپور ہے۔یہی وہ خوبیاں ہیں جس سے شاعر کے فن کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔اس لئے بے وجہ نہیں جو ذوقیؔ اپنے کلام پر نازاں تھے۔مرثیہ نگاری میں ذوقیؔ کا مقام بلندی پے ہے۔

۱۰۔درگاہ قلی خان :

خاں دوراں درگاہ قلی خاں دکن کے حاکم آصف جاہ کے مقربین میں سے تھے۔ یہ اصلاً ایرانی تھے۔آصف جاہ اول نے ان کی سرپرستی کی، جس وقت ان کی عمر چار سال کی تھی ان کو جاگیر دار اور منصب سے سرگراز کیا گیا تھا۔بیس سال کی عمر میں آصف جاہ اول کا ہمرکاب ہوا۔ایک زمانے تک صوبہ خجستہ بنیاد کا صوبہ دار تھے۔انتقال کے بعد انکی لاش اورنگ آباد لائی گئی اور یہ باپ کے مقبرہ میں دفن کیئے گیئے۔

درگاہ کواپنے گھرانے کی تہذیبی روایات کے ساتھ ساتھ رسولؐ اورآل رسولؐ سے بہت محبت تھی،اسی لئے وہ خود بھی عزاداری کرتے تھےاوراپنے یہاں کی مجلسوں میں پڑھنے کے لئے مرثیے بھی لکھتے تھے۔سالارجنگ کے کتب خانے میں ان کے انیس مراثی اور اکیس سلام موجود ہیں۔یہ مرثیے ۱۷۵۳ء سے ۱۷۶۶ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ان مرثیوں کواگر ہیئت کے اعتبار سے دیکھا جائے توبارہ مرثیے مربع،ایک مفردہ اور باقی مخمس،مثمس،دہربند،مسدس اور ترجیع بند کے ہیں۔کچھ ایسے بھی ہیں جس میں عربی فارسی کے دودومصرعے دہرہ بند کے طریقے سے آتے ہیں۔ان کے مرثیوں میں دکنی کے بجائے شمالی ہند کے مراثی کے رنگ زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔انھوں نے اپنے سبھی مرثیے دہلی سے دکن جانے کے بعد لکھے،دکن میں مرثیہ گوئی کی بہترین روایت ہونے کے باوجودانھوں نے دکنی مرثیوں کی انداز سے ہٹ کر دہلوی انداز کے مرثیوں کی تخلیق کی۔اسلئے ان کے مرثیوں کے ساخت میں وہ تسلسل کا انداز نہیں ملتا جو دکن کے اور مرثیہ گو کے یہاں ملتا ہے۔ان کے مرثیوں کے کسی بند میں کربلا کے واقعہ کا کوئی ایک پہلو بیان کیا گیا ہے تو دوسرے بند میں کسی اور پہلو کا۔

پیاس میں بیتاب جان بو تراب — آٹھ دن میں نہیں ملا اک قطرہ آب
دیکھ عباسؑ علی یہ اضطراب — قصد پانی کا لیے جلد و شتاب
مشک بھر کر لے چلے مثل سحاب — بے مروت ہائے ہو رے کر عتاب

چھوٹے بڑے نہیں کیا ہے ہے آئی کر
سارے بالک چلاتے پانی پانی
خوک سگ سیراب و اولاد بتول
درعطش باصد مصیبت یا رسول

ان کاایک ترکیب بندمرثیہ ملاحظہ ہو

فریاد کرکے شاہ شہیداں کہے خدا — چھٹے بڑے شہید ہوئے کوئی نہیں رہا
جینا ہے تلخ ، ہائے نہیں زندگی روا — ہے گا وداع اہل حرم سخت اب بلا
کلثوم وشہربانو و زینب یہ ماجرا — سن کرگرے ہیں پاؤں پہ مل پچھاڑ کھا
جاتے کہاں ہو چھوڑ ہمیں وامصیبتا — ہم سب کریں گے جان ترے پاؤں پر فدا

اے وارث غریباں بہر خدا مرو
بے یار و بے برادر وبے آشنا مرو

درگاہ کے کلام میں بہت روانی ہے،لفظوں کی بندش،مصرعوں میں اس انداز پر کیے گئے ہیں گویاکسی مشین میں

ڈھالے گئے ہوں۔ یایوں کہیں کہ شعر کہتے وقت شاعر کا ذہن مصرعے ڈھال رہا ہو۔کلام میں سلاست اور روانی نے ایسا اثر پیدا کر دیا ہے کہ پڑھنے والا اس کی روانی میں بہنے لگتا ہے۔درگاہ قلی مرثیے کا مقصد رنج وغم ہی سمجھتے تھے اور اسکو مصائب کے بیان تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے۔حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ نادر شاہ کے حملے کے وقت آصف جاہ کے ساتھ محمد شاہ کی طرف سے بات کرنے گئے تھے اور وہاں جا کر جواں مردی کا ثبوت بھی دیا تھا،جس کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے، پھر بھی انھوں نے اپنے مرثیوں میں جنگ وجدل،مناظر کا بیان اور واقعہ نگاری کی طرف کوئی توجہ نہیں کی بلکہ صرف اشک فشانی کو ہی اپنا مقصد سمجھا جو مرثیہ کا اصل مقصد ہے۔

کاظم علی خاں کاظم :

کاظم علی نام اور ''کاظم'' تخلص کرتے تھے۔یہ حیدرآباد کے ایک باذوق اور امیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کاظم کنک گہری کے نواب امیر جنگ کے داماد حضرت اجالا شاہ کا مرید تھے۔ان کا شمار آصف جاہی امراء میں ہوتا ہے۔ بعد میں یہ مہاراجہ چندولال کے دربار سے متعلق ہو گیا۔ان کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کی یہ فطری شاعر تھے۔ان کے کلیات میں نظمیں،غزلیں،مرثیے اور مثنویاں وغیرہ درج ہے۔انھوں نے مرثیہ کو مسدس کی شکل میں لکھا،اور مسدس کو قدیم مسط کے اصول پر ہی لکھا۔لیکن ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر بند کے ٹیپ کے شعر میں بحر بدل جاتی ہے۔ان کے مرثیہ کے دو بند ملاحظہ ہو۔

اے مومناں کرو غم دو شاہ دو جہاں کا بسمل شہید اکبر، حامی عاصیاں کا
ظلم و جفا کو دیکھو قومِ یزیدیاں کا لوٹے ہیں گھر کو کافر کوثر کیساقیاں کا
ہمیشہ غم میں شاہ کے کرو دل بے چین
حشر میں آکر چھوڑاویں گے تم کو امام حسین

ہے ہے یزیدوں نے مولا کو لے لئی ہیں قول و قرار کر کر ظلم و جفا کیے ہیں
آل نبی کے اوپر کیا کیا ستم دیے ہیں طاقت نہیں قلم کو لکھیں جو اس بیاں کا
غم میں جن کے آپ خدا روئے ہے ہر سال
نبی علی پر دکھ سدا حسن سدا بے حال

مرثیہ کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زبان صاف اور سادہ ،ا وراحساس وجذبات سے بھرپور ہے۔اسلوب بلند ہے

قادر :

قادؔر حیدرآباد کے ایک مشہور مرثیہ گوشاعر تھے۔ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جنوبی ہند کے دو بڑے مرثیہ گو اپنے مرثیوں میں ان کا ذکر کرتے ہیں،جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ان کے عہد میں زندہ ہوتے تو ان کو اپنے کلام کی داد ضرور ملتی۔شمالی ہند کے مرثیہ گو قائؔم نے اسے اسی انداز سے مخاطب کیا ہے۔

''قایم کا آج ہند میں شہرہ ہوا بلند
دکھن میں اس کے شعر کہو قادؔر استیں''

اس شعر میں قایم یہ بتانا چاہتے ہے کہ شمالی ہند میں اس کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو دکن میں قادرؔی کو،جس قائؔم کا یہ شعر ہے وہ قائؔم چاندپوری سے بہت پہلے کا شاعر ہے۔

قادؔر اپنے زمانے کے بلند پایہ کے شاعر تھے۔لیکن ان کے نام کے متعلق اختلاف پایہ جاتا ہے،کوئی ان کو غلام قادؔر سے موسوم کرتا ہے تو بعض انہیں میر عبدالقادر بتاتے ہیں۔قادؔر جب پچاس سال کے ہوئے تو انھوں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی،اور اپنا سارا وقت خدا کی عبادت اور مرثیہ خوانی میں لگا دیا۔ان کے مرثیوں کے مطالعہ سے انکی فنّی خوبیوں اور علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو علم نجوم اور علم ہندسہ میں بھی مہارت حاصل تھی۔ان کے مراثی تسلسل،مضامین،سادگی اور انسانی جذبات کی ترجمانی کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔پیش ہے ان کے مرثیہ کا کچھ نمونہ۔

ہوا شہرت محرّم میں یو غم ہے شاہ عالی کا
کہ ہے فرزند پیارا وہ دونوں عالم کے والی کا

چھوپا رہے دین کا چندر کہ جس کے سوگ سوں جگ
فلک ہر ملک میں تانے شمیانا رات کالی کا

ستارے سب یہ قدسیاں نے ملا کر سب گگن اوپر
حسینؑ کے عرس کو بہاند ہے منڈف موتیاں کی جالی کا

نہیں یوں اشک شبنم سوں کھولے ہیں آہ کے گل ہو
دیکھو غم کے چمن میانے لطافت غم کے مالی کا

قیامت کانپنا قادؔر تزلزل جب کرے ظاہر
مجھے تقویٰ تب آخر ہے حسین سرورے عالی کا

ان مختصر سے نمونے سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قادؔر کو اپنے فن پر پوری طرح سے قدرت حاصل تھی

۔ان کے ہر شعر کو ایک اچھے نمونے کے طور پر رکھا جا سکتا ہے۔کلام میں سوز و درد کی بھرمار نظر آتی ہے،انداز بیان اور خیال کی ندرت ان کے کلام کو بلندی تک پہنچاتے ہیں۔

بحریؔ :

بحریؔ بیجاپور کی سلطنت کے ایک گاؤں گوگی کے رہنے والے تھے۔ان کا اصل نام قاضی محمود تھا اور تخلص ''بحریؔ'' کرتے تھے۔ان کے والد قاضی بحرالدین عرف قاضیؔ دریا گوگی کے قاضی تھے۔شاید والد کے نام کی مناسبت سے ہی انھوں نے پنا تخلص بحریؔ رکھا۔یہ اپنے گاؤں میں زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکے اور وہاں سے بیجاپور پہنچے۔اس وقت بیجاپور کے حکمراں سکندر عادل شاہ تھا،اس کو بحری سے عقیدت ہوگئی اور اس نے بحری کو اپنے دربار میں جگہ دے دی۔مگر ان کو یہ عزت زیادہ دن تک راس نہ آسکی ،کیوں نکہ بیجاپور کی سلطنت کا تخت الٹ گیا۔بحریؔ وہاں سے ہجرت کر کے حیدرآباد چلے آئے۔مگر حیدرآباد بھی ان کو راس نہ آیا اور تھوڑے دنوں بعد ہی گولکنڈہ کی سلطنت بھی زیروزبر ہوگئی۔اسکے باوجود بحریؔ نے ان ناخوشگوار حالات میں بھی اپنے کام کو جاری رکھا۔ان کے مرثیے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے عہد کے مشہور مرثیہ گو شاعر تھے۔ان کے مرثیہ کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو۔

جس شاہ کے وجود مبارک پہ غم ہوا	تب سب جہاں تے حرف خوشی کا عدم ہوا
رخ گل رخاں کے غم منے جیوں زعفراں ہے زرد	تھا قد الف نمن سوا وجیوں وال خم ہوا
گلزار، گلستاں منے غم تے ہو چاک چاک	روتا ہے ہر شجر نہ کہ شبنم تے نم ہوا
دل جل کے راکھ کیوں نہ ہوا چھی کے بن منے	جیوں کہ چنار غم کی اگن کا اگم ہوا
غم تاب لیا نہ آب میں غرقاب نوحیاں	ہور قوم لوطؔ غم تے زمیں میں ہضم ہوا
ہر ایک الم بغیر ملم نیں ہے یو عجب	غم کے الم کوں پہر کے یہی غم ملم ہوا
بن دو کہہ ہر بشر کوں نہ پانی نہ کہاں ہے	پانی سوں نیز نین کا ہور قوت دم ہوا
کرو بیان فلک پہ یتا روئے آہ مار	سناسیاں کوں جل میں یو غم دم بہ دم ہوا
پیغمبراں میں جیوں کہ محمد سوں ختم ہے	یوں غازیاں میں شہ کی غزا سوں ختم ہوا
جکوئی دل میں شاہ کے غم کا نہال لائے	او دل یقیں کہ حشر کوں باغ ارم ہوا
بحریؔ مدام شاہ کے ماتم میں یوں گلے	جیوں چاند آسمان پہ گل گل کے کم ہوا

بحریؔ نے اپنے مرثیہ کو حسین بنانے کے لئے تشبیہات اور استعارات کا استعمال کیا ہے۔اور اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ان کا انداز بیان شاعرانہ ہے۔مرثیہ میں سوز و درد بھی ملتا ہے۔انکے خیال میں ندرت ہے،اور یہی سب باتیں انکو ایک بلند مرثیہ گو کے عہدہ تک پہنچاتی ہیں۔

۱۱۔امامی :

دکنی سلطنتوں کی تباہی کے بعد برہان پور نے اردو شاعری اور خاص کر مرثیہ گوئی میں بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اور ایک دو نہیں بلکہ کئی بڑے مرتبہ کے مرثیہ کہنے والے یہاں پیدا ہوئے۔انہیں بلند مرثیہ گو میں ایک نام امامی کا بھی تھا، جو برہان پور میں نہر کھودنے کا پیشہ کرتے تھے۔ان کے نام کے بارے میں پتا نہیں چلتا۔مگر ان کو مرثیہ لکھنے کا بڑا شوق تھا اور انھوں نے مرثیہ نگاری میں ہی بڑا نام کمایا۔ان کا اسلوب بیان بہت دلچسپ اور دلکش ہے۔وہ اکثر مراثی مکالمہ کی شکل میں لکھا کرتے تھے اور اپنے مرثیوں میں ڈرامائی اثر پیدا کرتے تھے۔نصرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اردو' میں امامی کے مرثیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے مراثی ''اڈنبرا'' کی بیاض میں موجود ہے۔سفارش حسین کے کتاب 'اردو مرثیہ' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس بیاض میں امامی کے کل آٹھ مرثیے موجود ہیں۔جس میں ۱۱۷ شعر اور مثلث کے ۲۸ مصرے ہیں۔انھوں نے پہلے مرثیہ میں حضرت امام حسینؑ کا ذکر کیا ہے، جو اسلوب و بیان کے لحاظ سے بہت بہتر ہے۔ان مرثیوں میں انھوں نے بحریں بہت دلچسپ استعمال کی ہیں، جس سے ان کو پڑھنے سے قارئین اس کے سحر میں ڈوب جاتا ہے۔نمونہ پیش ہے۔

کیا ظالماں نے ظلم کیا بے حساب آج   مظلوم کربلا میں ہیں عالی جناب آج
اس غم سوں موماناں کو ہوا پیچ و تاب آج   گویا علی کے گھر کا کھولا غم کا باب آج

تھا آئینہ رسول کو درشن حسینؑ کا   ہے دہ جفا کی گرد میں درپن حسین کا
زخماں کے جواہراں میں دسے تن حسینؑ کا   دستا ہے جوں شفق میں نول آفتاب آج

کیوں عرش فرش پر نہ گرا بے قرار ہو   کیوں تاب لا سکے نہہ فلک دیکھ ظلم یو
کیوں عرش فرش پر نہ گرا بے قرار ہو   سنگیں دلاں نے ظلم کی پی کر شراب آج

یا رب بہ حق خواجہ کونین مصطفٰے!   یا رب بہ حق فاطمہؓ ناموس مرتضٰے
یا رب بہ حق جملہ اماماں مجتبٰے!   برلا ہر ایک مراد امامی شتاب آج

امامی کی زبان صاف، بیان شاعرانہ اور پر اثر ہے۔کلام میں روانی ہے۔اس مرثیہ میں درد و غم کا ایک دریا سا نظر آتا ہے۔جس سے ان کے بلند مرتبہ شاعر ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔مرثیہ کے آخری دو بند میں امامی نے معبود حقیقی سے مناجات کی ہے۔

۱۲۔ہاشم علی :

ہاشم علی بھی امامی کی طرح برہانپور کے ایک بلند پایہ مرثیہ گو شاعر تھے۔ان کے اعتقاد کے مطابق انکے مرثیے سننے

کی لئے آنحضرت صلّم خواب میں تشریف لایا کرتے تھے۔نصر الدین ہاشمی کے مطابق اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بطور بیاض موجود ہے۔جس کو انھوں نے ''دیوان حسینی'' سے موسوم کیا ہے۔اس دیوان میں دو سواڑتیس (۲۳۸) مرثیے ہیں۔ان مرثیوں کو اگر موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں شہدائے کربلا کے علاوہ حضرت رسولؐ خدا، جناب فاطمہؑ، حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے مرثیے بھی شامل ہیں۔ان کے بہت سے مرثیے ایسے ہیں جو واقعات کربلا کے کسی ایک شہید کے حال میں لکھے گئے ہیں، یا کسی واقعہ کا سلسلے سے ذکر ہوا ہے۔پسران مسلم، جناب سکینہ، اسیری حضرت عابد اور حضرت زینب کی حضرت علیؑ سے فریاد وغیرہ۔اس کے علاوہ انھوں نے جناب قاسمؑ اور حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کو اپنا پسندیدہ موضوع قرار دیا ہے۔ہاشم علی نے مرثیوں کے علاوہ کسی اور صنف سخن میں ایک شعر بھی نہیں لکھا۔وہ خود کہتا ہے۔

''ہاشمؔ علی ہمیشہ ثنا خواں ہے شاہ کا
جز مدح و منقبت سخن اس نے لکھا نہیں''

دیوان حسینی میں زیادہ تر مرثیوں کی ہیئت غزل کی ہے، نہ ان میں زیادہ وسعت ہے اور نہ تسلسل۔موضوعات کے لحاظ سے جو مراثی لکھے گئے ہیں، ان میں موضوع کی یکسانیت دیکھائی دیتی ہے لیکن کسی خاص واقعہ کا مسلسل بیان اس میں نہیں ملتا ہے۔بعض مرثیوں میں جو مکالمے ملتے ہیں وہ کافی اچھے ہیں۔ایک مرثیہ مربع کی شکل میں ملتا ہے جس میں انھوں نے نئی دلہن جناب فاطمہ کبریٰ اور حضرت قاسمؑ کا اس وقت کا منظر پیش کیا ہے جب وہ میدان جنگ میں جانے کے لئے رخصت ہو رہے تھے۔یہ ایسی جذباتی کشمکش کا منظر ہے جسے ہاشم علی نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

جلوہ سیں اوٹھ کے رن کوں چلا تب کہے دولہن　　دامن پکڑ کے لاج سوں، الجھنواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدہارو تم اس حال میں ہمن　　اتم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھون میرا
کیسی یو کد خدائی وکیسی ہے یو برات　　آتا فراق تم سوں یہ جلوہ کی آج رات
گھر کوں نہ لے گئے ہو، نہ بولے ہو ہم سوں بات　　دیکھا نہیں جمال کوں بھر کے نین میرا
اس کربلا کے بن میں اکیلی میں کیوں رہوں　　تجہ باج میں جہاں میں پھرا مید کیا دھروں
جد کے مدینہ کیونکہ میں اس ٹھار سے پھروں　　تم اپنے ساتھ لے کے دکھاؤ وطن میرا
جاتے ہو چھوڑ رن کی طرف مجہ کوں تم رولا　　نہیں شرم کا ہنوز یہ سر سوں گھونگھٹ کھلا
کرتے نہیں محبت وہ جاتے میا بھولا　　اس زندگی سوں آج بھلا ہے مرن میرا
شعلہ لگا ہے دل منے اس غم کا کیا کروں　　مجہ کوں روا ہوا ہے اگر زہر کھا مروں
دوری میں ہائے تیری میں دن رین کیوں بھروں　　فرقت کی آگ ستیں جلے گا بدن میرا
قاسم کھڑا تھا روتے نین سن دلہن کی بات　　غم ناک اپنا دیکھ کے دامن دلہن کے ہاتھ

تب آہ دردناک سوں بولا دلہن کے ساتھ ایے بوستان راحت و سرو چمن مرا
مجہ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار تیرے فراق سات میں جاتا ہوں اشکبار
میں کیا کروں صلاح نہیں حکم کردگار حق نے کیا ہے رن میں مقرر رہن میرا
ہے داغ دل میں تیری جدائی کا کیا کہوں نہیں ہے امید رن سے پھر آکر تجے ملوں
جو کچھ ہوا ہے مقدروں میں راستی کہوں وعدہ ہوا ہے بحشت میں تم سوں ملن میرا
ہاشم علی یو غم کی حکایت کوں کیا کہوں اس درد، اس الم روایت کوں کیا کہوں
دلہن کی بے کسی و شکایت کوں کیا کہوں محشر تلک کہیں گے محبان بچن مرا

کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام میں درد ہے۔ واقعہ اور جذبات نگاری پر ہاشم علی کو پورے طور سے قدرت حاصل ہے۔ بیان میں تسلسل اور روانی کے علاوہ حفظ مراتب بھی ملتا ہے۔ مرثیہ کے مکالمہ میں ڈرامائی انداز خوبصورتی سے نمایاں ہوتا ہے۔ مرزا (گولکنڈہ) کے بعد ہاشم علی پہلا مرثیہ نگار ہے جس نے طویل مرثیے لکھے ہیں اور روایتیں نظم کی ہیں۔ اس نے مرثیوں میں زبان بہت صاف اور سادہ استعمال کی ہے۔

☆ دہلی کے اہم مرثیہ نگار :

ہندوستان میں اردو شاعری کی روایت ہی دیر سے ہوئی تو ظاہر ہے کہ مرثیہ کہنے میں بھی دیر ہوئی ہوگی۔ لیکن شمال کی اس کمی کو ایک عرصے تک دکن پورا کرتا رہا، جس کا پتہ اورنگ زیب کے عہد سے چلتا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے یہ بات کہی ہے کہ ان کے مرثیے ہاتھو ہاتھ دکن سے شمالی ہندوستان پہنچتے تھے۔ عہد اورنگ زیب میں مجالس کا رواج ہو چکا تھا۔ اور اسکے انتقال کے بعد اس کی اولاد مذہب تشیع کی پیروی کرنے لگی تھی۔ اور عزاداری کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ علی جواد زیدی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

> '' جو مواد اب تک ہمارے سامنے آ چکا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دہلی کی اردو مرثیہ گوئی اورنگ زیب کے آخری زمانے سے شروع ہو کر سیر (۱۷۱۲) اور محمد شاہ (۱۷۱۹) کے زمانے میں اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکی تھی۔'' [۴]

اس عہد تک دہلی میں کئی عاشور خانوں کی تعمیر ہو چکی تھی اور اس میں مجلسیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ان مجلسوں میں کہیں محتشم کاشی تو کہیں حسن کاشی کے مرثیے پڑھے جاتے تھے اور کہیں ''روضۃ الشہداء'' کا بیان ہوتا تھا۔ گھر گھر کے تعزیہ خانوں میں مراسم عزا بجالائے جاتے تھے۔ لیکن یہاں اس صنف سخن میں طبع آزمائی کب اور کس نے کی اس امر کا صحیح پتہ نہیں چلتا مگر شیخ چاند نے ''قائم دہلوی'' کو پہلا مرثیہ گو شاعر مانا ہے۔ سفارش حسین نے روشن علی سہارن پوری کو قائم دہلوی سے پہلے کا بتایا ہے۔ روشن علی نے ''عاشور نامہ'' کے نام سے ایک طویل نظم ۱۱۰۰ھ میں تصنیف کی جو 'روضۃ الشہدا' کے انداز

میں بیان کی گئی ہے۔اس نظم میں تین ہزار چھ سوانتالس اشعار ہیں۔نظم کا خاتمہ اس شعر سے ہوا ہے۔

''ہزار اوپر یک صد میں بتیس تمام

بہ روز دوشنبہ، صفر وقت شام''

دہلی میں مرثیہ نگاری کے ابتدائی دور میں مرثیہ کہنے والے شاعروں کی تعداد صرف تیرہ تھی۔اور یہ تیرہ وہ لوگ ہیں جسکو قدیم تذکروں میں نمایاں جگہ ملی ہے۔اور یہ مقام ان کو ریختہ نے دلوایا ہے۔دھیرے دھیرے یہ تعداد بڑھ کر پچاس ہوگئی۔ان مستند مرثیہ لکھنے والوں میں فضلی،صلاح،مسکین،غمگین،حزین،محب،سکندر،سودا،میر تقی میر،قائم چاند پوری،میر حسن اور مصحفی جیسے بڑے شاعر شامل ہیں۔مگر جہاں تک مرثیہ کہنے والوں میں مقبولیت کا تعلق ہے ان میں مسکین،سکندر،میر گھاسی اور اشرف کو ہی حاصل ہوئی۔

دہلی مرثیہ نگاری کو علی جواد زیدی نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے اور ابتدائی دور کو انھوں نے اورنگ زیب کے آخری زمانے سے لے کر محمد شاہ کے زمانے تک کے مرثیے شامل کئے ہیں۔اس دور کے مرثیہ نگاروں میں مسکین اور کرم علی جیسے مرثیہ نگاروں کے مرثیے ہئیت کے تنوع کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔دوسرے دور کو علی جواد زیدی نے ادبی دور کے نام سے مخاطب کیا ہے۔اس دور میں انھوں نے سودا،فغاں،قائم،قاسم،فراق،ضیاء اور میر حسن جیسے ناموں کو شامل کیا ہے۔سودا نے کھل کر مرثیہ کی بعض خامیوں پر تنقید کی اور ادبی عناصر مرثیہ میں شامل کئے۔جس کی وجہ سے مضمون اور زبان و بیان دونوں میں توازن آیا۔تیسرے دور کو ارتقائی دور سے پکارا گیا ہے۔اس دور کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مسدس کو مرثیہ کا مستند ڈھانچہ مان لیا گیا۔اس دور سے پہلے زیادہ تر مرثیے مربع کی ہیئت میں مقبول تھے۔اگرچہ مرثیہ نگار مسدس کی ابتداء پہلے ہی دور میں کر چکے تھے لیکن اس دور میں قبول عام حاصل ہوا۔چوتھے دور کو دور جدید نام دیا گیا ہے۔اس دور میں غالب،ظہیر اور ظفر جیسے شاعروں کے نام آتے ہیں۔

ا۔ فضل علی فضلی :

فضل علی نام اور فضلی تخلص کرتے تھے۔ان کی پیدائش بہادر شاہ اوّل کے آخری زمانے میں ۱۱۲۲ھ میں ہوئی اور احمد شاہ کے زمانے میں وفات ہوئی۔اس کی وفات کی تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔فضلی نے مشہور صوفی ملاّ حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہداء'' کا اردو نثر میں ''کربل کتھا'' کے نام ترجمہ کیا۔اس میں فضلی نے کچھ اضافے بھی کئے، اور اس میں کئی اشعار کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔شمشاد حیدر زیدی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ

'' مختار الدین اور مالک کے قیاس کے مطابق وہ نواب مشرف علی خاں کے بیٹے یا بہت قریبی عزیز تھے۔نواب مشرف علی خاں شیعہ تھے اور تقیہ کی زندگی گزار رہے تھے۔علی الاعلان مجالس نہیں کرتے تھے۔اپنے محل کے اندر زنانی مجلس کرتے تھے

،جن میں فضلی روضہ خوانی کرتے تھے۔ چونکہ ''روضۃ الشہداء'' فارسی زبان میں تھی، اکثر عورتیں معنی ومفہوم نہ سمجھ پاتیں، اسی وجہ سے فارسی سے اردو میں پہلا ترجمہ وجود میں آیا۔'' ۵؎

اس کتاب کی تخلیق فضلی نے ۲۳ سال کی عمر میں کی۔'کربل کتھا' میں 'روضۃ الشہداء' کے جن اشعار کا فضلی نے اردو ترجمہ کیا ہے وہ زیادہ تر مثنوی کی صورت میں ہے۔ان کے علاوہ انھوں نے اپنے مرثیوں کے بہت سے حصہ اس میں داخل کئے ہیں جو مربع اور مفردہ کی ہیں۔فضلی نے الگ سے بھی مرثیہ کہے ہیں۔

حضرت علی اکبرؑ کے میدان جنگ میں جاتے وقت ماں کے احوال فضلی نے یوں بیان کئے ہیں۔

آنکھوں سے آنسو چلے جاتے تھے زار پھرتی تھی خیموں میں روتی بے قرار

جھانکے تھی دروازے پر جا بار بار کہتی تھی اس در پہ بھی کوئی دربان ہے

جو مجھ اکبر کی خبر لا وے شتاب یعنی کوفیوں پر ہوا وہ فتح یاب

اس کو دو زر و زیور بے حساب مجھ بھروں شیرنی سے ارمان ہے

فضلی نے منفرد مرثیہ کے نمونے پیش کئے ہیں۔اس مرثیہ میں انھوں نے ایک ماں کے جذبات کی سچّی اور پراثر عکاسی کی ہے۔زبان صاف اور سادہ ہے۔

۲۔میر عبداللہ مسکین :

محمد شاہی دور کے مرثیہ نگار تھے۔انھوں نے مرثیہ نگاری کے علاوہ کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ان کے مرثیوں کی شہرت دور دور تھی۔ان کے مرثیوں کو حاصل کرنے کے لئے مرثیہ خواں بڑی محنت اور کوشش کرتے تھے۔ان کی پیدائش ۱۱۱۰ھ سے ۱۱۱۵ھ کے آس پاس کی بتائی جاتی ہے۔جب درگاہ قلی شاہ دہلی پہنچے تو اس زمانے میں وہاں مسکین کی مرثیہ نگاری کا بولبالا تھا۔مسکیؔن کے مرثیوں کی تعداد کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام زندگی مرثیہ نگاری کے نام کردی تھی۔انھوں نے اس صنف میں اتنی مشق بہم پہنچائی کہ ان کا نام اپنے ہم عصروں میں ایک نمائندہ مرثیہ گو کی حیثیت سے لیا جانے لگا۔مسکیؔن نے مرثیہ کو قصیدہ کے شکل میں پیش نہ کر کے مربع مخمس اور مسدس کی ہیئت میں لکھے ہیں۔اس کے مرثیوں میں اتنی گداختگی اور مظلومیت کا پہلو ہوتا تھا کہ اہل مجلس گریہ وبکاہ کے لئے مجبور ہو جاتے تھے۔ان کے مرثیہ نگاری کے تعلق سے ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں۔

''مسکین اپنے عہد کے سب سے نمایاں مرثیہ گو ہیں۔صلاؔح اور ان کے معاصرین قربان علی، خادم، کلیم وغیرہ کے مرثیے بیشتر غزل کی صورت میں ہیں جس میں تسلسل نہیں، اس کے علاوہ ان کی زبان میں فارسی کا بہت زیادہ اثر ہے۔مسکین کے مرثیے

ان کے مقابلے میں بہت رواں ہیں۔مسلسل واقعات کا بیان بھی ہے مگر ان بیانات کی
نوعیت مختلف ہے۔ان میں زیادہ تر بین کے مضامین نظم کئے گئے ہیں، رخصت اور
شہادت کا ذکر بھی ہے تو ان میں مظلومی کی کیفیت کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔''[٦]

مسکین اپنے زمانے کے اتنے مشہور مرثیہ گو تھے کہ ان کا ذکر سوداؔ نے اپنے قصیدہ ''تضحیک روزگار'' میں کیا ہے۔

''اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا　　　پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے''

مسکین کے مرثیے کے نمونہ پیش ہے۔

روتے ہوئے اصغرؑ کو لیا گود میں سرور　　　مرتا ہوا اس قوم کو دکھلایا لے جا کر
پانی تو کہاں ملتا تھا غیر ازدم خنجر　　　اک تیر جو مارا بچے پیاسے کے گلے پر
گردن سوں چلی دونوں طرف خون کی نالی

اس واسطے جو موانہ　جانے اسے امّا　　　ہاتھ اپنے سے اصغرؑ کا لہو پونچھتا بابا
پیٹھ اس کی تھپکتا ہوا اور دیتا دلاسا　　　بچے کی طرف مصلحتاً　سر کو ہلاتا
گھر لے چلا لیکن نہ چھپی لعل کی لالی

اماں کے کلیجے کے اوپر برچھی سی چل گئی　　　جیوں گود لیا بچے کی گردن وہیں ڈھل گئی
دیکھا　کہ بچہ جاں اس کی نکل گئی　　　یکبار　جگر پھٹ گیا اور آتما جل گئی
جب تک ہو سکا سر کے اوپر خاک اڑالی

مسکین کا مرثیہ مسلسل، مربوط اور رقت خیز ہے۔اس مرثیہ میں ایک ماں اور باپ کے احوال کو بیان کیا ہے کہ کس طرح کوئی باپ اپنے بچے کو پانی پلانے لے جاتا ہے اور وہاں اس بچے کو پانی کی جگہ تیر سے ذبح کر دیا جاتا ہے۔زبان صاف اور سادہ ہے، بیان میں سوز وگداز ہے۔جس کو سننے کے بعد سامعین اپنے آنسوں کو روک نہیں پاتے۔انھوں نے اپنے مرثیے میں زیادہ تر بین کے مضامین نظم کئے ہیں۔

۳۔غمگین :

غمگینؔ مسکینؔ کے بھائی تھے، یہ بھی دور محمد شاہ کے مرثیہ گو تھے۔ان کی پیدائش اور وفات کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔بقول شمشاد حیدر زیدی ان کے مرثیے ایڈنبرا یونیورسٹی کی ایک بیاض میں موجود ہے۔انھوں نے اپنی کتاب میں غمگین کے کچھ مراثی پیش کیے ہیں۔یہ مرثیے درد انگیز انداز میں لکھے ہوئے ہیں۔پیش ہے چند بند۔

آج نکلا پھر لگن پر غم سوں خم ہویوں ہلال　　　کربلا کے حادثے میں ہیں نبی کے پاک آل
تھا حسن کے باغ جاں کا شاہ قاسمؑ نونہال　　　تحت جلوہ کے گگن میں جھوجھ مکنا مکھ پہ ڈال

آج غمگیں برج باہر غم سوں روتا آسماں   آج لرزا عرش کرسی اورزمیں کے سب جبال

مرثیہ سوز وغم سے بھرا ہوا ہے۔زبان صاف ہے۔ان سب کے باوجود مرثیہ نگاری میں جو شہرت مسکین کو حاصل ہوئی وہ ان کے حصہ میں نہیں آئی۔

۴۔محبؔ :

محبؔ مسکینؔ کے ہم عصروں میں شمار کیے جاتے ہیں، یہ مسکینؔ سے عمر میں چھوٹے تھے۔انھوں نے اپنے آخری وقت میں دہلی سے حیدرآباد ہجرت کر لی تھی۔محبؔ نے کئی مرثیہ لکھے ہیں۔یہ مرثیے مربع ،مفردہ مثلث ،مخمس اور مسدس کی شکل میں ملتے ہیں۔ان کے مرثیوں کی ایک بیاض کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں موجود ہے۔مرثیوں کے علاوہ محبؔ نے کئی نوحے اور سلام بھی لکھے ہیں جو مسدس اور مخمس کی شکل میں ملتے ہیں۔انھوں نے اپنے زیادہ تر مرثیے حضرت قاسمؑ کی شان میں لکھے ہیں۔ان میں کہیں قاسمؑ کی رخصت تو کہیں ان کی شادی اور کہیں شہادت کا بیان کیا گیا ہے۔ان کے مرثیہ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہو۔

غمگیں ہو چڑھا بیاہ پہ یہ کس کا بنا ہے   نوبت بجی ماتم کی یہ کیوں ؟ سہرا کھلا ہے
یہ کیسا ہے دولہا ،کہ کفن سر کو بندھا ہے   دولہن کے چلا گھر کو یا اب گور چلا ہے

موت مشاط ساتھ ہے، لینے والی جان
قاسمؑ اب دن بیاہ کے چلے ہیں قبرستان کے

ان کا ایک اور مرثیہ ملاحظہ ہو۔

ہائے قاسم کی سواری رن میں پہنچی جس گھڑی   لینے سر رسم دھنگانا یک بیک موت آرڑی
چاند سے منہ پر لگی تلوار جیوں گل کی چھڑی   ہولہو کی دھار تھی ،دولہے کے سہرے کی لڑی

مرثیہ پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان صاف ہے اور مرثیہ میں فنی خوبیوں کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔حضرت قاسمؑ کے مرثیے میں محبؔ نے ہندوستان کی مروجہ رسموں کو کربلا سے ملا کر بڑی خوبی اور دردانگیز انداز میں پیش کیا ہے۔

۵۔مرزا محمد رفیع سودا :

اردو شاعری میں ’’استادِفن‘‘ کہلانے والے مرزا محمد رفیع سوؔدا کی پیدائش ایک رئیس گھرانے میں ہوئی تھی۔جس کا اثر ان کے مزاج اور طبیعت کی رنگینی میں دکھتا ہے۔سودا نے شاعری کی ہر صنف میں اپنی قسمت آزمائی ہے،لیکن جو شہرت ان کو قصیدہ اور مرثیہ سے ملی کسی اور سے نہ مل سکی۔سودا نے اپنے فطری صلاحیتوں سے کام لے کر مرثیہ نگاری کو پرتاثر بنایا ہے۔اس کے مرثیوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہیئت اور مواد میں بہت سے تجربات کئے اور اس کو

ایک سانچے میں ڈھالا۔سودا نے مرثیے کی ساخت میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں مختلف مضامین بھی شامل کئے ہیں۔جنگ کے مناظر جس کو انیس اور دبیر نے اپنے مرثیوں میں ارتقائی رنگ میں پیش کیا ہے۔سودا کے یہاں یہ مناظر ابتدائی شکل میں ملتے ہیں۔

سودا نے مرثیہ نگاری کو ایک مشکل ترین صنف بتایا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ کربلا اہم ہستیوں سے متعلق ہے۔جو بے حد محترم و اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔یعنی حالات شہدائے کربلا کا بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ایک واقعہ کو مختلف انداز سے پیش کرنا اور حفظ مراتب کے ساتھ بیان کرنا ایک دشوار کام ہے۔سودا نے مربع مخمس اور مسدس سبھی شکلوں میں مرثیہ نگاری کی ہے۔کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ان کے مرثیوں کی ایک بیاض ''بہارستان سخن'' کے نام سے موجود ہے جس میں ان کے مربع مخمس اور مسدس کے مرثیہ شامل ہیں۔سودا کا ایک مسدس مرثیہ ملاحظہ ہو۔

کیا کروں شادیِ قاسم کا میں احوال رقم　　واسطے دیکھنے کے آرسی مصحف جس دم
بیاہ کی رات رکھا تخت پہ نوشاہ نے قدم　　گائے تقدیر و قضا نے یہ بد ہاوے باہم

قاسما مرگ جوانا نہ مبارک باشد
جلوۂ شمع بہ پروانہ مبارک باشد

لا کے ائے مالنیاں رن کے چمن سے تلوار　　گوندھ نوشہ کے لیے آج گل زخم کا ہار
تار گتھنے کا کرو سہرے کے لوہو کی دہار　　گاؤ دروازے پہ تم باندھ کے یہ بندھن وار

غم ایں خانہ بہ ہر خانہ مبارک باشد
درد کاشانہ بہ کاشانہ مبارک باشد

ہے عجب جشن کہ جس میں ہو یہ اسباب سرور　　سینہ ہر ایک کھڑا کوٹے ہے دف کے دستور
غم بجاتا ہے بہ ناخن زن دل ہو طنبور　　اجل آ رقص میں گاتی ہے یہ نوشہ کے حضور

غم جان تو بہ جانانہ مبارک باشد
چہ بہ خویش و چہ بہ بیگانہ مبارک باشد

کپڑے بنے تھے جو پہننے کے لیے بیاہ کی رات　　کیا گھڑی تھی وہ کہ نوشہ کی ہوئی قطع حیات
یوں بدا تھا کہ سیے جائیں کفن دوز کے ہات　　شہ نے پہنے تو کہا موت نے کر تسلیمات

بہ قدرت خلعت شاہانہ مبارک باشد
جامہ پر خون شہیدانہ مبارک باشد

چاہنا کھانے کا اس بیاہ میں ہے نادانی　　جز کباب دل مہماں نہیں یاں بریانی
چلو بھر مانگے ہیں نوشہ جو کسی سے پانی　　کہتی ہے بیاہ کے یوں سامنے آ مہمانی

ناؤ نوش غم جانانہ مبارک باشد
بہ تو ایں خوردن شکرانہ مبارک باشد

آخر کار کہوں کیا میں زمانے کے کھوڑ　　دیکھ اس چہرے کو جو بدر سے رکھتا تھا ہوڑ
جس گھڑی ہجر اندغور کیا سہرا توڑ　　اٹھ چلا کہہ کے نبی سے دل صد چاک کو چھوڑ

بہرزلف توہمیں شانہ مبارک باشد
زینت و زیب عروسانہ مبارک باشد

سوؔدا کے اس مرثیہ میں سوز و درد تو نظر آتا ہے مگر یہ اس میں رقت خیز پیرائے کی کمی نظر آتی ہے۔ یہ مرثیہ ادبیّت کے لحاظ سے تو اچھا مرثیہ ہے، اس میں شاعرانہ پیرائے بھی بیان کئے گئے ہیں لیکن پھر بھی یہ اہل مجلس کو رلانے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ مرثیہ کے چوتھے بند پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے تینوں مصرعے درد سے بھرے ہوئے ہیں لیکن چوتھا مصرع اور بیت سننے والوں کو داد دینے کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اور اس طرح تینوں مصرعے کا اثر ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر چھٹے بند میں نظر کی جائے تو کچھ یہی حال ہے۔ مرثیہ کی زبان فارسی آمیز ہے۔ اس مرثیہ میں سوؔدا نے روایتیں بیان کی ہیں، رزمیہ مناظر بھی بیان کئے ہیں۔ اس میں جذبات نگاری کی عکاسی بھی کی ہے۔ ان سب کے باوجود سوؔدا کے مراثی عوام کے دل میں جگہ نہ پا کر کلیات کی ہی زینت بنے رہے۔ اس لئے بعض لوگوں نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ مرثیہ کے سوا کسی اور صنف میں طبع آزمائی کریں۔ لیکن سوؔدا کو یہ مشورہ پسند نہ آیا۔ اس بات کو سودا نے مرثیہ کے ایک مطلع میں کہا ہے۔

''جو مجھ سے کہتے ہیں کہ مرثیہ سوا کچھ اور
وہ چاہتے ہیں زباں سے مری سننا کچھ اور''

۶۔ میر تقی میرؔ :

میرؔ کی پیدائش ۱۷۲۴ء میں ہوئی، یہ چھوٹے تھے تبھی ان کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ بھائیوں کی بے رحمی، ایذا رسانی اور ان کے دوسرے عزیزوں کی نافرمانی نے میر کی زندگی تلخی اور پریشانیوں سے بھر دی۔ جس سے کہ زندگی خود ایک مرثیہ بن کر رہ گئی تھی۔ میر اپنے درد و غم کو اپنی غزلوں میں پیش کر کے روتے اور رولاتے تھے۔ مگر جب میر دہلی کو خیر باد کر کے لکھنؤ پہنچے تو انھوں نے رونے اور رلانے کے لئے مرثیہ نگاری کو اپنا لیا، حالانکہ یہ وقت ان کی زندگی کا آخری وقت تھا۔

ہر چند شاعری میں نہیں ہے تری نظیر　　اس فن کے پہلوانوں نے مانا تجھی کو میر
پر ان دنوں ہوا ہے بہت تو ضعیف و پیر　　کہنے لگا جو مرثیہ اکثر بجا کیا

یوں تو میرؔ نے غزل گوئی میں اپنا ایک علیحدہ مقام بنایا ہے مگر مرثیہ گوئی میں بھی وہ پیچھے نہیں تھے۔ میر کے قلمی نسخے

میں ان کے ۳۹ مرثیے شامل ہیں، جو پروفیسر مسعود حسن رضوی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں۔ رضا لائبریری میں بھی میر کے نو مرثیہ موجود ہیں جسکا ذکر شمشاد حیدر زیدی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان نو مرثیے میں دو ایسے مرثیے ہیں جو ان ۳۹ مرثیے میں شامل نہیں ہیں۔ اس طرح میر کے کل ۴۱ مراثی ملتے ہیں جسکو بقول شمشاد حیدر زیدی مسیح الزماں صاحب نے مرتب کیا ہے۔

میر نے مرثیے مربع، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس اور منفردہ لکھے ہیں۔ جن میں مربع زیادہ ملتے ہیں۔ ان کا ایک مرثیہ 'کربلا' کے عنوان سے مرزا محمد یوسف کی کتاب 'انتخاب ادبی مراثی' میں بھی موجود ہے۔ جو مربع کی شکل میں ہے اور اس مرثیہ کے کل بند ۴۰ ہیں، مگر انتخاب صرف گیارہ ہی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کرتا ہے یوں بیان سخن رانِ کربلا | احوال زار شاہ شہیدانِ کربلا
با آنکہ تھا فرات پہ میدانِ کربلا | پیاسا ہوا ہلاک وہ مہمانِ کربلا
انصاف کی نہ ایک نے کی چشم نیم باز | کھولے ستم کے ہاتھ زبانیں کیاں وراز
قتل امام مقصد و تیاری نماز | بدتر تھے کافروں سے مسلمانِ کربلا
سیلاب تھا بلا کا ہر اک سمت گرم جوش | فریاد بیکسوں کی طرف کم کسو کے گوش
آل نبی تمام ہوئی خوں سے سرخ پوش | صلوات برحسینؑ و جوانانِ کربلا
منصف تھے ہائے کتنے دروں تیرہ اہل شام | خوش تشنہ لب جنہوں نے کیا کشتن امام
فخر بشر کا نور دل و دیدہ تشنہ کام | سیراب وحش و طائر و حیوان کربلا
نوک سناں پہ رکھ کے چلے لے سر امام | ناموس کے جو لوگ تھے بندی ہوئے تمام
ٹکڑے جگر کے ہوتے تھے کرتا تھا جب کلام | بے خانماں وہ جمع پریشان کربلا
بیٹے بھتیجے اس کے جواں مارے سب پڑے | ہو ٹکڑے ٹکڑے سامنے بیکس بہت لڑے
فرصت نہ اتنی دی کہ کوئی خاک میں گڑے | پوشیدہ کیا ہے ظلم نمایان کربلا
شاید غبار رکھتی ہیں چشمان مہر و ماہ | احوال پر ہمارے نہیں مطلقاً نگاہ
پردہ رہے جو گر پڑے گردون رو سیاہ | ہیں سر برہنہ خاک نشینان کربلا
ہے تودہ تودہ لاش پہ جن کی یہ خاک دھول | سب پہ شگفتہ رو تھے نگاہوں میں جیسے پھول
منھ دیکھ ان کے کہتے تھے صلوات بر رسول | گلزار تھی یہ وادئی ویران کربلا
سر اس کا کٹ کے نیزے پہ جس دم رکھا گیا | نو نیزہ پانی چڑھ کے جیوں کو ڈبا گیا
ہر چند بوند پانی کی کوئی نہ پا گیا | لیکن خدا کا قہر تھا طوفان کربلا
مشفق پدر تو رخت سفر کر گیا ہے بار | بھائی کو اس سے آگے ہی دشمن گئے تھے مار

ہوں میں برہنہ پا سو مرض سے نحیف و زار پھر ہر قدم پہ خار مغیلان کربلا
القصہ پیٹ روکے گئے آگے وے اسیر دل چاک سر میں خاک جواں اور خرد وپیر
بس تو بھی اپنے ہاتھ سے رکھ کر قلم کو میر کہہ باد سے کہ ہووے گل افشان کربلا

میؔر نے اس مرثیہ میں واقعہ کربلا کو بڑی سادگی سے بیان کیا ہے۔مضامین سیدھے سادے اورتعزیت سے بھرے ہوئے ہیں۔ چونکہ میر نے مرثیہ فن کی پختگی اور استادگی کی منزل میں پہنچ کر لکھا ہے اس لئے ان کے مرثیے ادبی حیثیت اور مرثیت کے لحاظ سے بلند درجہ کے ہیں۔اس مرثیہ میں میؔر نے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد کا واقعہ بیان کیا ہے۔امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔مرثیہ میں غزل کا پیرائے بیان ،اصطلاحیں اورویسی ہی طرزفکر ملتی ہے۔مرثیہ کی زبان صاف اور سادہ ہے۔اس میں سوز ودرد بھی ہےاور بین بھی ،جسکوسن کر سامعین کی آنکھیں بھرآتی ہیں۔

میؔر کے مرثیوں میں روایتیں بھی ملتی ہیں۔ان کے مراثی مقصدشہادت حسینؑ کا احساس کراتے ہیں۔یہ مرثیے صرف بیان مظلومی کربلا تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس میں ان واقعات کا بھی بیان ملتا ہے جس سے امام حسینؑ کی امن پسندی ،جاہ وثروت سے بے نیازی ظاہر ہوتی ہے۔میؔر کی مرثیہ نگاری کے بارے میں علی جوادزیدی لکھتے ہیں۔

''سودا ہی کی طرح میر بھی دلّی کے رثائی اکتسابات لکھنو تک پہنچاتے ہیں اور مستقبل میں ہونے والی تبدیلیوں کی راہ ہموار کرتے ہیں۔''[۷]

۷۔میر غلام حسن :

میر ضاحکؔ کے بیٹے اور میر انیسؔ کے دادا میر غلام حسن کا تخلص حسن تھا۔لیکن یہ اپنے تخلص کے ساتھ لفظ میر ضرور لگاتے تھے۔یہ پرانی دہلی کے سیدواڑے محلّے میں پیدا ہوئے تھے۔اپنے باپ کی طرح میر حسن نے بھی بزم سخن میں بہت نام کمایا۔اور نہ صرف اپنے باپ کا نام روشن کیا بلکہ خود اپنا بھی ایک منفرد مقام بنایا۔میر حسن نے غزل،قصیدہ،مثنوی اور مرثیہ میں صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے مگر وہ مثنوی گوشعراء کی صنف میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔اس کی تصنیف سحرالبیان آج بھی اردو ادب میں ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔اوراس مثنوی کی توسیف اردو شعراء کے تذکرہ نگاروں نے کی ہے۔

میر حسن نے مرثیے لکھے ہیں مگر ان کا ایک بھی مرثیہ اس کی کلیات میں نہیں ملتا۔لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ مرثیے کہتے تھے۔وہ خود اپنے تذکرۂ شعراء میں لکھتے ہیں۔

''اکثر بفرمایش نواب معلّی القاب مرثیہ امام علیہا السلام نیز بگفتن می آیز۔''[۸]

(اکثر نواب معلّی القاب کی فرمائش سے امام حسین علیہ السلام کا مرثیہ بھی کہنا ہوتا ہے۔)

بقول شمشاد حیدر زیدی میر حسن کے تین مرثیے پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کے ذخیرۂ مراثی میں موجود تھے۔ان مرثیوں میں دو مربع اور مسدس کی شکل میں ہیں۔مربع مرثیوں میں ایک ۳۷ بند اور دوسرا ۴۴ بند کا مرثیہ ہے۔مسدس مرثیے کل ۲۶ بند موجود ہیں۔۳۷ بند کے مرثیے میں تقریباً آدھے مرثیے میں جناب سکینہ اوران کی ماں کی گفتگو ہے،جس میں امام حسین کی شہادت کی خبر سن کر وہ ان کے بارے میں دریافت کرتیں ہیں،اوران کی ماں صبر کی تلقین کرتی ہیں۔ملاحظہ ہو۔

جب سکینہ نے سنا گھر میں کہ وہ سرور گیا	یعنی جنت کو پیاسا سبط پیغمبر گیا
سنتے ہی یہ ماجرا ہوش اس کا تو یکسر گیا	رو رو کر بولی اماں بابا میرا کیدھر گیا

تھا ابھی تو دامن اس کا ہاتھ میں میرے اماں	میں جدا روتی تھی اور تھا وہ جدا گریہ کناں
میں جو ٹک غافل ہوئی جاتا رہا وہ پھر کہاں	مجھ کو بھی لے چل وہاں بابا مرا جیدھر گیا

تو تو کہتی تھی کہ جنت کو گیا پیاسا غریب	مجھ کو تشنہ چھوڑ کر جانا تو ہے اس سے عجیب
اور گیا ہے وہ تو بلوادے گا مجھ کو عنقریب	یونہیں ہوگا سچ یہ خطرہ اب مرے دل پر گیا

اے اماں بابا کی صورت مجھ کو دکھلا دے شتاب	میں ترے صدقے گئی تو اس کو بلوا دے شتاب
یا مجھی کو اس تلک بی بی تو پہنچا دے شتاب	ہجر کے داغوں سے اس کے دل تو میرا بھر گیا

سن کے یہ بیٹی سے اماں نے دیا رو رو جواب	اے بچی کہتی ہے یہ تو کیا کہیں دیکھا ہے خواب
تیرا بابا ہے کہاں لاؤں اسے کیوں کر شتاب	کیا کہوں میں اس کا قصہ تجھ سے وہ سرور گیا

جن نہالوں کے تیئں زہرا نے پالا دودھ دے	وے شجر بن پانی مرجھا کر زمیں پر گر پڑے
بیخ و نبیاد ان کی کھودی باغیوں نے تیغ سے	موسم گلزار احمد کا سماں بندھ کر گیا

صبر کرائے بیٹی اتنا بھی نہ ہو تو بے قرار	کیا کریں چارہ نہیں یوں تھی رضائے کردگار
تیرے بابا کے گلے پر چل گئی خنجر کی دھار	تن زمیں پر ہے پڑا اور سیس نیزے پر گیا

مرثیہ کی زبان صاف اور سوز گداز سے بھرپور ہے۔ایک باپ کے لئے بیٹی کی محبت اور اس کے جذبات کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔سکینہ کا اپنے بابا حسینؑ کے لئے رونا اور اسکی ماں کا سمجھانا سامعین کے دلوں میں ایک درد سا پیدا کر دیتا ہے۔

تذکروں میں ملتا ہے کہ میر حسن اپنے آخری دنوں میں شاعری کی باقی اصناف کو یعنی غزل،قصیدہ اور مثنوی کہنے کو تضیع عمر اور بیہودگی سمجھنے لگے۔ایسی شاعری سے ان کا دل بھر گیا تھا اور اب وہ شاعری (مرثیہ) سے اپنے عاقبت بنانے کے خواہشمند تھے۔ایک دوسرے تذکرے میں ملتا ہے کہ وہ آل نبی کے سوا کسی اور کی مدح کرنا پسند نہ کرتے تھے۔اور امام

حسینؑ اور انصار حسینؑ کی مدح کو سخن کا نتیجہ یعنی شاعری کا ماحصل سمجھتے تھے۔ مدح امام کا اطلاق خاص کر مرثیے پر ہوتا تھا اور مرثیہ گوئی کو کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آخر عمر میں میر حسنؔ دوسرے اصناف سخن سے زیادہ مرثیہ گوئی کی طرف مائل تھے۔

☆ لکھنؤ کے اہم مرثیہ نگار :

لکھنؤ میں مرثیہ نگاری اور عزاداری کی ابتداء سعادت علی خاں برہان الملک کے عہد سے مانی جاتی ہے۔ سعادت علی خاں برہان الملک کو اودھ کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ایرانی تھے اور موسوی سیّد اور اثنا عشری مذہب کے پیروکار تھے۔ انھیں عزاداری سے نہایت عقیدت تھی۔ چنانچہ اودھ میں عزاداری کی ابتداء بھی اسی وقت ہوئی تھی، لیکن اس کی صحیح تاریخ کا تعین ہنوز ممکن نہیں ہے۔ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ برہان الملک سے پہلے بھی اودھ میں عزاداری رائج تھی یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور ملتا ہے کہ اس کے عہد میں عزاداری ہوتی تھی۔ ڈاکٹر ریاض الہاشم اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ۔

> ''اس کی ابتداء یوں تو اس حکومت کے بانی یعنی نواب سعادت خاں برہان الملک کے وقت میں علامتی طور پر اس طرح شروع ہوئی کہ قاضی محمد عاقل نے فیض آباد میں بابری مسجد کی مرمت کروائی اور پھر انہیں کی اجازت سے مسجد کے چبوترے پر دوران محرم تعزیہ رکھنے کی اجازت طلب کی جو مل گئی۔ یہیں سے اودھ میں عشرۂ محرم میں عزاداری کے شروع ہونے کا پتہ چلتا ہے۔''[۹]

۱۷۷۵ کے آس پاس نواب آصف الدولہ نے اپنا پایہ تخت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر لیا۔ جس سے لکھنؤ میں عزاداری کا رواج عام ہوگیا۔ اس رواج میں مذہب کی قید نہیں تھی۔ لکھنؤ کی زندگی میں عزاداری ایک تہذیب وثقافت کی شکل میں رچ بس گئی تھی۔ اور اس طرح عزاداری کے فروغ نے شاعروں کو مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس دور کے اہم مرثیہ نگاروں میں حیدریؔ، سکندرؔ، گداؔ، احسانؔ اور افسردہؔ اہم ہیں۔

جس طرح علی جواد زیدی نے دہلی کی مرثیہ گوئی کو چار دور میں تقسیم کیا ہے، اسی طرح ڈاکٹر مسیح الزماں نے بھی لکھنو مرثیہ گوئی کو تین ادوار میں بانٹا ہے۔ پہلے دور کو انھوں نے ''دورِ آغاز'' کا نام دیا ہے۔ جن میں شامل مرثیہ نگاروں میں حیدریؔ، سکندرؔ، گداؔ، احسانؔ اور افسردہؔ وغیرہ ہیں۔ اس دور کے مرثیوں میں کربلا کے واقعہ کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے پیش کیا گیا ہے۔ پورا مرثیہ ایک واقعہ پر مبنی ہوتا تھا اور اس میں ابتداء اور خاتمہ کی منزل بھی پیش کی جاتی تھی۔ اس دور میں ہیئت کے اعتبار سے مسدس کو ترجیح دی جاتی تھی۔ مسدس کا انتخاب اس دور کا اہم قدم ہے۔ جذبات کی عکاسی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور ساتھ ہی رخصت پر بھی توجّہ دی جاتی تھی۔ اس دور میں مرثیہ چونکہ لحن میں پڑھے جاتے تھے اس لئے ۳۰۔۴۰ بند سے زیادہ کے نہیں لکھے جاتے تھے۔

دوسرے دور کو ''دورِ تعمیر'' کے نام سے پکارا گیا۔اس دور کے اہم شعراء میں خلیقؔ،ضمیرؔ، فصیحؔ اور دلگیر کے نام آتے ہیں۔مرثیہ کا ڈھانچہ اس دور میں مکمل ہوا۔اس دور میں تحت اللفظ خوانی کے رواج نے مرثیہ کو طوالت بخشی۔مرثیہ میں واقعات تفصیل سے بیان ہونے لگے۔واقعات اور منظر ایک اندرونی ربط کے ساتھ بیان ہونے لگے اور مرثیہ میں رخصت اور شہادت کے بیان میں نفسیات کا دخل بھی ہونے لگا۔جنگ کے مناظر کے علاوہ مرثیہ میں سماجی زندگی کے بہت سے پہلو دکھائے جانے لگے۔اس دور میں مرثیہ کی ظاہری ہیئت مسدس تو رہی لیکن اس کے ساتھ ہی مرثیہ کی داخلی ہیئت بھی متعین ہوگئی۔اس دور کے آخر تک مرثیہ کا جو ڈھانچہ بناوہ کچھ اس طرح ہے۔

۱۔چہرہ ۲۔ماجرا ۳۔سراپا ۴۔رخصت ۵۔آمد ۶۔رجز ۷۔جنگ ۸۔شہادت ۹۔بین۔

مرثیہ کا یہ ڈھانچہ ایک دن میں نہیں بنا اور نہ ہی یہ کسی ایک شخص کی دین ہے بلکہ یہ دکن سے لکھنو تک کے سفر میں ہزاروں تجربوں کے بعد متعین ہوئی ہے۔اور اس کا ڈھانچہ مکمل میر ضمیر کے دور میں ہوا ہے۔اس دور میں مرثیہ کی شکل مسدس ہونے کے ساتھ ساتھ لمبائی کے لحاظ سے بھی بڑھ گئی تھی،مرثیے کے بند سو سے پونے دوسو تک کے ملتے ہیں۔

ڈاکٹر مسیح الزماں نے تیسرے دور کو دورِ عروج بتایا ہے۔اس دور میں مرثیہ نے ایک ایسی شکل اختیار کر لی تھی، جس میں المیہ کی طرح ابتداء عروج اور خاتمہ ہوتا ہے۔اسی خصوصیت کی وجہ سے مصنفین نے مرثیہ نگاری کو ڈرامہ نگاری کہا ہے اور ان دونوں میں مماثلت ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔لکھنو تک پہنچتے پہنچتے مرثیہ ہیئت اور موضوع کے جن تجربات سے گزرا اس کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔جہاں ایک طرف لکھنو میں پہنچ کر مرثیہ کے موضوع میں وسعت پیدا ہوگئی تو دوسری طرف اس کی شکل میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی کہ وہ مربع سے مخمس اور مخمس سے مسدس کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔پہلے دور میں مرثیہ نے ترقی کی منزل احسانؔ، گداؔ اور افسردہؔ کی رہنمائی میں طے کی،اور اس کا ڈھانچہ کو مکمل کرنے میں فصیحؔ،دلگیر اور ضمیرؔ نے دوسرے دور میں کوشش کی اور تیسرے دور میں انیسؔ اور دبیرؔ نے اس کو عروج تک پہنچا دیا۔

۸۔میر حیدریؔ :

میر حیدری نام اور حیدریؔ تخلص کرتا تھا۔اودھ کے قدیم مرثیہ گوشعراء میں حیدری کا نام بھی آتا ہے۔ان کے حالات زندگی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا ہے۔بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ یہ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور پھر وہاں سے لکھنو چلے گئے۔حیدری کے جو مرثیے ملے ہیں ان سب کی ہیئت مسدس کی ہے۔اور ان میں صفائی اور روانی بھی موجود ہے۔حیدری کے ۲۲ مرثیے ملتے ہیں جس کا ذکر اکبر حیدری کشمیری نے کیا ہے۔

> ''جناب سیّد مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں ان کے اکیس مرثیے ہیں،بیس مسدس اور ایک مربع میں،ان کے علاوہ دو سلام بھی ملتے ہیں۔راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں دو مسدس مرثیے ہیں ان میں سے ایک مسعود صاحب کے یہاں

بھی ہے اس طرح ان کے کل مرثیوں کی تعداد جن کا مطالعہ راقم الحروف نے کیا ہے
بائیس ہے۔''۱۰؎

ان کے ایک مرثیہ کا کچھ بند بطور نمونہ پیش ہے۔جس میں رزم کا بیان کیا گیا ہے۔

جس طرف نیزہ اٹھا کے جاتے دونوں نیزہ دار — تھے گرادیتے ہزاروں فوج ظالم کے سوار
یا علیؑ کہہ کے لگاتے جس پہ یہ تیغ آبدار — کرتے دو ٹکڑے برابر تھے اسے مثل خیار
پر جدھر کرتے تھے حملہ یہ بہادر اور دلیر
کہتے تھے ظالم کہ بھاگو ہیں ادھر آئے یہ شیر

واہ ری ان کی شجاعت ،واہ رے ان کے حواس — بے حواسی تھی پھری گویا نہ ان کے گرد و پاس
چور تھے زخموں سے پر چہرے نہ تھے ان کے اداس — مثل گل ہر زخم پر کھلتے تھے یہ خالق شناس
سینکڑوں حربے لعینوں کے مگر کھاتے تھے یہ
اور اٹھائے باگیں گھوڑوں کی بڑھے جاتے تھے یہ

جس گھڑی اعدا سے لڑتے تھے یہ دونوں رشک ماہ — تھی زمیں سے عرش تک اس دم صدائے واہ واہ
چیں نہ تھی ان کی جبیں پر ہے خدا اس کا گواہ — کہتی تھی ان کی دلیری دیکھ ظالم کی سپاہ
سن میں تو چھوٹے ہیں پر یہ لڑنے والے ہیں بڑے
ہیں شجاعت میں یہ دونوں اپنے نانا پر پڑے

مرثیہ کے مطالعہ کے بعد اس کو ایک عمدہ رزمیہ مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔اس مرثیہ میں امام حسینؑ کے دونوں بھانجوں کی جنگ کا ذکر ان ہی کی زبانی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔حیدریؔ کے مرثیوں کی زبان ان کے دہلی کے معاصرین شعراء کے مقابلے میں بہت صاف اور ہموار ہے۔ان کے مرثیوں میں رزم کا بیان بھی ملتا ہے رخصت اور شہادت کا ذکر بھی ہوتا ہے،اور واقعات کا ربط باقاعدہ نظر آتا ہے۔

۹۔محمد علی سکندر :

نام محمد علی اور تخلص سکندؔر تھا۔یہ اس عہد کے سب سے مقبول اور معروف مرثیہ گو تھے۔ان کی سن پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔علی جواد زیدی نے ان کی پیدائش ۲۸۔۱۷۲۷ء کی بتائی ہے تو وحید الحسن ہاشمی ان کو ۱۷۱۹ء کا بتاتے ہیں۔تذکرہ نگاروں نے انھیں پنجاب کا باشندہ بتایا ہے،لیکن ان کی پرورش دہلی میں ہوئی۔دہلی سے یہ فیض آباد اور پھر وہاں سے یہ لکھنو چلے گئے۔سکندر اپنی عمر کے آخری حصے میں نظام حیدر آباد کی طلب پر لکھنو سے حیدر آباد چلے گئے اور وہیں پر ان کا انتقال ۱۸۰۰ء میں ہوا۔

سکندر نے مرثیے کئی ہیئتوں میں لکھے ہیں، جن میں مربع، مخمس اور مسدس وغیرہ شامل ہیں لیکن مسدس کی ہیئت میں مرثیے زیادہ کہے ہیں۔ سکندر کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ انھوں نے عوامی زبان میں مرثیے کہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو پوربی، پنجابی، بنگالی اور مارواڑی زبان سے بھی واقفیت تھی اور انھوں نے ان سبھی زبانوں مرثیے کہے ہیں۔ یہاں پوربی زبان کی ایک مثال پیش ہے جو دردوغم کے جذبات سے بھری ہوئی ہے۔

بن کربل ما بانو دکھیا نینا نیر بہاوت ہے ابن علیؑ کی لوتھ کے اوپر بیاکل ہو ہو جاوت ہے
چھاتی پیٹت آنسوا ڈھلکت رو رو ہو سناوت ہے زہرا جی کی بہو پیاری بن سیّاں دکھ پاوت ہے
یا حیدر تم ساقی کوثر چلو اتنا تنک پلاؤ تس کے مارے بہو تمہاری ترس رہی ہے پیاس بجھاؤ
تم بن مورا کون ہے کا سے مانگوں نیر کنبہ سگرا کھت گیو کھیت رہے شبیر

سکندر کا ایک مرثیہ جو سب سے زیادہ مشہور ہے اور کئی بار شائع ہو چکا ہے، وہ یہ ہے۔

''ہے روایت شتراسوار کسی کا تھا رسولؐ ''

یہ مرثیہ مسدس کی شکل میں ہے اور ۶۲ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس مرثیہ کا مضمون یہ ہے کہ امام حسینؑ کی چھوٹی بیٹی جو علالت کے سبب ان کے ساتھ سفر میں نہ جا سکی، مدینہ میں اپنی نانی حضرت امّ سلمٰی کے ساتھ ہیں وطن سے ایک قاصد کے ہاتھ خط بھیجتی ہیں۔ جس میں ماں باپ اور بھائی بہن کے لئے پیغام ہوتا ہے، وہ قاصد کربلا اس وقت پہنچتا ہے جب سب شہید ہو چکے ہیں اور امام حسینؑ میدان میں تنہا کھڑے ہیں، قاصد سے خط لیکر وہ پڑھتے ہیں اور ایک ایک شہید کو مخاطب کر کے وہ صغرا کا سلام پہنچاتے ہیں۔ اس دردناک مرثیہ کا کچھ بند پیش ہے۔

ہے روایت شتراسوار کسی کا تھا رسول ان دنوں شہر مدینہ میں ہوا اس کا نزول
جس محلّہ میں بہم رہتے تھے حسنین و بتول ایک لڑکی کھڑی دروازے پہ بیمار و ملول

خط لئے کہتی تھی پردہ کے قریں زار و نزار
ادھر آتجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار

نا گہاں سن شتراسوار وہ آواز حزیں با ادب آن کے کہنے لگا پردے کے قریں
کوئی اس گھر میں دلاسے کو ترے ہے کہ نہیں اتنی سی عمر میں کیا دکھ ہے تجھے اے غم گیں

کون سی قوم کی تو لڑکی ہے بیمار و صغیر
کیا ترا نام ہے تو کس کے لئے ہے دلگیر

وہ لگی کہنے سن اے بندۂ حیُّ القیوم میرا نانا ہے نبیؐ، دادا علی باب علوم
یہ محلّہ بنی ہاشم کا ہے سب کو معلوم اور میں لڑکی جو بیمار ہوں دکھیا مغموم

فاطمہ صغرا اسی واسطے ہے میرا نام
دادی زہرا کی سی صورت ہے مرے منہ کی تمام

ایک تو فاقہ کشی دوسری میں ہوں نادار — گھر میں دانہ نہیں کیا دوں تجھے اے ناقہ سوار
ایک مقنع ہے مرے سر پر سو دیتی ہوں اتار — میں نے بخشا اسے بھائی مرا خط لے کے سدھار

کہیو بابا سے کہ ہے فاطمہ صغرا بے چین
نام لے لے کے وہ مر جائے گی کہہ کہہ کے حسینؑ

اس لئے دیتی ہوں خط میں تجھے اے ناقہ سوار — کربلا کی مجھے بو آتی ہے تجھ سے ہر بار
میرا بابا بھی گیا ہو گا ادھر کو نا چار — گر کبھی ہو ترا اس دشت کے میداں میں گزار

کہیو رو رو کے زبانی تو مرا سب سے پیام
بندگی میرے بڑوں کو مرے چھوٹوں کو سلام

سکندؔر ایک قادرالکلام شاعر تھے۔اس لئے ان کے مرثیہ بھی مربوط ہیں۔اس مرثیہ کی زبان تاثیر میں ڈوبی ہے۔جو درد وغم کے جذبات واحساسات سے لبریز ہے۔مرثیہ کا لب ولہجہ بہت رقت آمیز ہیں۔ان کا انداز بیان بھی دلکش ہے۔یہ مرثیہ واقعات نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔

۱۰۔مرزا علی گدا :

مرزا علی گدؔا کا شمار لکھنو کے قدیم مرثیہ گو میں ہوتا ہے۔یہ میرؔ،سوداؔ،میر حسنؔ،افسردہؔ،سکندؔر اور حیدرؔی کے ہمعصر تھے۔ان کی پیدائش ۱۷۴۵ء کو لکھنو میں ہوئی تھی۔لیکن ان کی وفات کی تاریخ میں اختلاف ملتا ہے۔قاضی عبدالودود نے ان کی وفات کی تاریخ ۱۸۱۸ء بتائی ہے۔جبکہ مسیح الزماں نے ان کے انتقال کی تاریخ ۱۸۱۶ء قرار دی ہے۔
گدؔا کی تصنیف میں مرثیوں کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔بقول شمشاد حیدر زیدی مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں گدا کے مرثیوں کی ایک بیاض موجود ہے جس میں ۲۷ مرثیے ہیں اور یہ سب مرثیہ مسدس کی ہیئت کے ہیں۔گدا کے مرثیوں کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کے مرثیوں کا کوئی مخصوص ڈھانچہ نہیں ہے،مرثیہ نگاری میں ان کا مقصد کربلا کے واقعات میں درد انگیز پہلوں کو اجاگر کرنا ہے۔ان کے مرثیوں کا انداز بیان دہلی کے مرثیوں سے جداگانہ ہے۔مرثیوں میں حضرت قاسمؑ کی شادی کی رسموں کا ذکر سودا اور دیگر مرثیہ نگاروں کے یہاں بھی ملتا ہے مگر گدا کے مرثیوں میں ایک دوسرا سماج ہی سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔مرثیہ میں حضرت قاسمؑ کی شادی کی یہ رسم ملاحظہ ہو۔

جب حنا بندی کی آئی رات مہر و ماہ کی — بانو بی بی ، بی سکینہ مہندی کے ہمراہ کی
لے کے آرائش گئی جب سالی اس نوشاہ کی — مہندی ہاتھوں میں لگا قاسمؑ بنے کی بیاہ کی

بولی کیوں غم گین بیٹھے بھائی تم ہو نوشاہ آج
بیاہ کی مہندی لگی ہے لو مبارک باد آج

سر سے پاؤں تک بلائیں ماں نے اس نوشہ کی لے یوں کہا قربان جاؤں اے مرے قاسمؑ بنے
سامنے بیٹھی ہے سالی تجھ کو مہدی باندھنے لے مبارک باد اس کی اور اسے نیگ دے

سمدھیانے کی جو یہ سب بی بیاں ہیں نیک نام
بہنوں کو تسلیم کر اور ساری چچیوں کی سلام

گدؔا کے مرثیوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے مرثیوں کا رنگ دہلی کے مرثیے سے جدا ہے۔ان کے مرثیے میں اٹھارویں صدی کے الفاظ کی موجودگی کا احساس بار بار ملتا ہے۔زبان صاف ہے ۔گدا کے مرثیوں میں فارسی ترکیبوں کی بھرمار نظر آتی ہے۔یہاں کھڑی بولی کا استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

۱۱۔مرزا پناہ علی بیگ افسردہ :

نام مرزا پنا علی بیگ اور تخلص ’’افسرؔدہ‘‘ تھا۔یہ لکھنو کے باشندہ تھے اور اپنے عہد کے ممتاز مرثیہ گو میں سے ایک تھے۔اس کی حالات زندگی کا پتا نہیں چلتا ہے۔بس یہ معلوم ہوا کہ شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ان کی بیوی بہو بیگم کی سرکار میں ملازم تھے اور فیض آباد میں مقیم تھے۔افسردہ کو مرثیہ سے خاص دلچسپی تھی ۔اور اس کے سارے مرثیے مسدس کی شکل میں ملتے ہیں۔ان کی مرثیوں کا ذخیرہ مسعود حسن رضوی کے پاس تھا مگر اب یہ موجود نہیں ہے۔

افسرؔدہ کے مرثیوں کے بندوں کی تعداد ۳۰ سے ۴۰ کے درمیان تک ہے۔مرثیوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بین پر زیادزور دیا گیا ہے۔جنگ کا بیان مختصر طور پر کیا گیا ہے۔مرثیہ کے ابتداء سے ہی واقعات کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔افسردہ کے مرثیوں میں جدّت پائی جاتی ہے۔انھوں نے اپنے معاصرین مرثیہ نگار سکندؔر اور گدؔا کے مقابلے اپنے مرثیے کے موضوعات کو وسعت عطا کی ۔انھوں نے حضرت عباسؑ ،حضرت علی اکبر اور حضرت علی اصغرؑ،رسولؐ خدا، حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ کے حال کے مرثیے کہے ہیں۔سفارش حسین رضوی اپنی کتاب میں کریم الدین کے اس قول کو لکھا ہے۔

’’ یہ شاعر مرثیہ گوئی میں اپنے وقت میں ہم عصروں پر سبقت لے گیا تھا اور بہت درد آمیز مرثیہ کہتا تھا۔ بہت سے مرثیے عاجؔز نے اس کے دیکھے ،اس کے مرثیے میں رقت بہت ہے۔اور مضامین بھی اچھے اچھے باندھتا ہے۔‘‘[۱۱]

افسرؔدہ کا ایک مرثیہ دیکھئے جس میں حضرت عبّاسؑ کو علم سونپنے کے واقعہ کا بیان کیا گیا ہے۔اس مرثیہ میں افسرؔدہ نے جوش بیان اور سادگی زبان پر زیادہ زور دیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

عبّاس کو سبط نبی ؐ کا علم ملا　　جعفر کا اس رتبہ و جاہ وحشم ملا
ہمراہ اس کے رہبر ملک عدم ملا　　کوثر فلک نشان اسے ہر قدم ملا
مہر عرب نور الٰہی کے نور سے
روشن تھا ابر شام پہ چوں ماہ دور سے

کہتا تھا آج مجھ کو وہ دولت ہوئی نصیب　　جعفر کو جو رسول سے عزت ہوئی نصیب
روز اخیر کیا یہ سعادت ہوئی نصیب　　سبط نبیؐ امام کی خدمت ہوئی نصیب
میں قتل ہوں نبی کے علمدار کی طرح
شہپر ملیں گے جعفر طیار کی طرح

مرثیہ میں تسلسل، ربط اور روانی بہت ہے۔افسردہ کی مرثیہ گوئی مقصد اور فن دونوں کے اعتبار سے کامیاب ہے۔اس لیے افسردہ کو اونچے درجے کا مرثیہ گو کہہ سکتے ہیں۔

۱۲ میر احسان علی :

میر احسان علی کے حالات زندگی کے بارے میں کچھ بھی دستیاب نہ ہوسکا۔ان کے مرثیے مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہیں۔جس کی تعداد تقریباً ۱۰۸ ہے۔اور یہ سبھی مرثیے مسدس کی ہیئت میں ہیں۔جس کے ساتھ تاریخ کتابت بھی درج ہے۔ان کا سب سے پرانا مرثیہ ۱۸۰۲ کا مکتوبہ ہے۔مرثیہ گوئی احسان کی زندگی کا ماحصل تھا۔ان کا شمار لکھنؤ کے ابتدائی مرثیہ گویوں میں ہوتا ہے۔انھوں لئے ان کو گدا، سکندر اور افسردہ کا ہم عصر کہنا غلط نہ ہوگا۔

احسان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نہایت غم انگیز اور دردناک واقعات کو بہت ہی سادہ اور سلجھی ہوئی زبان میں بیان کیا ہے۔انھوں نے گریہ، بکا اور رقت آمیز پر زور دیا ہے۔ان کے مرثیے میں بیان کا تسلسل کہیں نہیں ٹوٹتا۔ان کے ایک مرثیہ کا کچھ بند بطور نمونہ پیش ہے۔

اے خسرو زمن وزماں شاہ کائنات　　اے ہم غریب عاصیوں کے موجب نجات
کیا حادثات روئے زمیں کی سناؤں بات　　ان میں ترے نواسے کے کاٹے گئے ہیں ہات
ماٹی اوپر تڑپتا ہے لوہو لہاں ہے
خالق سے دل لگا ہے عبادت میں دھیاں ہے

نہ اس کو یہ خبر ہے کہ تن ہے چھد اکہاں　　نہ اس کو یہ حواس ہے لوہو بہا کہاں
نہ اوس کو ہوش یہ ہے کہ سر ہے کٹا کہاں　　نہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ میں ہوں پڑا کہاں

حلقوم کٹ گئے سے یہ کرتا پکار ہے
گھر سارا عاصیوں پہ ہمارا نثار ہے
سر کٹ گیا ہے اوس کو الم کچھ نہیں ہوا عجز اوس غریب امام کا کم کچھ نہیں ہوا
زخمی ہے جسم کہتا ہے غم کچھ نہیں ہوا گھر لٹ گیا کہے ہے ستم کچھ نہیں ہوا
لوہو لہاں قبلہ کی جانب پڑا ہے وہ
امّت کی مغفرت کی دعا مانگتا ہے وہ

احسان کے مرثیہ میں ناظم اور گدا کا انداز بیان ملتا ہے۔ بیان سادہ اور کلام محاسن شعری سے پاک ہے۔ مرثیہ میں ہندی زبان کا اثر نظر آتا ہے۔

۱۳۔ مرزا اکبر علی خاں مقبل :

مقبل فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام مرزا اکبر علی خاں تھا اور تخلص مقبل۔ ان کے والد کا نام امیر الدولہ مرزا حیدر بیگ نواب آصف الدولہ کے نائب تھے۔ مقبل ابتداء میں نواب مختار الدولہ کے دیوان خانے کے داروغہ تھے، اور نواب کے انتقال کے بعد یہ بہو بیگم کے وکیل بن گئے۔

مقبل اپنے عہد کے مشہور مرثیہ گو میں سے ایک تھے، لیکن ان کا کوئی مرثیہ آج تک نہیں چھپا۔ راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں ان کا ایک نایاب دیوان ضخیم موجود ہے۔ یہ دیوان سلاموں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ان کے متعدد مرثیے بھی شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں اپنی مرثیہ نگاری پر ناز تھا۔ مقبل کے مرثیوں کے بند ۳۰۔۴۵ سے زیادہ کے نہیں ملتے۔ ان کے کئی مرثیوں میں صرف ایک مرثیہ مخمس کا ملتا ہے اور باقی مسدس کی ہیئت میں ہیں۔ مقبل نے اپنے مرثیوں میں تمہید کے بجائے رخصت، آمد اور شہادت کے مضامین پر زور دیا ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں حضرت عباسؑ۔ حضرت علی اکبرؑ، شہادت امام حسینؑ، دشمنوں کے ہاتھ اہل حرم کا لٹنا، اہل حرم کا قید ہو کر شام جانا وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔ ان کا ایک مرثیہ حضرت اکبرؑ کی رخصت سے شروع ہوتا ہے۔ علی اکبرؑ جنکو ان کی پھوپھی زینب نے پالا تھا، انھیں یہ شکایت تھی کہ میدان جنگ میں جانے سے پہلے اکبر ان سے رخصت لینے نہیں آئے۔ علی اکبرؑ کی رخصت کو جس طرح مقبل نے اپنے مرثیہ میں پیش کیا اس کی مثال کم ہی مرثیہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔

خبر خیمہ میں یہ جس وقت آئی اجازت شاہ سے اکبرؑ نے پائی
تو سر کو پیٹ کر زہراؑ کی جائی پکاری شہ کو مجھ تک آؤ بھائی
ابھی اکبر کو مت کرنا روانہ
شبیہ مصطفیٰ کو گھر میں لانا

حسینؑ ابن علیؑ اکبر کو لے کر عزیز وآئے جو خیمہ کے اندر
تو روکر بولی یوں زہراؑ کی دختر کیا کیا آپ نے سبط پیمبر
نہ پوچھا بھائی زینبؑ دل جلی کو
اجازت رن کی دی اکبر علی کو

کرو تم غور اس کو ائے برادر وہی زینب تمھاری ہے یہ خواہر
جو رخصت مانگتے تھے تم سے یاور انھیں کہتے تھے جا خیمہ کے در پر
رضا جب لیجیو بنت علیؑ سے
تو رخصت ہوجیو سبط نبیؐ سے

گیا قاسم جو دی میں نے اجازت گیا عباس بھی ہو مجھ سے رخصت
جو میں نے کی ہے اکبر پر ریاضت سنو بھائی یہ ہے جائے قیامت
چلا یہ رن کو اور مجھ سے چھپایا
سبب اس کا نہ زینب کو بتایا

گلہ جب کر چکی زینب دل افگار کیا یہ عذر شہ نے چار و ناچار
کوئی باعث نہ تھا جز اس کے زنہار بہت اکبر کو جو کرتی ہو تم پیار
خطر تھا تم سے گر رخصت کو آوے
جگر زینب تمہارے پھٹ نہ جاوے

مرثیہ کا لب ولہجہ بڑا زور دار اور رقت آمیز ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے۔ کلام میں روانی کے ساتھ ساتھ سوز و گداز بھی ہے۔ جو سامعین کی آنکھیں اشکبار کرنے کے لئے کافی ہے۔

۱۴۔ میر مستحسن خلیقؔ:

نام میر مستحسن تھا اور تخلص ''خلیقؔ'' کرتا تھا۔ یہ میر حسن کے منجھلے بیٹے اور میر انیس کے باپ تھے۔ یہ فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ میر خلیق نے فیض آباد اور لکھنو میں تربیت پائی۔ فیض آباد میں یہ ایک غزل گو کی حیثیت سے مشہور تھے۔ خلیق نے اپنی شاعری کی ابتداء سولہ سال میں کی تھی۔ یہ پہلے اپنا کلام اپنے والد میر حسن کو دیکھایا کرتے تھے پھر بعد میں اس نے مصحفیؔ کو اپنا استاد بنالیا۔ خلیق فیض آباد کے تھے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ وہیں گزرا تھا، لیکن یہ ملازمت کی وجہ سے لکھنؤ آتے جاتے تھے۔ خلیق اپنے آخری ایّام میں لکھنو میں ہی آباد ہو گئے۔

خلیق نے مرثیہ کے علاوہ غزل اور سلام میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ان کی شناخت ایک مرثیہ گو کی ہی حیثیت

سے ہوتی ہے۔ایک عرصے تک میر خلیق کے مرثیوں کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔عبدالسلام اور شبلی نے بھی اپنی کتابوں میں اس کے مستند معیاری مجموعہ موجود نہیں ہونے کی بات کی ہے۔سید مسعود حسن رضوی نے اپنے کتاب میں لکھا ہے۔

''میر خلیق کے مرثیہ کا کوئی مستند معیاری مجموعہ موجود نہیں ہے اور ان کی کوئی جلد اب تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ایک مدّت تک ان کا کلام نایاب سمجھا جاتا رہا ہے۔شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں، عبدالسلام نے شعر الہند میں اور حامد حسن قادری نے تاریخ مرثیہ گوئی میں خلیق کے مرثیے دستیاب نہ ہونے پر افسوس ظاہر کیا ہے لیکن راقم حروف کی سالہا سال کی جستجو میں خلیق کے مرثیے کثیر تعداد میں فراہم ہو گئے ہیں۔بہت سے مرثیوں کے کئی کئی نسخے ہیں اور یہ ان کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔مکّرر نسخوں کو خارج کر دینے کے بعد خلیق کے مرثیوں کی تعداد ایک سو اسّی (۱۸۰) ہے۔''[۱۲]

اکبر حیدری کاشمیری نے خلیقؔ کے مرثیوں کی تعداد تقریباً تین سو بتائی ہے۔جس میں سارے مرثیے مسدس کی شکل میں ہیں۔ان میں سے بہت سے مرثیے ایسے بھی ہیں جن میں بندوں کی تعداد ۷۰ سے ۸۷ کی ہے۔ان کے ۵۲ مرثیے ایسے ملتے ہیں جن میں تاریخ کتابت درج ہے۔خلیقؔ کے مرثیوں میں کوئی مرثیہ ایسا نہیں ملتا جس میں مرثیے کے تمام اجزاءِ ترکیبی موجود نہ ہوں۔البتہ الگ الگ مرثیوں میں ان میں سے بعض عناصر نظر آتے ہیں۔چہرا عموماً ان کے مرثیوں میں نہیں ہوتا، جبکہ رخصت کے مناظر یہاں تفصیل سے نظر آتے ہیں۔جنگ کا بیان دو تین مصرعوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔لیکن ماجرائے شہادت پر یہ اپنا پورا زورِ قلم صرف کرتے ہیں۔

خلیقؔ نے اپنے مرثیوں کا موضوع واقعات کربلا کے متعلق کرداروں کو بنایا ہے۔جس میں حضرت عبّاس کا دریا پر جانا، علی اصغرؑ کا پانی کے لئے بیتاب ہونا، اہل حرم کا قید ہونا اور رہائی شامل ہے۔خلیقؔ نے ایک مرثیہ میں حضرت مسلم کے دونوں معصوم بچوں کی گرفتاری اور قتل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔مرثیہ کا کچھ بند مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

قتل جب مسلم مظلوم ہوا کوفہ میں — خوں مدینہ کے مسافر کا بہا کوفہ میں
اس کے بیٹوں کا نشاں جب نہ ملا کوفہ میں — حکم یہ حاکم کوفہ نے دیا کوفہ میں
ڈھونڈھو جس جا ہوں چھپے نور نظر مسلم کے
شہر سے بھاگنے پاویں نہ پسر مسلم کے

سن کے یہ رہ گئے خاموش وہ دونوں گلرو — ہونٹ تھے کانپتے آنکھوں سے رواں تھے آنسو
چاند سے مکھڑوں کے اوپر تھے لٹکتے گیسو — ضبط سے رونے کے گھٹتے تھے صراحی سے گلو
حکم حاکم سے کبھو خوف زدہ ہوتے تھے
کبھو آپس میں گلے ملتے تھے اور روتے تھے

عمر بھر گھر سے نہ باہر کبھو یوں تھے نکلے　　راہ معلوم نہ رہبر تھا کوئی ساتھ ان کے
سونی جنگل میں پیادہ روی اور سن چھوٹے　　آبلے پاؤں میں پڑ پڑ گئے چلتے چلتے
پتے پیروں کی ہوا سے جو کھڑکنے لگتے
خوف سے سینوں میں دل ان کے دھڑکنے لگتے

چھوٹے بھائی نے بڑے سے کہا با دیدۂ نم　　دوڑتے دوڑتے سینے میں سماتا نہیں دم
مجھ سے اب بھائی چلا جاتا نہیں ایک قدم　　دونوں تلوؤں سے لہو جاری ہے دیکھو پیہم
دوپہر ہو گئی ہے کانٹوں کے اوپر چلتے
بابا ہوتے تو مجھے گود میں لے کر چلتے

تب بڑے بھائی نے سر پر سے عمامہ کو اتار　　دھجیاں پھاڑ کے تلووں سے لپٹیں یکبار
سر لگا بھائی کا چھاتی سے بچشم خونبار　　کبھی گودی میں لیا گہ کیا کاندھے پہ سوار
راہ ان غمزاروں سے قافلہ کی چھوٹ گئی
صبح جو ہوگئی دونوں کی کمر ٹوٹ گئی

آخر ایک چشمہ پہ ایک نخل انہیں آیا نظر　　درمیاں بیٹھے اسی نخل کے دونوں چھپ کر
آفتابہ لئے ایک لونڈی جوں ہی آئی ادھر　　چاہتی تھی چلے اس چشمہ سے پانی وہ بھر
جنبش باد سے آپ اس گھڑی لہرانے لگا
عکس خورشید و قمر اس میں نظر آنے لگا

خلیقؔ کا یہ مرثیہ بڑا رقت آمیز اور دلخراش ہے۔اس کے ایک ایک شعر سے دردوغم کا اندازہ ہوتا ہے۔مرثیہ میں ڈرامائی انداز نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔خلیق کی زبان میں صفائی اور روانی پائی جاتی ہے۔خلیقؔ کی مرثیہ نگاری کا بیان کرتے ہوئے مسیح الزماں لکھتے ہیں کہ۔

''خلیقؔ نے یہ نہیں کیا کہ واقعات کے مختلف پہلوؤں کا سرسری بیان کرتے چلے جائیں ،جو دور اول اور اس سے پہلے کی مرثیوں کی خصوصیت ہے بلکہ انھوں نے بیانات میں تفصیل مدنظر رکھی ہے اور باقی کو سرسری طور پر بیان کر دیا ہے۔اس طرح ان مرثیوں میں سطحیت نہیں بلکہ نفسیات انسانی کی قابل ذکر تصویریں بھی ہیں اور معاشرت کا نقشہ بھی۔''[۱۳]

۱۵۔مرزا جعفر علی فصیح :

نام مرزا جعفر علی اور فصیح تخلص تھا۔اور پیدائش ۱۸۲۷ءکو فیض آباد میں ہوئی۔ان کے والد کا نام مرزا ہادی تھا۔فصیح نے دینی علوم اور حدیث کی کتابیں میر دلدار علی سے پڑھی تھی۔اور اپنا استاد ناسخ کو بنایا۔فصیح کو علم عروض اور قافیہ پر عبور حاصل تھا۔فیض آباد سے فصیح لکھنؤ چلے آئے۔اس وقت لکھنو کی فضا شاعری میں رچی ہوئی تھی۔فصیح نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل سے کی اور پھر مرثیہ گوئی کی طرف قدم بڑھایا۔انھوں نے جب مرثیہ گوئی کے میدان میں قدم رکھا تو اس صنف میں اپنا بڑا نام پیدا کیا۔فصیح سے قبل مرثیہ کو مذہبی حیثیت تو حاصل ہی تھی لیکن فصیح نے اس کو علمی حیثیت بھی عطا کی۔

مرزا فصیح نے اپنے مرثیوں میں سبھی اجزاء ترکیبی کا استعمال کیا ہے۔چہرہ، سراپا، رخصت، جنگ، شہادت اور بین کے مضامین ان کے مرثیوں میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ان کے مرثیے چھوٹی اور طویل دونوں بحروں میں ملتے ہیں۔فصیح نے مختصر مرثیے لکھے ہیں، اور مرثیے کو علمی حیثیت دینے کے لئے فصیح نے احادیث اور واقعات کو پیش کیا ہے، ساتھ ہی روایتوں کی صحت کا بھی خیال رکھا ہے۔فصیح کی مرثیہ گوئی کی تعریف کرتے ہوئے مسیح الزماں تحریر کرتے ہیں۔

> ’’فصیح نے مرثیہ کو علیٰ اخلاقی تعلیمات، جذباتِ انسانی کی مصوری، محاکات نگاری اور ندرت بیان سے ممتاز کیا اور اپنی صلاحیتوں سے وہ رفعت و وسعت بخشی کہ مرثیہ کی تاریخ میں انھیں اس تعمیر کے ایک اہم ستون کی حیثیت حاصل ہوگئی۔‘‘ ۱۴؎

فصیح کا ایک مرثیہ ملاحظہ ہو جس میں حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد اس وقت کے واقعہ کا بیان کیا گیا ہے کہ جب حسنین اپنے والد کو دفن کر واپس آتے ہیں اور اس کو راستے میں وہ فقیر بکا کرتا ہوا نظر آتا ہے جس کو حضرت علیؑ روٹیاں کھلایا کرتے تھے۔اس فقیر کو حضرت کے شہید ہونے کی خبر نہ تھی، وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ میرا مونس نہ جانے کہاں ہے۔جو مجھے روٹیاں دیا کرتے تھے اور جب حسنین اس کو شہادت علیؑ کی خبر دیتے ہیں تو وہ گریہ وزاری کرنے لگتا ہے۔یہ مرثیہ درد و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔

عالم میں عجب دھوم ہے فریاد و فغاں کی — انیسویں تاریخ ہے ماہِ رمضاں کی
یارو شب ضربت ہے شہ کون و مکاں کی — اے مومنو طاقت نہیں اس غم کے بیاں کی

ظالم کا چلا وار ید اللہ کے سر پر
مسجد میں لگی تیغ اسداللہ کے سر پر

اس شب کو تو عالم میں ہوا شور قیامت — اس شب کو چھپا خاک میں خورشید امامت
اس رات کو ماٹی میں ملا وہ قد و قامت — اس رات کو ظاہر ہوئی کیا کیا نہ کرامت

تابوت گئے لے کے جو شہزادے نجف کو

سونپا صدف قبر میں اس دُرِّ نجف کو

روتے ہوئے پھر گھر کو پھرے دونوں جگر ریش — اس راہ میں یہ واقعہ آیا انہیں درپیش
ویرانہ میں اک دیکھا جگر سوختہ درویش — تنہا ہے پڑا پاس نہ بیگانہ ہے نہ خویش

رو رو کے وہ کرتا تھا مناجات خدا سے
شہزادوں کا دل دکھنے لگا اس کی صدا سے

نزدیک گئے اس کے جو حیدر کے عزادار — دیکھا کہ پڑا روتا ہے تنہا وہ دل افگار
کہتا ہے کئی روز سے بھوکا ہوں میں بیمار — کیوں روٹھ گیا مجھ سے اپاہج سے مرا یار

یا رب وہ مرا مونس و غم خوار کہاں ہے
یا رب وہ مرا یار وفادار کہاں ہے

فصیحؔ کے مرثیے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مرثیے علیٰ درجہ کے ہیں، اور ان کا انداز بیان شگفتہ اور پرزور ہے۔ مرثیوں میں روزمرہ کے محاورات کا استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے ان کے مرثیوں میں کچھ ایسے الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے، جس کو ناسخؔ نے متروک قرار دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں تشبیہیں اور استعارے بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ فنی خوبیوں کے لحاظ سے یہ مرثیہ فصیحؔ کا ایک ادبی شاہکار ہے۔ چہرہ، رخصت، آمد، جنگ، شہادت اور بین کے مضامین اس کے مرثیے میں بے کم و کاست نظم کئے گئے ہیں۔

۱۶۔ میر مظفر حسین ضمیرؔ:

میر مظفر حسین اردو دنیا میں میر ضمیرؔ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر قادر حسین خاں تھا۔ ان کی پیدائش ۱۷۸۳ء میں ہوئی۔ میر حسنؔ اور نساخؔ ان کو لکھنؤ کا باشندہ بتاتے ہیں۔ ان کی وفات واجد علی شاہ کے عہد میں ۶ نومبر ۱۸۵۵ء کو ہوئی۔ میر ضمیر نے دس سال کی عمر سے ہی شاعری کی طرف قدم رکھا۔ ابتداءً انھوں نے غزل گوئی سے کی پھر رفتہ رفتہ قصیدہ میں طبع آزمائی کی اور پھر مرثیہ کہنے لگے۔ میر ضمیر کی مرثیہ گوئی کے بارے میں تذکروں میں ملتا ہے کہ ایک بار ان کے پڑوسی غلام علی کے یہاں شب عاشور ذاکر نہ ملنے کی وجہ سے انھوں میر ضمیر سے التجا کی کہ وہ مجلس میں مرثیہ پڑھیں۔ میر ضمیر نے اس مجلس میں گداؔ کا ایک مرثیہ پڑھا، جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ لوگوں کی عزت افزائی نے میر ضمیر کو مرثیہ کہنے پر مجبور کردیا۔

میر ضمیر نے اپنی شاعری میں مصحفیؔ سے اصلاح لی تھی۔ انھوں نے تقریباً چار سو (۴۰۰) مرثیے کہے ہیں۔ ان کے بیشتر مرثیے مسدس کی شکل میں ملتے ہیں۔ لیکن کچھ مرثیے مخمس۔ اور تضمین کی ہیئت میں پائے گئے ہیں۔ ایک مرثیہ مثنوی کی شکل میں بھی ملتا ہے، جس میں بندوں کی تعداد ۴۰۔۵۰ سے زائد ہے۔ ان کے مختلف اجزاء میں کیفیت کے لحاظ سے

تنوع بھی ملتا ہے۔شبلی نعمانی میر ضمیر کی مرثیہ گوئی کے متعلق لکھتے ہیں۔

''سب سے پہلے جس شخص نے مرثیے کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر، مرزا دبیر کے استاد ہیں.... انھوں نے مرثیے میں جو جدتیں پیدا کیں وہ حسب ذیل ہیں:
۱۔ رزمیہ لکھا، ۲۔ سراپا ایجاد کیا، ۳۔ گھوڑے، تلوار اور اسلحہ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے اور یہی مضامین آج موجودہ مرثیوں کے مہمات موضوع ہیں، ۴۔ واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی، چنانچہ ایک ایک جزئی واقعے کو تفصیل کے ساتھ لکھا، ۵۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور اور بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی۔ غلط الفاظ جو مرثیوں کے لئے گویا جائز مان لیے گئے تھے، اکثر ترک کر دیے گئے۔ ان کے عمدہ کلام کا اگر انتخاب کیا جائے تو میر انیس کا کلام معلوم ہوگا۔''۱۵

میر ضمیر وہ پہلے مرثیہ گو شاعر ہیں جنھوں نے مرثیے کی جدید طرز ٹھہرائی۔ ان کی شہرت کا عام طور سے باعث وہ مرثیہ ہے، جس کو انھوں نے حضرت علی اکبرؑ کے حال میں لکھا تھا۔ اس مرثیہ میں ایک سو ایک بند شامل ہیں۔ اس سے پہلے جو مرثیے لکھے جاتے تھے وہ ۳۰ سے ۴۵ اور حد ۵۰ بندوں تک کا ہوتا تھا۔ لیکن میر ضمیر نے جو مرثیہ علی اکبرؑ کی شہادت کا لکھا ہے، اس میں انھوں نے پہلے تمہید سے مرثیہ کا چہرہ باندھا، پھر انھوں نے سراپا لکھا، پھر میدان جنگ کا منظر دکھایا اور بیان شہادت پر مرثیہ کا خاتمہ کیا۔ چونکہ یہ مرثیہ پہلا ایجادی مرثیہ تھا اسلئے تعریف کی آوازیں دور دور تک پہنچی، اور تمام شہر میں اس کا شہرہ ہو گیا، اطراف سے طلب میں فرمائشیں آئیں۔ یہ ایجاد مرثیہ گوئی کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ملاحظہ ہو۔

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے ... جس نور سے پرنور یہ نورنظری ہے
آمد ہی میں حیران قیاس بشری ہے ... یہ کون سی تصویر تجلی سے بھری ہے
گو حسن کا رتبہ نہیں مذکور ہوا ہے
منبر مرا ہم مرتبہ طور ہوا ہے

صد شکر کہ مجلس مری مشتاق سخن ہے ... یہ فیض عنایات حسینؑ اور حسن ہے
پھر جوشِ جوانی پہ مری طبع کہن ہے ... یہ قوتِ امداد شہ تشنہ دہن ہے
نقاش میں یہ صنعت تحریر نہیں ہے
تصویر دکھاتا ہوں، یہ تقریر نہیں ہے

سراپائے علی اکبر ملاحظہ ہو:

قرآن کی تشبیہ یہ کس دل نے بنائی پیشانی انور ہے کہ ہے لوح طلائی
ابرو سے ہے بسم اللہ قرآن نظر آئی جدول کشش زلف کی تاروں نے دکھائی

وہ زلف وہ بینی الف لام رقم ہے
پر میم دہن مل کے یہ اک شکل الم ہے

اردو مرثیہ کا یہ عہد ترقی کا عہد تھا۔ بہت سارے شعراء اس وقت اس کے نوک پلک درست کرنے میں لگے ہوئے تھے، تب ضمیر نے چاہا کہ وہ مرثیہ کو علمی وفنی حیثیت سے بھی بلند مقام تک پہنچایا جائے۔ تاکہ دوسرے اصناف کے مقابلے میں مرثیہ کمتر نہ لگے۔ چنانچہ ضمیر نے مرثیہ کے لئے ایک نئی راہ چنی، جس میں انھوں نے جذبوں کی ترجمانی کے بجائے علمیت کا اظہار، مناظر واقعات کی تصویر کھینچنے کے بجائے استعارہ اور سوچی ہوئی تشبیہوں سے بات کو نئے طریقے سے کہنا ہی شاعری کا کمال سمجھا گیا۔

۱۷۔ چھنّو لال دلگیر :

دلگیر کا نام چھنو لال تھا۔ اور والد کا نام منشی رسوارام تھا ان کی قوم سکسینہ کائستھ سے تعلق رکھتے تھی۔ ان کے بزرگوں کا وطن شمس آباد تھا۔ یہاں سے ان کے والد دہلی گئے اور پھر لکھنؤ آکر بس گئے۔ یہیں دلگیر کی پیدائش ۱۷۸۳ء میں ہوئی۔ لکھنؤ میں ہی ان کی تعلیم وتربیت بھی ہوئی۔

دلگیر میر خلیقؔ اور میر ضمیرؔ کے ہمعصر تھے۔ اس وقت اودھ کی عزاداری اور مرثیہ نگاری اتنی زیادہ وسعت اور مقبولیت حاصل کر چکی تھی کہ غیر مسلم شعراء بھی غم سید والا میں غمگین نظر آنے لگے تھے۔ چھنو لال بھی مکروہات دنیوی سے بے زار ہو کر مرثیہ نگاری کی طرف متوجہ ہو گئے، اور اپنا تخلص طربؔ ترک کر کے دلگیرؔ لکھنے لگے۔ دلگیر غم آل رسولؐ میں اتنا سرشار ہوئے کہ کچھ اس انداز سے شعر کہنے لگے۔

دلگیر اب دعا ہے غم شاہ کم نہ ہو
غیر از غم حسین مجھے اور غم نہ ہو

....

ہے تجھے دل سے جو دعوائے غلامی دلگیر
حامئی حشر ترا خواجہ قنبر ہوگا

دلگیر کی شاگردوں کی طویل تعداد تھی جوان سی باقاعدہ مشورۂ سخن کرتے رہتے تھے۔ دلگیر تاریخ اسلام اور تاریخ

کربلا کے جزئیات کے علاوہ احادیث، سنت اور قرآن سے بھی بخوبی واقف تھے۔اس لئے دلگیر جہاں اپنے مرثیوں میں شہدائے کربلا کی شان میں الگ الگ مراثی کہے ہیں وہیں کتاب وسنت کے بھی بڑے بلیغ اشارے ملتے ہیں۔دلگیر نے اپنی شاعری کا آغاز سترہ سال کی عمر میں کیا تھا۔دلگیر کے مرثیوں کے موضوعات میں بڑی وسعت ہے۔انھوں نے اپنے مرثیوں میں شہدائے کربلا کے ساتھ ساتھ جناب مسلم، امام حسن، پسران مسلم، حضرت علیؑ، حضرت رسولؐ خدا، جناب سکینہ، جناب عابد بیمار کو موضوع بنایا ہے۔

دلگیر کا شمار اپنے زمانے کے مشہور مرثیہ گو میں ہوتا ہے۔رجب علی بیگ سرور نے خصوصیت کے ساتھ دلگیر کی مرثیہ گوئی کو سراہا ہے۔دلگیر نے قلیل عرصہ میں سلام اور مرثیہ کا ضخیم دیوان تیار کیا۔ڈاکٹر مسیح الزماں نے اپنی کتاب میں ان کی سات جلدوں کا ذکر کیا ہے۔یہ جلدیں نول کشور پریس لکھنو سے شائع ہوئی تھیں۔دلگیر کے کلام میں مرثیے کے اجزاء ترکیبی بدرجہ اتم موجود ہیں۔مرثیے میں بین کا کچھ بند ملاحظہ ہو۔

بین کر رہی تھی بنت علیؑ رو رو کر　　نہ ہوا بیاہ زمانے میں ترا اے پسر
بیاہ کے ذکر سے شرماتے نہیں اے اکبر　　نیچی آنکھیں نہیں کر لیتے ہوا ے رشک قمر
زندگانی کے سبب شرم و حیا ہے اکبرؑ
شرم جس شے سے ہے تم میں نہیں وہ شے اکبرؑ

کبھی یہ طور نہ تھا اے مرے فرزند فہیم　　زینبؑ آئی ہو ترے پاس نہ کی ہو تعظیم
گرد لاشے کے پڑی پھرتی ہیں با حال سقیم　　آج کیوں بھول گئے اپنا وہ معمولِ قدیم
اٹھو اور عمئہ نا شاد کی تعظیم کرو
جنگ کے وصف بیاں کرتی ہوں تسلیم کرو

جانے کے وقت یہی ذکر تھا ہر دم لب پر　　سر پہ آئی اجل اور آئی نہ صغراؑ کی خبر
جبکہ تم کر گئے اس منزل فانی سے سفر　　قاصد خواہر مہجور تب آیا اکبر
یہ تو معلوم ہو اہے وہ ابھی جیتی ہے
میں خبر کرتی ہوں خواہر وہ تری جیتی ہے

دلگیر نے اپنے مرثیوں میں رخصت اور بین پر خاص توجہ دی ہے۔اور یہی وہ مقامات ہوتے ہیں جن میں جذبات نگاری سے درد اور اثر پیدا کیا جاتا ہے۔دلگیر نے ان مقامات پر نفسیاتی نقطوں کو پیش نظر رکھا ہے۔مگر اس کی مثال ان کے مرثیوں میں بہت کم ملتی ہے۔البتہ مسلمان گھرانوں کی سماجی زندگی، عورتوں اور بچوں کی باتیں اور رسم ورواج کو کامیابی کے ساتھ اپنے مرثیوں میں پیش کئے ہیں۔دلگیر کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں۔

''دو باتیں دلگیر کی مجھ کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔اول وہ خاندانی ہندو تھے،لیکن
رخصت اور بین وشہادت کے بیان میں اس افراط سے مسلمانوں کے مراسم اور خاص
محاورے اور مستورات اہل اسلام اوران کے بچوں کی باتیں برت دیتے ہیں کہ تعجب
ہوتا ہے۔''۱۶؎

۱۸۔میر ببر علی انیسؔ :

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ اردو مرثیے کی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔اردو مرثیے کی کوئی بھی تاریخ ذکر انیس و دبیر کے بغیر نامکمل ہے۔انیس کا پورا نام میر ببر علی اور تخلص انیسؔ تھا۔ان کی تاریخ پیدائش مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر فضل امام رضوی نے ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء بتایا ہے۔ان کے اجداد کا وطن گرچہ دہلی تھا،لیکن میر انیسؔ کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی تھی۔ان کے والد میر خلیقؔ اور دادا میر حسنؔ تھے۔ان سبھی کا شمار اردو کے نامور شعراء میں ہوتا ہے۔ابتداء میں میر انیس نے تعلیم اپنے والد میر خلیقؔ سے حاصل کی،اور بعد میں مولوی نجف علی فیض آبادی اور مولوی حیدر علی لکھنوی کے علوم و فیوض سے مستفید ہوئے۔انیس نے ان دونوں عالموں سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

انیس نے شاعری کی دنیا میں عہد طفلی میں ہی قدم رکھا تھا،اوراس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے عہد طفلی میں ایک بکری پال رکھی تھی،اوراس کے ساتھ وہ کھیلا کرتے تھے۔جسکے مرنے پر ان کو بہت رنج و ملال ہوا۔اور یہ شعر بیساختہ ان کی زبان پر آ گیا۔

''افسوس کہ دنیا سے سفر کر گئی بکری
آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مر گئی بکری''

انیس نے فیض آباد سے لکھنو کا سفر کئی بار کیا،شروع میں وہ اپنے والد کے ساتھ جاتے تھے،پھر بعد میں وہ مستقل آباد ہو گئے۔انیس نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی پھر والد کے کہنے سے انھوں نے غزل گوئی کو ترک کر کے مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔اس واقعہ کا بیان محمد حسین آزاد کچھ یوں لکھتے ہیں۔

'' ایک موقع پر کہیں مشاعرے میں گئے اور غزل پڑھی۔وہاں بڑی تعریف ہوئی۔
شفیق باپ خبر سن کر دل میں باغ باغ ہوا مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کو کہاں
گئے تھے؟انھوں نے حال بیان کیا۔غزل سنی اور فرمایا کہ!اب اس غزل کو سلام کرو اور
اس شغل میں زور طبع کو صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔سعادت مند بیٹے نے
اسی دن ادھر سے قطع نظر کی۔غزل مذکورہ کی طرح میں سلام لکھا۔دنیا کو چھوڑ کر دین
کے دائرہ میں آ گئے اور تمام عمر اسی میں صرف کر دی۔''۱۷؎

انیسؔ کے مزاج میں نازکی اور نفاست بہت تھی۔اس کے متعلق کئی باتیں کہی جاتی ہے۔ان کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ منشی نوبت رائے نظؔر نے فروری ۱۹۰۸ کے رسالے ''زمانہ'' میں لکھا ہے کہ ایک ہندو شاعر کے سلام میں ایک شعر لا جواب نکل آیا۔میر انیس کو یہ شعر سنایا گیا تو وہ بولے کہ میں اس شعر کے بدلے میں اپنا سب دفتر دینے کو تیار ہوں۔وہ شعر یہ ہے۔

''کہتی تھی بانو الہیٰ کیجیو وارث کی خبر
آج کیوں سر سے ڈھلی جاتی ہے چادر بار بار''

میر انیسؔ کے عہد تک پہنچتے پہنچے اردو مرثیہ کا ڈھانچہ مکمل ہو چکا تھا اور اس کے جزائے ترکیبی بھی متعین ہو چکے تھے۔مرثیہ کے خاکے کی اس تکمیل میں میر ضمیر کا بڑا ہاتھ تھا۔اب تک کے مرثیے کے اجزا میں واقعات، روایات، رخصت، جنگ اور بین شامل تھے۔چہرہ کا استعمال مرثیہ نگاری میں کم ہی ملتا تھا۔اب جب مرثیہ کا نیا ڈھانچہ وجود میں آیا تو چہرہ سب سے پہلے لکھا جانے لگا، پھر سراپا،اس کے بعد گھوڑے اور تلوار کی تعریفیں، جنگ کے بیانات اور آخر میں بین کو جگہ دی گئی۔

مرثیہ میں میر انیس نے چہرہ سے پہلے تمہید کو جگہ دی۔پھر رخصت اور آمد کو مستزاد کیا۔جنگ کے ضمن میں رجز، تعارف اور مبارز طلبی کو ضروری کیا۔اور آخر میں شہادت اور بین کو الگ الگ رکھنے کی صورتیں پیدا کیں۔انیس نے ان موضوعات کے علاوہ جہاں کوئی اور رنگ معلوم ہوا اس کو اس نے وہیں ڈالا۔مثلاً صبح کا منظر، گرمی کی شدت، کسی منظر یا ماحول کی تصویر، کردار نگاری یا مکالمے وغیرہ سبھی موضوع کو بڑی فنکاری سے انیس اپنے مرثیے میں سمو دیتے ہیں۔انیس کے مرثیہ میں چہرے کا بند دیکھئے۔

صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور   زمزمے کرنے لگے یاد الہیٰ میں طیور
مثل خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور   یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رخ مولا سے ظہور حق تھا
صبح کا ذکر ہے کیا چاند کا چہرہ فق تھا

میر انیس کے مرثیوں میں اس عہد کی سماجی وتہذیبی تصویر، جاگیردارانہ عہد کے آداب نشست، خودداری و بزرگی کا پاس، نفاست وشائستگی، عورت مرد، آقا وغلام، عزیز اور دوست کے انداز تکلم بڑے خوبصورت انداز میں ملتے ہیں۔ان کے پاس درباروں میں بادشاہ اور امراء کے سامنے آ کے کھڑے ہونے، بیٹھنے، بات کرنے کے کچھ آداب تھے۔واقعہ کربلا کا اصل تہذیبی منظر کچھ بھی رہا ہو، لیکن میر انیس نے اس سارے واقعہ کو اپنے تہذیبی منظرنامے سے پیش کیا ہے۔اس کی مثال ''جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا'' سے ملاحظہ ہو۔اس مرثیہ میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا کہ جب امام حسینؑ طویل سفر

کے بعد شدید گرمی میں کربلا پہنچتے ہیں اور حضرت عباسؑ ان سے خیمہ لگانے کی اجازت مانگتے ہیں۔

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسؑ نامور — خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہ بحروبر
ایذا ہے محملوں میں بہت اہل بیت پر — بچے ہیں تازگی میں گلوں سے زیادہ تر
کب سے عماریوں کے ہیں پردے چھٹے ہوئے
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے گھٹے ہوئے

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا — زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا
پیچھے ہٹے، یہ سنتے ہی عباس با وفا — جاکر قریبِ محملِ زینب یہ دی صدا
حاضر ہے جاں نثار امام غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

جب حضرت زینبؑ انھیں جگہ طے کرنے کا اختیار دے دیتی ہیں تو وہ کہتے ہیں۔

یہ سن کے خادموں کو پکارہ وہ مہ جبیں — فراش آ کے جلد مصفٰا کریں زمیں
حاضر ہوں آب پاش محل دیر کا نہیں — یاں ہوگا خیمۂ حرم بادشاہ دیں
جلد ان کو بھیجو لوگ جو ہیں کاروبار کے
لے آؤ اشتروں سے قناتیں اتار کے

اسی درمیان جب شام کا لشکر وہاں پہنچتا ہے تو حضرت عباسؑ کہتے ہیں۔

بولے ملازموں سے یہ عباسؑ باوفا — دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا
آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کون سا — کہہ دو کہ اہل بیت کے خیمے کی ہے یہ جا
لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
اتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

کرسی نشیں ہے لخت دل سید البشر — آئین خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
آتی ہے اڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر — کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں وہ خیرہ سر
پھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑے پہ ظالم سوار ہیں

مرثیہ کے اس بند میں میر انیس نے اجازت اور تکمیل حکم کی جو صورت پیش کی ہے اور جن آداب خسروی کا ذکر کیا ہے وہ اس وقت کے جاگیردارانہ معاشرے کا ایک حصہ اور اس وقت کی زندگی کا ایک اہم ترین جز ہے۔ اس کے علاوہ انیس

نے اپنے مراثی میں ہر طبقے کے افراد کی نفسیات و کیفیات اور جذبات انسانی کے پیش نظر زبان کا استعمال کیا ہے۔الفاظ کی ترتیب میں انھوں نے عقلی اور علمی بصیرت کے امتزاج سے کام لیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انیس کی زبان میں شائستگی، شگفتگی اور دلکشی کا بھرپور ثبوت ملتا ہے۔یہ شعر ملاحظہ ہو۔

'' کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا ''

۱۹۔مرزا سلامت علی دبیر :

دبیرؔ کی پیدائش دہلی میں ۱۸۰۳ءمیں ہوئی تھی۔ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ان کے والد دہلی کو خیر باد کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔دبیر کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہی ہوئی۔عربی و فارسی کی تعلیم فضیلت کی حد تک حاصل کی۔دبیر کو بچپن سے ہی مرثیہ گوئی کا شوق تھا۔انھوں نے سن شعور کے ساتھ ہی شاعری شروع کر دی تھی،اور آغاز ہی میں مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔دبیر نے میر ضمیرؔ کی شاگردگی قبول کی اور اپنے استاد سے زیادہ کمال حاصل کیا۔دبیر پیدا تو دہلی میں ہوئے،لیکن پرورش لکھنؤ میں ہوئی یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی زبان،روزمرہ کی بولی اور انداز بیان ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔اس وقت کے لکھنؤ کا مزاج ان کے مرثیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔دبیر نے جہاں ایک طرف اپنے مرثیوں کو لفظی اور معنوی رعایتوں سے آراستہ کیا وہیں دوسری طرف موضوع کے اعتبار سے ان کے مراثی واقعات و روایات کا خزانہ ہے۔دبیر کے مرثیوں کی خصوصیت انہیں موضوعات کی رنگارنگی ہے۔دبیر نے جہاں تاریخی روایت اخذ کیے ہیں وہیں اپنے مرثیوں میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مناقب بھی پیش کئے ہیں۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

چاہے زرہ نبا کے جو داؤد کا وقار واللہ جعل ساز ہے کیا اس کا اعتبار
ہر بخیہ گر نہ ہو کبھی ادریس نامدار ہر ناخدا کو نوح کہے گا نہ ہوشیار
کیا جاہلوں کے عیش کا سامان ہوگیا
بیٹھا جو تخت پر وہ سلیمان ہو گیا

یوسف غریقِ چاہ سیہ ناگہاں ہوا یعنی غروب ماہ تجلّی نشاں ہوا
یونس دہان ماہی شب سے عیاں ہوا یعنی طلوع نیّرِ مشر قستاں ہوا
فرعون شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور ید بیضا تھا آفتاب

لکھنؤ میں جب دبیر کی شہرت اور مقبولیت بڑھی تو انیسؔ بھی فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے۔دونوں نے مل کر جہاں صنف مرثیہ گوئی کو آگے بڑھایا وہیں ان دونوں میں ادبی معرکے بھی شروع ہو گئے۔دونوں میں لطیف انداز میں نوک جھونک ہونا شروع ہوگئی۔اس کے متعلق ڈاکٹر اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ۔

''مرزا دبیر اردو کے عظیم،مستند اور مسلّم الثبوت شاعر ہیں۔مرثیہ گوئی میں میر انیس ان

کے مدّ مقابل تھے۔ان کے زمانے میں پورالکھنؤ دوحصوں میں بٹا ہوا تھا۔دبیر کے
طرفدار دبیریے اور انیس کے حامی انیسیے کہلاتے تھے۔مگر دونوں اساتذہ آپس میں
ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔‘‘[۱۸]

مرزا دبیر نے انیس کے مانند اپنی پوری زندگی مرثیہ گوئی میں صرف کردی۔اور اپنے مرثیوں میں نئی نئی تشبیہات اور مضامین کو جگہ دی۔اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں کی عہد میں ہی مرثیہ گوئی بام کمال تک پہنچ گئی۔اور یہ دونوں اپنے وقت کے استاد کہلائے۔حالانکہ دبیر نے مرثیہ کے علاوہ دوسرے صنف مثلاً سلام ،نوحے اور رباعیات وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔لیکن اپنی محنت اور ریاضت سے مرثیے کو ایک بلند مقام پر پہنچادیا۔مرثیہ نگاری میں ایک علیٰ مقام پانے کے باوجود بھی دبیر کا کوئی بھی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا۔البتہ ان کے انتقال کے کچھ ہی مہینوں بعد ’’مراثی دبیر‘‘ کے نام سے دوجلدیں مطبع اودھ اخبار لکھنؤ نے شائع کیا۔ان مجموعہ کی پہلی جلد ۱۸۷۵ء اور دوسری جلد ۱۸۷۶ء میں چھپی۔اس کے علاوہ دبیر کے کئی مجموعہ شائع ہوئے جس کا ذکر تذکرہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔

دبیر کے مرثیے کا سب سے بڑا موضوع واقعۂ کربلا ہے۔اس کے علاوہ حضرت علی اکبرؓ ،حضرت عباسؑ ،حضرت امام حسینؑ ،شام غریبا کا منظر،اسیروں کا قید ہونا،زندان شام وغیرہ ایسے موضوع ہیں جس کا ذکر ان کے مرثیوں میں بے شمار ملتے ہیں۔اس کے علاوہ منسلک چیزوں کو اپنے مرثیے کا موضوع بنایا ہے۔دبیر کا ایک مرثیہ حضرت علی اکبرؓ کا ملاحظہ ہو جس میں ایک باپ اپنے جوان بیٹے کی موت پر بین کرتا ہوا اس کی لاش پہ جاتا ہے۔

جب موسم جوانی میں اکبر گزر گیا　　یعقوبؑ کربلا کا قرار جگر گیا
نکلے جو ڈھونڈنے کو تو نور نظر گیا　　چلّاتے تھے ارے میرا یوسف کدھر گیا
کاٹا نہالِ تازہ ہمارا غضب کیا
زینبؑ کے پالے پوسے کو مارا غضب کیا

بیٹا لہو میں لال ہے منھ ان کا زرد ہے　　زلفوں میں بال بال بیاباں کی گرد ہے
واں لب پہ العطش ہے یہاں آہ سرد ہے　　واں نیزہ ہے جگر میں یہاں دل میں درد ہے
رونے پہ شہ کے صاحب اولاد روتے ہیں
وہ حال ہے کہ دیکھ کے جلاد روتے ہیں

یعقوبؑ یوں پھرے تھے نہ یوسف کی چاہ میں　　تاریک آسمان و زمیں تھی نگاہ میں
بوندیں لہو کی سونگھتے ہیں قتل گاہ میں　　ہاتھوں سے لاش ڈھونڈتے ہیں گر کے راہ میں
جو پوچھتا ہے گم ہوئی کیا شے حضور کی
فرماتے ہیں تلاش ہے آنکھوں کے نور کی

دولت ملی ہے خاک میں اٹھارہ سال کی   سو خاک چھانتا ہوں میں دشت قتال کی
چھائی ہے میرے چاند پہ بدلی زوال کی   للہ دے خبر کوئی بانو کے لال کی
ڈھونڈے کہاں حسینؑ کدھر جائے کیا کرے
معذور آنکھوں سے نہ کسی کو خدا کرے

کہتے تھے دست و پا نہیں قابو میں جی نہیں   قوت نہیں حواس نہیں زندگی نہیں
زینبؑ کی اور سکینہ کی یاد اس گھڑی نہیں   تم تھے تو سب تھے تم جو نہیں اب کوئی نہیں
سینے سے سینہ آکے نہ پیارے لگا گئے
بابا کو اپنے گور کنارے لگا گئے

کیا کیا تڑپ تڑپ کے بیاں شاہ نے کیا   اکبرؑ کو درد دل نے نہ واں بولنے دیا
درد جگر سے بیٹھ گئے شاہ کربلا   تڑپے حسینؑ اور کلیجہ پکڑ لیا
چلائے آہ کون سی صورت نکالوں میں
فرزند کو پکاروں کہ دل کو سنبھالوں میں

دبیر کے مرثیوں میں بین کا حصہ بہت پر اثر اور کامیاب ہوتا ہے۔ مرثیے میں بین لکھنے کے ہنر میں مرزا دبیر میر انیسؔ سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔ ان کے بین ایسے دل گداز اور جگر خراش ہوتے ہیں کہ سامعین موثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے۔ دبیر کے مرثیوں میں بین کے بارے میں مسیح الزماں اپنا خیال کچھ یوں پیش کرتے ہیں۔

''شہادت اور بین میں دبیر عموماً سادگی بیان سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے ان کے بیانات میں درد و اثر ہے۔ اس میں وہ غم و الم پیدا کرنے کے لئے نئے نئے انداز اختیار کرتے ہیں۔ محاورے اور روزمرہ کی زبان کی خوبی نے ان کے بیانات میں جان ڈال دی ہے۔'' [19]

۲۰۔ واجد علی شاہ اخترؔ :

واجد علی شاہ جان عالم شاہان اودھ کے آخری اور فرمانروا اور پر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ یہ اپنا تخلص اخترؔ لکھتے تھے۔ واجد علی شاہ کے نزدیک امام حسینؑ کی عزاداری ان کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین تھا۔ وہ ہمیشہ عزاداری کے مقدس فرض کو اپنے لئے وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔ ان کے عہد میں لکھنؤ ہندوستان بھر میں عزاداری کا سب سے بڑا مرکز مانا جاتا تھا۔

واجد علی شاہ اختر کئی دیوانوں اور مثنویوں کے مصنف ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے سلام ،نوحے ،غزل اور مرثیے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔انہوں نے کم وبیش کتابیں تصنیف کی ہیں ۔بقول اکبر حیدری کاشمیری جناب سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں ان کے بہت سے مرثیے ہیں۔اس کے علاوہ ان کا ایک مرثیوں کا مجموعہ بھی ''ریاض العقبیٰ'' کے نام سے ملتا ہے۔اس میں شامل مرثیوں کی تعداد ۵۵٦ ہے جو مسدس کی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔یہ مجموعہ بادشاہ کی حیات میں ہی خاں نثار رئیس الدولہ کے اہتمام سے ۱۸۸۲ء میں شائع کیا گیا تھا۔

واجد علی شاہ اختر کے مرثیے شاعری کے اعتبار سے نہیں بلکہ فن عروض کے لحاظ سے بہت عمدہ مرثیے ہیں۔ان کی مرثیہ نگاری کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مرثیہ نگاری کی ابتداء اسی زمانے میں شروع کی ہوگی جس زمانے میں وہ غزل گوئی کیا کرتے تھے۔اس وقت کا لکھنؤ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے زمزموں سے گونج رہا تھا۔واجد علی شاہ جو ادعائے شعراء کے سبب ہر صنف میں طبع آزمائی کا شوق رکھتے تھے کسی مرثیہ گو سے کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ان کی مرثیہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے کوکب قدر سجاد علی مرزا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

''کلیات سوم 'ریاض ال عقبیٰ' تک دریافت شدہ مرثیوں میں ہمیں کوئی ستّر مرثیے ملتے ہیں۔جن میں بندوں کی تعداد تقریباً چھ ہزار ہیں۔تیس برس کی مدت میں اتنے مرثیے کہہ لینا واجد علی شاہ جیسے پر گو شاعر کے لئے مطلق دشوار نہ تھا۔''[۲۰]

واجد علی شاہ کے اب تک جتنے بھی مرثیے ملے ہیں وہ سب مسدس کی ہیئت میں ہیں۔شررؔ لکھنوی کے بیان کے مطابق گھر سے امامباڑے تک دو فرلانگ کی مسافت طے کرتے ہوئے مرثیہ اور سلام لکھواتے تھے۔دو کاتب ان کے ساتھ چلتے تھے،جس میں ایک سے مرثیہ لکھواتے اور ایک سے سلام۔اتنی تیزی سے کہے ہوئے مرثیوں میں جو خوبیاں و خرابیاں ہوسکتی ہیں وہ سب ان کے مرثیوں میں موجود ہیں۔موضوع کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کے مرثیوں میں حضرت قاسمؑ ،حضرت علی اکبرؑ ،حضرت عباسؑ ،امام حسینؑ ،اہل حرم کا قید ہونا اور زندان شام کے واقعات وغیرہ موضوعات ملتے ہیں۔ان کا ایک مرثیہ حضرت علی اکبرؑ کا ملاحظہ ہو۔

دنیا میں کوئی بھائی سے بھائی جدا نہ ہو　　فصل بہار میں کوئی گل سوکھتا نہ ہو
صیاد باغ دہر میں ہرگز ہوا نہ ہو　　بلبل کو خار ہجر کا یارب لگا نہ ہو
آنسو بھی اس بہار میں گلزار بن گئے
باغ خدا سے دوستو کیا کیا چمن گئے

واجد علی شاہ کا ایک اور مرثیہ ملتا ہے،جس کو مرزا محمد یوسف نے اپنی کتاب انتخابِ ادبی مراثی میں چھاپا ہے۔یہ

مرثیہ حضرت قاسمؑ کی شہادت بیان کرتا ہے۔اس مرثیہ کو۵۱ بندوں میں لکھا گیا ہے۔واجد علی شاہ نے اس مرثیہ میں اجزاء مرثیہ کا کامیابی سے استعمال کیا ہے۔چہراہ،سراپا،شہادت،بین کا بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔مگر پھر بھی اس مرثیہ میں وہ خوبیاں نہیں ملتی ہیں جو ایک کامیاب مرثیہ میں ہونا چاہیے۔مرثیہ کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

میداں میں صفیں چیر کے پہنچا جو وہ ذیشاں　　کی تیغ حوالے سرِ قاتل پہ اسی آں
غل پڑ گیا قاتل کو لیا شاہ نے پہچاں　　بچنے کی نہیں قاتلِ مردود کی اب جاں
پلٹیں جو صفیں چور ہوئے قاسمِ ناشاد
گھوڑوں کے سموں سے ہوئی وہ نعش بھی برباد

حواشی :

۱) اردو مرثیہ : سفارش حسین، ص ۲۵، قومی کونسل برائے فروغ اردو۔
۲) اردو مرثیہ: سفارش حسین رضوی، ص ۵۴، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔
۳) اردو مرثیہ، سفارش حسین رضوی، ص ۵۵، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔
۴) دہلوی مرثیہ گو: حصہ اوّل، ص ۲۰۔
۵) اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات: شمشاد حیدر زیدی، ص ۴۷۔
۶) اردو مرثیے کا ارتقاء: ڈاکٹر مسیح الزماں، ص ۱۰۲ ۔
۷) دہلوی مرثیہ گو : جلد اول، علی جواد زیدی، ص ۱۲۳ ۔
۸) تذکرۂ شعراء ، میر حسن، ص ۸۵۔
۹) اودھ میں اردو مرثیہ: ڈاکٹر ریاض الہاشم، ص ۵۳۔
۱۰) اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء: اکبر حیدر کشمیری، ص ۲۵۳۔
۱۱) اردو مرثیہ: سفارش حسین رضوی، ص ۲۳۳۔
۱۲) سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ: اسلافِ میر انیسؔ، ص ۱۵۳۔
۱۳) اردو مرثیے کا ارتقاء: مسیح الزماں، ص ۱۹۸۔
۱۴) اردو مرثیے کا ارتقاء: مسیح الزماں، ص ۲۴۴۔
۱۵) موازنۂ انیس و دبیر: شبلی نعمانی، ص ۳۹۔
۱۸) کتاب نما کا خصوصی شمارہ: مرزا دبیر نمبر ڈاکٹر اکبر حیدری، ص ۷۔
۱۹) اردو مرثیے کا ارتقاء: مسیح الزماں، ص ۴۶۱۔
۲۰) واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات: کوکب قدر سجاد علی مرزا ص ۵۹۷۔

☆☆☆

بابِ سوّم

میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد اردو مرثیے کی مختصر تاریخ

میر انیس اور مرزا دبیر نے اپنے عہد میں مرثیہ نگاری کو اس مقام تک پہنچایا کہ اس زمانے میں لکھے جانے والی نظمیں بھی مرثیہ کی ہیّت میں لکھی جانے لگیں اور اس کا ثبوت مولانا الطاف حسین حالی کی 'مسدس' ہے۔ اور بعد میر انیس و دبیر اور نوابین کے اودھ کی حکومت ختم ہونے کے بعد بھی مرثیہ کو عوام کی دلچسپی اور شاعروں کے ذوق نے زندہ رکھا۔ اس کے باوجود بعد انیس کوئی دوسرا انیس پیدا نہ ہوسکا، تاہم ان کی پیروی کرنے والوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ لیکن مرثیہ کو جو مقام انیس و دبیر نے بخشا تھا وہ مقام اسے پھر نصیب نہ ہوسکا۔ بعد انیس و دبیر مرثیہ نگاری کے بارے میں صفدر حسین لکھتے ہیں۔

> ''خیال کی جتنی ممکن حدیں نظر آتی تھیں سب بھر چکی تھیں۔ ہر قسم کے تصرفات ختم ہو چکے تھے اور پھر بھی ان کا میدان، زمانہ کی نغمہ ریزیوں کی گونج مذہبی اور ادبی دونوں فضاؤں پر اب تک اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ پچھلے انداز سے انحراف کر کے کوئی نئی لے چھیڑنا اور کامیاب ہو جانا تصور ہی میں نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے انیس و دبیر کے بعد کے شعراء نے اسی بسی ہوئی آواز میں آواز ملانا شروع کیا۔''[1]

میر انیس کے بعد کے مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہ کی اور نہ ہی مضامین میں کوئی وسعت پیدا کی۔ ان کے زمانے میں مرثیہ ویسا ہی رہا جیسا کہ انیس کے زمانے میں لکھا جاتا تھا۔ یعنی مرثیہ کی ابتداء چہرے سے شروع ہو کر رخصت، رجز، جنگ کے مدارج طے کرتا ہوا شہادت اور بین پر ختم ہوتا تھا۔ انیس کے نواسے پیارےؔ صاحب نے مرثیہ میں ساقی نامہ کا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ ہادیؔ لکھنوی، نفیسؔ لکھنوی اور شادؔ عظیم آبادی وغیرہ نے اپنے مرثیوں میں ساقی نامہ کا استعمال کیا ہے، مگر یہ بھی بہت دنوں تک نہ چل سکا۔ انیس کے بعد مرثیہ کا ایک نیا دور شروع ہوا، اور اس دور میں مرثیہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ لیکن ان میں جو نام اہم ہیں وہ عشقؔ، تعشقؔ، نفیسؔ، سلیسؔ، وحیدؔ، مہدی حسن ماہرؔ اور اصغر حسین فاخرؔ وغیرہ کا ہے۔

مضامین کے اعتبار سے ان مرثیہ نگاروں کے مرثیے قریب قریب انیسؔ کے انداز پر ہی لکھے گئے، لیکن انیسؔ کی قادرالکلامی کے آگے یہ مرثیے بالکل پھیکے اور کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ مرثیہ کا رزمیہ عناصر بھی انیسؔ کے بعد ہلکے پڑنے لگے۔ عشقؔ نے اپنی مرثیہ نگاری کو انیسؔ کی مرثیہ نگاری سے علیحدہ رکھا۔ عشقؔ میں قوت اور اظہار دونوں کی کمی نہ تھی مگر پھر بھی وہ انیسؔ کی طرح استعاراتی اور پیکری ذہن نہ رکھتے تھے، اس کے باوجود وہ جزئی صورت حال کا احاطہ محض بیانیہ کے بل بوتے پر کر لیتے تھے۔ عشقؔ نے اپنے مرثیوں میں بہت زیادہ قید و بند اختراع کئے۔ ان کی مرثیہ نگاری کے بارے میں شمس

الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں۔

''میر عشق اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو غیر ضروری قیدو بند اختراع کرنے میں ضائع
نہ کردیتے تو وہ انیس کی روایت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔''۲

پیش ہے انیسؔ و دبیرؔ کے بعد کے کچھ اہم مرثیہ گو شاعر جنھوں نے انیسؔ و دبیرؔ کی روایت کو برقرار رکھنے کے باوجود اپنا ایک منفرد مقام بنائے رکھا۔

۱۔ میر مہر علی انسؔ :

نام میر مہر علی اور تخلص انسؔ کرتے تھے۔ یہ میر خلیقؔ کے بیٹے اور میر انیسؔ کے منجھلے بھائی تھے۔ ان کی پیدائش ۱۲۲۳ھ کو فیض آباد میں ہوئی تھی۔ انس نے جب شاعری شروع کی تو اصلاح شعر یہ اپنے والد میر مستحسن خلیقؔ سے کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی یہ اپنے چھوٹے بھائی میر مونسؔ سے بھی اصلاح لیا کرتے تھے۔ میر انس کے زیادہ تر مرثیے غیر مطبوعہ کی شکل میں ملتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر ریاض الہاشم۔

''میر مہر اُنسؔ کے کچھ مرثیے ''ریحان غم'' کے عنوان سے سید عبدالحٔی تاجر
کتب نے ایک مجموعے کی صورت میں ترتیب دیکر شائع کیا تھا۔۳

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام تر مرثیہ گو شعراء کا موضوع واقعہ کربلا ہی ہوتا ہے۔ صرف ان کے اظہار بیان میں انفرادیت نظر آتی ہے۔ اور وہ انفرادیت یہ ہوتی ہے کہ کسی مرثیہ گو نے اپنے مرثیہ میں کسی پہلو پر زیادہ روشنی ڈالی ہے تو کسی نے دوسرے پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ انس نے جس پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے وہ حضرت عباسؑ ہے۔ انس نے حضرت عباسؑ کے میدان میں جانے کی اجازت سے لیکے بازوں کے کٹنے اور شہید ہونے تک کے سبھی واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ انس کا ایک مرثیہ ملاحظہ ہو جسمیں انھوں نے حضرت عباسؑ کے رعب و جلال اور دبدبہ کا ذکر کیا ہے۔

نیزہ زمیں پہ گاڑ کے گونجا وہ شیر نر ۔۔۔ چہروں سے رنگ اڑ گئے تھرّا گئے جگر
نکلے رجز میں خشک زبان سے وہ شیر نر ۔۔۔ جس کے جواب میں فصحانے جھکائے سر
غل تھا، زبان ناطقہ الکن سے لال تھا
لاریب فیہ مصحف ناطق کا لال تھا

ڈھالوں سے شامیوں کے ادھر چھا گئی گھٹا ۔۔۔ دریا پہ جھوم جھوم کے سب آ گئی گھٹا
ایسا بڑھا یہ ابر کہ شرما گئی گھٹا ۔۔۔ باران تیر دشت میں برسا گئی گھٹا
کشتوں کو اپنے فوج عدو روندنے لگی
جنگل میں برق قہر خدا کوندنے لگی

چمکی جو تیغ آمد قہر خدا ہوئی   سر پر جو آگئی تو قیامت بپا ہوئی
سینے سے روح ،جسم سے گردن جدا ہوئی   خوں میں ڈبو چکی تو نہ پھر آشنا ہوئی
بار اس غضب کی ،وار وہ اس زوروشور کا
دشمن کواس کا گھاٹ کنارہ تھا گور کا

اس کے علاوہ مناظر جنگ ،منظر نگاری ،جذبات نگاری اور رزمیہ میں تلواراور گھوڑوں کی تعریف اور مصائب کے بیانات میں انسؔ نے اپنے اجداد کے طرز نگارش کی پیروی کی ہے ۔انسؔ کا کوئی بھی مرثیہ ترتیب عناصر سے عاری نہیں ہے ۔ان کی مرثیہ نگاری مجموعی طور پر روایتی ہے ۔مرثیہ نگاری سے ان خاص مقصد زور بیان اور مذہبی عقیدے کا مظاہرہ کرنا تھا،ان کے مرثیوں میں روایات ،احادیث ،قرآنی آیات اوراسلامی فلسفہ کے بیان پر خصوصی توجہ دی گئی ہے ۔فصاحت ، بلاغت ،صنائع بدائعاور دیگر رموز وتلازم شعوری یا غیر شعوری طور پر ان مرثیوں میں جہاں بھی استعمال ہوئے ہیں ۔وہاں اچھا تاثر پیدا ہوا ہے ۔اس طرح اُنس کے مراثی انیسؔ ودبیرؔ کی جگہ پا سکتے ہیں ۔

۲۔سید محمد نواب مونسؔ :

نام محمد نواب اور تخلص مونسؔ تھا۔ یہ میر مستحسن خلیقؔ کے سب سے چھوٹے بیٹے اور میر انیسؔ کے چھوٹے بھائی تھے ۔ ان کی ولادت فیض آباد میں ہوئی تھی ۔ان کی طبیعت میں بڑی دلکشی تھی ۔ کہتے ہیں کہ انہیں کے دم سے میر انیسؔ کی نشست گاہ میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا،اور وہاں پر ہر صنف سخن پر گفتگو کی جاتی تھی ۔مونسؔ کی مرثیہ نگاری انیسؔ سے کم نہیں تھی ، ان کے کلام کو دیکھ کر اکثر لوگ دھوکہ کھا جاتے تھے ۔لیکن پھر بھی یہ انیس کی طرح مشہور نہیں ہوئے ۔مونس مرثیہ بہت خوب کہتے تھے اور ان کا مرثیہ پڑھنے کا انداز نہایت موثر اور دلکش تھا۔ کچھ تذکرہ نگاروں نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ انیسؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے بعض ان کو خلیق کا شاگرد بتاتے ہیں ۔لیکن اس بات سے بحث نہ کرتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مونسؔ پہلے اپنے والد خلیق سے اصلاح لیتے ہوں گے اور بعد میں بھائی انیسؔ سے بھی مشورہ کرتے ہوں گے ۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری پہ انیس کا رنگ سخن ہے ۔مونسؔ کا طرۂ امتیاز ان کی فصاحت ہے ،اس میں ان کے خاندانی پس منظر کا دخل نظر آتا ہے ،وہ خود لکھتے ہیں ۔

بس مونس فصیح زباں اب نہ لکھ یہ حال   خود ہے زباں ناطقہ تیری ثنا میں لال
خالق نے جنم کی ہے اسی گھر پہ بول چال   حقا کہ ہے یہ فیض شہنشاہ خوش خصال
نازک مثالیوں کی فصاحت کی حد نہیں
یہ رنگ یہ زباں ،یہ سخن بے مدد نہیں

مونسؔ کے کلام میں فکری عنصر اور فن بہت اعلیٰ درجہ کا معلوم ہوتا ہے۔ منظر کشی میں ہندوستان کی فضا کا رنگ نمایاں ہے۔ مکالمہ بندی اور نفسیات نگاری کے بیان میں خوش اسلوبی، سادگی اور برجستگی ہے۔ مونس نے بھی میر انیس اور دبیر کی طرح دنیائے مراثی کے ہر موضوع پہ طبع آزمائی کی ہے۔ جناب زینبؑ، جناب سکینہؑ، حضرت عباسؑ، حضرت علی اکبرؑ، جناب حر، امام حسینؑ اور شہادت حسینؑ کے بعد کے واقعات کو مونس نے اپنے مرثیوں میں بڑے موثر انداز سے پیش کیا ہے۔ مونس کا ایک مرثیہ ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے بعد شہادت حسین اہل حرم کے بین اور ان کی تباہی کو بیان کیا ہے۔

اعدا جو رن میں شمع امامت بجھا چکے — عرشِ خدا گرا چکے کعبے کو ڈھا چکے
سرور کے پیاسے حلق پہ خنجر پھرا چکے — دنیا سے پنجتن کی نشانی مٹا چکے
غل تھا کہ قبر میں بھی ستایا بتولؑ کو
بے سر کیا نماز میں سبطِ رسولؐ کو

تھا خیمہ حسینؑ میں غل واحسینؑ کا — چھینلی تھی سر سے زینبؑ وکلثومؑ نے ردا
کہتی تھی بانوؑ مجھ پہ فلکِ غم کا گر پڑا — وارث مرا شہید ہوا وا مصیبتا
آیا کسی کو رحم نہ زہرا کے لال پر
ہے ہے تباہی آگئی احمد کی آل پر

رانڈیں یہ بین کرتی تھیں سر پیٹ پیٹ کر — اور طبل فتح رن میں بجاتے تھے اہل شر
نیزوں پہ رکھے جاتے تھے ستر دوتن کے سر — دوڑا رہے تھے گھوڑوں کو سرور کی لاش پر
تاکید کر رہا تھا عمر فوج شام کو
جلدی جلا دو آگ سے شہ کے خیام کو

یہ حکم تھا کہ بیوؤں کا زیور بھی لیجیو — کبرؑ اکے سر کا مقنع پُر زر بھی لیجیو
گوش سکینہؑ جان کے گوہر بھی لیجیو — زینبؑ کے فرق پاک کی چادر بھی لیجیو
بے خوف لوٹو خانہ ابن بتولؑ کو
محتاج کر دو خلق میں آل رسولؐ کو

سنتا ہوں اک مریض ہے خیمہ میں تشنہ کام — سجادؑ اس کو کہتے ہیں عابدؑ ہے اس کا نام
اب ہے وہی وصیٔ شہنشاہِ خاص و عام — روکے اگر تو کیجیو کام اس کا تم تمام
اور تپ میں غش جو پایئو ابن حسینؑ کو
قیدی بنا کے لایئو ابن حسینؑ کو

مونس نے اپنے مرثیوں میں روایتی انداز اپنایا ہے۔جس کی وجہ سے وہ دوسرے مرثیہ نگاروں کے مقابلے میں اپنا کوئی منفرد مقام نہ بنا سکے۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعد انیس اور دبیر مرثیہ گوئی میں مونس ایک قابل درجہ کے مرثیہ نگار ہیں۔

۳۔حسین مرزا عشق :

عشق میر انس کے بڑے صاحبزادے تھے،اور انیس و دبیر کے ہمعصر تھے۔ان کا نام حسین مرزا اور تخلص عشق تھا۔ان کی پیدائش ۱۸۱۷ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔والد نے ان کو عربی و فارسی کی تعلیم کے علاوہ دیگر علوم مثلاً خطاطی،فن سپہ گری، تیراندازی اور شہ سواری بھی سکھائی تھی۔والد کی ان کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں مرزا عشق ایک قابل شخصیت بن کر ابھرے۔عشق ایک باوضع انسان تھے۔لکھنؤ کے ہر طبقے کے افراد ان کو جانتے تھے اور ہر کوئی ان کا دیوانہ تھا۔اور ان کا سلوک بھی ان سب سے بہت اچھا ہوتا تھا،یہی وجہ ہے کہ عشق اپنے دور میں ہر دل عزیز تھے۔اور اسی طرح ان کی ذاکری اور شاعری بھی سب کو خوب پسند تھی۔ان کی مرثیہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر جعفر رضا لکھتے ہیں۔

> ''میر عشق کی زندگی میں ان کی مرثیہ خوانی کی بڑی اہمیت رہی۔بلکہ ایک طرح سے ان کی تمام ترقی وشہرت کا دارومدار ان کی مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی پر رہی۔اسی کے ذریعہ ان کو فارغ البالی نصیب ہوئی۔کیونکہ ان کی مرثیہ خوانی سے متاثر ہو کر ہی نواب نیا محل نے ان سے شادی کی۔میر عشق کی پہلی عظیم الشان مجلس نیا محل کے یہاں ہوئی تھی اور اسی کے بعد ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔''[۴]

عشق بذات خود مرثیہ خوانی کو ثواب دارین خیال کرتے تھے۔لہذا جس کسی نے بھی مجلس عزا میں ذاکری کے لئے انھیں بلایا،وہاں جانے میں انہیں کبھی قباحت نظر نہیں آئی۔جس وقت عشق نے وفات پائی (۱۸۸۶) اس وقت انکی عمر ۶۸ سال تھی۔

مرزا عشق نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی اور ناسخ کی شاگردگی اختیار کی۔عشق نے غزل گوئی میں بہت نام کمایا،لیکن جب یہ میر ضمیر کی بیٹی کے ساتھ منسوب ہوئے تو ضمیر سے اصلاح لینے لگے اور غزل کو خیرآباد کر مرثیہ کی طرف رجوع ہوئے۔اور بہت سے مرثیے لکھے،جن کی وجہ سے ان کا شمار مرثیہ گو شعراء میں ہونے لگا اور ایک دبستان کی بنیاد پڑ گئی۔عشق کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ جس وقت میں انیس اور دبیر کو ماننے والی دو جماعتیں پہلے سے موجود تھیں اسی وقت میں عشق نے ایک چھوٹی سی جماعت اپنی طرفداروں کی بھی پیدا کر لی۔عشق کی مراثی کا مجموعہ 'بریان غم' کے نام سے نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئے ہیں۔

عشق کے مرثیوں میں غنائیت،جذباتیت،سوز گداز اثر نازک خیالی موجود ہے۔ان کے مرثیوں کے موضوع بھی

گھوڑوں ،تلوار اور زعفر جن کو بنایا ہے۔ان کے مراثی کے گھوڑے عام گھوڑوں کے مقابلے کافی مختلف ہے،وہ اپنا درجہ و اعزاز بخوبی سمجھتا ہےاور فخر کرتا ہے۔جب وہ سوار کو اپنی پشت پر بٹھا کر روانہ ہوتا ہےتو اس کے حرکات وسکنات میں شان دل ربائی پیدا ہوتی ہے جس سے سامعین محو ہو جاتے ہیں۔عشق کا ایک مرثیہ میرزا محمد یوسف نے اپنے کتاب 'انتخاب ادبی مراثی' میں شائع کیا ہے جس کا موضوع 'زعفر جن' ہے۔اس مرثیہ میں عشق نے زعفر کے ذریعہ امام حسین کی شہادت کو بیان کیا ہے۔یہ مرثیہ ۱۲۷ بندوں میں لکھا گیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

تڑپتے دور سے دیکھا جو مجھ کو سرور نے کیا اشارہ امام غلام پرور نے
طلب کیا مجھے شیر خدا کے دلبر نے کہا سبھوں نے یہ سلطان فیض گستر نے
کھڑا ہے دور پریشان راہ دوسر کو
ہمارے پاس بلا لو وہاں سے زعفر کو

سرک سرک گئے سب راہ ہو گئی پیدا ہوا یہ غل کہ بلاتے ہیں آپ کو زعفر
وہیں کھڑی رہی سب فوج میں چلا تنہا پہنچ کے پاس جو دیکھا بدل گیا نقشا
خدا کی شان تھی سبط نبی کی شان نہ تھی
یہ رعب تھا کہ ذرا تن بدن میں جان نہ تھی

بندھی تھی شاہ کے تحت الحناک گلے میں کفن دبا رہے تھے کھڑے بازوئے حسین ،حسن
رسول پوچھتے جاتے تھے خون زخم بدن جناب حمزہؑ و جعفر خموش فرط محن
حسینؑ ہنس رہے تھے تیر ظلم کھائے ہوئے
کھڑے تھے حیدرؑ کرار سر جھکائے ہوئے

ہزاروں زخم تھے لیکن ذرا نہ تھے بیتاب پر ایک زخم کو بازو کے چومتے تھے جناب
کیا سوال جو میں نے دیا مجھے یہ جواب نہ پوچھ آہ ملے خاک میں عجب مہتاب
یہ زخم تیر نہیں شغل ِ زندگانی ہے
ہمارے اصغرؑ بے شیر کی نشانی ہے

وغا کا حکم دو آقا نہیں ملال سے ہوش سزا دے امّت ِ بد کو ذرا یہ حلقہ بگوش
کہا امام نے ہاں ہاں یہ کیا خموش خموش کیا ہے میری محبت نے تیرے دل میں جوش
نہ کر شکایت ِ امّت جناب سنتے ہیں
نہ ہو خلاف رسالت مآب سنتے ہیں

عشق نے اس مرثیہ میں میدان کربلا میں ارواح انبیاء اور فرشتوں کے ہجوم کا بیان زعفر جن کے حوالے سے کیا ہے۔ چونکہ ایک جن کے پاس یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ ان سب چیزوں کو بھی دیکھ سکتا ہے، جسے عام طور سے انسانی آنکھیں نہیں دیکھ پاتی ہیں۔اس کے ذریعہ سے امام حسینؑ کو خاصان خدا کی صف میں دکھایا گیا ہے۔اس طرح عشق کے مرثیے میں اپنی جدا راہ نکالی اور اسی وجہ سے وہ دبستان عشق کے بانی قرار پاتے ہیں۔ان کے مرثیوں میں جہاں تنوع، جدت اور لسانی پابندی ملتی ہے وہیں شاعرانہ نزاکتیں، تخلیقی حسن وتخیل کی وہ کیفیت کی کمی نظر آتی ہے جسے مرزا غالبؔ نے 'چیزے دیگر' کا نام دیا تھا۔

۴۔میر تعشقؔ :

میر تعشقؔ کا شمار ان کے عہد کے ذہین لوگوں میں ہوتا تھا۔ان کا نام سید مرزا اور تخلص تعشقؔ تھا۔ یہ انسؔ کے چھوٹے بیٹے اور میر عشقؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ان کی پیدائش ۱۸۲۳ء رکاب گنج لکھنؤ میں ہوئی تھی۔تعشقؔ کی تعلیم ان کے والدین کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ان کے والد نے اپنے بڑے بیٹے عشقؔ کی طرح تعشقؔ کو بھی تیراندازی، سیف زنی اور ران سواری کی مشق اپنی نگرانی میں انجام دلائی۔

تعشقؔ نے بھی اپنی شاعری کی ابتداء غزل سے کی ۔جس وقت انھوں نے شاعری کی دنیا میں قدم رکھا اس وقت ان کی عمر ۱۰ یا ۱۱ سال کی تھی۔تعشق نے ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت پائی لیکن انھوں نے بھی عشق کی طرح غزل کو چھوڑ کو مرثیہ کی طرف اپنا رجحان کیا۔تعشق نے کئی ہزار غزلیں لکھیں اور جب یہ عراق تشریف لے جانے لگے تو سب غزلیں ہمراہ لیتے گئے اور جب جہاز بیچ سمندر میں پہنچا تو غزل کی گٹھری میں وزن باندھ کے یہ کہہ کر سمندر کی نذر کی کہ تعشقؔ دنیا میں صرف مدّاحی کے لئے آیا ہے۔اور غزل صرف اس لیے کہی تھی کہ طبیعت میں روانی آجائے۔اور خود کو مرثیہ گوئی کی طرف مائل کر لیا۔لیکن ان کی غزلوں کا ایک دیوان آج بھی موجود ہے۔تعشق مرثیہ اور غزل دونوں کے ہی استاد مانے جاتے ہیں۔ان کا کلام جذبات، حسن بندش، نزاکتِ خیال اور تاثیر کے لئے مشہور ہے۔ان کی مرثیہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جعفر رضا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

> ''تعشق کے مرثیوں کی بڑی خصوصیت ان کا تغزل آمیز پیرایہ بیان ہے۔انھیں خود بھی غزل کے مضامین سے بڑی دلچسپی تھی، جس کا ثبوت ان کا انتخابِ تخلص بھی ہے۔''[۵]

تعشقؔ کی مرثیوں میں اکثر جگہوں میں غزلیت کے ساتھ حسن وعشق کی باتیں قلم بند نظر آتی ہیں۔وہ ہجر وفراق، وصال وغیرہ کا تذکرہ بھی بڑی بے تکلفی سے کرتے ہیں۔تعشق کی سب سے بڑی انفرادیت تغزل اور مرثیت کے امتزاج سے ایک ایسا دل عزیز رنگ اختیار کرنا ہے جسے آج تک پسند کیا جاتا ہے۔لیکن اس امتزاج سے ان کی مرثیت میں

کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ وہ واقعات کربلا کو تغزل کے آنکھوں سے دیکھتے ہیں ،جسکی وجہ سے انکے رزم میں بھی بزم کا عنصر ملتا ہے۔ملاحظہ ہو یہ بند۔

سچ ہے دنیا میں شب ہجر بلا ہوتی ہے دم بدم آرزوئے مرگ سوا ہوئی ہے
آہ سینے کے لئے تیر جفا ہوتی ہے دل جلاتی ہے جو ٹھنڈی بھی ہوا ہوتی ہے
زندگی کہتے ہیں دنیا سے گذر جانے کو
دل تڑپتا ہے گلا کاٹ کے مر جانے کو

تعشق نے اپنے مرثیوں میں دنیا کی بے ثباتی کے مضامین بھی شامل کئے ہیں تاکہ سامعین کو عبرت حاصل ہو سکے۔یزیدی فوج کے پیش نظر صرف دنیا داری کی فکر ذہن پر سوار رہتی تھی۔جبکہ اہل بیت کے پیش نظر فکر عقبیٰ دامن گیر رہتی ہے۔اور جہاں تک حق پرستوں کا سوال ہے تو وہ دولت دنیا کی چنداں پرواہ نہیں کرتے۔مثال دیکھئے۔

دنیا میں ایک حال میں رہنا محال ہے گہ اوج آفتاب کو ہے گہ زوال ہے
جو آج سرفراز ہے کل پائمال ہے کل ایک رات بدر کو حاصل کمال ہے
ہوتے ہی صبح جلوۂ مہتاب ہو گیا
انجم کی انجمن کا مرقع الٹ گیا

جہاں میر تعشق نے اپنی مرثیہ گوئی میں غزل اور مرثیہ کو ایک دوسرے میں پیوست کیا ہے ،وہیں انھوں نے جذبات نگاری،واقعات نگاری اور محاکات پر کمال بھی حاصل کیا ہے۔اور اس کے ذریعہ مرثیہ کو ایک نئی کیفیت عطا کی ہے۔اور غزل و مرثیہ کی ہم آہنگی میں اپنے دور کے پسند کا سامان مہیّا کیا ہے۔

۵۔میر خورشید علی نفیس :

نفیس میر انیسؔ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ان کی ولادت ۱۲۳۴ھ فیض آباد میں ہوئی تھی۔انیس کے تین بیٹے تھے،نفیس،سلیس اور رئیس۔مگر صحیح طور پر انیس کے جانشین نفیس ہی تھے۔یہ مرثیہ نگاری میں انیس و دبیر کے مقابلے میں کوئی انفرادیت تو قائم نہ کر سکے،لیکن ان کے کلام میں شکوہ،سلاست،روانی اور برجستگی غرض وہ ساری چیزیں موجود ہیں جو ایک قادرالکلام شاعر کا حصہ ہوتا ہے۔ان کے کلام میں انیسؔ کی شاعری کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔وہ اپنے شعر کی اصلاح اپنے والد سے ہی کیا کرتے تھے۔مرثیہ کے علاوہ انھوں نے سلام اور رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے مرثیوں کی تعداد تقریباً ۸۴ ہے۔

نفیس نے اپنے مرثیوں میں انیس و دبیر ہی کی پیروی کی ہے۔انھوں نے اپنے مرثیے میں امام حسینؑ کے مرتبے مقصد حیات،جذبہ ایثار اور عشق خدا کو موضوع بنایا ہے۔اگر چہ وہ انیس و دبیر کی طرح مرثیہ نگاری کو بلند مرتبہ پر فائز دیکھنا

چاہتے تھے لیکن وہ ان کی ہمسری نہ کر سکے۔ پھر بھی انھوں نے اپنی ذمہ داریوں کو خوبصورتی سے انجام دیا ہے۔ انھوں نے مرثیے میں وہی معیار اور تیور کو باقی رکھا جو میر انیس کی یادگار ہے۔ بالخصوص 'بین' پر انھوں نے زیادہ زور دیا۔ اپنے مرثیے کے ذریعہ سامعین کو رلانا ہی ان کا مقصد تھا۔ ان کی یہ مرثیہ ملاحظہ ہو جس میں نفیس نے اس وقت کا بیان کیا ہے جب حسینؑ کے سارے انصار و اقرباء شہید ہو چکے ہیں اور حسینؑ ظہر کے وقت تنہا کھڑے ہے اور حسینؑ کو اکیلا دیکھ کے اہل حرم میں ایک کہرام برپا ہو گیا اور سب بیبیاں رونے لگی ۔

تسبیح فاطمہ کے جو دانے بکھر گئے　　تنہا رہے حسینؑ نمازی کدھر گئے
پیرو امام پاک کے سب کوچ کر گئے　　باہم تھا جن سے رشتہ الفت گزر گئے
سوداغ اور ایک دل حق شناس تھا
کوئی نہ وقت ظہر نمازی کے پاس تھا

زاری وہ بیبیوں کی وہ بچوں کا شور شین　　پتھر کو آب کرتے تھے سیدانیوں کے بین
کبرٰ بلک رہی تھی سکینہ کو تھا نہ چین　　چلا رہی تھی بانوئے بیکس کہ یا حسین
قاسمؑ کی ماں تھی چاک گریباں کئے ہوئے
زینبؑ کھڑی تھی بال پریشاں کئے ہوئے

اس کے علاوہ نفیس نے اپنے مرثیوں میں بچوں کے جذبات کی عکاسی بھی بڑے خوبصورت انداز سے کی ہے۔ نفیس نے جناب عباسؑ کے جذبات کی غمازی بھی بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔ اس کے علاوہ جناب زینبؑ، عون و محمد، حضرت قاسمؑ، علی اکبرؑ اور بعد شہادت حسینؑ کے واقعات کو انھوں نے اپنے مرثیوں کا موضوع بنایا ہے۔

۶۔ میر ہادی وحیدؔ:

میر ہادی نام اور وحیدؔ تخلص تھا۔ ان کی پیدائش ۱۸۳۲ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ وحید میر انیسؔ کے بھتیجے اور میر مہر اُنسؔ کے فرزند تھے ان کی طبیعت میں جوش اور وجدانِ شعر پہلے سے موجود تھا اس لئے انھوں نے سن شعور سے ہی مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا اور تھوڑے ہی عرصے میں انکو کافی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ وحید اپنی شاعری کی اصلاح اپنے والد سے ہی کراتے تھے۔

وحیدؔ نے اپنے مرثیوں میں جن موضوع پر زیادہ توجہ دی ہے ان میں عون و محمد کا ذکر آتا ہے۔ یہ دونوں معصوم بچے حضرت زینب کے فرزند ہیں۔ یہ دونوں بڑے دلیر اور جہاد کے جذبے سے سرشار تھے۔ ان کے پاس جو تلواریں تھی وہ چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وحید نے اپنے مرثیے میں ان بچوں کی بہادری اور جرأت کا ذکر بڑے انوکھے انداز میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک مرثیہ ''درحال معراج محمدؐ'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس مرثیہ کے ۲۱ بندوں میں اوصاف محمدؐ کا ذکر

کیا گیا ہے۔اس کے بعد فلک کی سمت کوچ کرنے کا ذکر ہوا ہے۔ جہاں مختلف ارواح سے ان کی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ چوتھے آسمان پر ان کی ملاقات حضرت عیسیٰؑ سے ہوتی ہے اور وہاں ملائکہ کو بھی دیکھتے ہیں۔ حضرت محمد کا رفرف پر سوار ہونے کا بیان ملاحظہ ہو۔

واں پہنچے پیمبرؐ کہ جہاں کوئی نہ پہنچا واں پہنچے جہاں دخل نہ میکال نے پایا
واں پہنچے جہاں عرش سا اعلیٰ ہے اک ادنا واں پہنچے کہ جبرئیل کے پر جلتے ہیں جس جا
واں پہنچے جہاں کا نہ کھلا حال کسی کو
اللہ کو معلوم ہے یا اس کے نبیؐ کو

وحید کی مراثی پر انیس اور اُنس کا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ جس کی بنیاد پر بیان کی لطافت، شگفتگی اور تازگی ان کے اپنے مزاج اور آہنگ کا پتا دیتی ہے۔ ان کے کلام میں روانی ہے ،لفظوں کا انتخاب اور ان کی نشست وحید کے یہاں بڑے حسین انداز میں ملتی ہے۔ تصور اور تخیل کی تصویر کو لفظوں کا لباس پہنانے میں جو کمال وحید کو حاصل ہے اس کی مثال کسی اور کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ مثال کے لئے یہ مرثیہ ملاحظہ ہو جس میں جناب عباسؑ جہاد پر جانے کے لئے ابتدائے جنگ سے ہی بے چین نظر آتے ہیں۔ وہ امام حسینؑ سے بار بار اجازت مانگتے ہیں لیکن نہیں ملتی۔ قاسمؑ کی شہادت کے بعد عباسؑ کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جناب عباسؑ کی ذہنی کیفیت اور قلبی واردات کا اندازہ' چہرہ' کے ان بندوں سے کیا جاسکتا ہے۔

حیدر کا شیر عازمِ دشت قتال ہے جرات کے ولولے ہیں توقف محال ہے
رخ پر جلالت اسد ذوالجلال ہے خاموش ہیں یہ پاس شہ خوش خصال ہیں
مضطر ہیں شوق تیغ زنی میں جو دیر سے
تلوار دوش پر ہے ،ٹہلتے ہیں شیر سے

ابن حسن کے غم میں تحیّر ہے دم بدم چہرے سے آشکار تکدّر ہے دم بدم
افزائش نہیب و تہور ہے دم بدم تیغوں کی بجلیوں کا تصور ہے دم بدم
پہنچے نہیں ہیں گرچہ ابھی رزم گاہ میں
پھرتے ہیں لوٹتے ہوئے بسمل نگاہ میں

۷۔ پیارے صاحب رشیدؔ :

نام سید مصطفیٰ میرزا اور تخلص رشیدؔ تھا۔ والد کا نام احمد مرزا صابرؔ تھا۔ ان کی شادی میر انیس کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اس طرح میر عشقؔ ان کے چچا اور میر انیسؔ ان کے حقیقی نانا تھے۔ رشید کی ولادت لکھنؤ میں ۵ مارچ ۱۸۴۶ء کو ہوئی

تھی۔رشید کی تعلیم وتربیت میر عشقؔ کی نگرانی میں ہوئی۔میر عشق اپنے بھتیجے کو بہت پیار کرتے تھے۔انھوں نے رشید کو عربی اور فارسی کے علاوہ فن سپہ گری،شہ سواری اور تیغ زنی کے جوہر سکھائے۔انھوں نے رشید کی تعلیم وتربیت کے لئے اکثر اساتذہ کی بھی خدمات حاصل کی تھی۔

رشید میر انیس کے نواسے اور مرزا اُنس کے پوتے تھے۔ان کا ددھیال غزل گو اور ننیال مرثیہ گو تھا۔اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رشید کو یہ دونوں رنگ ورثے میں ملے ہیں۔جنہیں انھوں نے اپنے مرثیہ میں اس طرح سمویا کہ مرثیہ کو ایک نیا رنگ ملا۔یہ رنگ ایسا پسند آیا کہ لوگ رشید کے کلام پر سر دُھننے لگے۔عشق اور تعشق کی طرح رشید نے بھی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی۔انھوں نے جب شاعری شروع کی تو اس کی اصلاح وہ کئی اساتذہ کرتے تھے۔وہ انیس کے علاوہ اپنے چچا میر عشقؔ اور ان کے چھوٹے بھائی تعشقؔ دونوں سے مشورہ کرتے تھے۔اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

میں بھی ہوں وارث طرز سخن میر انیس　　　ہوں تعشقؔ کے سبب ملک مضامیں کا رئیس
مونسؔ خلق ہوں میں میری زباں ہے جو سلیس　　　ایک ہی باغ کے دو پھول ہیں میں اور نفیس
خوب تحقیق میں بچپن سے رہی کد مجھ کو
مستند ہوں کہ ملی عشقؔ کی مسند مجھ کو

بلبل گلشن ناسخ ہوں یہ ہے فخر کی جا　　　اُنسؔ جد ہیں میرے صابرؔ ہیں پدر صبر چچا
تھے خلیقؔ اور حسن ہیچ مداں کے نانا　　　اُنسؔ نانا کا تخلص بھی ہے یہ ربط ہوا
آج ہے سب کی زبان زد کہ وحیدؔ ایسا تھا
کل مجھے یاد کریں گے کہ رشیدؔ ایسا تھا

رشید کی طبیعت غزل گوئی کی طرف بہت مائل تھی۔وہ مرثیہ میں غزل کے امتزاج سے ایک نیا رنگ بھرنا چاہتے تھے۔لکین اس فن میں میر تعشق پہلے ہی اپنا کمال دیکھا چکے تھے۔انھوں نے اپنے زمانے کے ادبی مذاق کو دیکھتے ہوئے مرثیہ کے حدود پر نظر ڈالی۔وہاں ان کو بہار اور ساقی نامہ میں اپنا رنگ جمانے کا موقع ملا۔یوں تو میر انیس اور نفیس نے بھی اپنے مرثیوں میں ساقی نامہ کا ذکر کیا ہے،لیکن تمام تحقیقی صداقتوں کے باوجود یہ بات بھی سچ ہے کہ ساقی نامی کو رشید نے مرثیہ کا ایک جز بنا دیا۔اور اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ رشید وہ پہلے مرثیہ گو شاعر ہیں جنھوں نے اتنی شدت اور کثرت سے ساقی نامہ لکھے کہ وہ انھیں کے نام سے مشہور ہو کر رہ گئے۔رشید کو ساقی نامہ کے ساتھ ساتھ بہار کا بھی اتنا شوق تھا کہ شاید ہی کوئی ایسا مرثیہ ہو جسمیں انھوں نے بہار اور ساقی نامہ کا ذکر نہ کیا ہو۔ساقی نامہ کا یہ بند دیکھئے۔

ساقیا نہر پہ سقائے حرم جاتا ہے　　　کچھ برا رنگ زمانے کا نظر آتا ہے
ہو گئی فکر سوا نشہ جو کم پاتا ہے　　　جلد دے جام یہ مے کش ترا چلاتا ہے

نشہ ہو صاف تو اعدا کی صفائی لکھوں
خوب لڑ جائے طبیعت تو لڑائی لکھوں

رشید کے مراثی دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بہار اور ساقی نامہ میں اس قدر کھو گئے کہ مراثی کی ضروریات کو نظر انداز کر دیا۔ اور رنج وغم، شجاعت و بہادری، ایثار و قربانی وغیرہ کے جذبات مشتعل کرنے کے بجائے خوش کن مضامین کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ مرثیہ نگاری کو اس کی روح سے الگ کر دیتے ہیں۔ رشید نے اپنے مرثیہ کے لئے جناب عباسؑ، جناب علی اکبرؑ اور امام حسینؑ کو موضوع بنایا ہے۔ رشید کے مرثیے میں جذبات کی شدت بھی نظر آتی ہے، وہ ایک ہی آدمی کے مختلف موقعوں پر الگ الگ جذبات کا بیان کرتے ہیں۔ جوان اور بوڑھوں کے علاوہ ان کے یہاں بچوں کے جذبات بھی سن وسال کے لحاظ سے پیش کئے گئے ہیں۔ بچوں کی نفسیات سے رشید گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ امام حسینؑ جنگ کے میدان سے عباسؑ کے مشک وعلم کو واپس لاتے ہیں تو اہل حرم میں صف ماتم بچھ جاتی ہے، لیکن سکینہ خوش ہیں کہ ان کے چچا واپس آ گئے۔

دوڑی کہتی ہوئی مشکیزہ مرا لائے ہیں　　لو خبر مجھ کو نہ تھی میرے چچا آئے ہیں

یا ایک باپ کے جذبات دیکھئے جو اپنے چھ مہینے کے بچے کو لے کر میدان میں سوال آب کے لئے جاتا ہے اور وہاں اس کے بچے کو شہادت ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

نکلے خیمے سے عجب یاس سے سلطان امم　　دشت میں ایک بلندی پہ کیا آکے قیام
لے کے ہاتھوں میں بڑھا یا طرف لشکر شام　　کھول کر منہ علی اصغرؑ کا کیا شہ نے کلام
ان کا سن دیکھ لیں اور سوکھے ہوئے لب دیکھیں
تم میں جو صاحب اولاد ہوں وہ سب دیکھیں

رو دیئے بعض پشیماں ہوئے بعضے بے پیر　　حرملہ سے پسر سعد نے کی یہ تقریر
رنگ اچھا نہیں کر قطع کلام شبیرؑ　　اس ستم گر نے بڑا ظلم کیا، مارا تیر
باغ جنت میں دل فاطمہؑ بے تیر چھدا
حلق اصغرؑ کا چھدا بازوئے شبیرؑ چھدا

رشید اپنے دور کے کامیاب ترین مرثیہ گویوں میں سمجھے جاتے تھے۔ جانشینی عشق اور انیس کے یکجا ہونے کے بنا پر عوام وخواص میں رشید کی بہت اہمیت تھی۔ رشید نے اپنے بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنی انفرادیت کو نمایا کرنے کے لئے مرثیہ میں بہار اور ساقی نامہ کو غیر معمولی اہمیت دی جس نے ان کو ایک الگ پہچان دی۔

۸۔علی محمد عارف :

عارف میر انیسؔ کے پر پوتے اور میر محمد حیدر جلیسؔ کے فرزند تھے۔ان کی ولادت ۱۸۵۹ءکو ہوئی۔یہ اپنے نانا کی زیرِ نگرانی تعلیم وتربیت پائی۔اور مرثیہ گوئی میں بھی انہیں کے شاگرد بنے۔ان کی مرثیہ کی ساخت زبان اور خیالات کے اعتبار سے نفیس ہی کی پیروی کرتے ہیں۔وہ خود کھتے ہیں۔

جد وآباد کا چلن چھٹنے نہ پائے مجھ سے

طرز مرعوب کہن چھٹنے نہ پائے مجھ سے

عارفؔ بہت بڑے زباندان تھے۔ان کے مرثیے امتیازی درجہ کے ہوتے ہیں ۔اور یہ نہایت فصیح و بلیغ اور زوردار ہوتے ہیں۔ان کے مرثیوں میں انیسؔ اور نفیسؔ کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے،لیکن ان کا انداز بیان کچھ کمزور نظر آتا ہے۔ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ پاکستان میں ’معارف سخن‘ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔عارف نے مراثی میں انیسؔ اور نفیسؔ کے مرثیوں کی پیروی کرنے کی وجہ سے کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں کر سکے۔اور مرثیہ نگاری میں کوئی نئی راہ روش اختیار نہیں کی۔انیسؔ ودبیرؔ کی مرثیہ نگاری میں اپنائے گئے عناصر یا موضوعات پر ہی طبع آزمائی کی۔

عارف اپنے مرثیوں میں ہیرو کی سیرت اور اس پر ظلم وستم کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہیں ۔اور بین کے اشارات کچھ اس انداز سے کرتے ہیں جن میں خیالات وزبان کی سادگی بھی ہوتی ہے اور جذبات کی تخئیل بھی،اس لئے سوز گداز تیز تر ہو جاتا ہے۔جناب علی اکبرؑ کے حال کا یہ مرثیہ ملاحظہ ہو۔

آپس میں رہا کرتی تھیں باتیں یہی پہروں سب کی یہ تمنا تھی کہ جلدی یہ جواں ہوں

دل بڑھتا تھا ماں باپ کا یہ بڑھتے تھے جوں جوں جو چاہنے والے تھے وہ دیتے تھے دعا یوں

ارمان ہو پورا شہِ والا کی بہن کا

وہ دن ہو کہ اس گھر میں قدم آئے دلہن کا

وہ عورتیں جن سے کہ زیادہ تھی ملاقات آتی تھیں زیارت کے لئے اکثر اوقات

یوں دست ادب جوڑ کے کہتی تھیں وہ خوش ذات بی بی کہو فرزند کی ٹھہرائی کہیں بات

فرماتی تھیں زینب ابھی جلدی مجھے کیا ہے

ہو جائے گی شادی بھی جو منظور خدا ہے

یوں پوچھو تو پیغام گئے آئے کئی جا لیکن ابھی راضی نہیں شاہنشہِ والا

گو سب سے زیادہ مجھے اس کی ہے تمنا پر مصلحت ایسی ہے کہ ہے دیری ہی زیبا

جو دل میں ہے ان کے نہیں ظاہر وہ کسی پر

موقوف ہے یا وقت پہ یا شہ کی خوشی پر

عارف نے مرثیہ کہتے وقت مرثیہ کے تقدس کو سامنے رکھا اور ساتھ ہی ادب کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ عارف کا انداز بیان سادہ اور سہل ہے۔زبان صاف ہے۔ان کی مرثیہ نگاری روزمرہ اور محاورہ بندی کی ساتھ ایک مخصوص حالت اور کیفیت کے انفرادی انداز کے اظہارے بیان کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔

۹۔سید علی محمد شاد :

نام سید علی محمد تھا اور یہ اپنا تخلص شاؔد عظیم آبادی کیا کرتے تھے۔ان کی پیدائش ۸ جنوری ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد میں ہوئی۔ان کے والد کا نام سید اظہار حسین عرف عباس مرزا اور والدہ کا نام عارفہ بیگم تھا۔شاد نے اپنی تعلیم عظیم آباد سے ہی پوری کی اور ۱۸۹۱ء میں حکومت برطانیہ نے شاد کو خان بہادر کے خطاب سے نوازہ۔۱۸ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے اور تا عمر حکومت برطانیہ کے نامزد میونسپل کمشنر رہے۔اس کے علاوہ ایک اخبار ''نسیم سحر'' بھی نکالا تھا اور اخلاقی اور سماجی معاملات کے متعلق مختلف پرچے شائع کراتے تھے۔شاد نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۸۵۷ء سے پہلے کیا تھا۔انھوں نے رباعی، نظم اور مرثیہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ابتدا میں جب شاؔد نے ایک مرثیہ کہا تھا، جسے شاد کے چچازاد بھائی نے جب ۱۸۵۹ء میں دبیؔر عظیم آباد آئے تو وہ مرثیہ پر ان کو اصلاح کے لئے دیا۔تقریباً دوسال کے بعد دبیؔر نے وہ مرثیہ اصلاح دے کر واپس کیا۔دبیؔر کی اصلاح نے شاد کی طبیعت کو بجھا دیا اور ان کا جی مرثیہ گوئی سے ہٹ گیا۔اور پھر انھوں نے مرثیہ کہنا ترک کر کے غزل گوئی پر اکتفا کرلیا۔

شاؔد نے عمر کے آخری حصہ میں احباب کے اصرار پر دو ایک مرثیہ تصنیف کیا جسکی بہت تعریف ہوئی، پھر کچھ مرثیے اور لکھے۔اور ڈاکٹر صفدر حسین کا خیال ہے کہ شاد کے مراثی کی تعداد سو سے اوپر ہے۔جن کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار کی ہیں۔شاد کے مرثیوں میں جہاں ایک طرف میر انیؔس اور دبیؔر کے اثرات نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف عہد حاضر کے اثرات بھی نمایاں ہوتے ہیں۔انھوں نے اپنے مرثیوں کے مضامین پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور مرثیہ کے وہ حصے جو اصلیت سے قریب نہ تھے انکو حذف کیا ہے۔ان کے مراثی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک نئے قسم کا مرثیہ ایجاد کرنے کی کوشش کی ہے۔شاد نے اپنے مرثیوں کی تمہیدوں میں نئے نئے مضامین داخل کئے ہیں جو کہ روایتی مرثیوں میں نہیں نظر آتے ہیں۔شاد کی مرثیہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے شمشاد حیدر زیدی لکھتے ہیں کہ۔

> ''شاد کے ان خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک نئے قسم کا مرثیہ ایجاد کرنا چاہتے تھے۔اسے فلسفیانہ مرثیہ کہئے یا تعلیمی مرثیہ۔ان کے مرثیے ہیئت کے لحاظ سے روایتی ہیں۔لیکن روایتی راہ سے انحراف کیا ہے۔انھوں نے اپنے مرثیوں میں نئے نئے مضامین داخل کیے، جس سے معاشرے کی اصلاح ہو سکے۔ایک مرثیہ کے مقدمے میں فلسفۂ نفس کو بہ تفصیل بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسانی صفات صمدی کا مظہر

ہے اور یہی سبب ہے کہ اس کا میلان اعلیٰ ظرف ہے۔'' ۶

شاد نے اپنے مرثیے کو ایک نئے انداز بیان سے پیش کیا۔اس میں تفکر اور تصوّف کی چاشنی ملائی، اور اس طرح اسے ایک نئے انداز سے سنوارا۔ان کے کلام میں فن کے حسن اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ بیان کی خوبی بھی نظر آتی ہے۔ان کا ایک مرثیہ دکھئے۔

اے خضر شوق راہِ حقیقت بتا مجھے　　منزل پہ جو پہنچ گئے ان سے ملا مجھے
جی جاؤں جس کی بو سے وہ ساغر پلا مجھے　　جو یا ہے جس کی روح وہ عالم دکھا مجھے
آئینہ مرقعِ صدق و صفا کہیں
وہ مرثیہ سنا جسے سب مرثیا کہیں

باتیں ہوں اس طرح کی تری اے زباں پسند　　سن کر جنھیں کریں حکمائے زماں پسند
آساں نہیں ہے لفظ ومعنی کا انتظام　　نظروں میں ہوں تُلے ہوئے سب موقع و مقام
تصنیف شعر کے لئے لازم شعور ہے
تقلید بے محل سے کنار اضرور ہے

داخل مبالغہ بھی محاسن میں ہے مگر　　اتنا نہ ہو کہ نفس مطالب کا ہو ضرر
باتیں وہ ہوں، پسند کریں جن کو ذی ہنر　　آنکھوں کے آگے عین صداقت ہو جلوہ گر
اظہار مدعا میں کسی جا خلل نہ ہو
مطلب وہ کیا کہ جس کا کوئی ماحصل نہ ہو

مشکل ہے سب سے مرثیہ گوئی ہے جس کا نام　　آساں سمجھ لیا ہے زمانہ نے اب یہ کام
مذہب کی یہ بھی صنف میں داخل ہے لاکلام　　لازم یہ ہے کہ دل سے کرے اس کا احترام
مدّ نگاہ درد و غم جاں گزار ہے
گل دستہ سخن نہ بنے مرثیا رہے

شاد نے اپنے مرثیے کے قریب قریب سبھی عناصر پر طبع آزمائی کی ہے۔رخصت، سراپا اور جنگ و بین کے مناظر کو انھوں نے اپنے مرثیے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔حضرت عباس کا یہ مکالمہ دیکھئے، جس میں شاد نے المیے کے انسانی گوشوں کی ترجمانی پر اثر انداز سے کی ہے۔

خیمے میں میری لاش جو لائے امام دیں　　ہٹ جائیو خدا کے لئے تم الگ کہیں
بچوں کا بھی قیام مناسب وہاں نہیں　　نازک ہیں پھول سے بھی زیادہ یہ نازنیں

کیوں کر سہیں گے اس المِ دل خراش کو
دیکھا نہیں کبھی کسی زخمی کی لاش کو

شاد کے مرثیہ اردو مرثیہ نگاری میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی مرثیوں میں تاریخ احادیث کے بیان۔تبلیغی نظریات اور قوم کے اصلاحی مضامین ملتے ہیں۔جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ وہ روایت پسند نہیں بلکہ روایت شناس تھے۔

۱۰۔سید محمد ہاشم بہار :

سید محمد ہاشم بہار کی پیدائش ۱۸۶۴ء کو حسین آباد میں ہوئی تھے، یہ اپنا تخلص بہار حسین آبادی کرتے تھے۔ یہ ابھی تک گمنامی کے گہرے اندھیرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ بہار کو ان اندھیروں سے باہر نکالنے میں پروفیسر ذیشان فاطمی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ پروفیسر ذیشان فاطمی نے ان پر پہلا تحقیقی کام کر کے بہار کو اردو دنیا سے متعروف کرایا۔ بہار کے مرثیوں کو سات الگ الگ مقدموں کے ساتھ جابر حسین صاحب نے شائع کیا ہے۔

بہار کا پہلا مرثیہ ''ذہن رسا'' ہے جو ۱۰ مئی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔اور اسی کے دوسرے دن یعنی ۱۱ مئی ۱۹۲۰ء کو ان کا دوسرا مرثیہ ''نمودِ سخن'' شائع ہوا۔اور پھر ۱۲ مئی ۱۹۲۰ء ہی کو ان کا تیسرا مرثیہ ''کیمیائے سخن'' بھی شائع ہو گیا۔ پھر تین سال کے بعد ''خاصانِ خدا'' ۱۹۲۳ میں، ''گنج شہیداں'' ۱۹۲۳ میں، ''سرمائیہ تحسین'' ۱۹۲۴ میں، ''قصرِ جہاں'' ۱۹۲۶ میں شائع ہوا۔ان سات مرثیوں کے علاوہ ایک رباعیوں کا مجموعہ اور ایک طویل فارسی مثنوی ''نالئہ شبگر'' کے نام سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ بہار کے مرثیوں کا مجموعہ ''بہار حسین آبادی کے مراثی'' کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔

بہار کا پہلا مرثیہ 'ذہن رسا' ۱۶۰ بندوں پر مشتمل ہے۔اس مرثیہ میں فلسفئہ زندگی ،فلسفئہ صبر و اخلاق اور معاشرت وغیرہ سے متعلق موضوعات شامل ہیں۔مرثیہ میں شہادت کے تین اور بین کے صرف ایک بند ہی شامل ہیں جس سے مرثیہ میں شدت کی کمی نظر آتی ہے۔مرثیہ میں زمین کربلا پر امام حسینؑ کی آمد سے لیکر ان کی شہادت تک کے واقعات ہے۔ ذہن رسا کے علاوہ بہار کے دیگر مرثیے صرف پچاس بندوں پر ہی مشتمل ہیں۔ان کا آخری مرثیہ ''قصرِ جہاں'' ۱۵۷ بندوں پر لکھا گیا ہے۔اس مرثیہ میں ڈرامائی عنصر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔مرثیہ کی تمہید میں روزہِ عاشور جنت کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تمام پیغمبران اور حضرت علیؑ اور فاطمہؑ کربلا کے شہیدوں کے منتظر ہیں۔اس کے علاوہ اس میں حُر سے لیکر حضرت حسینؑ تک سارے شہیدوں کا استقبال اور ان سے کربلا کے حالات دریافت کئے گے ہیں۔مرثیہ میں جنت کا جو منظر بیان کیا گیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

جہاں میں قصر نبی خود بخود اداس ہیں آج — سرور کا جو محل تھا مقام یاس ہے آج
تمام قدسیوں کا ماتمی لباس ہے آج — جمال زرد ہے حوروں پہ وہ لباس ہے آج

ملک خموش ہیں چہرے کا رنگ فق فق ہے
نہ حسن ہے در و دیوار پر نہ رونق ہے
کھڑے ہیں صحن گلستاں میں دل گرفتہ شجر نہ مسکراتے ہیں غنچے نہ ہنستے ہیں گل تر
نہ سبز شاخ نہ شاداب کوئی برگ و ثمر چمن اداس، ہوا سست، دل گداز اثر
نشیمنوں سے طیور اپنے سر نکالے ہوئے
ہر اک طرف نگراں ہیں جگر سنبھالے ہوئے

بہار کے ساتوں مرثیے ساخت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جدید مرثیہ کے بانی شاؔد نے مرثیہ میں جو تبدیلیاں کیں وہ موضوع لحاظ سے تھی، انھوں نے مرثیے کے اجزاء میں کوئی بدلاؤ نہیں کیا تھا۔لیکن بہار نے جو اپنے مرثیہ میں تبدیلی کی ہے وہ موضوع اور اجزاء دونوں کے لحاظ سے کی ہے۔جمیل مظہری نے بہار حسین آبادی کے مرثیوں کو''ذہنی انقلاب'' کہا ہے۔

۱۱۔مرزا محمد طاہر رفیؔع :

مرزا محمد طاہر رفیع مرزا دبیؔر کے پوتے اور مرزا اوؔج کے بیٹے تھے۔ان کا تخلص رفیؔع تھا جو مرزا دبیر کا تجویز کردہ تھا۔ان کی پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر آغا سکندر مہدی نے ان کی سن ولادت ۲۴ جنوری ۱۸۶۸ء بتائی ہے، جبکہ سید عاشور کاظمی نے 'اردو مرثیے کا سفر' میں اسے ۱۸۷۰ء تحریر کی ہے۔

مرزا رفیع نے جب ہوش سنبھالا تو لکھنؤ کی فضا میں میر انیؔس اور دبیر کی مرثیہ کا ہی رنگ چھایا ہوا تھا حالانکہ یہ دونوں اس وقت اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔لوگ ان دونوں کی تقلید کرنا اپنی شان سمجھتے تھے۔رفیع کا زمانہ وہ زمانہ تھا جہاں انیسئے سلاست وروانی کے دلدادہ تھے وہیں دبیریے مضمون آفرینی، خیال بندی اور شکوہ الفاظ کو مرثیے کی جان تصور کرتے تھے۔اس کے علاوہ مرثیہ میں جدت کے حوالے سے غزل اور فلسفے کے نام سے دو الگ الگ راہیں قائم ہو رہیں تھیں۔ایک طرف اوؔج اور شاؔد وغیرہ تھے جو مرثیے میں فطری عنصر داخل کرنے پر زور دے رہے تھے تو دوسری طرف بہار اور ساقی نامہ کے نام پر تغزل کا اثر بڑھانا بعض لوگوں کا مقصد بن گیا تھا۔ایسے میں رفیع کے سامنے ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ کس راہ کو اپنائیں اور کس راہ کو ترک کریں۔مرثیہ پر زمانہ کا جو رنگ غالب تھا اس سے نظریں چرانا بھی مشکل تھا۔اس لیے انھوں نے اس راہ کا انتخاب کیا جسکی پیروی مرزا اوؔج کر چکے تھے۔اوج نے اپنے والد مرزا دبیر سے مرثیہ میراث میں پایا تھا اور اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی۔لیکن رفیع مرثیہ کو آگے لے جانے کے بجائے پیچھے لے آئے۔رفیع کو جہاں ایک طرف مرثیے میں نئے عہد کے بڑھتے ہوئے اثرات کا احساس تھا وہیں وہ اپنی پچھلی روایات سے بھی انحراف نہیں کر سکتے تھے۔اس ذہنی مخمصہ میں وہ مرثیہ کو جدید افکار میں نہیں ڈھال سکے اور اسے قدیم طرز پر لے آئے۔شاید یہی سبب ہے

کہ ان کے مرثیوں کو وہ کامیابی نہ حاصل ہو سکی جو اوؔج کو ملی تھی۔ ان کے مرثیہ کا یہ بند ملاحظہ ہو جسمیں انیس کا رنگ نظر آتا ہے۔

اول وقت سحر کا وہ سہانا منظر فرشِ سبزہ پہ وہ بچھتے ہوئے شبنم کے گوہر
اوس کھا کھا کے وہ نکھرے ہوئے رنگ گل تر عرقِ گل میں وہ ڈوبی ہوئی ہر شاخ شجر
نیند میں مست تھے خوشنودئے گل شبو سے
جاگ اٹھے اہل چمن قمریوں کی کو کو سے

رات کا کچھ وہ اندھیرا وہ دھند لکے کی ضیا صاف شفاف وہ میدان وہ جنگل کی فضا
لوٹتی پھرتی ہے سبزے کے بچھونے پہ صبا نکہت گل کو اڑاتی ہوئی پھرتی ہے ہوا
دامن دست کو خوشبو سے بسانے کے لئے
رنگ تازہ چمنستاں میں جمانے کے لئے

مرثیہ کا وہ بند بھی ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے مرزا دبیؔر اور مرزا اوؔج کے رنگ اور ان کی پیروی پر فخر کیا ہے۔

معرکہ جھیل لوں جس سے وہ شراب آج پلا لب شمشیر قلم سے بھی لب جام ملا
کلک مداح ہو مست مئے سر جوش ولا بد مذاقوں کے بہکنے کا نہیں کچھ بھی گلا
ان کی جھوٹی ہی سہی منھ نہ کبھی موڑوں گا
اوؔج پیتے تھے جسے میں نہ وہ مے چھوڑوں گا

نہیں ممکن ہے دبیرِ سخن آرا کا جواب چھک کے آتے تھے نہ مانگی کبھی منبر پہ شراب
اوؔج کا تھا یہ طریقہ کہ نہ وہ لا سکے تاب سیر ہونے کے لئے مانگتے تھے بادۂ ناب
ان کا پیرو ہوں میں ،صحبت کا اثر ہے ساقی
عیب کچھ اس میں نہیں یہ بھی ہنر ہے ساقی

رفیع کی انھیں خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے آغا سکندر مہدی تحریر کرتے ہیں۔

''ان کے مراثی میں قدیم وجدید امتزاج کا ایک حسین سنگم نظر آتا ہے۔ جس میں ایک طرف قدیم طرز مرثیہ کی جھلک ،لطف زبان وادا، درد واثر ہے تو دوسری طرف نئے ڈھنگ کے مضمون آفرینی کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔''[۷]

۱۲۔ مرزا جعفر علی خاں اوج لکھنوؔی:

مرزا جعفر علی خاں مرزا دبیؔر کے اکلوتے اور قابل بیٹے تھے۔ یہ اپنا تخلص اوج لکھنوؔی کرتے تھے۔ انکو بچپن سے ہی

شعروشاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ان کے عہد میں لکھنو کا مزاج اور ماحول شاعرانہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ اوج نے سولہ سال کی عمر سے ہی مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا۔اور جہاں تک شاعری کی اصلاح کا سوال ہے تو انھوں نے اصلاح شعر اپنے والد سے ہی کی۔جو کہ اپنے عہد کے بہت مشہور شاعر مرثیہ نگار تھے۔اوج نے مرثیہ گوئی کو اس حد تک مشق کر لیا تھا کہ اپنے والد کی حیات میں ہی یہ کافی مشہور ہو گئے تھے۔اپنی ایک الگ پہچان بنا چکے تھے۔

مرزا اوج علم عروض کے فن میں بھی ماہر تھے،اور اس فن میں انھوں نے ایک کتاب 'مقیاس الاشعار' کے نام سے لکھی ہے۔اوج نے تقریباً سو مراثی تصنیف کئے ہیں۔جن میں سے ایک مجموعہ 'معراج الکلام' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ان کے ابتدائی مرثیوں میں پوری طرح سے دبیریت مسلط تھی۔انھوں نے اپنے مرثیوں میں دبیریت کے تمام تر لسانی،فنی،علمی اور شعری صفات کو برتا ہے۔وہ مرثیے میں موضوع کے انتخاب اور بندش میں دبیر ہی کی مماثلت رکھتے تھے۔مگر بعد میں انھوں نے دھیرے دھیرے دبیریت کو خیر آباد کر کے انیسیت اپنا لیا۔نظر الحسن ''سبع مثانی'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> ''موجودہ زمانے کے عام مذاق اور ملک کے عام رجحان طبائع کو دیکھ کر استاذی معظمی مرزا اوج صاحب مرحوم اور مکرمی مرزا طاہر صاحب بہت کچھ مرزا صاحب کے رنگ سے الگ ہو گئے اور دونوں صاحبوں کے کلام میں ''انیسیت'' کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔''[8]

اسی سلسلے میں صفدر حسین بھی لکھتے ہیں کہ۔

> ''اس میں شک نہیں کلام انیس کی ادبی حلقوں مقبولیت اور ''موازنہ'' کی تصنیف ان کی ملک سے روشناسی اتنی بڑ گئی تھی کہ بڑے بڑے فرسودہ وضع کے پابند مرثیہ گویوں کو بھی اپنے قدیم رنگ میں جا بجا تبدیلیاں کر کے انداز انیس کی تقلید کرنی پڑی۔بہر حال اس کوشش میں مرزا اوج کے کلام میں انیس و دبیر دونوں کا امتزاج پیدا ہو گیا۔''[9]

مرزا اوج جدید مرثیہ کے پس منظر میں اپنے اسلوب اور طرز فکر کے اعتبار سے ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔شمشاد حیدر زیدی نے مرزا اوج کو جدید مرثیہ کا بانی کہا ہے۔وہ خود لکھتے ہیں۔

> '' جدید مرثیے کی جانب پہلا قدم اوج نے اٹھایا''

مرزا اوج نے جہاں ایک طرف اپنے مرثیوں میں قدیم موضوع کو جگہ دی ہے وہیں دوسری طرف انھوں نے اپنے زمانے کے مسائل اور اخلاقی پہلوؤں کو مرثیوں میں برتا ہے۔اور ساتھ ہی قومی درد اور اصلاح قوم کو بھی پیش کیا ہے۔ان کے مرثیوں کے مطالعہ سے اس زمانے کے اہم مسائل اور ان مسائل کو سلجھانے کے ساتھ ساتھ قوم کی قیادت کی

بھی ذمہ داری کا اندازہ ہوتا ہے۔اس طرح اوج وہ پہلے مرثیہ گو ہیں جنھوں نے اپنے مرثیوں میں واقعہ کربلا کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ان سے قبل مرثیہ گو حضرات مرثیے سے اس طرح کا کام نہیں لیا کرتے تھے۔اوج نے اپنے مرثیوں کے موضوعات میں تبدیلی یا اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے،اور بہار اور ساقی نامہ کو مرثیے کے لئے موزوں نہیں سمجھا۔اوج کا مرثیہ جسکو انھوں بعنوان 'نغمہ فغاں' کے تحریر کیا ہے بہت عمدہ ہے۔یہ مرثیہ ۱۳۳ بندوں میں لکھا گیا ہے۔اس مرثیہ کا کچھ بند ملاحظہ ہو

زمانے کا ہے عجب انقلاب شام وسحر ہیں شاہد اس پہ وہ آفتاب شام وسحر
غضب ہے رنگ جہاں خراب شام وسحر نمود و بود کا ہے پا تراب شام وسحر
سفیدی اور سیاہی برائے نام نہیں
جھپک گئی جو ذرا آنکھ صبح و شام نہیں

حیات وصحت وعیش دوروزہ پر ہے یہ حال کہ خواب میں نہیں آتا ہے آخرت کا خیال
یہ جانتے ہیں کہ ہر چیز کے لئے ہے زوال ہیں اس پہ عزت عقبیٰ کو کھو کے طالب مال
یہ اپنے دل میں نہ معلوم کیا سمجھتے ہیں
برا بھلے کو بھلے کو برا سمجھتے ہیں

ہے جاہلوں کا تو کیا ذکر علم کے طلبا کہ پڑھنے لکھنے کا رہتا ہے جن کو شغل سدا
ہے جن سے مسجدوں کو زیب و زین نام خدا ہے خانقاہ و مدارس کی دل میں جن کے جا
نہ جانے کیسی وہاں تربیت یہ پاتے ہیں
سند وفور جہالت کی لے کے آتے ہیں

غرض تو یہ بھی فضیلت سے بہرہ ور ہوتے فنون صنع وتجارت سے بہرہ ور ہوتے
فنون صنع وتجارت سے بہرہ ور ہوتے ادب سے خلق سے حکومت سے بہرہ ور ہوتے
مراحم اور مظالم کو یہ سمجھ لیتے
محاسن اور مکارم کو یہ سمجھ لیتے

اصول دین خدا اور فروغ دین خدا ہے علم انہیں کا علم جہل محض ان کے سوا
بغیر ان کے نہ تم ہوگے عالم و دانا ہے علم انہیں کا علم جہل محض ان کے سوا
ہو ان کے بعد اگر حوصلے طبیعت کے
ہیں فن صناعت وحرفت کے اور تجارت کے

جو قوم قوم کی دیتے ہیں بار بار صدا یہ چاہتے نہیں اپنے سوا کسی کا بھلا
رہا جو منحصر قدم فائدہ تو کیا یہ حکم ملت اسلام کا نہیں حاشا
وہ بات چاہئے نکلے نہ غیریت جس میں
ہر ایک نوع بشر کی ہو خیریت جس میں

اوج کی دنیا کافی وسیع تھی ان کے نزدیک مرثیہ نگاری یا عزاداری صرف مذہبی عقیدت مند پر ہی منحصر نہ تھی بلکہ انسانی فرائض کی ادائیگی کا بھی نام تھا۔اوج نے مرثیہ کے موضوعات میں بھی تبدیلی یا اضافہ کرنے کی ایک قابل قدر اور اجتہادی کوشش کی ہے۔انھوں نے اس عام رواج پر بھی توجہ دی ہے کہ کلاسیکی مرثیوں میں ہندی تہذیب کا رنگ بہت زیادہ ہے۔اس کے علاوہ کردار نگاری کی اصلاح اور تاریخی تنقید پر بھی توجہ دی ہے اور غلط روایتوں سے پرہیز کیا ہے۔انھوں نے اپنے مرثیوں میں بیان واقعات تسلسل کے ساتھ نہیں بلکہ جذبات کے دھارے پر سفر کیا ہے۔لیکن ترتیب وتہذہب کو بیانیہ سے الگ بھی نہیں ہونے دیا ہے۔اوج نے مرثیہ میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی اور جہاں تک ہو سکا اس میں تبدیلی بھی لائی۔ان کے یہاں مرثیوں میں جہاں مقصدیت موجود ہے وہیں عقیدت کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔لیکن طرز بیان میں شاعرانہ لطافتوں کا امتزاج ملتا ہے۔اوج کو تاریخ کا گہرا شعور تھا اس لئے انھوں نے مرثیوں سے ضعیف روایتوں کو ترک کر دیا۔ان کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے محمد رضا کاظم لکھتے ہیں کہ۔

''اوجؔ کے یہاں جدّت طرازی کے بہت پہلو ہیں اور ہر پہلو جدید مرثیہ کے حق میں ایک نیک فال ثابت ہوا۔جدید مرثیہ میں سیاسی اور فکری شاعری کے جو دو اہم دھارے بہہ رہے ہیں ان دونوں کا سر چشمہ اوج ہی کا کلام ہے۔''[۱۰]

۱۳۔میر محمد علی مسرور :

میر محمد علی مسرورؔ کی پیدائش ۱۸۷۷ء کو حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ان کے والد کا تعلق دہلی سے تھا،مگر ملازمت کے سلسلے میں ان کو حیدر آباد جانا پڑا جہاں مسرور پیدا ہوئے۔مسرور نے جب شاعری کی ابتداء کی تو اپنی اصلاح اشعار 'ناجی' سے لیا کرتے تھے۔مسرور نے تقریباً چالیس مرثیوں کی تخلیق کی ،جس میں مرثیہ کے تمام اجزاء موجود ہیں۔ان کے مرثیے میں عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں ،جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مسرور کو ان دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔اس سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مرثیوں میں کثرت سے عربی وفارسی کا استعمال ان کے استاد 'ناجی' کے اثر کا نتیجہ ہے۔

موضوع کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مسرور کے مرثیوں میں حضرت عباسؑ ،امام حسینؑ ، جناب زینبؑ ،علی اکبرؑ اور حضرت قاسمؑ جیسے موضوع موجود ہے۔ان کا ایک مرثیہ حضرت عباسؑ کی جنگ اور شہادت کے حوالے سے ملتا ہے،

جو۱۱۵ بندوں پر مشتمل ہے۔اس کا ایک بند دیکھئے۔

مری فغاں سے کھلا رایت جنود وفا　　مرے وجود نے قائم کیا وجود وفا
جہاں میں ہے مری ہستی سے ہست و بودوفا　　مری نمود سے ثابت ہوئی نمود وفا
نہیں ملال جو دنیائے پر جفا چھوٹے
نہیں یہ ہاتھ اگر دامن وفا چھوٹے

اب ذرا جنگ کے یہ بند ملاحظہ ہو۔

جھپٹ جھپٹ کے بھگاتا ہے فوج کو ضیغم　　لپٹ لپٹ کے اجل سے شریر دیتے ہیں دم
دپٹ دپٹ کے دکھاتا ہے شیر اک عالم　　سمٹ سمٹ کے فنا ہو رہے ہیں اہل ستم
گرے ہوئے سپہ بد یقیں کے جھنڈے ہیں
ہوا کی تیغ سے ناری تمام ٹھنڈے ہیں

مسرور کی مرثیہ نگاری کے بارے میں رشید موسوی اپنی کتاب ’دکن میں مرثیہ اورعزاداری‘ لکھتے ہیں کہ :

’’مسرور کے کلام میں ان کی علمیت اور تاریخی واقعات پر عبور اور تحقیق کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔وہ جب تک کسی روایت کے متعلق خود تحقیق کر کے مطمئین نہ ہوں جائیں اسے نظم نہیں کرتے تھے۔ان کے مرثیوں میں بین اور واقعہ نگاری اعتدال سے بڑھنے نہیں پاتے۔بین میں اشاروں اور کنایوں سے زیادہ کام لیتے ہیں۔‘‘[۱۱]

مسرور جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے استاد بھی تھے۔ان کی شاگردگی میں دکن کی مشہور مرثیہ گو’باقر امانت خانی‘اور’سعادت علی رضوی‘ تھے۔ان کے پانچ مرثیے باقر امانت خانی کے فرزندوں نے۱۹۹۶ئمیں شائع کروائے تھے۔ مسرور مرثیہ کے علاوہ نوحے بھی لکھا کرتے تھے،ان کے نوحے دو حصوں میں شائع ہو چکے ہیں۔جو حیدرآباد میں کافی مشہور تھے۔

۱۴۔دلورام کوثری :

دلّو رام نام اور تخلص کوثری تھا۔ان کی پیدائش ۱۸۸۳ء کو قصبہ لاندھئر ضلع حصار میں ہوئی تھی۔ان کے والد کا نام بھورارام تھا۔یہ خاندان سے چوہان تھے۔دلورام ہندی اور اردو کے علاوہ فارسی اور عربی زبان بھی بخوبی جانتے تھے۔ان کی تصنیفات سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں موجود ہیں۔وہاں ان کی چار کتابیں ملتی ہیں،آب کوثر،بشارت انجیل،اعجاز جعفری اور قرآن اور حسین۔’قرآن اور حسین‘ان کی مرثیہ ہے،جس میں قرآن اور حسینؑ کا تقابل کیا گیا ہے۔اس مرثیہ کی سنِ تصنیف کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر صفدر حسین کے مطابق یہ مرثیہ ۱۹۱۸ء سے قبل تحریر کی گئی تھی تو ہلال

نقوی نے اسے ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۵ء کے درمیان کی تحریر بتائی ہے۔امیر علی جونپوری اور ڈاکٹر سید قمر عابدی کے مطابق دلو رام نے یہ مرثیہ ۱۹۲۸ء میں موچی دروازے کی مجلس میں خود پڑھا تھا۔اس کے علاوہ ان کے چار۔ پانچ مرثیوں کا ذکر اور بھی ملتا ہے،لیکن جو مقبولیت ’قرآن اور حسین‘ کو حاصل ہوئی اور کسی کے حصہ میں نہ آسکی۔

دلّو رام کوثری ایک غیر مسلم ہونے کے باوجود جدید لب ولہجہ کا ’قرآن اور حسین‘ جیسے عنوان کے تحت مرثیہ کہا ہے۔انھوں نے ’قرآن اور حسین‘ جیسا مرثیہ لکھ کر اپنے عہد کے حوالے سے ایک جرآت مندانہ قدم اٹھایا ہے۔یہ مرثیہ روایتی مرثیوں کے انداز سے ہٹ کر لکھا گیا ہے۔اس میں مرثیہ کے اجزاء جیسے سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ اور شہادت کا بیان نہ کر کے قدیم مرثیہ کی روایت کو توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس مرثیہ کا موضوع مقصد شہادت حسینؑ بتانا یا قومی مسائل یا انقلاب نہیں ہے بلکہ اسکا موضوع حسینؑ اور قرآن کا تقابل ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ یہ مرثیہ دوسرے مرثیوں سے انفرادیت رکھتا ہے۔’’قرآن اور حسینؑ‘‘ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کم لوگوں نے قلم آزمائی کی ہے۔اس مرثیہ میں قرآن اور حسینؑ کا آپسی رشتہ اور ان کا رتبہ بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

قرآن اور حسین برابر ہیں شان میں　　دونوں کا رتبہ ایک ہے دونوں جہان میں
کیا کیف ان کا ہو کہ ہے لکنت زبان میں　　پیہم ندا یہ غیب سے آتی ہے کان میں
قرآں کلام پاک ہے شبیرؑ نور ہے
دونوں جہاں میں دونوں کا یکساں ظہور ہے

ہادی ہے ایک ،ایک ہدایت کی ہے کتاب　　شافع ہے ایک ،ایک شفاعت کی ہے کتاب
اک ہے امام، ایک رسالت کی ہے کتاب　　حضرت کا یہ نواسہ،وہ حضرت کی ہے کتاب
ان دونوں پر تمام فضائل تمام ہیں
دونوں یہ بوسہ گا ہ رسولؐ انام ہیں

شبیرؑ بے مثال ہے قرآں ہے لا جواب　　اک ان میں منتخب ہے تو اک ان میں انتخاب
ہیں خانہ خدا میں رسولؐ فلک جناب　　اس زانو پر حسینؑ ہیں اس زانوں پر کتاب
قرآں ہے اس بغل میں حسینؑ اس بغل میں ہیں
دونوں شریک آپ کے علم و عمل میں ہیں

قرآں اگر حسین کو کہیے تو ہے بجا　　اصغرؑ دل حسینؑ ہے یٰسین کبریا
یوسف کا سورہ ہے علی اکبرؑ سا مہ لقا　　سقائے آل سورۂ کوثر ہے واہ واہ
الکہف اگر حبیب امام غیور ہے
حُر دلیر سورۂ توبہ ضرور ہے

مرثیہ میں دلورام نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے احادیث اور روایات کا سہارا لیا ہے۔مرثیے کے مطالعہ سے اہلبیت اور اسلامی اصول کے بہت سے گوشے قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔اس میں ''قرآن اور حسینؑ برابر ہیں شان میں'' کو دلّو رام ۲۱ بندوں تک تو ثابت کرتے ہیں مگر اس کے بعد کے بندوں میں وہ ''قرآن سے حسینؑ زیادہ ہیں شان میں'' کی دلیل دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

قرآں میں وصفِ سبط نبی ہے لکھا ہوا　　ممدوح کا ہے مدح سے رتبہ بڑھا ہوا
ہے رحل پر کلامِ مقدس دھرا ہوا　　دستِ نبیؐ پہ ہے گل زہرا کھلا ہوا
قرآں بغل میں دوش پہ زہرا کا لال ہے
قرآن سے حسینؑ کا رتبہ کمال ہے

مرثیہ کی زبان صاف اور سادہ ہے۔مرثیہ میں موضوع تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اور پورا مرثیہ قرآن اور حسینؑ کے مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔اس طرح اردو جدید مرثیہ نگاری میں دلّو رام کا نام بھی اپنی منفرد پہچان رکھتا ہے۔

۱۵۔میر مہدی علی شہید یار جنگ شہید :

میر مہدی شہید یار جنگ شہید حیدرآباد میں ۱۸۸۴ء (۱۳۰۲ھ م) میں پیدا ہوئے۔ان کے جد اعلیٰ سید زین العابدین ہمدم طباطبائی، مہاراجہ چندو لعل شاداں کے زمانے میں شیراز سے حیدرآباد آئے تھے اور مہاراجہ نے انھیں اپنے استاد کی حیثیت سے بھی مقرر کیا تھا۔لہذا شہید کو شاعری کا ذوق وراثت میں ملا تھا۔جس کی شروعات انہوں نے نوحہ اور سلام سے کی تھی۔انھوں نے پیارے صاحب رشید کو اپنا استاد تسلیم کیا لیکن ساتھ ساتھ نظم طباطبائی سے بھی صلاح و مشورہ لیتے رہے۔ان کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا۔

اردو ادب و شاعری میں شہید کا نام خاص طور پر اہلِ تشیع حضرات کے لئے تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ان کی غزلیں اور رباعیات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔شہید کے رباعیوں کا مجموعہ ''تسبیح خیال'' اور مجموعۂ سلام ''صد سلام (حصۂ اول دوم وسوم)'' شائع ہو کر کافی مقبول ہو چکے ہیں۔جو اہلبیت اطہار کے جذبۂ عقیدت سے لبریز ہیں۔

مراثی شہید کی صحیح تعداد آج تک معلوم نہیں ہو سکی ہیں۔لیکن ان کی مرثیہ گوئی کا ذکر ''دکن میں اردو''، ''صد سلام (حصۂ دوم)'' اور ''مرقع سخن'' وغیرہ میں مل جاتا ہے۔ڈاکٹر رشید موسوی کے تحریر کے مطابق شہید نے صرف ایک مرثیہ کہا ہے جو ۷۴ بند پر مشتمل ہے۔اس مرثیہ میں انھوں نے امام حسین علیہ السلام کے فضائل و مناقب بیان کئے ہیں لیکن زیادہ زور فضائل پر دیا ہے۔درج ذیل مثال غور فرمائیے:

ناز حیدر کو بھی ہے جس پہ شجاعت ایسی　　لاش اکبر کی اٹھا لیتے ہیں قوت ایسی
فوج سے جنگ پہ آمادہ ہیں ہمت ایسی　　آنکھیں لشکر کی جھکی جاتی ہے ہَیبت ایسی

دل کو جنبش ہی نہیں تیغوں کی جھنکاروں میں
شکر کے سجدے کئے جاتے ہیں تلوار میں

اس بند میں انھوں نے امام حسین علیہ السلام کی ہمت، دلیری اور شجاعت کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے واقعات کربلا کی طرف اشارے کیے ہیں۔شہید کے مرثیوں میں مرقع سخن کے بہار یہ بند ملاحظہ ہو:

یہ نہ آئے گا کسی اور کے بہکانے میں — ہوش اتنے ہیں ابھی ہاں ترے دیوانے میں
تو پلانا نہ کسی کو میرے پیمانے میں — ندیاں خون کی بہہ جائیں گی میخانے میں
غیر بھی ہیں نہ بس اب دور خبردار چلے
میکدہ میں تری مرضی ہے کہ تلوار چلے

جوش خوں بڑھ گیا پھر زخم جگر کے آگے — میرے سینہ پہ ابھر آئے ہیں دل ے چھالے
مست ہیں جھومتے ہیں آج ترے متوالے — ودی اودی وہ گھٹا ابر وہ کالے کالے
چار جانب سے صدا آتی ہے لا اور پلا
ہاں پلا اور پلا ، اور پلا اور پلا

یہاں اس بند میں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ پیارے صاحب رشید کا اثر شہید کی شاعری پر کتنا ہے۔خاص طور پر بیت کے آخری مصرع میں شہید کے یہاں روایتی انداز نمایاں نظر آتا ہے۔شہید نے غزل ترک کر دی تھی اور سلام کثرت سے کہتے تھے۔جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مزاج میں تغزل کا رجحان زیادہ تھا ورنہ سلام کی طرف نہ جاتے۔نجم آفندی اس سلسلے میں ''صد سلام'' کے تعارف میں لکھا ہے کہ ''شہید نے تو اپنی ہستی کو سلام کے لیے وقف کر دیا ہے۔'' شہید کے مراثی میں غزل کی چھاپ بھی دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے دو ہی مرثیے کہے ہیں۔

۱۶۔سید اولاد حسین شاؔعر :

نام سید اولاد حسین عرف للن تھا اور تخلص شاؔعر تھا۔ان کی پیدائش ۱۸۸۹ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔شاعر بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔اس لئے ان کی ذات میں بیک وقت کئی صفات خدا نے جمع کر رکھی تھیں۔وہ ایک عالم دین، خطیب اور شاعر ہی نہیں تھے بلکہ تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔انھوں نے اپنی مرثیہ گوئی کا آغاز اس وقت کیا جب مرثیہ گو جدید مرثیہ نگاری میں ایک نیا رنگ پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔شاعر نے بھی اپنی مرثیوں میں تاریخ کا رنگ بھرا، اور اپنی ایک منفرد جگہ بنالی۔انھوں نے ایک مرثیہ ایسا لکھا جس کا عنوان انھوں نے ''تاریخی مرثیہ'' رکھا۔اس مرثیہ میں انھوں نے تیمور کا ذکر بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔بند ملاحظہ ہو۔

کوئی چرواہا کہے کوئی گدا و مزدور ہم کہیں فاتح چین ہوش ربائے فغفور
ایشیا کے سر اقبال کا دیہیم غرور ذرۂ خاک در حیدر صفدر تیمور
اس نے شبیر کا غم ہند میں منوایا ہے
تعزیہ تاج کی جا، سر پہ لئے آیا ہے

ایک تربت بنی پھر خاک شفا کی سر دست زندگی بھر رہا تیمور مئے عشق میں مست
اپنے ہی دعوے سے ہوتی ہے مورخ کو شکست کون اس کو کہے ظالم جو ہو مظلوم پرست
چتر کا سایہ تھا، تلواروں کے یا ں سائے تھے
اس طرح ٹھاٹھ سے دہلی میں حسینؑ آئے تھے

اس بند کا یہ مصرعہ ’’کون اس کو کہے ظالم جو ہو مظلوم پرست‘‘ نے برسوں سے لکھی جانے والی روایت کو جھٹلا دیا ہے۔ان کا ایک اور مرثیہ بھی ملتا ہے جس میں انھوں نے عزاداری کے حوالے سے مضمون لکھے ہیں۔اس مرثیہ میں تاریخ عزاداری کے ذیل میں نور جہاں، چاند بی بی، خان خاناں، عرفی، بہرام فیض اور غفران مآب جیسی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔اس مرثیہ کی ابتداءاس بند سے ہوتی ہے۔

تھا وہ اک عہد کہ معروف تھے مشہور تھے ہم گوہر منتخب دیدۂ جمہور تھے ہم
کہیں سلطاں کہیں حاکم، کہیں دستور تھے ہم اور جہاں کچھ بھی نہ تھے کام کے مزدور تھے ہم
صبح سے دھوپ میں ہنگام شفق آتا تھا
سائے کے نام سے ماتھے پہ عرق آتا تھا

شاعرلکھنوی کا عہد ایک ایسا عہد تھا جہاں ہر مرثیہ گو شاعر اپنے مرثیے کو جدید کہلواتا تھا لیکن حقیقتی صورت حال یہ تھی کہ چند کو چھوڑ کر باقی سبھی پرانی روش کی ہی پیروی کرر ہے تھے۔اس عالم میں شاعر نے تاریخ کو مرثیہ میں سمونے کی کوشش کی۔اور اس میں احتیاط واعتدال کو بھی راہ دی۔شاعرلکھنوی نے جدید مرثیے کے خاکے میں جو رنگ بھرے وہ آج بھی صاف نظر آتے ہیں۔اس کی مثال ان کا ایک مرثیہ ’’مزدور‘‘ ہے۔یہ مرثیہ ۸۸ بندوں پر مشتمل ہے۔جس میں شاعر نے مزدور اور مزدوری کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔اور مزدور کی محنت کو باعث افتخار بشر مانا ہے۔اور یہ مانتے ہیں کہ اگر مزدور نہ ہو تو دنیا کی ساری ترقی اور خوشحالی ماند پڑ جائے۔مزدوروں کی عظمت مرثیہ کے اس بند سے لگائی جاسکتی ہے۔

فاقہ کش بھی تھے نبیؐ فاتح ومنصور بھی تھے عزت خاک بھی تھے مطلع و النور بھی تھے
ان کے گھر دولت کونین سے معمور بھی تھے حق کے محبوب بھی تھے، خلق کے مزدور بھی تھے
ہو اشارہ تو قمر شق ہو رسالت ایسی

سنگ خندق میں اٹھائے ہیں مشقت ایسی

کاٹتے جاتے ہیں خندق میں زمینوں کے طبق رنگ رخسار کہ کھلتے ہوئے لالے کا ورق

بے کتاب اہل عمل کے لیے محنت کا سبق تخم تھا عزت مزدور کا ماتھے پہ عرق

تھا یہ مقصد کہ عرق میں سر و سینہ بھیگے

پھر نہ مزدور کا دنیا میں سفینہ ڈوبے

مزدوروں کی اہمیت بتانے کے لئے شاعر نے اس مرثیہ میں وہ تمام برگزیدہ شخصیتوں کی مثال دی ہے جن کے دم سے نبی آدم، فخر آدم کو بلند ترین اعزاز سے سرفراز ہو چکی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، رسول اکرمؐ، حضرت علیؑ سے لے کر حضرت فاطمہ اور کربلا میں حضرت حسینؑ اور ان کے رفقاء اور اہل بیت کی ثابت قدمی کو تاریخی حقائق کے ساتھ بڑے پر اثر انداز میں بیان کر کے شاعر نے ایک نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔

۱۷۔ غلام عباس ناصر زید پوری :

غلام عباس ناصر زید پوری، زید پور بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی لیکن حیدر آباد منتقل ہو گئے اور محکمۂ تعلیمات میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۸ء تک انھوں نے خدمت انجام دیں اور اور وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔ اپنے عمر کے اواخر تک ناصر علمی مشاغل میں مصروف رہے اور ۱۹۶۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے علمی مشاہدے کی بدولت ان کے شعری صلاحیتیں نکھرتی چلی گئیں اور رفتہ رفتہ انھوں نے مرثیہ نگاری میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ انھوں نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۵ء میں لکھا جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ناصر نے سو سے بھی زائد مرثیے کہے ہیں جس کی اصلاح ورفیع سے لیتے تھے۔ یہ وہ رفیع ہیں جو دبستانِ دبیر سے تعلق رکھتے تھے اور اوج کے جانشین کہے جاتے تھے۔ رفیع کے بعض مراثی بہت طویل ہے جس کی وجہ سے ان کے مراثی کو بہت مقبولیت ملی اور وہ اہم مرثیوں میں شمار کیے جانے لگے۔

ناصر کے بعض مرثیوں مین صرف چہاردہ معصومین کے فضائل و مناقب ملتے ہیں اور چند مراثی وہ ہیں جن میں واقعات کربلا کو دل پذیر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ درج ذیل بند ملاحظہ فرمائیے:

خلد سے باغ شہادت میں ہوا آتی ہے اصل میں جو ہے بقا بعد فنا آتی ہے

دیدہ دل کو نظر شان خدا آتی ہے کہ حیات ابدی بن کے قضا آتی ہے

جان دے دیتے ہیں خالق کی رضا کی خاطر

وہی زندہ ہیں جو مرتے ہیں خدا کی خاطر

درج بالا بند میں واقعات کربلا اور شہدائے کربلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے شہدائے کربلا کی عظمت، ان کی اہمیت اور ان کے رتبہ کی اہمیت کو بتایا ہے۔ یہ بند غور فرمائیے:

بس ایک دن میں تمام انبیاء کا کام کیا	وفا کا کام کیا ماسوا کا کام کیا
خدا کا بندہ تھا لیکن خدا کا کام کیا	کبھی رسول کبھی مرتضیٰ کا کام کیا

یہی سبب ہے شہہ مشرقین ہو نہ سکا
جہاں میں کوئی جواب حسین ہو نہ سکا

اس بند میں شاعر امام حسین علیہ السلام کے فضائل اور ان کی عظمت پر پُر جوش محبت و والہانہ عقیدت کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے اور صرف ایک ہی مصرعہ میں وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے جس بات کے لیے ہزاروں اشعار بھی کم پڑھ جاتے۔۔۔

بس ایک دن میں تمام انبیاء کا کام کیا

اس ایک مصرعہ میں شاعر یہ کہہ گیا کہ جس کام کے لئے اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے ہیں (یعنی دینِ حق کا کام) وہی کام حضرت امام حسین علیہ السلام نے محض ایک دن میں پورا کر دیا۔ دکن کی مرثیہ گوئی کی تاریخ میں ناصر ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے بیشتر مرثیے آزادی سے قبل لکھے ہیں اور دکن میں مرثیہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

۱۸۔ نجم آفندی :

اردو کے بڑے شعراء میں نجم آفندی کا شمار بھی ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش اکبرآباد (آگرہ) میں ۱۸۹۲ء میں ہوئے۔ ان کو بھی شاعری وراثت میں ملی۔ نجم آفندی کے جداعلیٰ مرزا فصیح جو کہ ترک وطن کر کے مکہّ چلے گئے تھے، اور ترکی حکومت نے انھیں آفندی کا خطاب دیا اور وہیں سے ان کے خاندان میں آفندی کا لقب تحریر کیا جانے لگا۔ نجم آفندی کے والد برؔم آفندی کا شمار بھی اردو کے بڑے شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کا یہ شعر جو کہ بہت ہی مشہور ہوا ملاحظہ فرمائے۔

ایک شب عرش پر محبوب کو بلوا ہی لیا
یہ وہ غم ہے خدا سے بھی اٹھایا نہ گیا

نجم آفندی نے اصلاح بیت بھی والد برؔم آفندی سے ہی لی۔ نجم آفندی نے مرثیے ہی تحریر نہیں کئے بلکہ اس کے علاوہ نظم، غزل، رباعی، سلام اور نوحے بھی کہے ہیں جو کہ بہت کامیاب ہوئے۔ مرثیہ نگاری کے تعلق سے دیکھا جائے تو ان کے تین مرثیے ملتے ہیں جن میں دو مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ مرثیہ ہے۔ ان کا پہلا مرثیہ ''فتح مبین'' ۱۹۴۳ء میں تحریر کیا۔ یہ مرثیہ بیانیہ ہے، جس میں انھوں نے رزمیہ اور بزمیہ دونوں رنگ کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ ''فتح مبین'' کے تعلق سے ڈاکٹر

سید قمر عابدی لکھتے ہیں۔

''نجم آفندی کا یہ مرثیہ اپنے آہنگ کے اعتبار سے ایک غیر معمولی مرثیہ ہے حالانکہ بیانیہ اور مبصرانہ ٹکنیک جو اس مرثیہ میں انھوں نے نئی استعمال کی ہے جدید مرثیے کے حوالے سے منفرد نہیں ہے۔ مگر اسلوب ضرور منفرد نظر آتا ہے'' ۱۲

نجم آفندی نے ''فتح مبین'' میں جدید مرثیہ کے سارے لوازم کو یکجا کر کے پیش کیا ہے شہادت عظیم کی سیاسی اور فکری تشریح میں انھوں نے جس بلاغت سے کام لیا ہے اور آرائش کی جو موزونیت انھوں نے پیش کی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

جب لے لیا حسینؑ نے میدان کربلا بدلا لہو سے رنگِ گلستانِ کربلا
تھا وقتِ عصر اور ہی عنوانِ کربلا کوتا تھا فرشِ خاک پہ مہمان کربلا
بے سر تھا قتل گاہ میں لاشہ پڑا ہوا
بالیں پہ فتح حق کا تھا جھنڈا گڑا ہوا

عالم میں بے مثال ہے یہ کربلا کی جنگ یکساں وغا کی بندہ و آقا کی تھی امنگ
کچھ سن کا امتیاز نہ تفریق نسل و رنگ حق کی صلائے عام تھی میدان تھا نہ تنگ
ہر باوفا حسینؑ کے قدموں پہ سو گیا
آقا کا خوں غلام کا خوں ایک ہو گا

ان کا دوسرا مرثیہ ''معراج فکر'' جو کہ ۷۳ بندوں میں مشتمل ہے۔ جس میں سیاسی اور عصری رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے امام حسینؑ کی قربانی کے مقصد کو غریب قوم کے جینے کے حق سے جوڑ کر شخصیت امام حسینؑ کو آفاقی پیمانے تک پہنچایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہر قوم میں ہے جس کی شہادت کا احترام دنیا میں جس کا نام ہے اک مستقل پیام
اس درجہ اس ذکر ہے مقبولِ خاص و عام ہر اک زباں کے شعر و ادب میں ملا مقام
تقریر و نظم و نثر کی کچھ انتہا نہیں
اب تک کسی کا تذکرہ اتنا ہوا نہیں

صدیوں سے جس کی مدح سرائی کا دور ہے ہر دور میں مسئلۂ فکر و غور ہے
اس باب میں سکوت طبیعت پہ جور ہے محرومِ درد ہو کوئی یہ بات اور ہے
واہل دل ہے دست نگر کربلا کا ہے
ہر ملک کے ادب پہ اثر کربلا کا ہے

نجم آفندی کے مرثیے فکری اور کامیاب ترین مرثیے ہیں ،جس سے واقعات کربلا، کردار امام حسینؑ اور مقصد شہادت امام حسینؑ کے حوالے سے فکر کے گوشے کھولتے ہیں۔اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ نجم آفندی کے مرثیے کم ضرور ہیں لیکن یہ بھی جدید مرثیے کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۹۔سید آل رضا :

اردو کے نامور شاعر سید آل رضا ۱۰ جون ۱۸۹۶ء کو اناؤ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد سید محمد رضا اودھ چیف کورٹ کے اولین پانچ ججوں میں شامل تھے۔سید آل رضا نے ۱۹۱۶ء میں کنگ کالج لکھنؤ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی، اور ۱۹۲۰ء میں الہ آباد سے ایل ایل بی پاس کر کے لکھنؤ چلے گئے اور وہاں وکالت شروع کی۔۱۹۲۱ میں وہ پرتاپ گڑھ چلے گئے اور پھر ۱۹۲۷ میں واپس لکھنؤ آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔تقسیم کے بعد یہ پاکستان چلے گئے اور اپنی ساری عمر وہیں بسر کی۔

یوں تو آلِ رضا نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی۔اور غزل کا آغاز پرتاپ گڑھ سے ۱۹۲۲ میں کیا۔آل رضا پرتاب گڑھ سے ہی آرزو لکھنوی سے خط کتابت کے ذریعہ اپنی شاعری کی اصلاح لیا کرتے تھے۔۱۹۲۹ میں ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''نوائے رضا'' کے نام سے شائع ہوا۔اور ۱۹۵۹ میں ان کی شاعری کی دوسرا مجموعہ ''غزل معلیٰ''، کراچی سے شائع ہوا۔اور پھر یہ بعد میں مرثیہ نگاری کی طرف متوجہ ہو گئے اور بہت کم غزلیں کہیں۔اور تمام تر صلاحیتیں نوحہ ومرثیہ کے لئے وقف کر دی۔۔اگر ان کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی غزلوں میں بھی واقعات کربلا کی گونج سنائی دیتی ہے۔

زباں حرفِ دعا،سجدے میں سر اور خاک پر سجدہ
ہوئے ہوں گے کم اتنے خیر مقدم تیغ قاتک کے

☆☆

اے رضا پڑھ لو محبت کی نماز آخر
عصر کا وقت ہے خورشید لب بام آخر

۱۹۳۹ میں انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ ''شہادت سے پہلے'' کے عنوان سے لکھا۔اور دوسرا مرثیہ ۱۹۴۲ میں لکھا جس کا عنوان ''شہادت کے بعد'' تھا۔ان کے یہ دونوں مرثیہ ۱۹۴۴ میں لکھنو میں ایک ساتھ شائع ہوئے۔قیام پاکستان کے بعد نور باغ کراچی میں انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ 'شہادت سے پہلے' پڑھا۔اور اس طرح وہ پاکستان کے پہلے مرثیہ گو قرار پائے گئے۔۱۹۴۴ میں انھوں نے اپنا تیسرا مرثیہ ''بہار پر ہے زمانہ نزول قرآں کا'' لکھنا شروع کیا جس کو تقسیم ہند کے بعد کراچی میں مکمل کیا۔ان کے بیس مرثیوں کا مجموعہ ''مراثی رضا'' کے نام سے خراساں اسلامک ریسرچ سنٹر، کراچی سے ۱۹۸۱ء میں

شائع ہوا۔

آل رضا نے اپنے مرثیے میں قدیم روایت کے مطابق یعنی چہرہ، رخصت، رجز، جنگ، شہادت اور اس کے دیگر اجزائے مرثیہ کو ملحوظ نہیں رکھا۔ بلکہ اپنے مرثیہ کو نیا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیہ کے فن کے بارے میں کچھ یوں کہا ہے۔

ہر اک زمانے میں اجزاء مرثیہ بدلے تے ایک دور ہی میں مرثیوں کے رنگ نئے
کہو ضرور کہو جو بزرگ کہتے تھے مگر کچھ اپنی طرف سے بھی خاص بات رہے
کلام غیر کو اپنا لیا تو کیا حاصل
ادل بدل کے وہی کہہ دیا تو کیا حاصل

آل رضا مرثیہ میں جہاں جدید رنگ کے پیروکار دکھائی دیتے ہیں تو وہیں مرثیہ کی قدیم لوازم کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کی مرثیہ کے متعلق سید عاشور کاظمی لکھتے ہیں۔

''سید آل رضا زرخیز ذہن اور عمیق فکر کے شاعر تھے۔ انھوں نے جدید مرثیے کی تھیوری کو نہ صرف سمجھا بلکہ اس کی وکالت بھی کی لیکن عمل میں قدیم مرثیے کے لوازم سے رشتہ نہیں توڑا۔''۱۳۱

آل رضا نے اپنے پہلے مرثیہ 'کلمۂ حق' میں شہادت کے اسباب اور اس کے نتائج اور دور رخوں کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں اجزائے مرثیہ سے گریز کیا گیا ہے۔ یہ مرثیہ ۷۲ بندوں پر مشتمل ہے۔ ان کا دوسرا مرثیہ جس کا عنوان ''قافلہ آل محمد سوئے شام چلا'' چونکہ تحریک آزادی کے زمانہ شباب میں کہا گیا تھا اس لئے اس مرثیے میں قومی و سیاسی دونوں ہی طرح کے جذبات کارفرماں دکھائی دیتے ہیں۔ آل رضا کے اس مرثیہ میں فلسفیانہ شعور صاف طور سے نمایاں ہے۔ ان کا ایک اور مرثیہ ''عظمت انساں'' جو ۱۹۶۶ میں شائع ہوا ہے۔ اس مرثیہ میں انھوں نے سیاست سے الگ ہو کر فلسفہ کی وادی میں قدم رکھا ہے۔ اس میں انھوں نے خودی کے مسلئے پر اظہار خیال کیا ہے۔ عشق کو عقل پر فوقیت دینے کے قائل نہیں، وہ انسان کی خواہشات کو اس کے ارتقائی مقاصد کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اس مرثیہ کا یہ بند دیکھئے۔

قرآن دے رہا ہے وہ دستور ذی حیات شایان زندگی ہو کہ ہے زندگی کی بات
کیسی حدوں میں رہ کے بنائے گئے صفات جنسی تعلقات، معاشی معاملات
کیا جرم و احتیاط ہے کیا آن بان ہے
اسلام اعتدال برتنے کی شان ہے

۲۰۔جوشؔ ملیح آبادی :

جس طرح اوجؔ اور شادؔ نے مرثیے میں جدت لانے کی کوشش کی اسی طرح جوش نے بھی مرثیے میں نئے تجربات کر کے اپنا منفرد مقام بنایا۔ان کا پورا نام شبیّر حسن خاں اور تخلص جوشؔ تھا۔انکی ولادت ۵ دسمبر ۱۸۹۸ءکوملیح آباد میں ہوئی۔ خاندان میں پہلے سے ہی شعروشاعری کا چرچا تھااس لئےمحض نوسال کی عمر سے ہی انھوں نے شاعری شروع کردی تھی۔ جوش نے بیشتر شعری اصناف میں تجربات کئے جس سے انھیں ''شاعرانقلاب'' کے لقب سے نوازہ گیا۔انھوں نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا وہ دورانگریزوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد کا تھا۔جوش کی مرثیہ نگاری کے تعلق سے عقیل رضوی اپنی کتاب ''مرثیے میں سماجیت'' میں لکھتے ہیں۔

''ان حالات میں جوش کی مرثیہ نگاری کا آغاز ہوا۔وہ پہلے شاعر تھے،جنھوں نے
مرثیے میں انقلاب اورقومی آزادی کے تصورکورواج دیا۔''[۱۴]

جوش کے مرثیے کواندرونی ترتیب اورمضامین کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وہ قدیم مرثیوں سے بہت مختلف ہیں۔انھوں نے مرثیے میں نظم کی تکنیک استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ہیئت کے تعلق سے دیکھا جائے تو جوش نے مسدس کوہی مرثیہ کی سب سے بہترین ہیئت بتایا ہے۔اس کے علاوہ ایک بات اور جو جوش کوانیسؔ اور دبیرؔ سے الگ کرتی ہے وہ یہ کہ مرثیہ کے لئے مسدس کی ہیئت کومخصوص کردینا میرخلیقؔ،میرانیسؔ اورمرزادبیرؔ کا کارنامہ ہےلیکن اس ہیئت میں اورنئےشعوروفن کےساتھ ساتھ نئے مسائل زندگی کااضافہ کرنا جوش کی دین ہے۔

جوش نے مرثیہ کےعلاوہ نظمیں،سلام قطعےاوررباعیاں بھی تحریر کی ہیں۔ان کےاب تک آٹھ مرثیہ ملتے ہیں جو اپنے الگ موضوع،اسلوب اورہیئت کی بناپراوروں سے منفرد ہیں۔مراثی کےعنوان حسب ذیل ہیں۔

(۱) آوازۂ حق

(۲) حسینؑ اورانقلاب

(۳) موجدوفکر

(۴) وحدت انسانی

(۵) طلوع فکر

(۶) عظمتِ انسانی

(۷) زندگی اورموت

(۸) پانی اورآگ

جوش صاحب نے اپنا پہلا مرثیہ''آوازۂ حق'' ۱۹۱۸ءمیں تحریرکیا تھا،جوان کا واحد کلاسیکی مرثیہ ہے۔اس کے

علاوہ انھوں نے جتنے بھی مراثی کہے ہیں ان سب میں بدلتے وقت وحالات، انقلاب اور قومی آزادی کے تصور ملتے ہیں۔ آوازۂ حق کے ذریعے جوش ملیح آبادی نے قوم کو عمل کا درس دیا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ
مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابن علیؑ ہو

آج کے بدلتے ہوئے وقت اور حالات میں جب اقوام مسلم ہر طرف سے ظلم وستم کا نشانہ بن رہی ہے اس عالم میں ایک صدی قبل جوش کا دیا گیا یہ پیغام اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے بعد ان کا دوسرا مرثیہ حسینؑ اور انقلاب (۱۹۴۱ء) منظر عام پر آیا۔ یہ وہ عہد تھا جب ساری دنیا پر جنگ کے ابر چھائے ہوئے تھے اور ہندوستان میں آزادی کی تحریک جاری تھی۔ ان سب مناظر کو مدّ نظر رکھتے ہوئے جوش نے واقعات کربلا کے ہولناک اور عبرت ناک واقعات کا ذکر کر کے قوم کے حوصلہ کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اس بند پر نظر کیجئے۔

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا وہ حسینؑ خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسین
اک دین تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسینؑ جو کربلا کا داورِ محشر تھا وہ حسینؑ
جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو روحِ انقلاب کا پروردگار تھا

ہاں خاتمِ حیات ابد کا نگیں ہے تو گردونِ داروگیر کا مہرِ مبیں ہے تو
اک زندہ حد فاصل دنیا و دیں ہے تو کونین کا تخیل عہد آفریں ہے تو
پھر دشت جنگ کو ہے ترا انتظار اُٹھ
اُٹھ روزگار تازہ کے پرور دگار اُٹھ

جوش اپنے مرثیوں کے ذریعہ لوگوں کو رولانا نہیں بلکہ لوگوں کو جگانا چاہتے تھے۔ ایک مدّت تک مرثیے کا مقصد رونا اور رولانا تھا لیکن جوش نے اس روایت کو توڑتے ہوئے مرثیے کے مقصد کو ہی بدل دیا۔ یہ جوش کا ہی کارنامہ تھا کہ انھوں نے مرثیے کے مقصد کو تبدیل کر اس میں معنوی جہت پیدا کر دی۔ یہ انقلابی اقدام انھوں نے ''حسینؑ اور انقلاب'' سے ہی شروع کیا جو مخالفت کی وجہ بنا۔ عوام ان کے مرثیہ کو مرثیہ ماننے سے ہی انکار کرنے لگی۔ جوش کی مرثیہ نگاری کے تعلق سے شمشاد حیدر زیدی لکھتے ہیں۔

''جوش کے مرثیوں کو مسدس کہنا تو آسان ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مرثیہ تو اپنے

موضوع کی وجہ سے مرثیہ کہلاتا ہے، نہ کہ ساخت کے اعتبار سے۔مرثیے نے مختلف موڑ بھی لیے ہیں۔ پہلا موڑ وہ ہے جب میر ضمیؔر نے اسے ایک مقررہ ڈھانچہ دیا۔ دوسرا اہم موڑ اوجؔ اور شادؔ کے یہاں نظر آتا ہے۔تیسرا اہم موڑ مرثیے میں جوشؔ کی بدولت آیا۔ جب روایتی ترتیب مجروح ہوگئی تو اسے مسدس کیوں کر کہہ سکتے ہیں اور اسے مرثیہ ماننے کا کیا جواز ہے، جب کہ ان کے پہلے مرثیے ''آوازۂ حق'' میں تقریباً تمام اجزا موجود ہیں۔''۱۵؎

جوش کے مرثیوں میں ایک اور نئی بات جو نظر آتی ہے وہ عنوان ہے۔قدیم مرثیوں میں عنوان نہیں ملتے ہیں بلکہ جس شہید کے حال کا مرثیہ تحریر کیا جاتا تھا اسی کے نام کو مرثیہ کا نام بنا دیا جاتا تھا مثلاً مرثیہ درحال جناب زینبؑ یا مرثیہ جناب عباسؑ وغیرہ۔سیکڑوں مرثیوں میں سے دبیؔر کا ایک مرثیہ ''مظہر حق'' کے عنوان سے ملتا ہے۔جوش کے مرثیہ نگاری کا ایک نمایاں پہلو ان کا حساس حسن بھی ہے۔ان کی انھیں خوبیوں کی بنا پر جوش کا نام سنہرے الفاظ میں لکھا جاتا ہے۔

۲۱۔رزمؔ ردولوی :

ان کا نام تو سید جعفر مہدی تھا لیکن یہ اپنا تخلص 'رزم' کرتے تھے۔ان کی ولادت ۱۹۰۲ء کو رودولی (یو پی) میں ہوئی تھی۔ان کی تعلیم و تربیت بھی رودولی میں ہی ہوئی۔رزم نے پہلے قصیدہ اور نوحے کہے پھر بعد میں یہ مرثیہ بھی کہنے لگے، لیکن ان کے یہ مرثیے قدیم رنگ میں تھے۔جب رزم نے بدلتے ہوئے وقت پر نظر ڈالی تو ان کو بھی اپنے مرثیے میں جدیدیت کا رنگ ڈالنا پڑا۔رزم نے جن جدید موضوعات پر مرثیے لکھے ہیں ان میں چشم بینا، غلامی اور اسلام، فلسفۂ حیات اور حسینؑ، نشر شہادت، عورت کا درجہ اسلام میں، اہل بیت، حقوق انسانی اور اسلام ہے۔ان کا ایک مرثیہ ''چشم بینا'' جسکو مرزا محمد یوسف نے اپنی کتاب ''انتخاب ادبی مراثی'' میں شائع کیا ہے۔یہ مرثیہ ۲۱ بندوں پر مشتمل ہے لیکن مرزا یوسف صاحب نے صرف ۱۹ بند ہی انتخاب کیا ہے۔یہ مرثیہ میں سوئی قوم اور بےحس زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔اسمیں انھوں نے زندگی کو صرف نام کی زندگی بتایا ہے۔پیش ہے مرثیہ چشم بینا کے کچھ بند۔

زندگی کیا تھی فقط کہنے کو نام زندگی   درہم برہم تھا سرتا سر نظام زندگی
بےحسی کی بستیاں تھیں اور مقام زندگی   حاملانِ زندگی تھے غلام زندگی
سانس لے لیتے تھے آہِ سرد بھرنے کی طرح
زیست پر قابو نہ تھا جیتے تھے مرنے کی طرح

اپنے ہی مفہوم سے تھی آپ بیگانہ حیات   زد پہ تھا مرگِ جہالت کے نظام کائنات
مول لیتی تھی حکومت ذاتِ انساں یا صفات   بکتے تھے بازارِ عالم میں ضمیر و حسّیات

نیک و بد لیتے تھے کروٹ قہر آئین سے
کھیلی تھی بادشاہت خود اصولِ دین سے

ہاتھ میں تھے رہزنِ دیں کے عنانِ زندگی   الٹے قدموں جا رہے تھے رہروانِ زندگی
لٹ رہا تھا دن دہاڑے کاروانِ زندگی   جھک رہا تھا خاکِ ذلت پر نشانِ زندگی
پست تھی ہمت ابھرنے کا کوئی کیا نام لے
کون ایسا تھا جو گرتے ہوؤں کو تھام لے

اس مرثیہ میں رزم بتاتے ہیں کہ کس طرح اس بےحس زندگی سے نکلے اور کس طرح مشکلات کا سامنا کریں۔ اور وہ امام حسین کو مثال کے طور پہ پیش کرتے ہیں کہ کس طرح وہ نرغہ اعدا میں رہتے ہوئے بھی ہار نہیں مانتے اور انصاف کی لڑائی لڑتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر انسان کو ان کی پیروی کرنے میں دشواری ہو تو اسکو حضرت اکبرؑ ،عباسؑ اور حضرت قاسمؑ کے کارناموں کو دیکھ کر سیکھ لینی چاہئے ۔ان کا یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

رخ پلٹنا اور ہوا کے رخ پہ بہنا اور ہے   چشمِ بینا و دلِ دانا میں رہنا اور ہے
مسکرا کر اپنے دل پہ چوٹ سہنا اور ہے   تیغ کی جھنکار میں تکبیر کہنا اور ہے
تو نے بتلایا بل ابرو پر نہ آنا چاہئے
تیغ اٹھانا چاہئے کب سر جھکانا چاہئے

ایک تیری ذات ہے اک مرکزِ عزووقار   نوعِ انساں کے فضائل کا ہے تو پرور دگار
تا ابد ہے تیری تاثیر شہادت برقرار   آج قربانی کی ہے بیدار قوموں میں پکار
گو کہ در پر وہ زمانے میں ہدایت ہے تیری
وقت تجھ کو چاہتا ہے پھر ضرورت ہے تیری

حضرت شبیرؑ بے شک تھے امام ذی کمال   یہ بشر ہو کر بھی تھے فوق البشر بے قیل وقار
پیروی بالفرض ان کی ہے اگر مشکل سوال   سامنے ہے اکبرؑ و عباسؑ و قاسمؑ کی مثال
آنسوؤں سے اپنے دل کی گرد دھونا چاہئے
آنکھ کو سوئے مآلِ کار ہونا چاہئے

۲۲۔ نواب کاظم علی خان (کاظم جنگ) :

نواب کاظم جنگ حیدرآباد کے مشہور جاگیردار اور امیر نواب شوکت جنگ کے صاحب زادے تھے۔انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم جیسے عربی اور فارسی گھر پر ہی پائی، پھر کانونٹ اسکول سے انگریزی اور باقی کی تعلیم حاصل کی۔ان کے زمانہ

طالب علمی سے ہی جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تھا جہاں سے کاظم جنگ نے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کاظم جنگ کی طبیعت بچپن سے ہی شعر وسخن کی طرف مائل تھی۔ خود ان کے خاندان میں شعر وسخن کا بڑا چرچہ رہتا تھا۔ کاظم جنگ بچپن سے ہی بڑے ذہین تھے اور ان کی ذہانت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے لڑکپن کے زمانے میں ایک محفل میں ان کا جانا ہوا۔ جس میں اس زمانے کے استاد شاعر مہاراجہ کرشن پرشاد شادؔ بھی شریک تھے۔ اس وقت کاظم کی عمر ۱۲ سال تھی۔ محفل میں جلیلؔ کا یہ شعر پڑھا گیا۔

غرور حسن تمھیں جس قدر ہو زیبا ہے
خدا کے فضل سے صورت بھی ہے شباب بھی ہے

کاظم نے اسی زمین میں سلام کا یہ بیت کہا۔

نثار جان سے اکبر پہ کیوں نہ ہوں حوریں
شبیہہ احمد مرسل بھی ہیں شباب بھی ہے

مہاراجہ نے اس شعر پر اعتراض کیا کہ شبیہہ احمد مرسل کے بجائے ہم شبیہہ احمد مرسل ہونا چاہئے تھا۔ جس پر کاظم نے اس کے جواب میں انیسؔ کا یہ شعر پڑھا۔

یہ سب تعلیاں شعراء کی فضول ہیں
بس خاتمہ ہوا کہ شبیہِ رسول ہیں

ان کے جواب اور حاضر دماغی سے سارے اہل محفل اور خود مہاراجہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کاظم جنگ شروعات میں اپنی بیت اصلاح اس وقت کے مشہور شاعر حکیم عابد علی غیور سے لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد مولانا طباطبائی کے شاگردگی اختیار کر لی۔ اصلاح کا یہ سلسلہ بقول کاظم جنگ کے وہ صرف غزلوں اور سلاموں کے حوالے سے تھا۔ مرثیے میں انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ کاظم جنگ نے مرثیہ نگاری کی ابتداء ۲۰ سال کی عمر سے ہی شروع کر دی تھی۔ نواب جنگ نے انیسؔ کی مرثیہ نگاری سے اثر قبول کیا۔ یہ انیس کے فن، ان کی سلاست اور روانی کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کئی مرثیوں کی تخلیق کی۔ ان کا سب سے اہم مرثیہ ''تصویر درد'' ہے۔ ان کے مرثیوں میں قدیم اور جدید دونوں رنگوں کی آمیزش ملتی ہے۔ جہاں ایک طرف وہ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کو پوری طرح برتتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف وہ ہر مرثیہ کو عنوان کے حوالے سے بھی جدید رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً مرثیہ ''خیبر'' یا مرثیہ ''نور''۔ یہ مرثیے ان کے بہت مشہور مرثیوں میں سے ایک ہے۔ مرثیہ 'نور' میں انھوں نے رسول اکرمؐ کی تعریف بیان کی ہے۔ محمد اور علی کو ایک ہی نور کے دو ٹکڑے بتایا ہے جو آگے جا کے ایک بنا۔ مرثیہ کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

وہ نور جوہر قدرت کی اولیں تحریر وہ نور جس سے عیاں حسن خاص کی تصویر
وہ نور چودہ شبیہوں کی ایک ہی تصویر وہ نور خواب خدیجہ کی جاگتی تصویر
مقام عجز میں تاج سر نیاز کیا
وہ نور خلق جسے کر کے حق نے ناز کیا

وہ نور محرم اسرار ذات لایزلی وہ نور جس کے مراتب ہیں مثل شمش جلی
وہ نور جس کے سبب راہِ حق جہاں کو ملی وہ نور نام محمد ہے جن کا اور علی
اگرچہ نور کا دو جا یہاں ظہور ہوا
پھر آگے چل کے وہی نور ایک نور ہوا

کاظم جنگ کا مرثیہ جدیدیت کے اعتبار سے ایک کامیاب مرثیہ ہے۔مرثیہ کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ان کے مرثیوں میں ہمیں انیس کا رنگ صاف صاف نظر آتا ہے۔

۲۳۔باقر امانت خانی :

سید باقر رضوی نام تھا،ان کے اجداد ایران سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ان میں سے دو بزرگ کا نام تاریخ میں موجود ہے جو میرک حسین اور میرک معین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔مغل بادشاہ اورنگ زیب نے ان کی صلاحیت اور شجاعت سے متاثر ہوکر ان کو امانت خان اور دیانت خان کا خطاب عطا کیا تھا۔باقر امانت کے اجداد اورنگ زیب کے زمانے میں ہی اس کی فوج کے ہمراہ حیدرآباد آئے تھے۔سید باقر رضوی امانت خان کے نسل سے ہیں اسلئے وہ اپنے نام کے آگے امانت خانی لکھنے لگے۔

باقر امانت خانی کی پیدائش ۱۹۰۷ء کو حیدرآباد میں ہوئی تھی۔ان کے والد کا نام میر زین العابدین تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم ان کے والد اور ان کے ماموں کی زیرنگرانی ہوئی تھی۔ بعد میں انھوں نے مدرسہ تعلیم المعلمین ،جاگیردار کالج اور سٹی کالج سے اپنے تعلیم پوری کی۔ یہ اپنی شاعری کی اصلاح اپنے ماموں صفی حیدر سے لیا کرتے تھے،ماموں کے مرنے کے بعد یہ مشہور شاعر اور مرثیہ گو میر محمد مسرورؔ حیدرآبادی کے سامنے اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے۔ان کو شاعری اور مصوری سے فطری لگاؤ تھا۔شاعری کے ساتھ ساتھ یہ مصوری بھی کیا کرتے تھے۔اس لئے یہ رنگوں میں شاعری اور لفظوں میں مصوری کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا کرتے تھے۔باقر کی اس صفت کی مثال ان کے اس بند کے حوالے سے دکھئے۔

جس وقت تجھ سے شام کے زنداں کا در بنے تصویر انتظار کی تارِ نظر بنے
زنجیر خود لکیر ہو ٹیڑی اگر بنے بیمار کی شبیہ چراغ سحر بنے
اک قبر کا نشان بھی تھوڑی سی جا میں ہو
زنداں جو بن چکے تو اندھیرا فضا میں ہو

باقر امانت خانی نے مرثیہ گوئی کی ابتداء ۱۹۵۵ء میں کی تھی۔انھوں نے اب تک ۲۶ سے زائد مرثیے کی تخلیق کی ہے۔ان کا پہلا مرثیہ ''تصویر اجر رسالت'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔اس کے بعد ''شباب فکر'' ۱۹۵۶ء میں اور ۱۹۵۷ء میں ''معرقع وفا'' شائع ہوا ہے۔ان کا ایک مرثیہ ''سفیر شجاعت'' کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا،جس میں انھوں نے اپنے خاندان کی باتیں کی ہیں۔اس مرثیہ کے ابتدائی بندوں میں انھوں نے اپنے اجداد کے قصائد بیان کئے ہیں،اپنے خاندان کو امام رضاؑ سے جوڑا ہے اور اپنے مرثیہ گو ہونے پر فخر کیا ہے۔اور بعد میں انھوں نے اپنے مرثیے کے رخ کو بدلتے ہوئے مرثیے کی تاریخ کو نظم کیا ہے۔ان کا ایک اور مرثیہ ''آئینہ فرات'' کے عنوان سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔یہ مرثیہ جدید فکر کو اپنے اندار سمیٹے ہوئے ہے۔اس مرثیے کے چہرے میں باقر نے ۲۸ بند پانی کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔جس میں انھوں نے طوفان نوح کی روایت کو نظم کیا ہے۔پانی کو موضوع بنا کر مرثیہ لکھنے والوں میں راجہ صاحب محمود آبادی اور جوشؔ کا نام بھی آتا ہے۔آئینہ فرات کا کچھ بند ملاحظہ ہو۔

پانی سے ہی جہاں میں بقائے حیات ہے — پانی کے ایک قطرے میں اک کائنات ہے
پانی سے ہر شجر میں بہار ثبات ہے — پانی اگر ہو خشک تو پیاسی فرات ہے
بندش ہو آب کی تو بقا بھی فنا بنے
پانی نہ ہو تو سارا جہاں کربلا بنے

چہرے میں مرثیے کے جو پانی کا ہو بیاں — دریائے طبع جوش کی حالت میں ہو رواں
خشکی ذہن سات سمندر میں ہو نہاں — آب حیات پینے لگیں شہہ کے مدح خواں
تاثیر ایسی بزم میں کر جائے مرثیہ
ہر دل میں پانی بن کے اتر جائے مرثیہ

پانی کی نبض تیز جو ہوتی ہے ایک بار — گرمی سے آفتاب کے چڑھ جاتا ہے بخار
پانی کے ہے مزاج میں کس درجہ انکسار — بجلی کی لے کے قوتیں گرتا ہے آبشار
قطرے اڑے جو آب کے نظارہ بن گیا
پانی کو رقص سوجھا تو فوارہ بن گیا

پانی نہ ہو تو پھول کا چہرا رہے اداس — پانی ہی باغ دہر میں جینے کی ہے اساس
حساس دل ہی اصل میں ہے تشنگی شناس — ہم آپ کو بتائیں گے کہتے ہیں کس کو پیاس
اپنا سلام تشنہ دہن کے حواس کو
ہم تو حسینؑ کہتے ہیں شدت کی پیاس کو

باقر امانت خانی نے اپنے مرثیوں میں تمام اجزائے مراثی کو برتا ہے اوراس بات کا بھی خاص خیال رکھا ہے کہ مرثیہ کا انداز روایتی نہ ہوجائے۔اس لئے انھوں نے اپنے تمام مرثیوں میں عنوان کا دامن تھام رکھا ہے۔باقر نے مرثیے کے اہم جز''بین'' کوخاص طور سے برتا ہے۔ڈاکٹر رشید موسوی نے باقر امانت خانی کی مرثیہ نگاری کی تعریف کچھ یوں کی ہے۔

''باقر عموماً اپنے مرثیوں کے عنوان منتخب کر کے لکھتے ہیں جو مرثیہ نگاری میں جدید رجحان کا نتیجہ ہے۔وہ مرثیے کے کلاسیکی انداز واقدار کوترک کئے بغیر نیا مرثیہ لکھنے پر قادر ہیں۔ان کے یہاں قدیم مرثیے کی اجزاء تمہید یا چہرہ،رجز یا گھوڑے کی تعریف اور ساقی نامہ سبھی کچھ ملتے ہیں۔متقدین کی طرف وہ واقعات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں لیکن واقعاتی پہلوؤں پر زور دینے کے بجائے اس کے تاثرات کو پیش کرتے ہیں اور تاثرات کے ابھارنے میں حقیقت نگاری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔''۱۶

۲۴۔ نسیم امروہوی :

سید قائم رضا نام اور نسیم امروہوی تخلص کرتے تھے۔پیدائش امروہہ میں ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔شاعری ان کو وراثت میں ملی۔ان کے دادا شمیم امروہوی کا نام اردو دنیا کے بڑے مرثیہ گوشعراء میں شمار ہوتا ہے۔ان کو''فرزدق ہند'' کے نام سے بھی نوازہ گیا تھا۔نسیم امروہوی کے پاس مرثیہ کی روایت ان کے دادا اور پردادا سید حیدر حسین یکتا سے آئی۔نسیم امروہوی کی زندگی کا ایک بڑا حصہ امروہہ سے باہر ملازمتوں گزرا۔

نسیم امروہوی ایک زودنویس شاعر تھے،انہوں نے مرثیہ کے ساتھ ساتھ نعت منقبت،سلام،نوحے،غزل، مثنوی،قطعہ،رباعی،نظم اور گیت کے ساتھ ساتھ کافی تعداد میں شخصی مرثیے بھی لکھے ہیں۔شاعری کے ساتھ ساتھ امروہوی نے تحقیق،تنقید،تاریخ،ترجمہ،ڈرامہ،افسانہ،صحافت،لغت،سیاست،لسانیات غرض کی ہر میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تین ضخیم مراثی کی جلدیں چھپ چکی ہیں۔انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ''گل خوش رنگ''۱۹۲۳ء میں تحریر کیا۔اس مرثیہ ابتدائی چند بند میں جدید لب ولہجہ استعمال کیا گیا ہے اس کے علاوہ پورا مرثیہ قدما کی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔

تجھ میں اے باغ وطن اب گل خوش رنگ نہیں　　کس روش پر گل وبلبل میں یہاں جنگ نہیں
تن پہ کس غنچے کے ہستی کی قبا تنگ نہیں　　طنطنے ہیں وہی ماضی کے وہ اورنگ نہیں

آنکھ باوصفت کدد،جدھر اٹھ جاتی ہے
فقر کی شاہی بے ملک نظر آتی ہے

ہائے کیسی یہ ہوا مرے گلستاں میں چلی　　کوئی بے داغ شگوفہ ہے نہ گل ہے نہ کلی
ہر طرف بے علمی بے عملی بے عملی　　اجی کے ہے سانچے میں ڈھلی

ا جو سرمایۂ اسلاف وہ سب کام آیا
آفتاب آج ریاست کا لب بام آیا

ان کا دوسرا مرثیہ ’’پیغام اور انقلاب‘‘ ۱۹۳۶ء میں تصنیف ہوا۔اس مرثیہ کے ذریعہ نسیم امروہوی جدید مرثیہ کو ایک ادبی تحریک کی حیثیت سے منوانے کی سعی کرتے نظر آتے ہیں۔ان کا ایک مرثیہ ’’قرآن اور حسینؑ‘‘ کے حوالے سے بھی ملتا ہے۔اور اسی عنوان کے تحت ایک مرثیہ دلورام کوثرؔی کے یہاں بھی ملتا ہے۔دونوں نے مرثیہ میں فرق یہ ہے کہ دلورام کوثری کا مرثیہ پوری طرح سے صحیح معنی میں قدیم لوازم سے انحراف کرتا نظر آتا ہے،جبکہ نسیم امروہوی کا مرثیہ قدیم روایت کا پاسدار نظر آتا ہے۔

نسیم امروہوی کے مرثیے موضوعاتی ہیں۔انھوں نے مرثیوں میں مختلف موضوعات پر بحث کی ہے۔اس کے علاوہ واقعہ کربلا کے مخصوص کرداروں کو بھی موضوع کی کسوٹی میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔نسیم امروہوی کی موضوعاتی مرثیہ نگاری کے سلسلہ میں شمشاد حیدر زیدی اپنی کتاب ’’اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات‘‘ لکھتے ہیں۔

> ’’آپ کے خاص موضوعات میں علم وعمل،انقلاب اور حریت،اصلاح ملت،اتحاد و اتفاق،فلسفۂ غم ومسرت جزأت وہمت،عقل وعشق،قرآن واہل بیت،عزم وحوصلہ، ہجرت وغریب الوطنی،اسلام اور ایمان،تقویٰ اور پرہیزگاری خلوص ومحبت،صلح و امن،انسانیت وشرافت،حمد ونعت،مدح ومنقبت،چراغ وقلم،پانی اور آگ،خاک، ضعیفی،جوانی،طفلی وغیرہ۔لیکن سب سے زیادہ زور علم وعمل پر ہے۔واقعہ کربلا کی یاد میں جو مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں،ان کا رشتہ بھی عمل سے قائم رکھتے ہیں۔‘‘ ۷۱

نسیم امروہوی نے اپنے مرثیوں میں رزمیہ عناصر کو ترک نہ کرتے ہوئے مرثیے کی کلاسیکی روایت کو برقرار رکھا۔اس کے علاوہ جدید قومی مسائل کو بھی بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۲۵۔نواب میر شجاعت علی خاں شجیع :

نواب میر شجاعت علی خاں معظم جاہ ریاست حیدرآباد کے ولی عہد تھے۔ان کے والد نواب میر عثمان علی خاں آصف اور بڑے بھائی کا نام نواب میر حمایت علی خاں اعظم جاہ تھے۔ان کے پیدائش ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۲۵ھ م کو ہوئی۔ انھوں نے علامہ مولوی انوار اللہ خاں سے فضیلت جنگؒ سے مذہبی تعلیمات حاصل کی اور اس عہد کے مطابق ادبیات کی

تعلیم نظم طباطبائی سے حاصل کی ۔ چونکہ شجیع ریاست حیدرآباد کے نواب تھے لہٰذا ان کی یادگار کے طور پر باغ عامہ اور معظم جاہی مارکٹ آج بھی موجود ہے۔ان کی شخصیت افسانوی رہی ہے۔ان کی شادی سلطان ترکی خلیفہ عبدالمجید خاں کی بھانجی شہزادی نیلوفر سے ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ شجیع کا انتقال ۱۹۸۷ء میں ہوا۔

صدق جائسی نے اپنی تخلیق ''دربار دُربار'' میں شجیع کے عہد میں موجود جاگیردارنہ تہذیب کا ہوبہو نقشہ کھینچا ہے۔ شجیع کو شاعری سے والہانہ دلچسپی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جوش، فانی، صدق جائسی، نجم آفندی، علامہ ناصر زید پوری وغیرہ ان کے دربار سے وابستہ شعراء مانے جاتے ہیں۔ نجم آفندی کے تعلق سے مشہور ہے کہ وہ ان کے باقاعدہ استاد تھے اور عام طور پر یہ بھی مانا جاتا ہے کہ شجیع کی مذہبی شاعری پر نجم کے اثرات موجود ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ مذہب سے شجیع کو گہری وابستگی تھی جس کا ثبوت اہل بیت سے ان کی دلی عقیدت و والہانہ محبت کا اظہار ہے۔ انھوں نے روایتی انداز میں بھی غزلیں لکھی ہیں لیکن ان میں بھی عقیدت کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ انہوں نے چار مرثیے لکھے ہیں جن میں تین غیر مطبوعہ ہیں ایک ''دستور شہادت'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

مرثیہ ''دستور شہادت'' کو انھوں نے آل رضا اور جوش کی طرح مسدس میں لکھا ہے۔ اس مرثیے کا موضوع واقعات شہادت اور اس کے بعد اہلِ حرم کی اسیری ہے۔ جیسے انھوں نے نہایت چابک دستی کے ساتھ ایک تسلسل میں بیان کیا ہے اور آخر میں چھ بند عرض مداح کے شامل کئے ہیں۔ اس مرثیہ کا آغاز انھوں نے قصیدہ رثائیہ کے طور پر کیا ہے۔ درج ذیل بند ملاحظہ ہو:

قائد سجدہ گزاران شہادت ہے حسین
معنی صبر ہے مفہوم شجاعت ہے حسین
بزمِ ہستی میں پیمبر کی امانت ہے حسین
ناز پروردہ آغوش رسالتؐ ہے حسین
موت کی شان دکھانے کے لیے پالا تھا
جان اسلام بچانے کے لیے پالا تھا

یہاں شاعر نے مرثیہ کے اہم جز 'چہرہ' سے مرثیہ کی شروعات کی ہے اور درج بالا اشعار میں امام حسین علیہ السلام کی عظمت کو بیان کیا ہے۔ ۱۱۸ بند پر مشتمل اس مرثیہ کے ابتدائی چھبیس بند امام حسین علیہ السلام کی تعریف پر مبنی ہے جس میں شاعر نے جن مستند واقعات کو شعری زبان میں نہایت تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس کی وجہ سے مرثیہ پڑھتے وقت قاری پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

آنکھ کھلتے ہی دو عالم کی امامت پائی

پاؤں پھیلانے کو آغوشِ رسالتؐ پائی

دونوں ہاتھوں میں ید اللہ کی قوت پائی

ماں ملی فاطمہ زہرا سی وہ قسمت پائی

شان قلقِ حسنِ سبز قبا ساتھ رہی

تیغ عباس کی زینب کی دعا تا ساتھ رہی

اس کے بعد کے بند میں شجیع گریز کا استعمال کرتے ہیں اور استعاروں کے ذریعے میدانِ کربلا میں ہو رہی خیر و شر کی نا قابلِ فراموش جنگ کو بیان کرتے ہوئے اس منظر کی طرف بڑھتے ہیں جہاں چراغِ مصطفوی سے چراغِ بولہبی ستیزہ کار ہے:

اس طرف قافلہ نور ادھر لشکر شام

ادھر ایمان ہی ایمان ادھر کفر تمام

امرِ حق اس طرف اُس سمت یزیدی پیغام

آمنے سامنے اسلام و عدوئے اسلام

اس طرف علم کی نازش تھی حق آگاہی تھی

اس طرف جہل کا اندھیرا تھا گمراہی تھی

شاعر اس بند کے بعد شب عاشورہ، روزِ عاشورہ اور شہادت کے بعد کے واقعات تسلسل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ روزِ عاشورہ کے واقعات ملاحظہ فرمایئے:

یونہی تا ظہر جواں مردوں نے سر نذر دیئے

سر دیئے تیغوں کو نیزوں کو جگر نذر دیئے

بعض مجبوروں نے اشکوں کے گہر نذر دیئے

سب نے توفیق ارادت کے ثمر نذر دیئے

آج تک نام ہے مشہور وفاداروں میں

سو گئے رات کے جاگے ہوئے تلواروں میں

شجیع نے خیموں کو آگ لگانے کے منظر کو بھی نہایت پُر اثر انداز میں تحریر کیا۔ غور فرمایئے:

دیکھتے رہ گئے سب آگ لگانے والے

معرکہ جیت گئے صبر دکھانے والے

اس مرثیے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ عموماً جو بیت ہے وہ بیت معرکے کی۔ شجیع کا یہ مرثیہ ان کی والہانہ عقیدت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جو اردو ادب کے دکنی مرثیوں کے اہم مرثیہ میں شمار ہوتا ہے۔

۲۶۔آرزوؔ لکھنوی :

سید انوار حسین آرزو نام اور آرزوؔ تخلص کرتے تھے۔ انکی ولادت لکھنؤ میں ہوئی تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا اور بعد میں یہ مرثیہ کی طرف آئے۔ آرزو شروع سے ہی طرز انیس کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں غزل کے رنگ کو سمونے کی بخوبی کوشش کی۔ اس کے علاوہ آرزوؔ نے ایسی زبان لکھنے کی کوشش کی جس میں عربی، فارسی اور سنسکریت کے الفاظ کا استعمال نہ ہو۔ اور انھیں وہ خالص اردو کہتے تھے۔ خالص اردو پر ان کا ایک دیوان بھی شائع ہوا ہے جس کا نام ''سریلی بانسری'' ہے۔

آرزوؔ کے مرثیوں میں میر انیسؔ کی شعوری طور پر تقلید ملتی ہے۔ ان کا ایک مرثیہ 'توبہ' کے نام سے ملتا ہے، جو قدیم رنگ کے مرثیوں سے مختلف نظر آتا ہے۔ یہ مرثیہ ۸۲ بندوں پہ مشتمل ہے۔ اس مرثیہ میں نہ تو قدیم مرثیوں کی طرح گھوڑے اور تلوار کی تعریف کی گئی ہے، اور نہ ہی اسمیں ساقی نامہ کا ذکر ہوا ہے۔ اس مرثیہ میں خاص طور سے حضرت حر کا ذکر ہوا ہے۔ اس میں اس وقت کا بیان ملتا ہے جب کربلا میں حضرت حُر، ان کے بیٹے اور ان کے بھائی اپنی غلطی پر پشیمان ہوتے ہوئے ہیں اور توبہ کر کے حضرت امام حسینؑ کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اس مرثیے کے کچھ بند پیش ہیں۔

ذوق جنت میں شوقِ گل و لالہ چھوڑا   غل ہوا تا بہ فلک چاند نے ہالہ چھوڑا
لی سند خلد کی گھر کا جو قبالہ چھوڑا   مل گئی فوج ملائک جو رسالہ چھوڑا
اس حشم سے جو رہا باز وہ توقیر ملی
ترک منصب جو کیا خلد کی جاگیر ملی

پہلے تو راہ میں اس رہبر دیں کو روکا   کہیں جانے نہ دیا اور بجز دشت بلا
جب یہاں کوفیوں نے کی شہِ والا سے دغا   دل میں سوچا کہ ہوا جو مرے باعث سے ہوا
کفر کا ساتھ دیا دین سے بے پیر پھرے
کیا کروں فکر کہ برگشتہ یہ تقدیر پھرے

ہو گیا ساتویں تاریخ سے پانی بھی جو بند   متردد ہوا کچھ اور حر دانشمند
ہو گیا ساتویں تاریخ سے پانی بھی جو بند   ہوں گے امت سے رسولِ عربی کیا خرسند
دانہ ممکن ہے میسّر نہ اسے پانی ہے
واہ کیا خوب نبیؐ زادے کی مہمانی ہے

سن کے یہ تینوں دلیروں کے ہوئے منھ بشاش　　　کہا بھائی نے اسی راہ کی تھی ہم کو تلاش
بولا فرزند نہ اس فوج میں ہم ہوتے کاش　　　عرض کی عبد نے بے شبہ بری تھی یہ معاش
حر تو آمادہ ہی تھا شہؑ کی حمایت کے لئے
چاروں یکدل ہوئے شبیرؑ کی نصرت کے لئے

''توبہ'' کے علاوہ ان کے اور بھی کئی مرثیے ملتے ہیں۔لیکن توبہ ہی ایک ایسا مرثیہ ہے جس میں جدید مرثیے کے عناصر نظر آتے ہیں۔انکے دوسرے مرثیے قدیم مرثیوں اور عناصر ترتیب کے پابند نظر آتے ہیں۔واقعات کو مرثیے میں فصیل سے بیان کرنے کا رجحان بھی ان کے مرثیوں میں ماجود ہے۔آرزو کے مرثیے میں زبان صاف اور سادہ ہے،اور اسی کو وہ مرثیے کی کامیابی کا راز سمجھتے تھے۔

۲۷۔علی سردار جعفری :

علی سردار جعفری کی پیدائش ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو بلرام پور میں ہوئی تھی۔لیکن تعلیم لکھنؤ میں لی تھی۔سردار جعفری نے دوسرے شاعروں کی طرح اپنی شاعری کا آغاز غزل یا نظم سے نہیں کیا بلکہ مرثیہ سے شاعری کا آغاز کر بعد میں نظم کی طرف قدم رکھا۔انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ ۱۵ سال کی عمر میں لکھا تھا۔جس کا عنوان 'شمع امامت' ہے۔اس مرثیہ کے چند بند غور فرمائے۔

آتا ہے کون شمع امامت لیے ہوئے　　　اپنے جلو میں فوج صداقت لیے ہوئے
ہاتھوں میں جام سرخ شہادت لیے ہوئے　　　لب پر دعائے بخشش امت لیے ہوئے
پھیلی ہے بو فضا میں شہ مشرقین کی
ذروں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

گھوڑے پہ خود آگے آگے ہیں شیر کربلا　　　ہیں گرد سب عزیز و رفیقان با و فا
ابرار و پاک بین وحق آگاہ و پارسا　　　پھلی ہوئی ہے چہروں کی چاروں طرف ضیا
پورے بہار پر ہے گلستاں بتول کا
چھوٹا سا قافلہ ہے یہ آل رسولؐ کا

بر میں قبائیں سر پہ عمامے بندھے ہوئے　　　تیغیں کمر میں پہلو میں خنجر لگے ہوئے
دانتوں میں ہونٹ رانوں میں گھوڑے جمے　　　بازو بھرے بھرے ہوئے سینے تنے ہوئے
کمسن ہیں کچھ ضعیف ہیں کچھ نو جوان ہیں
پیشانیوں پہ سجدۂ حق کے نشان ہیں

ہمت پہ ولولوں پہ شجاعت کو ناز ہے طاعت گزاریوں پہ عبادت کو ناز ہے
صورت پہ دست صانع قدرت کو ناز ہے بازو میں زور وہ ہے کہ قوت کو ناز ہے
نقشے میں اک مصور زریں نگار کے
بکھرے ورق ہی مصحف پروردگار کے

پندرہ سال کی عمر میں جب سردار جعفری نے یہ مرثیہ منبر پر بیٹھ کر پڑھا تو ان کے والد اور چچا نے ان کو گلے سے لگا لیا۔مرثیہ جیسی مشکل صنف کو اتنی کم عمر میں اس خوبی سے لکھنا قاری کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔اس مرثیہ سے ان کو بہت واہ واہی ملی۔اس ہمت افزائی نے دوسرا مرثیہ لکھنے کو مجبور کر دیا۔اور محض بیس دنوں میں ہی انھوں نے دوسرا مرثیہ'' آتا ہے ابن فاتح خیبر جلال میں'' کہہ ڈالا۔اس مرثیہ کا منظر عام پر آنا تھا کہ ان پہ یہ الزام عائد کیا گیا کہ سردار جعفری خود مرثیہ نہیں کہتے بلکہ کسی دوسرے سے کہلواتے ہیں،اوراس کہ توجیہہ یہ دی گئی کہ ایک سولہ سال کا نوجوان اس پختگی اورکہنہ مشقی سے مرثیہ نہیں کہہ سکتا ہے۔اپنے اپر لگے الزامات کو جھوٹا صابت کرنے کے لئے سردار جعفری نے اپنے تخلیقی صلاحیت کا استعمال کرتے ہوئے ایک تازہ مرثیہ کہہ ڈالا۔اس مرثیہ کے بند اس طرح ہے۔

اے بلبل ریاض بیاں نغمہ بار ہو اے نوعروس طبع رواں ہم کنار ہو
اے خامہ شگفتہ زباں لالہ کار ہو اے حاسد دریدہ دہاں ، شرمسار ہو
کیا اس میں مجھ سے ہیچ مداں کا قصور ہے
یہ تو عطائے رحمت رب غفور ہے

سردار جعفری کے مرثیے میں انسیت کا رنگ نمایا ہے۔یہ بچپن سے ہی انیس کی مرثیہ نگاری سے متاثر تھے۔ان کے مرثیے کی زبان،تشبیہ،استعارے،ترتیب ہر چیز میں انیسؔ کا رنگ نظر آتا ہے۔

۲۸۔میر عابد علی سعید شہیدیؔ :

عابد علی سعید ۱۹۱۴ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ان کے والد شہید یار جنگ تھے جن کا شمار حیدر آباد کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا تھا۔انھوں نے ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ سے حاصل کی اور محکمۂ آبکاری سے ملازمت کی شروعات کی۔انھیں بچپن ہی سے شاعری کا بے حد شوق تھا لہذا انھوں نے اپنا تخلص سعید شہیدیؔ اختیار کیا۔شاعری کی ابتداء انھوں نے غزل سے کی اور یہی صنف ان کی شہرت کا باعث بنی۔غزل کے علاوہ انھوں نے نوحے اور سلام بھی کثیر تعداد میں لکھے ہیں۔سعید شہیدیؔ نے اہل بیت کی قید سے رہائی پر ایک مرثیہ بھی لکھا ہے جس میں چہلم شہدائے کربلا کے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ان کے سلام و نوحے کا مجموعہ'' خاک شفا'' میں یہ مرثیہ موجود ہے جو ۱۶ بند پر مشتمل ہے۔ اس مرثیہ کے درج ذیل بند ملاحظہ کیجئے:

جب ہوئی قید سے رہا زینب اے سعید آئی کربلا زینب
پہنچی جب غم کی مبتلا زینب رو کے دیتی تھی یہ صدا زینب
قید سے چھٹ کے آئی ہوں بھائی
شام میں لٹ کے آئی ہوں بھائی

کیا کہوں میں نے کیا اٹھائے محن بازوؤں میں میرے بند ہی تھی رسن
تھے تماشائی سارے مرد و زن لٹ گئی لٹ گئی میں شاہِ زمن
پھری بازار شام میں زینب
گئی دربار عام میں زینب

تجھ سے بر گشتہ تھی مری تقدیر خوب کی میری عزت و توقیر
سر سے چادر چھٹی ہوئی تشہیر پھری بازار میں میں ہو کے اسیر
اور بھی کچھ سناؤں کیا بھائی
اپنے بازو دکھاؤں کیا بھائی

تیرا فرزند عابد بیمار تھا جو راندوں کا قافلہ سالار
دو قدم بھی تھا جس کو چلنا بار اس سے کھنچوائے تھے شتر کی مہار
ظلم پر ظلم ڈھائے اعدا نے
اس کو کوڑے لگائے اعدا

جب کیا ہم کو داخل زنداں نام کو بھی نہ روشنی تھی وہاں
رو کے کہتی تھی یہ سکینہ جاں کہیں یاں سے چلو پھپھی اماں
مجھ سے برداشت ہو نہیں سکتی
میں اندھیرے میں سو نہیں سکتی

اس مرثیہ میں سعید شہیدی نے اہلِ حرم کے قید سے رہا ہونے اور کربلا پہنچنے اور کربلا پہنچ کر اپنے غم کی روداد سنانے کے ساتھ شہدائے کربلا کے چہلم کے بعد اہل حرم کی واپسی کو اس قلم برداشتہ انداز میں بیان کیا ہے کہ آنکھیں اشک بار ہو جاتیں ہیں۔

آگے کے بند میں شاعر نے جناب زینب کی فریاد و سوال کو بیان کیا ہے جو وہ امام حسین علیہ السلام کی قبر سے لپٹ کر کرتی ہیں:

کون ہے جو مدد کو اب آئے کون بے کس پہ اب ترس کھائے
بولو کیوں چُپ ہو میرے ماںجائے کیا یہ ہمشیر اب وطن جائے
کچھ توار شاد کیجئے بھائی
یا اجازت ہی دیجئے بھائی

اس کا جواب اس طرح ملتا ہے:

دی یہ شہ نے صدا وطن جاؤ خواہر با وفا وطن جاؤ
بنت مشکل کشا وطن جاؤ جاؤ بہر خدا وطن جاؤ
اور بھی تم کو غم اٹھانا ہے
پھر تمہیں قید ہو کے آنا ہے

چھوٹی بہر میں لکھا گیا سعید شہیدی کا یہ مرثیہ قابلِ داد ہے۔ جو عموماً نوحے یا سوز کی شکل میں پڑھا جاتا ہے۔ اس ایک مرثیہ کے علاوہ انھوں نے مسدس بھی لکھا ہے جس کا شمار ناقدینِ ادب مرثیہ میں ہی کرتے ہیں کیونکہ مسدس کوئی صنف نہیں بلکہ ہئیت ہے۔ سعید شہیدی کا مرثیہ ان کے غزلوں کے مجموعہ ''آفتابِ غزل'' میں شامل ہے جس کی سنِ اشاعت ۱۹۸۱ء ہے۔ اس مرثیہ کے ابتدائی بند ملاحظہ فرمایئے:

ہے وہ انسان جس کی عزت ہر بیشتر کے دل میں ہو تذکرہ جس کے ادب کا ساتھ ہر محفل میں ہو
یوں چمک انسانیت کی حس کے آب وگل میں ہو ماہِ کامل بن کے چمکے چاہے جس منزل میں ہو
آنکھ سورج کی نہ لڑ سکتی ہو جس کے نور سے
شمع سوزاں دیکھتے ہی تھرتھرائے دور سے

نہایت سادہ و آسان الفاظ میں شاعر نے اس بند میں امام حسین علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی شخصیت فخرِ آدم ہے۔ یہاں شاعر کا اندازِ بیان سہل ممتنع ہوتے ہوئے بھی جذباتیت سے پُر ہے۔ سعید شہیدی کی انفرادیت ہے کہ صرف مراثی میں ہی نہیں جملہ اصنافِ سخن میں انھوں نے سہل ممتنع کا اس طرح استعمال کیا ہیکہ جذبات مجروح نہیں ہو پاتے۔ ان کے مرثیوں کا انداز روایتی نہیں ہے بلکہ ان میں عصری معنویت کھل کر نظر آتی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

ہو وہ جس عالم میں اعلان صداقت کر سکے
نوک نیزہ پر بھی سر جس کا قیادت کر سکے

اس کے بعد کے تمام مسدس جو ۱۴ بند پر مشتمل ہیں ان میں امام حسین علیہ کی فضیلت، مظلومیت، ہمت اور شجاعت

کوموضوع بنایا گیا ہے۔جن میں لہجہ کے تعین کے ساتھ خیال کی جدت بھی صاف نظر آتی ہے۔

جس نے شان صبر پیغمبر دکھائی وہ حسین ‏ ‏ ‏ اپنے دل کی قبر خود جس نے بنائی وہ حسین

جس نے اپنی حسرتوں کی لاش اٹھائی وہ حسین ‏ ‏ ‏ بندگی پر جس کی نازاں ہے خدائی وہ حسین

جس نے کیں قربانیاں نانا کی امت کے لیے

خون پانی کر دیا جس نے عبادت کے لیے

سعید شہیدیؔ کی مرثیہ گوئی کے متعلق ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی ''آفتابِ غزل'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے بیشتر اصناف میں شعر کہے ہیں مگر غزل، سلام اور مرثیے انہیں زیادہ محبوب ہیں۔محمد وآل محمد سے ان کا والہانہ عشق واقعاتِ کربلا کا تذکرہ ان کے لیے عبادت سے کم نہیں اور یہ دونوں جذبے الگ نہیں ہیں۔ دراصل ایک ہی ہیں اور اس نے انہیں تاریخ سے ملی ہوئی گداز قلب کی دولت عطا کی ہے ان کے سلام ہوں یا منقبتیں یا غزل۔ یہ ایک پہلوان کے یہاں مشترک ہے۔ایک دکھا ہوا دل ایک زخمی احساس۔مگر ان کی شاعری اوران کا فن۔صرف اپنے غم ذات تک محدود نہیں۔ وہ صرف تڑپنا نہیں جانتے۔تڑپانا بھی جانتے ہیں۔ اپنے مجروح احساس کا کرب اپنے دکھے ہوئے دل کی صدا دوسروں تک بھی پہونچاتے ہیں۔ یہی ترسیل، یہی ابلاغ دراصل اچھی شاعری کی روح ہے۔یہی سبب ہے کہ وہ اپنے اشعار میں ترنم، آہنگ اور الفاظ کے انتخاب میں سہل ممتنع کا خیال رکھتے ہیں۔مگر یہ سہل ممتنع جذبات کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

اکبر کے بعد زیست میں کیا دلکشی رہی

لیلے تمام عمر یہی سوچتی رہی

انہوں نے مرثیہ میں بھی اسی آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے بڑی معنی خیز بات کہی ہے لیکن اس انداز سے کہ دوسروں کے جذبات سے ہم آہنگ ہو جائے۔''[۱۸]

الغرض سعید شہیدی کا مرتبہ اردو مرثیہ گوئی میں اہم ہے۔انھوں نے نہ صرف روایت سے ہٹ کر مرثیہ نگاری کی بلکہ چھوٹی بہر کو اپناتے ہوئے اس میں جدت بھی دکھائی۔

۲۹۔ جمیل مظہری :

جوشؔ ملیح آبادی کی طرح علامہ جمیل مظہری نے بھی مرثیہ نگاری میں اپنا منفرد مقام بنایا ہے۔صوبہ بہار کے ''موتی ہار'' (۱۹۱۵ء) میں پیدا ہوئے جمیل مظہری نے شاعری کی ابتدا بہت کم عمر سے ہی شروع کر دی تھی۔ان کا نام تو سید کاظم علی

تھا لیکن یہ مشہور علامہ جمیلؔ مظہری کے نام سے ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بہار سے کرنے کے بعد یہ کلکتہ چلے گئے جہاں انھوں نے فارسی سے ایم اے کیا۔

علامہ جمیل مظہری نے محض ۱۵ برس کی عمر سے ہی مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے پہلا مرثیہ ''عرفان عشق'' ۱۹۳۰ء میں تحریر کیا۔ جو کہ بہت مقبول ہوا۔ مرثیہ کے علاوہ جمہل مظہری نے نظم، قصیدہ، مثنوی اور رباعی بھی کہی ہیں۔ انکی اسی تخلیقی زاویئے کو مدّنظر رکھتے ہوئے شمشاد حیدر زیدی نے انھیں سودائے وقت کے نام سے مخاطب کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

''سودائے وقت علامہ جمیل مظہری نے بھی جوشؔ کی طرح مرثیہ کا رشتہ قومی شاعری سے جوڑنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے۔ سودائے وقت اس لئے کہ سودا کی طرح جمیل مظہری بھی بیک وقت غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور مرثیہ کے شاعر رہے ہیں۔''[۱۹]

علامہ جمیل مظہری نے دس مرثیوں کی تخلیق کی ہے جو کہ جدیدیت کے حامل ہیں۔ جمیل مظہری کے مرثیوں سے پہلے صرف تین ہی ایسے مرثیے ملتے ہیں جو جدید مرثیے کہے جا سکتے ہیں۔ ایک دلّو رام کوثریؔ کا مرثیہ ''قرآن اور حسینؑ'' دوسرا جوشؔ ملیح آبادی کا مرثیہ ''آوازۂ حق'' اور تیسرا نسیمؔ امروہوی کا مرثیہ ''گل خوش رنگ''۔ اگر صحیح معنیٰ میں دیکھا جائے تو صرف دلو رام کوثریؔ کا مرثیہ ''قرآن اور حسینؑ'' ہی قدیم روایت سے بغاوت کرتا نظر آتا ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی کا مرثیہ ''آوازۂ حق'' چونکہ ان کا پہلا مرثیہ تھا اس لئے اس میں کچھ رنگ انقلابی نظر تو آتے ہیں لیکن اسکو پوری طرح سے جدید نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے علاوہ نسیمؔ امروہوی کا مرثیہ ''گل خوش رنگ'' کے ابتدائی چند بند میں ہی جدیدیت کا رنگ نظر آتا ہے۔

جمیل مظہری نے مرثیہ ''عرفان عشق'' میں شہدائے کربلا کے جذبۂ روحانی کی تشریح کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے عشق اور وفا کے ذریعہ کربلا والوں کے جذبات کو بیان کیا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

عشق کیا ہے غمِ ہستی سے رہا ہو جانا — اور رہا ہو کے گرفتارِ بلا ہو جانا
بے پئے مست مئے جام فنا ہو جانا — بس کہ دشوار ہے پابند وفا ہو جانا

قید اس میں یہ بڑی ہے کہ دل آزاد رہے
فکر انجام نہ ہو کوششِ برباد رہے

وہ تنزّل وہ تلاطم وہ صفوں میں ہلچل — صف اول صف آخر، صف آخر، اول
آئی گھر گھر کی گھٹا فوج کے برسے بادل — عصر تک نعرۂ تکبیر سے گونجا جنگل

ہوئی مقتل میں اذاں، عشق کی منزل ہوئی طے
چند گھنٹوں میں نزاعِ حق وباطل ہوئی طے

اس کے علاوہ جمیل مظہری کا قبل آزادی جو دوسرا مرثیہ مقبول ہوا وہ ''پیمانِ وفا'' ہے جس کو انھوں نے ۱۹۳۶ء میں تحریر کیا تھا۔ مرثیہ میں حضرت مسلم سے کوفہ والوں کی بے وفائی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کا سلسلہ لکھنؤ میں جارج پنجم کی جبلی پارک پر امام بارگاہوں میں چراغاں کرنے والوں سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ جوڑا ہے۔ بند دیکھئے۔

خطبہ حضرت کا مدلل تھا جوانی چپ تھے　　عمل سودوزیاں کے وہ حسابی چپ تھے
نظر آتی تھی انھیں اپنی خرابی چپ تھے　　انتہا ہے کہ پیمبر کے صحابی چپ تھے
گونج کر رہ گئی شاہِ دوسرا کی آواز
ایک بندہ نہ اٹھا سن کے خدا کی آواز

کی منادی کی بغاوت کا جو دیکھے گا خواب　　اس پہ آئے گا خدا وندِ خلافت کا عتاب
ضبط ہو جائیں گے سب منصب و جاگیر و خطاب　　تھا جو اک ننگ خطیبانِ عرب ابن شہاب
شہریوں کو سربام آ کے جو دھمکانے لگا
اس کی تقریر سے ماتھے پہ عرق آنے لگا

قصر حاکم کو گھیرے تھے وہ غازی بھاگے　　توڑ کر بیعتِ مولا کے حجازی بھاگے
جو لگاتے تھے سرو جسم کی بازی بھاگے　　جوتیاں چھوڑ کے مسجد کے نمازی بھاگے
پائی آہٹ جو سواروں کی تو جی چھوٹ گئے
رشتے ایمان کی نیت کی طرح ٹوٹ گئے

اس کے علاوہ ایک اور خاص بات جو کہ ان کے کچھ مرثیوں میں نظر آتی ہے وہ مسدس میں تیسرے مصرعے کی تبدیلی ہے۔ ان کے تین مرثیے ''لمحۂ غور''، ''علمدار وفا'' اور ''حقیقت نور و نار'' میں انھوں نے تیسرے مصرعے کو غیر مقید کر کے لکھے گئے ہیں۔ یہ قیاس لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے ن۔م۔راشد کی ایک نظم ''رخصت'' جس میں انھوں نے کچھ حصہ مسدس کے بھی بیان کئے تھے اور اس میں تیسرے مصرعے کو قافیہ اور ردیف کی قید سے آزاد کر دیا تھا، سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ جمیل مظہری ن۔م۔راشد سے متاثر ہو کر یہ نمونہ پیش کیا تھا یا نہیں اس پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے باوجود ہیئت میں ہوئی اس تبدیلی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۳۰۔ شمیمؔ کرہانی :

نام شمس الدین حیدر اور تخلص شمیمؔ تھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۶ء کو پارہ ضلع غازیپور میں ہوئی تھی، جو ان کا ننہال تھا۔ ان کا اصل وطن کرہان ضلع آعظم گڑھ تھا۔ مشہور افسانہ نگار علی عباس حسینی ان کے ماموں ہوتے تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد اختر تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم کرہان میں ہوئی تھی۔ آگے کی تعلیم کے لئے یہ گورکھپور بھی گئے مگر وہاں ان کی تبیعت

نہیں لگی اور وہ واپس آ گئے۔ پھر فیض آباد میں وشیقہ عربی کالج میں داخلہ لیا، اور اسی دوران انھوں نے علی گڑھ مسلم کالج سے پرائیوٹ ہائی اسکول اور انٹر کے امتحانات دیتے رہے اور کامیاب بھی ہوتے رہے۔

شمیم ذہین طبیعت کے مالک تھے۔ اسی ذہنیت کی وجہ سے بچپن سے شعر و شاعری کرنے لگے تھے۔ انھوں نے نعت، منقبت، غزل، نظم اور نوحہ و سالام میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزل کا پہلا مجموعہ ''برق و باراں'' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا، جو کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ''روشن اندھیرا'' ان کے نظموں کا مجموعہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ ان کے بہت سے نوحے اور سلام بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ اگر ان کی مرثیہ گوئی کی طرف نظر ڈالی جائے تو وہاں ہمیں ان کا صرف ایک مرثیہ کربلائی اور کچھ مرثیے شخصی ملتے ہیں۔ ان کا ایک شخصی مرثیہ ۱۹۷۳ء میں پروفیسر احتشام حسین کے انتقال پر بھی لکھا گیا ہے، جس کا عنوان ''جانِ برادر'' ہے۔ کربلائی مرثیہ ''ذوالفقار'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس مرثیہ کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین اپنے خیالات کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں۔

> ''ہمارے قدیم مرثیہ نگاروں نے جس طرح تلوار کی تعریف کی تھی اس کے سحر میں گرفتار ہوئے بغیر شمیم کرہانی نے ایک ایسا راستہ تلاش کر لیا اور ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا جو وقت کے مذاق سے ہم آہنگ ہے۔'' ۲۰

''ذوالفقار''، جس کے معنی تلوار کے ہیں، اس کا ذکر یوں تو بیشتر شعراء نے اپنے مرثیوں میں بار بار کیا ہے۔ کوئی اس کی خوبصورتی کا ذکر کرتا ہے تو کوئی اس کی کاٹ کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن شمیم کرہانی نے اس کے اظہار کیلئے نیا پیرایہ اختیار کیا ہے، یہ وقت کے تقاضے سے ہم آہنگ بھی ہے۔ اس مرثیہ کی عظمت کا انداز اس بند سے لگایا جا سکتا ہے۔

باطل شکن مجاہد ایماں تھی ذوالفقار　　تدبیر چارہ سازئی انساں تھی ذوالفقار
شیر خدا کی جنبش مژگاں تھی ذوالفقار　　آئینہ جلالت یزداں تھی ذوالفقار
روشن ہے کائنات پہ قیمت میں قدر میں
اتری تھی آسمان سے چمکی تھی بدر میں

حق نے جسے زمیں پہ اتارہ وہ ذوالفقار　　برق غضب تھا جس کا اشارہ وہ ذوالفقار
تھی قہر ذوالجلال کا دھارہ وہ ذ و الفقار　　اُترا تھا جس کے گھر میں ستارہ وہ ذوالفقار
رن کی فضا میں دائرہ نور بن گئی
چمکی تو برق خرمن صد طور بن گئی

شمیم کرہانی نے اس مرثیہ کے اندر کئی گوشے چھپائے ہیں۔ مرثیہ کا ایک بیت ''اسلام پر فساد کا در کھولتی نہ تھی'' اس ہنرمندی سے کہا گیا ہے کہ تلوار جو کہ قتل و خون کے عنوان سے پہچانی جاتی ہے، اور شاید اسلام پر یہ الزام کہ وہ تلوار کے زور پر

پھلایا جاتا ہے، کا جواب بن جاتا ہے۔ وہ چلتی تھی تو حق کے لئے اور خاموش بھی رہتی تھی تو حق کے لئے یہ مصرع اپنے آپ میں ایک مکمل فلسفہ بیان کرتا ہے۔اس کا ایک اور مصرع ''بعد رسول مصلحتاً بولتی نہ تھی'' بھی تاریخ کے اس واقعہ کو بیان کرتا ہے جس میں حق گوئی کی سزا زبان کھچوانا تھی۔اس بیت میں مصلحتاً لفظ کا استعمال جس سلیقے سے کیا گیا ہے اس کی نظیر نہیں ہے۔اس سے شمیم کرہانی کی فنی خوبیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔انھوں نے مصائب بھی ذوالفقار کے حوالے سے ہی نظم کیا ہے۔مصائب کے یہ بند دیکھئے۔

بنت نبی کے چاند سے دلبر کی غم گسار اصغر کی غم گسار ہے اکبر کی غم گسار
صحرائے بیکسی میں بہتر کی غم گسار سارے عزیز و ہمدم و یاور کی غم گسار
تلوار ہوگی حیدر کرار کے لئے
تکیہ ہے آج عابد بیمار کے لئے

وہ حرملہ کا تیر وہ حلقوم شیر خوار وہ دو پہر وہ چہرئے شبیرؑ پر غبار
تھرّا رہی تھی فاتح خیبر کی ذوالفقار جلتی ہوئی وہ ریت وہ بانو کا گلعذار
یہ بھی تھا کام تیغ دو پیکر کے واسطے
تیار کی لحد علی اصغر کے واسطے

۳۱۔ڈاکٹر سید صفدر حسین :

ڈاکٹر صفدر حسین مئی ۱۹۱۹ءکو سادات بیارہہ کے ایک گاؤں تسنہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام سید ابرار حسین اور دادا حسن رضا تھے۔ان کے دادا ایک مشہور مرثیہ گو تھے۔صفدر کی ابتدائی تعلیم مطفر نگر سے ہی ہوئی۔پھر ایم۔اے اردو اور ایل ایل بی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ایم اے فارسی آگرہ اور پی ایچ ڈی ۱۹۵۷ میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ان کی اب تک کئی کتاب شائع ہوچکی ہے۔مرثیہ بعد انیس،شاہکار انیس، کاروان مرثیہ،منزل بہ منزل، سادات بارہہ کی تاریخ مدوجزر میں اور لکھنو کی تہذیبی میراث ان کی مشہور کتابیں ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے غزلوں اور منظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔'نگار غزل' ان کی غزلوں اور'رقص خیال' ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بھی 'لب فرات' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں ان کے سات مرثیے شامل ہیں۔جنکے عنوان اس طرح ہیں۔آئین وفا، علمدار کربلا، چراغ مصطفوی، مقام شبیری اور جلوۂ تہذیب وغیرہ ہیں۔صفدر حسین نے مرثیے کے ذریع روایتی مزاج کی پاسداری بھی کی اور جدید رجانات کی طرف بھی قدم بڑھایا ہے۔

مرثیہ ''آئین وفا'' میں صفدر حسین نے حضرت عباسؑ کے بہادرانہ کردار کی منظر کشی بڑی خوبصورت انداز میں کی ہے۔

وعدہ کرتا ہوں کہ تلوار نہ لے جاؤں گا　　مشکیں خاموشی سے بھرلوں گا چلا آؤں گا
صبر حضرت کا نمونہ انھیں سکھلاؤں گا　　سر جھکا کر تبر و تیر و سنا کھاؤں گا
نیزہ کی اجازت ہو ضرورت کے لئے
وہ بھی اپنی نہیں مشکوں کی حفاظت کے لئے

آئین وفا کے بعد ان کا سب سے مشہور مرثیہ ''جلوۂ تہذیب'' ہے۔ جو اپنے عنوان اور موجوع کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مرثیہ حضرت اکبرؑ کے حال کا ہے لیکن اس کا چہرہ جدید مضامین پر مشتمل ہے۔ اس مرثیہ میں صفدر حسین نے ایک ایسے قاری کو پیش کیا ہے جو بیسوی صدی کا رہنے والا ہے اور ذہنی کشمکش کا شکار ہے۔ جس تہذیب پر نسل انسانی کا دارومدار تھا انسان اس کو اب ترس رہا ہے۔ صفدر حسین نے بتایا ہے کہ تہذیب جو زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے اسکی روح حسینؑ ابن علی کی ذات ہے۔ مرثیہ میں تہذیب تخلیق کائنات کے حسن کو بتایا گیا ہے۔ مرثیہ کے کچھ بند ملاحظہ ہوں۔

نازِ تخلیق یہی ، راز تجلی بھی یہی　　جلوۂ طور یہی ،آتش سینا بھی یہی
گوتم و زرتشت کا شعلہ بھی یہی　　حسن یوسف بھی یہی اوریدِ بیضا بھی یہی
یہی ناگاہ دل کوہِ صفا سے نکلا
مشعل نور لیے غارِ حرا سے نکلا

یہی سرمایۂ انوار علومِ کونین　　تھا سلونی بہ لب فاتح صفین و حنین
یہی اسرار تجلی بہ حدیث ثقلین　　انھیں اسرار تجلی کا امیں قلب حسین
ظلم تر سیدہ و لدزیدہ سیاہی جن سے
کر بلا مہبطِ انوار الٰہی جن سے

کربلا کیا ؟انھیں آیات درخشاں کی دلیل　　ایک صدیوں کی روایات کی صبح تکمیل
جن پہ برپا ہوئی قربانی موعودِ خلیل　　علی اکبرؑ تھے یہاں اور وہاں اسمٰعیل
خون کم مایہ ادھر خون نبی کے بدلے
لاکھ تلوار یں ادھر ایک چھری کے بدلے

کس قدر مرحلۂ صبر وتحمل ہے ادق　　ہاجرہ تک پئے فرزند رہیں محو قلق
لیکن ایثار کی تاریخ نے الٹا جو ورق　　امّ لیلیٰ کی جبیں پر نہ شکن تھی نہ عرق
کے لیے جبر گوارا اس نے
موت کو سونپ دیا آنکھ کا تارہ اس نے

یوں تو صفدر حسین پاکستان میں مقیم ہیں مگر ان کے مرثیے ہندوستان کی تمام روایت اور سماجی تہذیب کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔انھوں نے مٹتی ہوئی تہذیب اور مرثیہ کی ختم ہوتی ہوئی اہمیت کو دوبارہ زندا کرنے کی کوشش کی ہے۔'جلوۂ تہذیب' کے بارے میں ہلال نقوی اپنی رائے کچھ یوں پیش کرتے ہیں۔

''جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ کہ ''جلوۂ تہذیب'' کا شاعر ''رقص طاؤس'' اور ''چراغ دیرو حرم'' خلق کر چکا ہے۔اس نے شاعری میں ہیئت و معنی کے کئی تجربات کیے ہیں۔ اس کے سابق ہنر نے اس تخلیق کی راہ ہموار کی۔''۲۱

۳۲۔میر عباس علی عابدؔی :

میر عباس علی عابدی کا شمار دکن کے مرثیہ گو شعرا میں ہوتا ہے۔ان کے والد شاعر بوتراب کیپٹن سید عباس عابدی المتخلص عابدی حاجی زوار میر محمد حسین ایڈوکیٹ تھے۔میر عباس علی عابدی ۱۹۱۹ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور اس عہد کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی جن میں عربی و فارسی شامل تھی۔اس کے بعد دارالشفاء ہائی اسکول سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔نو یا دس سال سے انھوں نے شاعری کی شروعات نوحہ سے کی۔رفتہ رفتہ انھوں نے تمام شعری اصناف پر طبع آزمائی کی۔تقریباً ۲۱ سال کی عمر سے میر عباس عابدی نے غزل گوئی کا آغاز کیا اور ۲۵ سال کی عمر تک تمام اصنافِ سخن کو تحریر قلم لایا۔شاعری کے علاوہ ان کو سوز و ساز اور راگ ارگنی سے بھی دلچسپی تھی اور تمام راگوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔اس کے علاوہ انھوں نے مصوری کے بھی چار امتحانوں میں نمایاں کامیابی درج کی تھی۔ان کی ملازمت کا حوال بھی کافی دلچسپ ہے۔انھوں نے کل ۴۸ سال تک نظام حیدرآباد کے یہاں خدمات انجام دیں۔آصف سابع میر عثمان علی خاں کے یہاں میر عباس علی عابدی بحیثیت پیلیس آفیسر کی گیارہ سال فائز رہے۔اس کے بعد مکرم جاہ کے پاس فلک نما پیلیس میں تقریباً بیس سال تک خدمات انجام دیں اور ساتھ ساتھ لگا تارتیس سال ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام بھی دیتے رہے جس میں نعت،غزل اور سلام شامل تھے۔

ابتداء میں عباس عابدی نے سید نجم الدین حسین انجم ترابی سے اصلاح لی لیکن ان کے انتقال کے بعد تقریباً پانچ سال تک تجمل آفندی کی شاگردگی قبول کی۔انھوں نے نوحے،مرثیے اور سلام نہ صرف لکھے بلکہ وہ ان کے طرزوں کے موجد بھی تھے جو یوپی کے طرز سے زیادہ ہم آہنگ تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت مرثیہ گو بھی تھے اور مرثیہ خواں بھی۔ان کے مذہبی کلام کے مجموعہ ''عقد زہرا وعلیؑ''، ''نادعلیؑ'' اور ''یاحسینؑ'' شائع ہو چکے ہیں۔مجموعہ ''یاحسینؑ'' میں مختلف نوحے،سلام اور چار مراثی شامل ہیں۔جن میں تین شامِ غریباں پر ہیں اور ایک مرثیہ ''شہادتِ عظمیٰ'' کے عنوان سے ہے۔یہ مراثی زیادہ طویل نہیں ہیں بلکہ ۷ا یا ۱۸ بندوں پر ہی مشتمل ہیں۔ان کے مراثی میں نہ تو روایتی پن نظر آتا ہے اور نہ جدید کے آثار۔انکا نظریہ لفظی معنوں کو اہمیت دینا ہے جس کی وجہ سے ان کے مرثیوں میں صرف شہادت اور بین ملتا ہے۔اور اسی نظریہ کو انھوں

نے مرثیہ ''شہادتِ عظمیٰ'' میں بدرجہ اتم برتا ہے یعنی اس میں سید الشہداء کی شہادت اور واقعات بعد شہادت کو انھوں نے نہایت دلبرداشتہ انداز میں پیش کیا ہے۔ایک اور اہم بات جو اس مرثیہ کی ہے وہ یہ کہ اس میں روایتی اجزائے ترکیبی کا استعمال نہیں ہے۔اس کے باوجود سادہ زبان بڑی عمدگی سے استعمال کی گئی ہے۔ یہ مرثیہ نہایت پرسوز و پراثر ہے۔مرثیہ کی ابتداء ملاحظہ کیجئے:

پشت سے گھوڑے کی جب شاہ زمیں پر آئے سرجدا کرنے لیے ہاتھوں میں خنجر آئے
سرجدا کرنے لیے ہاتھوں میں خنجر آئے لینے سر زانو پہ زہرا و پیمبرؐ آئے
رُک گئے سارے عدو شمر چڑھا سینہ پر
سانس رکنے پر تڑپنے لگا زہرا کا پسر

اس بند میں امام حسین علیہ السلام کے وقت شہادت کے منظر کو روبہ قلم لایا گیا ہے۔اگلے بند میں شاعر نے سید الشہداء کے عجز وانکساری، یاس اور مرضی خدا پر رضا کو بیان کیا ہے۔غور فرمایئے:

شمر سے شہ نے کہا حمد و ثنا کرنے دے بخشش امت محمد کی دعا کرنے دے
اتنا تھم جا کہ مجھے شکر خدا کرنے دے سجدۂ عصر بہر حال ادا کرنے دے
قتل کر مجھ کو مگر پہلے ذرا دیکھ تو لے
زینب خیمہ سے نکل آئی ہے کیا دیکھ تو لے

یہاں شاعر نے امام حسین علیہ السلام کی عظمت بیان کی ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر امت محمدیؐ کو بچایا ہے۔ اس کے علاوہ تادم آخر تک ان کے عبادت کے جذبہ کو بھی شاعر نے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ چونکہ میر عباس علی عابدی مرثیہ خواں بھی تھے لہٰذا جو الفاظ لحن میں موزوں ہو جاتے ہیں ان سے خوب واقف تھے۔ اس لحاظ سے چھٹے مصرعہ میں انھوں نے لفظ 'زینب' کا نون ساقط الوزن استعمال کیا ہے۔

عابدی نے اپنے دوسرے مرثیے کا موضوع اس طرح ترتیب دیا ہے کہ جناب زینب، امام زین العابدینؑ سے بعد شہادت مشورہ کرتیں ہیں اور حکم کی طلب گار ہیں کہ کیا کیا جائے۔اس مرثیہ کے یہ بند غور فرمایئے:

غش سے جگا کے زینب دلگیر نے کہا سجاد اٹھو خیمے جلاتے ہیں اشقیا
سیدانیوں پہ آج نیا وقت ہے پڑا سب کی ردائیں چھن گئیں ہر اک کا سر کھلا
جل جائیں ہم کہ رُخ سوئے دشت بلا کریں
اب تم امامِ وقت ہو دو حکم کیا کریں

الغرض عابدی کے مراثی کی خصوصیت یہ ہیکہ ان میں ابتداء تا آخر دردوغم اوررنج والم کی فضا سانس لیتی ہے۔

۳۳۔بانو سید پوری :

مرثیہ نگاری کی تاریخ میں یوں تو ایک سے بڑھ کر ایک مرد مرثیہ گو گزرے ہیں ،لیکن جب نسوانی مرثیہ گوئی کی بات آتی ہے تو ہمیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔روپ کمار کماری کا ذکر تو تقریباً ہر محقق مرثیہ نے کیا ہے،لیکن ان کی شخصیت ہمیشہ شک کے دائرے میں رہی۔ڈاکٹر سید قمر عابدی لکھتے ہیں کہ سوال تو یہاں تک اٹھائے گئے کہ گویا یہ واقعی اس نام کی کوئی شخصیت تھی بھی یا نہیں ،یا کسی استاد کی محض فرضی کارگزاری تھی۔لیکن جب اس سلسلے میں بانو سید پوری کا ذکر ہوتا ہوتا ہے تو نجم آفندی کا یہ قول ذہن میں گھوم جاتا ہے۔

''اب مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں کیوں کہ مجھے پورا اعتبار ہے کہ میری ناموجودگی میں بانو اس ذمہ داری کو بخوبی سنبھال لیں گی۔''۲۲

بانو کے زیادہ تر مرثیے رسالوں میں ہی شائع ہوئے رہے ،لیکن ان کے حیات کے آخری دور میں ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ ''زادآخرت'' کے عنوان سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ان مجموعہ میں ان کے سات مرثیے شامل ہیں۔اور اس میں شامل سبھی مرثیے اپنی نوعیت کے الگ مرثیے ہیں چاہے ان کے عنوان ہوں یا پھر لہجہ اور پیشکش۔ان کے کچھ مرثیے تو ایسی شخصیت کے ہیں کہ جن کا تذکرہ بہت کم یا یوں کہئے کہ دیکھنے کو ہی نہیں ملتا ہے۔وہ شخصیت جناب مختار اور میثمِ تمّار کی ہے۔ان کے حال کے منقبت تو ملتے ہیں لیکن مرثیہ شاید پہلی بار بانو نے تحریر کیا ہے۔

زادآخرت میں شامل پہلا مرثیہ حضرت علیؑ کا ہے۔یہ مرثیہ ابتداء میں منقبت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔بانو نے اس مرثیہ میں حضرت علی کے اس کردار کو رقم کیا ہے جس پر خود حضرت علیؑ ناز کرتے تھے۔ان کا مزدوری کرنا خود ان کی شان کو بالا کرتا ہے۔اس بات کو اجاگر کرنے کے لئے بانو سید پوری نے کچھ اس طرح لکھا ہے۔

ہے زمانے میں کہاں دوسری مولا کی مثال　　حسنِ ایثار ترا بخشش و احساں کا جمال
تیرے ملبوس وغذا شانِ عطا کا ہیں جلال　　کثرت زر سے نہیں تیری سخاوت کا کمال
چھالے ہاتھوں کے بیاں کرتے ہیں حالت تیری
ایک دستورِ مشیعت ہے سخاوت تیری

اس مجموعہ میں شامل دوسرا مرثیہ جناب فاطمہ زہرا کے حال کا ہے۔جس میں انھوں نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ فاطمہ کار رسالت کی برابر کی شریک تھیں کہ ان کے بغیر رسالت اپنے انجام تک نہ پہنچ سکتا تھا۔انھوں نے بتایا کہ مردوں کی راہنما تو خود پیمبر ہیں مگر عورتوں کے احکام کے لئے خدا نے فاطمہ کو پیدا کیا ہے۔اور جب بانو نے اس بات کو ثابت کر دیا تو آگے وہ اس طرح لکھتی ہیں کہ ان کا کردار آج کے مسائل کا حل بنتا نظر آتا ہے۔کس صورت میں لوگوں سے

مساوات کے ساتھ پیش آنا چاہیئے ،انسانی دوستی کے کیا اصول ہیں ،انسانی برابری کس کو کہتے ہیں ،ان سب باتوں کو بانو نے کردار فاطمہ کے ذریعہ اس مرثیہ میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کیا عزت وحرمت کا ہے ٹھہراؤ عمل میں　　لونڈی سے برابر کا ہے برتاؤ عمل میں
یہ شان مساوات کی دکھلاؤ عمل میں　　الجھن میں بھی بس رہتا ہے سلجھاؤ عمل میں
فرق آیا تو نقشِ ھل اتیٰ بن گیئں زہرا
مصروفِ عمل تین شب و روز تھیں زہرا

ان کا تیسرا مرثیہ جو اس مجموعہ میں شامل ہے وہ حضرت امام حسنؑ کا ہے۔ اس مرثیہ میں انھوں نے صلح کے حوالے سے کئی فلسفیانہ بند نظم کئے ہیں، جس میں صلح کے مقصد اور اس کی اہمیت کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں صلح کی اہمیت اور جدید حالات کو مدنظر رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ جو خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

صلح تہذیب کی اک شرحِ مبیں ہوتی ہے　　کس قدر صلح کی تصویر حسیں ہوتی ہے
صلح انساں کے شرافت کی امیں ہوتی ہے　　جادۂ فکر پہ تدبیر یقیں ہوتی ہے
کشمکش ختم نہیں ہوتی ہے شمشیروں سے
بات بنتی ہے تو بس صلح کی تدبیروں سے

کہیں تخریب سے ہو سکتی ہے تعمیر کی فتح　　دیر پا ہوتی نہیں تیغ کی شمشیر کی فتح
صلح کی فتح ہے بس عزت وتوقیر کی فتح　　زخم ہی زخم ہے غافل تبر وتیر کی فتح
حکمتِ چارہ گری ذہن کے بیماروں کی
دھار مڑ سکتی ہے بس صلح سے تلواروں کی

بانو سید پوری نے اس مرثیہ میں امام حسنؑ کی صلح کو کربلا کا پیش خیمہ قرار دیتی ہوئی کہتی ہیں کہ امام حسنؑ ہی وہ شخصیت ہیں جس نے کربلا کے لئے زمین تیار کی۔ اسلام کو شاہی دور سے دور کرنے میں مدد کی اور اسکو ایک حقیقی دین بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ لیکن بانو اس بات کو نظر انداز کرتی ہیں کہ دین تو کبھی شاہی تھا ہی نہیں اور اسکو حقیقی دین تو رسول نے ہی بنا دیا تھا۔ ان کا چوتھا مرثیہ جو اس مجموعے میں شامل ہے وہ جناب سید سجاد کا ہے۔ جس میں بانو نے ایک قیدی ،مظلوم اور بیمار کی جرات کے حوالے سے بات کی ہے۔ یزید کے دربار میں سجاد کا تقریر، حق بیانی اور باطل کی شکست کو بڑے پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ جناب سجاد کی دعاؤں کے مجموعے ''صحیفۂ کاملہ'' کا ذکر بھی کرتی ہیں اور ساتھ ہی اس کی عظمت بھی بیان کرتی ہیں۔

ہر نفس جہدِ بقا تھی تیری ہر سانس جہاد   کیسے آسکتی ہے الفاظ میں تیری روداد
تو امامت کا تسلسل ہے نبوت کی مراد   کر دیا تونے ادا حقِ خدا حق عباد

لفظ و معنی کی زبان پر ہے وظیفہ تیرا
سانس لیتا ہے دعاؤں میں صحیفہ تیرا

اس مجموعے میں ان کا اگلا مرثیہ جناب زینبؑ کا ہے۔جس میں جناب زینب کے تیور کا بیان موجودہ حال کے حوالے سے پیش کیا ہے۔اس میں ان کی اہمیت وعظمت کے بعد کربلا اور اس کے اثرات ، باطل کی شکست اور فتح حق بہ عنوان جناب زینبؑ بانو نے پوری کاوش سے نظم کیا ہے۔بانو کے سارے مرثیے کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا ضروری ہے کہ وہ ایک الگ فکر رکھنے والی خاتون تھیں ۔ان کے مرثیوں میں بے جا روایت پرستی نہیں ملتی اور یہی حال مرثیے کے اجزائے کے حوالے سے بھی ملتا ہے۔مرثیے مختصر ہونے کے باوجود اس میں درد واثر بھرپور ملتا ہے۔ان سب کے باوجود مرثیے کی زبان روایتی مرثیوں کی زبان سے الگ ہوکر قصیدہ کے زبان بن گئی ہے۔جس میں مشکل پسندی کے علاوہ کہیں کہیں سارہ زور قافیہ پیمائی پر نظر آتا ہے۔

۳۴۔امیدؔ فاضلی :

نام ارشاد احمد فاضلی اور تخلص امیدؔ کرتے تھے۔یہ ۷انومبر ۱۹۲۳ء کو بمقام ڈبائی ضلع بلندشہر میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام محمد فاروق حسن تھا۔انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد کے زیر نگرانی پوری کی ۔ابتداء میں فاضلی نے غزل گوئی میں طبع آزمائی کی ۔اس کے بعد مرثیہ گوئی کی طرف منتقل ہوئے۔ان کی غزل سے یہ قیاس لگایا جاسکتا ہے کہ وہ غزل نہ ہوکر سلام کے بیت ہیں۔فاضلی کے غزلوں کا ایک مجموعہ ’’دریا آخر دریا ہے‘‘ کے کچھ اشعار ایسے ہیں جو بغیر نام کربلا لئے قارئین کو کربلا پہنچا دیتے ہیں۔

احساس ستم مجبوروں میں جس وقت جہاں بیدار ہوا
ہر آہ وہیں جھنکار بنی ہر زخم وہیں تلوار ہوا

☆☆

خیمہ گاہ تشنگاں میں پیاس کی لہروں کے ساتھ
تیر دریا کی طرف سے رات بھر آئے بہت

فاضلی نے اپنی مرثیہ کی ابتداء ۱۹۷۳ء سے کی ۔انھوں نے اپنے مرثیوں میں موضوعات کو پیش کیا۔جس کے ہالے میں کرداروں کو پیش کرسکیں۔ان کے دو مجموعے ’’سر نینوا‘‘ اور ’’تب وتابِ جاوداں‘‘ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔’سر نینوا‘ میں ان کے چھ مرثیے شامل ہیں۔ جو کچھ اس طرح ہیں۔روشنی ،قرآن اور اہل بیت ،علم وعمل ،شعور وعشق ،صبر ورضا

اور بالعصر۔ یہ ایسے مرثیے ہیں جن کے عنوان ہی ان کے موضوع ہیں یہ سبھی مرثیے جدید طرز کے ہیں۔غم حسین کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل اور بدحالیوں کو بھی انھوں نے مرثیوں کا موضوع بنایا ہے۔فاضلی کی ذات میں برپا اضطراب نے انھیں مرثیہ کی طرف آنے پر مجبور کردیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی مرثیوں میں غزل کا رنگ نمایا طور پر نظر آتا ہے۔امام حسینؑ کا میدان جنگ میں آمد کا ایک منظر دیکھئے۔

حسینؑ تیغ یداللہ جب بچا کے چلے　　جنھیں تھا غرۂ جرات ، نظر بچا کے چلے
ہوائے گرم کے جھونکے بھی سر بچا کے چلے　　کسے مجال تھی گردن کوئی اٹھا کے چلے

اٹھا یہ شور شہ مشرقین آتے ہیں
بچاؤ جان کہ اب خود حسین آتے ہیں

فاضلی مرثیوں میں جب کرداروں کو موضوعات کے دائرے میں پیش کرتے ہیں تو مرثیوں میں روایتی اجزاء کو بھی پیش کرتے ہیں۔مثلاً ان مرثیوں میں رخصت بھی شامل ہے اور مکالمے بھی۔گھوڑے اور تلواروں کی تعریفیں بھی شامل ہیں اور نفسیاتی گوشے بھی۔جو مرثیوں کو کامیاب بناتے ہیں۔ان کے جو مرثیے جدید طرز کے ہیں وہ اپنے عنوان کے تحت ایک منفرد مقام رکھتے ہیں،مثلاً علم وعمل، روشنی اور العصر۔فاضلی اپنے مرثیوں میں قدیم اور جدید کی تفریق نہیں رکھتے۔وہ اپنی ذات کے حوالے سے کربلا اور حسینیت کے متعلق جو سوچتے ہیں وہی اپنے مرثیوں میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کا ایک مرثیہ ''علم وعمل'' کو دیکھئے۔فاضلی نے اس میں کس خوبی سے علم وجہل کا فرق اور عمل کا معیار بتایا ہے۔یہ مرثیہ بہت طویل نہ ہوکر ۳۱ بندوں پر ہی لکھا گیا۔

علم اک راستہ محسوس سے معلوم کی سمت　　علم لازم کا سفر جلوۂ ملزوم کی سمت
فکر پرواز ہے یہ لفظ سے مفہوم کی سمت　　علم ہر لحہ رواں اسم سے موسوم کی سمت

کب یہ دامانِ محمد سے جدا ہوتا ہے
بوئے گل کے لئے یہ مثل صبا ہوتا ہے

جہل کے ہاتھوں میں تلوار کا مطلب ہے فساد　　علم کے ہاتھ میں تلوار کے معنی ہے جہاد
علم کے پاس ہو طاقت تو جہاں ہو آباد　　جہل ہو صاحبِ قوّت تو بنے ابن زیاد

علم طالب کو طلب سے بھی سوا دیتا ہے
جہل انسان کو بوجہل بنا دیتا ہے

علم ڈھل جائے عمل میں تو محمدؐ کا علم　　اور عمل علم میں رچ جائے تو کرار حشم
علم ہے دل کا صحیفہ تو عمل اس کا قلم　　علم اگر سوزِ یقیں ہے تو عمل دیدۂ نم

علم نے گنگ خیالوں کو زبانیں دی ہیں
اورعمل نے سرِمقتل بھی اذانیں دی ہیں

اپنے مرثیہ ''العصر''میں فاضلی نے تمام موضوعات کوسمیٹ کر لکھا ہے۔انھوں نے انسان کے مسائل کو بیان کیا ہےاور بتایا ہے کہ آج کا انسان خسارے میں جی رہا ہے،سوائے ان کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کو انجام دیے ہیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو صبر وحق کی وصیت کی ہے۔فاضلی زبان روایتی مرثیوں کی طرح صاف اور شستہ ہے۔اورانداز بیان بھی اوروں سے جداگانہ نہیں ہے۔

۳۵۔ مہدی نظمی :

ولادت لکھنؤ کے جوہری محلّہ ۱۹۲۳ء کی ہے۔یوں تو ان کا اصلی نام سید ابن الحسن تھا لیکن جب انھوں نے اپنا تعلق ادب سے جوڑا تو نام بھی بدل لیا اور ابن الحسن سے مہدی نظمی کر لیا۔آج ادبی دنیا انھیں اسی نام سے جانتی ہے۔اپنے بارے میں نظمی خود بیان کرتے ہیں۔

> '' ۲۳اپریل ۱۹۲۳ءکولکھنؤ کی ایک بستی ''جوہری محلّہ'' کے ایک چھوٹے سے گھرانے میں پیدا ہوا۔جس کے در و دیوار پر عربی کا سبزہ اگ رہا تھا۔اور مفلسی کی بہار آئی ہوئی تھی۔میرے دادا شاعر تھے نام تھا سید فرزند حسین فاحر۔میرے والد شاعر تھے ان کا نام تھا سید اولاد حسین عرف للن صاحب شاعر،میری والدہ بھی لکھتی پڑتی تھی،ان کا نام تھا رضیہ بیگم۔ان کی ایک تالیف بہت مشہور ہے'' تذکرۃ الصحابیات۔''۲۳

مہدی نظمی کے والد رامپور کے دربار سے وابستہ تھے۔اس لحاظ سے مہدی کو بھی رامپور میں رہنا پڑا۔ان کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے یہ علی گڑھ گئے اور پھر وہاں سے لاہور کا رخ کیا۔اور وہاں انھوں نے مختلف فنون کی ٹریننگ لی۔۱۹۴۲ءکو مہدی کے والد نے رامپور کو خیر باد کر لکھنؤ منتقل ہو گئے۔۱۹۵۴ء میں مہدی نے دہلی قیام کیا اور صحافت کی دنیا سے رابطہ قائم کیا اور پھر صحافت ہی ان کا پیشہ بن گیا۔انھوں نے مختلف اخباروں اور میگزینوں میں لکھتے رہے جن میں نئی دنیا، پیام وطن،عوام،ایشیا،کاروان وطن،نظارہ،جمالستان،حسینی آواز وغیرہ خاص طار سے قابل ذکر ہیں۔

مہدی نظمی نے بھی اوروں کی طرح اپنی شاعری کی ابتداء غزل اور نظم سے کی،اس کے علاوہ منقبت،قصیدہ،مثنوی اور مرثیہ میں بھی قلم آزمائی ہے۔انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کی بھی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے جس میں افسانے،ناول،ریڈیو فیچر اور تاریخی مضامین شامل ہیں۔دھوپ چاندنی،گرم خون،جاں بازام عامر اور زلف وزنجیر وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔

مہدی نظمی نے اپنے مرثیوں میں جدید مسائل کے روایتی انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے مرثیوں میں گھوڑے اور تلواروں وغیرہ کی تعریف، رخصت، جنگ، رجز، سراپا اور بین کا ذکر خاص طور سے ملتا ہے۔ان کے تین مرثیوں کے مجموعے ملتے ہیں، جن میں مظلوم کربلا جلد اول اور دوم اور نذر اہل بیت شامل ہیں۔مہدی کے مرثیے کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مرثیوں میں اجزائے ترکیبی کے باوجود اپنی ایک الگ راہ اختیار کی۔انھوں نے مرثیوں میں زیادہ زور شہادت حسین پر دیا ہے۔ادر ساتھ ہی ان کے مقصد کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ قدیم پیرائے میں جدید فکر کو کامیابی کے ساتھ داخل کرتے نظر آتے ہیں۔یہ مرثیوں میں عمل کی باتیں کرتے ہیں اور جگہ جگہ پر انھوں نے مقصدِ شہادت حسین کا بیان کیا ہے۔

مہدی نظمی نے مرثیوں میں جدید مسائل پر خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ان میں جوہری توانائی یعنی ایٹم بم کی لڑائی کے خطرات، کولڈ وار اور ہتھیاروں کے ذخیرہ خیزی وغیرہ کے مضامین کا ذکر ملتا ہے۔ایک مرثیہ میں وہ ان مسائل کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

وہ ہوا و حرص کے میداں میں زرداروں کی دوڑ　　وہ فلک پر جوہری طاقت کے طیاروں کی دوڑ
وہ ستم ایجاد دانائی وہ ہتھیاروں کے دوڑ　　وہ خلا کی کوچ کرنے والے سیاروں کی دوڑ
مٹ نہ جائے خاک سے نام و نشان زندگی
رہ گزارِ مرگ میں ہے کاروان زندگی

ہے ستاروں کی بلندی پر تصادم کا خیال　　شیشۂ خلقت ہے نازک پڑنے ہی والا ہے بال
بننے والا ہے خلا دامانِ میداںِ جدال　　چاند میں ہوگی لڑائی کہکشانوں میں قتال
سازشِ ابلیس ہے آزار دینے کے لئے
بدلا آدم کا بنی آدم سے لینے کے لئے

خوں فشاں تلوار ہے دو فلسفوں کی بات پر　　ایک اس کی تاک میں ہے ایک اس کے گھات میں
دھوکے سو سو رنگ کے پنہاں ہیں اک اک بات میں　　آدمی مایوس دن میں ہے ہراساں رات میں
غم کی چنگاری سلگتی ہے حواس و ہوش میں
جانکنی ہے زندگی کی موت کی آغوش میں

مرثیہ کے یہ بند دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر کس درجہ صحیح ہے، آج کے دور یا آنے والے وقت کا ان کو احساس ہے۔ان کی یہی فکر مہدی کو اوروں سے ایک منفرد مقام دلاتی ہے۔مہدی نے مرثیوں میں انیسؔ کی مرثیہ گوئی اور انکے طرز کو بھی پیش کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کو ''انیس العصر'' بھی کہا جاتا ہے۔اس کا بیان ڈاکٹر سید قمر عابدی نے اپنی

کیاہے میں بھی کیا ہے۔

''ان کی مرثیہ گوئی قدیم طرز کی ہوتے ہوئے بھی جدید فکر لئے ہوئے ہے۔انیس کی مرثیہ گوئی کے سلسلے کو انھوں نے نئی ڈگر کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔اسی لئے ادبی حلقے میں ان کو''انیس العصر'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔''۲۴

۳۶۔ثمرہلّوری :

ان کا اصل نام سید محبّ الحسن رضوی تھا۔ان کی پیدائش ۱۵جون ۱۹۲۷ء کو ہلور(یوپی) میں ہوئی تھی۔جو آج کل سدھارتھ نگر ضلع میں واقع ہیں۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی۔ان کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔یہ ہندی بھی کافی اچھی جانتے تھے۔اس سلسلے میں امامیہ مشن کے زیر اہتمام انھوں نے بہت سی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ثمر کو علم عروض پر عبور حاصل ہے، یہ اپنے وقت کے ماہر لسانیات مانے جانے تھے۔انھوں نے اپنے بی اے تک کی تعلیم ہلور میں پوری کی لیکن تعلیم کے بعد روزگار کے سلسلے میں آپ کو ہلور کو خیر باد کر کے الہ آباد میں جانا پڑا وہاں انھوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ ایم اے فارسی زبان و ادب سے کیا۔

ثمر ہلوری نے اپنے شاعری کے ذریعہ یہاں بہت نام کمایا۔یہی سبب ہے کہ ان کے بے شمار شاگرد الہ آباد میں موجود ہیں۔جن میں احمد رمزؔ، انورؔ عباس، عابد الہ آبادی وغیرہ کے نام شمار کئے جا سکتے ہیں۔انھوں نے ہمیشہ شعر و سخن کی محفلوں کی سرپرستی کی تا کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔اور اسی سلسلے کے تحت انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا جو''خیمۂ نیم شبی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس ادارہ کی دوسری شاخ انھوں نے''خیمۂ نیم روز'' کے نام سے ہلور میں شروع کی۔اس ادارہ کا مقصد یہ تھا کہ نئے لکھنے والوں کو ایک اسٹیج ملے اور ادب کی خدمت بھی ہو سکے۔

ثمر نے اپنی شاعری کا آغاز نظم سے کیا اور پھر بعد میں غزل وغیرہ لکھے۔انھوں نے تقریباً ہر صنف سخن کو اپنا موضوع بنایا ہے۔شروع میں یہ نظم اور غزل لکھتے رہے لیکن بعد میں مذہبی شاعری اور مرثیہ کی طرف گامزن ہوئے۔ انھوں نے کئی مرثیوں کی تخلیق کی مگر کوئی بھی مرثیہ شائع نہ ہو سکا۔ان کے کچھ مرثیے شمس الرحمٰن فاروقی اور مہدی نظمی جو ایک مرثیہ گو شاعر ہیں کو حاصل ہوئے مگر مہدی نظمی کے انتقال کے بعد وہ چھپ نہ سکے۔ان کا ایک مجموعہ''ہیرے پتھر'' کے نام سے ملتا ہے جو ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کی کاوشوں میں ۲۰۰۸ء میں چھپا ہے۔اس میں ثمر کا ایک مرثیہ جو کہ حضرت عباسؑ کے حال کا ہے ملتا ہے۔اس کے کچھ بند اس طرح ہیں۔

ملگجی صبح عیاں یوں ہوئی مہتاب کے بعد سرمہ سا آنکھ کھلے جیسے کہیں خواب کے بعد
غول حوروں کا چلا خلد سے ،آداب کے بعد خدمتِ شاہ میں کی عرض یہ القاب کے بعد
واری یہ بانوئے جنت کی کنیزیں مولا
لائی ہیں نذر کو فردوس کی چیزیں مولا

یہ قبا سندسی استبرقی جامہ یہ ہے اطلسی خلد معلیٰ کا عمامہ یہ ہے
رب کی مرضی جو خریدی ہے تو نامہ یہ ہے یہ قلمدان مشیت کا ہے خامہ یہ ہے
حق کا اعلان یہ ہے خلد کے سردار ہیں آپ
جس کو جو چاہیں دیں کونین کے مختار ہیں آپ

ان کا یہ مرثیہ پوری طرح روایتی انداز میں لکھا گیا ہے جس کو ثمر نے ۱۹۷۱ء میں تصنیف کیا تھا۔اس کے باوجود ثمر کی شاعری کے جواہر بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں ۔انھوں نے مرثیہ میں ہر جزو مرثیہ کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہاریہ، چہرے کے بعد کے درمیان میں کچھ بند ساقی نامہ کے بھی ملتے ہیں ۔غرض یہ کہ ثمر ہلوری نے مرثیہ میں تمام اجزائے ترکیبی کا استعمال بالکل روایتی انداز میں کیا ہے۔اس میں جو بند مصائب کے استعمال ہوئے ہیں وہ بالکل سادہ ہیں،اس کی وجہ شاید اس وقت کے حالات ہو سکتیں ہیں۔یہ بند دیکھئے۔

ٹھوکریں کھاتے ہوئے رن میں ادھر اور ادھر ہاتھ سے تھامے ہوئے شاہ ضعیفی میں کمر
لاش عباسؑ پہ پہنچے تو کہا یہ رو کر بھائی قربان ہو اے جانِ برادر تم پر
جان و دل سے تمھیں بھائی ہے ترائی بھائی
چھوڑ کو مجھ کو بسائی ہے ترائی بھائی

شاہ چلائے نجف سے چلے آؤ بابا رحم تنہائی شبیّر پہ کھاؤ بابا
ہے یہی وقت اب اعجاز دیکھاؤ بابا اپنے عباسؑ کو مرنے سے بچاؤ بابا
بے سہارا ہوا جاتا ہے حسین اے بابا
جیتے جی مل نہیں سکتا اسے چین اے بابا

ثمر ہلوری کا صرف یہی ایک مرثیہ شائع ہو سکا ہے۔ہم یہ امید کرتے ہیں کہ ان کے اور مرثیے بھی جلد شائع ہوگیں۔

۳۷۔سید انور عباس :

مرثیہ گوئی میں انور عباس کا نام بھی بے حد ادب اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ان کی ولادت ۵ ستمبر ۱۹۲۷ء کو الہ آباد میں ہوئی تھی۔ان کے والد کا نام سید معجز عباس تھا۔انور عباس ایک زمیں دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔انور عباس نے بھی اوروں کی طرح شاعری کی ابتداء غزل سے کی ،اور بعد میں تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔مگر منقبت،قصائد اور مرثیہ نگاری ان کا خاص وصف تھا۔انور عباس اصلاح بیت کے لئے ثمر ہلوری کی شاگردگی اختیار کی تھی۔

انور عباس کا نظموں کا ایک مجموعہ ''نظم و رزم'' کے عنوان سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ان کی شاعری فکری شاعری

ہے،اس لئے ان کے مرثیوں میں بھی نئی نئی فکریں نظر آتی ہیں۔اور موجودہ حالات پر نظر ہونے کی وجہ سے ان کے مرثیے جدید لب ولہجہ کے مرثیے ہیں۔انور عباس نے کئی مرثیے لکھے ہیں جو قدیم طرز کے بھی ہیں اور جدید طرز کے ہیں۔یہ مرثیے موجوعاتی ہیں جو اپنی فکر میں منفرد ہیں۔ان کا ایک مرثیہ جو امام زمانہؑ کے حال کا ہے بہت مشہور ہے۔اس مرثیہ میں انھوں نے فن شاعری کے علاوہ حالات زمانہ کا بھی ذکر بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔

فکر میں الجھا ہوا ذہن رسا ہے امروز　　　مردِ آزاد گرفتارِ بلا ہے امروز
لب رہِ عرض میں محرومِ دعا ہے امروز　　　بزم تحریم کی بے شور و صدا ہے امروز
چشم نمناک بھی چپ ہے دل مغموم بھی چپ
کیا کیا جائے کہ ہے ظلم پہ مظلوم بھی چپ

پھر حکومت کی ہوس بر سرِ پیکار ہوئی　　　پھر علم دہر میں مظلوموں پہ تلوار ہوئی
پھر انا فخر سے بیعت کی طلب گار ہوئی　　　پھر زمیں کرب وبلیات کی تیار ہوئی
عمر بے مایہ حیاتِ ابدی مانگتی ہے
اب فضا عزم حسین ابن علی مانگتی ہے

عزم حسینی کے ذیل میں انور عباس مرثیہ کو کچھ اس طرح آگے بڑھاتے ہیں کہ آج کے دور میں جرات گفتار کے ساتھ ساتھ قربانی کا جذبہ جو کہ اب ختم سا ہو گیا ہے قوم میں پھر سے پیدا ہو جائے۔اور اس سلسلے میں وہ مرثیہ کو دعائیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو۔

گونج قائم رہے جن کی وہ صدا دے مولا　　　ظرف وآہنگ معین الضعفا دے مولا
جادۂ مرگ میں جینے کی ادا دے مولا　　　خون کو گرمئی خونِ شہدا دے مولا
وہ گلا دے کہ جسے دیکھ کے خنجر تھم جائے
وہ لہو دے جو سرِ دامنِ قاتل جم جائے

انور عباس کی نظر موجودہ حالات پر ہونے کی وجہ سے ان کے مرثیہ میں بھی ان حالات کی عکاسی ملتی ہے۔ان کی زبان دبیریت کا انداز لئے ہوئے ہے۔

۳۸۔قیصر عباس بارہوی :

ان کی ولادت ۱۶ جنوری ۱۹۲۸ء کو سادات بارہ کی مشہور بستی کیتھوڑا میں ہوئی تھی۔انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ ۱۹ سال کی عمر میں لکھنو میں کہا تھا۔جس کا مطلع کچھ اس طرح تھا۔

''عباسؑ نام دار کو جوش نبرد ہے''

جیسا کی مطلع سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ قیصر کا یہ مرثیہ بیانہ طرز پہ لکھا گیا ہے۔ان کا دوسرا مرثیہ بھی بیانیہ طرز پر ہی ہے جسکو انھوں نے ۱۹۵۳ء میں لکھا تھا۔اس کا مطلع ''یثرب سے لٹ کے آئی جو اولا د فاطمہ'' ہے۔یہ مرثیہ میں اہل بیت کی مدینے واپسی کا حال بڑے پر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔اس مرثیہ کے ایک سال بعد ان کا ایک اور مرثیہ منظر عام پر آیا جو روز عاشور کا حال بیان کرتا ہے۔اس مرثیہ میں یوم عاشورہ کے اس وقت کا بیان ہے جب امام حسینؑ کی بڑی بیٹی صغرا کا قاصد میدان میں پہنچتا ہے۔اس مطلع قیصر نے کچھ یوں رقم کیا ہے۔

''ہنگام عصر آیا جو صغرا کا نامہ بر''

قیصر کے قریب ۵۷ مرثیوں کا ذکر ملتا ہے۔ان کے مرثیوں کے تین مجموعے میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔جو شہادت فطرت،معراج بشر اور عظیم مرثیے کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔مجموعہ معراج بشر کے مرثیوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیصر نے انیس اور نسیم کے اسالیب کی آمیزش سے اپنے مرثیے کے اسلوب فن میں نیا رنگ بھرنے کے کوشش کی ہے۔لیکن اس میں کہیں کہیں دبیر کے رنگ کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔۱۹۷۳ کے بعد کے کلام میں قیصر نے انیس اور نسیم کے اسالیب کی آمیزش کی جگہ دبیر اور جوش کے اسالیب کی آمیزش سے اپنے مرثیے میں ایک جدگانہ رنگ بھرا ہے۔مرثیہ عرفان حیات کے چند بند دیکھئے۔

یوں برستا ہے مری سوچ کا بادل اکثر جس طرح سوکھے ہوئے کھیت پہ دہقاں کی نظر
یوں مرا شعلۂ احساس دکھاتا ہے اثر جیسے بستی میں مرے گھر کے اجڑنے کی خبر
اپنے دشمن کو بھی جینے کی دعا دیتا ہوں
کوئی مظلوم ہو سینے سے لگا لیتا ہوں

شمع ہوں جلوہ خصالوں سے محبت ہے مجھے پھول ہوں تازہ نہالوں سے محبت ہے مجھے
جملہ پاکیزہ خیالوں سے محبت ہے مجھے میں اجالا ہوں اجالوں سے محبت ہے مجھے
دشمن جذبہ تخریب ہوں تعمیر ہوں میں
آدمیت مرا ایمان ہے شبیر ہوں میں

مجموعہ عظیم مرثیے میں ان کے دو ایسے مرثیے ملتے ہیں جو جناب زینبؑ کے حال میں لکھا گیا ہے۔اور ایک ان کے بیٹے عون و محمد کے حال کا ہے۔ان مرثیوں کی زبان سادگی سے بھرپور،لطافت اور شیرنی کے ساتھ ساتھ شعور کی گہرائی بھی لئے ہوئے ہے۔منظر نگاری کی طرف قیصر نے خاص توجہ دی ہے اور مرثیوں میں منظر کی تصویر میں اصل فضا کو باقی رکھا ہے۔اور مصائب کے بیان میں کبھی کبھی بہت اختصار سے کام لیا ہے۔مرثیہ 'شام غریباں' میں جناب حر کی زوجہ کے کھانا پانی لانے کا واقعہ تاریخی حیثیت سے مستند نہ سہی لیکن حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے درست ہوسکتا ہے۔

'' زینب نے پانی پی لیا تشہیر کے لئے''

اس مصرعہ کے ذریع قیصر صاحب نے مقصد حسینی کی اہمیت اور درد و کرب دونوں کو ظاہر کیا ہے۔ان کا ایک مرثیہ ''حیراں ہوں کیا فضائل زینب رقم کروں'' میں جناب زینب کی تصویر کشی کچھ اس انداز میں کی گئی ہے۔

وہ گفتگو خطاب پیمبر کہیں جسے وہ حوصلہ شجاعت حیدر کہیں جسے
وہ عزم انقلاب کا محور کہیں جسے وہ دل کہ جوانی علی اکبر کہیں جسے

زینبؑ پہ ہر بلندی فطرت تمام ہے
عباسؑ کیا ہے ،غیرت زینب کا نام ہے

قیصر کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے ہلال نقوی اپنی کتاب میں کچھ یوں لکھتے ہیں۔

'' ۱۹۷۰ کے بعد ان کی مرثیہ نگاری میں جدید طرز فکر کی اٹھان زیادہ محسوس ہوتی ہے۔خیال کی تازگی اور بیان کی دل کشی اس دور میں نمایاں ہیں۔''۲۵

۴۰۔شہزاد معصومی :

شہزاد معصومی کی ولادت ۱۹۲۹ء کو علی نگر ''پالی''،ضلع جہان آباد (بہار) میں ہوئی تھی۔ان کے والد کا نام سید آل حسن معصومی تھا۔شہزاد نے شاعری کی ابتداء بچپن سے ہی کر دی تھی۔انھوں نے بہت سی نظم اور غزل لکھی،جسکی بیت اصلاح وہ اپنے والد سے لیا کرتے تھے۔انکو ترقی پسندر.جحان نے بہت متاثر کیا جس نے شعور کی نشو نما میں بہت مدد کی۔

مرثیہ کی ابتداء انھوں نے پالی میں کی۔جہاں محرم کی ایک مجلس میں مشہور مرثیہ گو شاعر جناب علی اکبر کاظمی نے اپنا مرثیہ جس کا مطلع تھا'' آج ہر دل پہ عجب غم کی گھٹا چھائی ہے'' پڑھا تو یہ شہزاد کی مرثیہ نگاری کا محرک بنا۔پھر دوسرے ہی سال انھوں نے اپنا جناب حرؑ کے حال کا کہہ ڈالا جس کا مطلع یہ تھا''ساقی عطا ہو فکر کو وہ جام بے خودی''۔اس مرثیہ کی کافی پزیرائی ہوئی اور یہیں سے ان کو مرثیہ کہنے کا حوصلہ ملا۔

شہزاد کے مرثیوں کا پہلا مجموعہ کلام''شعلۂ تشنگی'' کے نام سے بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔جسے بنگال اردو اکاڈمی نے ۱۹۸۱ء میں ایواڈ سے نوازہ۔ان کا ایک اور مجموعہ''معرکہ تیغ وگلو'' جوان کے بارہ مرثیوں پر مشتمل ہے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔جو خاص اہمیت کا حامل ہے۔ان کے مرثیوں میں انیسؔ اور شادؔ دونوں کے رنگ نمایاں طور پر ملتے ہیں۔بقول شہزاد انھوں نے خود انیسؔ اور شادؔ کو اپنا روحانی استاد تسلیم کیا تھا۔اور ان کے ہی رنگ میں مرثیہ کہنے کی کوشش کی ہے۔یہاں ایک بات اور بتاتی چلوں کہ انیسؔ رنگ قدیم رکھتے ہیں جبکہ شادؔ رنگ جدید کے مرثیہ گو تھے۔ اور یہی آمیزش شہزاد کے مرثیوں میں جھلکتی ہے۔جس کا ذکر انھوں نے اپنے مرثیوں میں بھی کیا ہے۔

ساقی عطا ہو فکر کو وہ جامِ بے خودی خود میکدہ بدوش ہو طبع رواں مری

ہے شآد اور انیؔس کی منظور پیروی　　　جن کی زباں ہے معجزۂ فنِ شاعری

پتھر بھی موم سحر بیانی سے جس کی ہو

دریا بھی آب آب روانی سے جس کی ہو

شہزاد نے اپنے مرثیوں میں انیؔس وشآد کے اسلوب کے ساتھ ساتھ جدید مسائل اور دور حاضر کی مشکلات پر بھی نظر رکھی ہے۔انھوں نے بڑی خوبصورتی سے جدیدیت اور سائنسی مسائل کو دلیل کے ساتھ مرثیوں میں پیش کیا ہے۔

کیا مقتدر انسان کا ہو چاند پہ جانا　　　مریخ پہ ''راکٹ'' کا دھنواں چھوڑ کے آنا

میزائل، وایٹم کا کہیں رعب جمانا　　　قوت کے تصرف سے زمانے کو ہلانا

سورج کی کرن ہم نے اگر کر لی اسیر آج

کیا اس سے بھلا مطمئن اپنا ہو ضمیر آج

جدید اور سائنسی مسائل کو اپنے مرثیوں میں برتنے کے باوجود یہ اپنے جدید لب ولہجہ کو ترک نہیں کرتے بلکہ کربلا کے حوالے سے کردار حسینی اور مقصد شہادت امام مظلوم بیان کرتے نظر آتے ہیں ۔ یہ کربلائی شہیدوں کے حوالے سے انسانیت کا درس بھی دیتے ہیں۔شہزاد کے تقریباً سبھی مرثیوں میں جدید مسائل اور نئی فکر نظر آتی ہے۔لیکن اس مرثیے میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ قدیم رنگ کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔مرثیوں میں کہیں کہیں تلوار کی کاٹ کے ساتھ ساتھ ساقی نامہ اور رجز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔مگر نہ تو یہ بند اضافی معلوم ہوتے ہیں اور نہ ہی اس سے مرثیے کے جدید رنگ میں کوئی فرق پڑتا ہے۔اسی سبب سے ان کی پہچان جدیدیت کے منجھے ہوئے شاعروں میں ہوتی ہے۔ان کے مرثیے کے کچھ بند ملاحظہ ہوں۔

ہے منفرد زمانے میں یہ خیر وشر کی جنگ　　　وہ کربلا کے دشت میں فکر ونظر کی جنگ

باطل سے یوں ہوئی نہ حقوقِ بشر کی جنگ　　　اللہ رے حسین کی وہ دو پہر کی جنگ

تا حشر حق کو مطلعِ خورشید کر دیا

انسانیت کو زندۂ جاوید کر دیا

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہزاد معصومی کی مرثیہ نگاری جدید اور قدیم رنگ کی آمیزش ایک نئی شکل کو جنم دیتی ہے۔ان کا لب ولہجہ بھی کہیں شاد تو کہیں انیس کے رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔یہی سبب ہی کہ جدید مرثیہ نگاروں میں یہ اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔

۴۱۔ پروفیسر سردار نقوی :

سردار نقوی امروہہ سے تعلق رکھتے ہیں۔امروہہ میں انھوں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس میں علمی وادبی سرگرمیوں کا چرچا تھا۔ان کی پیدائش مارچ ۱۹۴۱ء کو ہوئی تھی۔انکی تعلیم وتربیت بھی امروہہ میں ہی ہوئی۔سردار نقوی نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا اور اسمیں اپنا ایک منفرد مقام بنایا۔لیکن وہ غزل کی دنیا میں زیادہ دن نہ ٹھہر سکے اور ان کا ذہن مرثیہ نگاری کی طرف مائل ہو گیا۔سردار نقوی پاکستان ریڈیو کے لئے مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔یہ مضامین علمی،ادبی،مذہبی اور تہذیبی جیسے موضوعات پر ہوا کرتے تھے جن کی تعداد تقریباً سیکڑوں میں ہیں۔

پروفیسر سردار نقوی نے جو ایک اخاذ ذہن کے مالک تھے،اپنے ماحول اور اپنی محبتوں اور اپنے عقیدتوں کے ماخذ سے انسان دوستی،معاشی ناانصافیوں کے خلاف بغاوت اور ایک بہتر انسانی معاشرے کے قیام کا آئیڈیل ورثے میں پایا۔اور یہ آئیڈیل ان کے مرثیوں میں بھی نظر آتا ہے۔

ابتدا عظمت انساں ہے خبر ہے شبیّر   نور ہے یعنی محمدؐ سا بشر ہے شبیّر
سورۂ فجر کی میزان سحر ہے شبیّر   ذہن انسان میں اجالوں کا سفر ہے شبیّر
ارتقائے بشریت کی یہی منزل ہے
کربلا آج بھی ماضی نہیں مستقبل ہے

سردار نقوی نے اپنے مرثیوں میں کربلا کو دشت اور قتل گاہ ثابت کرنے کی جگہ اسے درس گاہ بنا کر پیش کیا ہے۔ایک ایسی درس گاہ جس نے موجودہ دور کے حساس انسان کو حریت فکر اور حق گوئی کا درس دیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنی مرثیوں میں تاریخ اسلام کے حوالوں پورے پورے اعتبار اور استناد کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے مرثیہ میں قرآنی آیتوں کے بھی حوالے پیش کیے ہیں۔پروفیسر سردار نقوی کے مرثیوں کے تین مجموعے ملتے ہیں۔جن میں نماز وفا،جوہر آگہی اور گریہ فرات ہے۔''گریہ فرات'' مجھے خورشید غازیپوری کے کتب خانے سے ملی۔جس میں ان کے چھ مراثی موجود ہیں۔جو اس طرح ہیں۔

۱) علم کی منزل معراج ہے عرفان رسول (۸۴ بند)
۲) عقل مسلم ہو تو ہادی کی ثنا کرتی ہے (۹۰ بند)
۳) ذکر شبیّرؑ ہے آسان یہی مشکل ہے (۷۴ بند)
۴) کربلا دین کی تہذیب کا گہوارہ ہے (۵۱ بند)
۵) شہر ابلاغ میں پھر باب وفا کھلتا ہے (۵۷ بند)
۶) کربلا آئینہ عظمتِ انسانی ہے (۵۲ بند)

پروفیسر سردار نقوی کے ان مرثیوں میں منطق کی دونوں قسموں کا کامیاب استعمال ملتا ہے۔ان کا ایک مرثیہ ''شہر ابلاغ میں پھر باب وفا کھلتا ہے'' اس کی مثال ہے۔اس کے ابتدائی دس بندوں میں جزئیات پر نگاہ ڈال کر مخاطب کو جس طرح کلیہ سے روشناس کرایا گیا ہے وہ نفیس بھی ہے اور علمی مزاج کا آئینہ دار بھی۔ان کا ایک اور مرثیہ جس کا مطلع ہے ''عقل مسلم ہو تو ہادی کی ثناء کرتی ہے'' اس کے ابتدائی چند بندوں میں جس طرح کلیات سے جزئیات کی طرف سفر کیا گیا ہے وہ شاعر کے فکری شعور کا غماز ہے۔مرثیہ کے کچھ بند ملاحظہ ہو۔

عقل مسلم ہو تو ہادی کی ثنا کرتی ہے   علم کو عدل کی میزان عطا کرتی ہے
فرض ہے اجرِ رسالت تو ادا کرتی ہے   مرکز نور سے مربوط رہا کرتی ہے
ایک ہی نور ، وہی شہر وہی دروازہ
علم کا شہر محمدؐ ہیں ، علی دروزہ

جہل جب دین میں فتنوں کو ہوا دیتا ہے   جال تشکیک کے ذہنوں میں بچھا دیتا ہے
حق سے یوں سرحدِ باطل کو ملا دیتا ہے   کفر پر جامۂ ِ ایمان سجا دیتا ہے
منبرحق پہ جو باطل کے قدم آتے ہیں
پھر نکالے ہوئے بت سوئے حرم آتے ہیں

تا بہ کے جھوٹے فسانوں سے طبیعت بہلے   عقل پھر عقل ہے کیوں بارِ جہالت سھ لے
یوں جسے چاہے کوئی اولِ مسلم کہہ لے   نعت تو لاؤ کوئی ، عمّ نبیؐ سے پہلے
جس کی تقدیر میں غلبہ ہے وہی غالب ہے
موجد نعت بہر حال ابو طالبؑ ہے

سب سے پہلے یہ کہا آپ نے صادق ہیں نبی   ماسبق ہیں جو کتب ان کے مطابق ہیں نبی
چشمہ رحمتِ رزّاق ہیں، رازق ہیں نبی   مظہرِ علمِ خدا ،مصحفِ ناطق ہیں نبی
کھیتیوں پر جو برستا ہے مسلسل پانی
ان کے چہرے سے طلب کرتا ہے بادل پانی

نازِ موسیٰ ہے اسے فخرِ مسیحؑا کہیۓ   حسبِ توفیق و نظر اسکا قصیدہ کہیۓ
دولت ِ آب کو جس شخص کا صدقا کہیۓ   اسکی اولا د کو پانی نہ ملے کیا کہیۓ
اور بھی اس چشمۂِ رحمت کا کرم جاری ہے
آل پر اسکی مگر ظلم وستم جاری ہے

جدید مرثیہ نگاری پہ اگر نظر ڈالی جائے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیشتر مراثی موضوع یا کردار کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ ایسے وقت میں سردار نقوی نے تجزیاتی مراثی لکھ کر اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ ان کے تجزیاتی مرثیوں کے بارے میں علامہ طالب جوہری لکھتے ہیں۔

''میں شدید اسرار کے ساتھ یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ سردار نقوی کے مرثیے نہ موضوعاتی ہیں اور نہ کرداری بلکہ اگر یہ اصطلاح مناسب ہو تو انہیں 'تجزیاتی مرثیے' کہا جاسکتا ہے۔''۲۶

سردار نقوی کا نام جدید مرثیہ کی تاریخ میں ان چند معتبر ناموں میں شامل ہیں جنھوں نے کربلا کے واقعہ کو ایک نئے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ساتھ ہی مرثیہ کے اس مزاج کو بھی بدلنے کی کوشش کی ہے جو صدیوں سے ایک روایت کی شکل میں چلا آ رہا تھا، اس کے باوجود ان کے مرثیوں میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک منفرد مرثیہ نگار کی شاعری میں ہونی چاہئے۔ سردار نقوی کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی اپنا خیال کچھ یوں پیش کرتے ہیں۔

''سردار نقوی نے شعوری کوشش سے تاریخ کے آئینے پر سے تنگ نظری کی گرد کو صاف کیا ہے۔ انھوں نے عالمانہ انداز میں تاریخ سے منسوب چند گمراہ کن سطور پر سرخ لکیر پھیر دی ہے۔ اس طرح شاعر سردار نقوی نے مورخ کا انتہائی سنجیدہ اور مشکل رول، پورے تحمل سے ادا کیا ہے۔ شاعر کا پختہ تاریخی شعور اور ان کے مرثیوں کی راشن تاریخی فضا یقیناً ان کی تخلیق کی ترفیع اور ترصیع کی بنیاد بنی ہے۔''۲۷

۴۲۔ سید محمد اظہر زائرؔ :

زائر سیتاپوری نے جدید مرثیہ کی تاریخ کو ایک انقلابی لہجہ عطا فرمایا ہے۔ ویسے تو ان کا نام سید محمد اظہار تھا لیکن انھوں نے اپنا تخلص زائرؔ لکھا۔ انھوں نے اپنے مرثیہ کا آغاز روایتی انداز سے کیا، لیکن بعد میں جدید مرثیے اور مقصدِ حسینی کو اپنے مرثیوں میں اہمیت دی۔ ان کے مرثیوں میں ایک انقلابی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ انھوں نے مرثیے میں آزادی کو خاص موضوع بنایا، جس سے ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل ہو سکے۔ زائرؔ کا پہلا مرثیہ ۱۹۳۲ء کو منظر عام پر آیا، جس میں روایتی رنگ صاف طور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد ان کا دوسرا مرثیہ ۱۹۴۳ میں آیا، جس میں جدید رنگ نظر آتا ہے۔ یہ مرثیہ ''پیغام فکر'' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں ۴۲ بند شامل ہیں۔ اس مرثیہ کے کچھ بند ملاحظہ ہو۔

عالم کے خشک و تر میں عجب انقلاب ہے　　سفا کیوں کا ظلم و ستم کا شباب ہے
ہر زندگی جہان میں پر اضطراب ہے　　امن و سکون کا لبِ بام آفتاب ہے

چھائی ہوئی ہے ظلمت غم کائنات پر
پردے پڑے ہوئے ہیں جمالِ حیات پر
دولت سے ہے تمیز شریف و ذلیل کی پھر اس میں بھی حدیں ہیں کثیر وقلیل کی
انسانیت کی قدر نہ نفس جلیل کی بس مرکز خیال ہے جھولی بخیل کی
جنت ہے اک نگاہ تمنا کے سامنے
سجدے میں دل ہیں دولت دنیا کے سامنے
اف درد سے بھری وہ کسانوں کی زندگی روتی ہے جن کے حال پہ خود ان کی بیکسی
وہ کشمکش حیات کی وہ ان کی خاموشی افلاس کی وہ ان پہ نگاہیں جمی ہوئی
چپ ہیں اگرچہ دل میں غمِ کائنات ہے
اک ساز بے صدا ہے کہ ان کی حیات ہے
ہاں پستیوں سے اوج کا ہے ایک راستہ دولت کے ہاتھ کیجئے سودا ضمیر کا
پھر دیکھئے تمام زمانے کا رتجھنا کیا دور ہے جو آپ کو کہنے لگے خدا
مافوق اپنے ظرف سے رتبہ بشر کا ہے
ادنیٰ سا اک طلسم یہ ارباب زر کا ہے

زائر کے بیشتر مرثیے غیر مطبوعہ تھے۔ان کا صرف ایک مرثیہ ''دنیا کو ایک راہ نما کی تلاش ہے'' بہت پسند کیا گیا اور یہ کئی بار شائع بھی ہوا۔زآئر کے مرثیے کو ان کے بیٹے احمد وصی اور کالی داس گپتا کے تعاون سے حاصل کر کے ''ترجمان'' اردو مرکز، عظیم آباد میں شائع کر دیے ہیں۔جس میں ان کے چھ مرثیے شامل ہیں۔

۱) دنیا کو ایک راہ نما کی تلاش ہے
۲) حسینؑ ابن علی فخر کائنات ہے تو
۳) آمد ہے اہلبیت کی دربار شام میں
۴) مقتل میں جب زوال ہوا آفتاب کا
۵) بلا کے رن میں خزاں فاطمہ کا باغ ہوا
۶) زوال مہر منور سے رن میں ہلچل ہے
۷) مومنو حشر دو عالم میں بپا ہوتا ہے

زآئر کا تیسرا مرثیہ '' آمد ہے اہل بیت کی دربار شام میں'' ایک بیانیہ مرثیہ ہے۔جس میں بعد شہادت امام حسینؑ

ان کی عورتوں اور بچوں کو شام کے دربار میں پیش کرنے کی واردات کو بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعدان کے کچھ مرثیہ صرف سوزخوانی کے لئے لکھے گئے تھے۔جس میں 'مومنوحشر دو عالم میں بپا ہوتا ہے' شامل ہے۔ یہ مرثیہ صرف ۱۲ بندوں پر ہی مشتمل ہے۔ایک مرثیہ 'زوالِ مہرمنور سے رن میں ہلچل ہے' انھوں نے نجم آفندی کی خواہش پر لکھا تھا،جس میں ۱۸ بند ہیں۔ان کے مرثیے نے جدید مرثیے کی تاریخ کو ایک انقلابی لہجہ دیا ہے۔سفارش حسین رضوی زائر کی مرثیہ نگاری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں۔

''زائر کے مرثیے کا انداز اوران کے بیان کا طرز رضاؔ سے ملتا جلتا ہے۔ان کے مرثیے کا مقصداورمنشاوہی روایتی ہے۔'' ۲۸

۴۳۔طیّب کاظمی :

طیّب کاظمی کی ولادت امبیڈکرنگرکی تحصیل اکبر پور میں ۱۴ مئی ۱۹۴۴ء کوایک زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی۔ان کے والد کا نام سیدعلی احمد کاظمی تھا۔انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں اور پھرشہر کانپور میں پوری کی۔آگے کی تعلیم جاری رکھنے کے لئے انکولکھنؤ جانا پڑا۔جہاں انھوں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعدشعیہ کالج میں ملازم ہو گئے۔اور وہیں سے ۲۰۰۶ء میں شعبہ طبیعیات کے لکچرر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

شاعری کی دنیا میں قدم انھوں نے نوحہ لکھ کر کیا۔طیّب نے اپنا پہلا نوحہ ۱۹۶۴ء میں ''حسین ابن علی تنہا ہیں رن میں یارسول اللہ'' لکھا۔جسکوانھوں نے اپنے استادشاعر ماہرؔلکھنوی کو دکھایا،نوحہ کی اصلاح کرتے ہوئے انھوں نے نوحہ کے پورے اشعار ہی بدل دئے جس سے ہمت پست ہوگئی۔بعد میں رفعت لکھنوی کے کہنے پر انھوں نے پہلا مرثیہ کہا۔ جس کا مطلع ''پروردگار عقل مجھے فکر نور دے'' تھا۔اسکی اصلاح طیّب نے انورؔنواب سے کروانی چاہی جوکہ علالت کی وجہ سے نہ ہوسکی۔تب طیّب کاظمی نے میر انیسؔ کواپناروحانی استادتسلیم کرکے مرثیہ کومکمل کیا۔بعد میں جب یہ مرثیہ انورنواب کو دکھایا توانھوں نے اس کی بڑی تعریف کی اورفرمایا کہ اب آپ اپنی نظر پر اعتماد کرکے اسکو پڑھ سکتے ہیں۔

طیّب کاظمی کے ۸ مرثیوں کا مجموعہ ''منظرمنظرخون'' کےعنوان سے ۲۰۰۸ میں شائع ہوا۔اس مجموعہ کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طیّب روایتی مرثیہ گوشاعر ہیں۔انھوں نے اپنے مرثیہ میں تمام اجزائے ترکیبی کوجگہ دی ہے مثلاً چہرہ،سراپا،رخصت،آمد،جنگ،شہادت اور بین۔اس کے علاوہ ان کے مرثیوں میں لکھنو اسکول کی خصوصیات بھی ملتی ہے جیسے نازک خیالی،تغزل اورتہذیبی روایتوں کا خیال۔

طیّب کاظمی نے جدیدیت کے دور میں بھی قدیم طرز کے مرثیے لکھےاورانھوں نے اس میں کوئی نئی راہ نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ان کا مقصدصرف انیسؔ و دبیرؔ کی پیروئی کرنا تھا۔پہلے مرثیے میں انھوں نے مرثیہ نگاری کے مقصد کو یوں بیان کیا ہے۔

یہ عہد کرکے آج اٹھاتا ہوں میں قلم اجذائے مرثیہ کو بہ خوبی کروں رقم
سلجھاؤں زلفِ فن کے کچھ اس طرح پیچ وخم جو مرثیے کا ہے وہی قائم رہے بھرم
مجھ کو اگر انیسؔ سخن کی مدد ملے
اس ذرّے کو دبیر فلک سے سند ملے

ان کا پہلا مرثیہ امام حسینؑ کے حال کا ہے جس میں انھوں نے مقصد سفر امام حسینؑ کو بیان کیا ہے۔ یہ روایتی انداز کا مرثیہ ہے۔ اس مرثیہ میں کچھ ایسے بند بھی پیش کئے گئے ہیں جو کہ انیس کی مرثیہ نگاری کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

یہ کہہ کے شاہ خیمے سے نکلے بہ چشمِ تر حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اِدھر اُدھر
جز یاس و بے کسی کوئی آیا نہیں نظر زینب رکاب تھامنے نکلی برہنہ سر
رہوار پر سوار جو ہونے لگے حسین
ساحل کی سمت دیکھ کے رونے لگے حسین

اس بند کے ذیل میں ذرا میر انیسؔ کے مرثیے کی یہ بیت بھی دیکھئے۔

نہ آسرا تھا کوئی شاہ کربلائی کو
فقط بہن نے کیا تھا سوار بھائی کو

طیّب کا یہ مرثیہ موضوع کے لحاظ سے بیحد روایتی ہے۔ جس میں صرف واقعات کی تفصیلی نظم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مجموعہ کا دوسرا مرثیہ ''وفا'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے جو حضرت عباسؑ کے حال کا ہے۔ عنوان کے حوالے سے یہ مرثیہ جدید لب ولہجہ کا معلوم ہوتا ہے۔ طیّب مرثیہ کی ابتداء بھی جدید اندازی سے کرتے ہیں لیکن آگے چل کر خود کو اجزائے ترکیبی کے سحر سے آزاد نہیں کرا پاتے اور وہ اپنی روش اور قدما کی پیروی میں مرثیہ کے آگے کے بند نظم کرتے ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل ایک اور مرثیہ جو کہ حضرت علی اکبرؑ سے مربوط ہے، اس میں انھوں نے حضرت علی اکبر کے ہم شبیہہ پیغمبر ہونے کی رعایت سے بڑے اچھے اچھے بند نظم کئے ہیں۔ اس میں مصائب کے ایک بند میں طیّب نے علی اکبر کے سینہ میں لگی برچھی کی انی کو ناگ پھنی سے تشبیہہ دیا ہے جس سے اس مرثیہ میں ہندوستانی آب وہوا نظر آتی ہے۔

دست اکبر کو جو سینے سے ہٹایا شہ نے آہ کس طرح ہو تحریر جو دیکھا شہ نے
بڑی مشکل سے جگر اپنا سنبھالا شہ نے ہاتھ جب زخم پہ رکھا تو یہ پایا شہ نے
دامن گل سے کوئی ناگ پھنی الجھی تھی
دل میں ٹوٹی ہوئی نیزہ انی الجھی تھی

مجموعہ میں شامل چھٹا مرثیہ اپنے عنوان اور کچھ حد تک جدید فکر کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔ یہ مرثیہ حسین کے دوست حبیب ابن مظاہر کے حال کا ہے، جن کی دوستی کو مثال کے طور پر پیش کر کے طیّب دنیا کو پیغام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ مرثیہ ''صحیفۂ عرفان'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے جن میں ۴۷ بند ترتیب دئے گئے ہیں۔ اس مرثیہ میں حبیب ابن مظاہر کے کردار اور ایثار کو بخوبی نظم کیا گیا ہے۔ اس کا ابتدائی بند ملاحظہ ہو۔

لکھ اے قلم صحیفۂ عرفان دوستی   منبر سے ہو تلاوت قرآن دوستی
روشن ہو سب پہ آیئہ وجدان دوستی   نافذ کچھ اس طرح سے ہو فرمان دوستی
جذبات خلق و مہر و وفا جاگنے لگیں
ذہنوں سے کید وبغض و حسد بھاگنے لگیں

موسیٰ کو فن ِ نطق سکھاتی ہے دوستی   بن کر مسیح مردے جلاتی ہے دوستی
بندے کو جب خلیل بناتی ہے دوستی   نمرودیت کی آگ بجھاتی ہے دوستی
امن واماں کی شمعیں فروزاں اسی سے ہے
کونین میں سکون کو ساماں اسی سے ہیں

طیّب کاظمی کے مرثیوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ انکے مرثیے قدیم رنگ کے ہونے کے باوجود ان میں کہیں کہیں جدیدیت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ان کے مرثیہ جدید دور میں قدیم طرز کے حوالے سے ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

۴۴۔ میر نظیر باقری :

میر نظیر باقری ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو اکروٹیہ سادات سنبھل مراد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصل نام سید نظیر عباس باقری تھا۔ یہ اپنا تخلص نظیر کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر میں پوری کی اور آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انکو نینی تال، سنبھل اور امروہہ کا سفر کرنا پڑا، مگر بعد میں یہ لکھنؤ آئے اور یہیں تعلیم مکمل کی۔ وہاں سے روزگار کے سلسلے میں انکو ممبئی جانا پڑا مگر وہاں بھی وہ زیادہ وقت نہ رہ سکے اور اپنے وطن واپس آ گئے۔

جہاں تک مرثیہ کا تعلق ہے تو ان کا ایک بہت مشہور مرثیہ ''دست کائنات'' ملتا ہے۔ یہ مرثیہ ۱۹۸۷ء میں طبع زاد تصنیف ہوا تھا۔ ان مرثیہ میں حضرت عباسؑ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کی عنوان ''ہاتھ'' نظم کیا ہے، اس میں نظیر باقری نے ہاتھ کے عنوان کے ذریعہ تاریخ آدمیت اور تاریخ اسلام کے اہم گوشوں کو بیان کیا ہے۔ اس مرثیہ میں تاریخ کے تمام حادثوں اور شخصیتوں کی خصوصیات نظم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مرثیہ کے چند بند دیکھئے۔

دنیا میں ہر دلیر کی پہچان ہیں یہ ہاتھ   اٹھ کر جو رک نہ پائے وہ طوفان ہیں یہ ہاتھ

دنیا میں ہر دلیر کی پہچان ہیں یہ ہاتھ　　اٹھ کر جو رک نہ پائے وہ طوفان ہیں یہ ہاتھ
رکھے جو سر بلند وہی جان ہیں یہ ہاتھ　　تاریخ انقلاب کا سامان ہیں یہ ہاتھ
ظالم جو حکمراں تھے وہ نا پید ہو گئے
ہاتھوں کی زد پہ آئے تو سب قید ہو گئے

ہر باوفا کے واسطے انعام ہیں یہ ہاتھ　　اہل جفا کی موت کا پیغام ہیں یہ ہاتھ
دشواریوں سے گزریں تو آرام ہیں یہ ہاتھ　　اس زندگی کا سب سے بڑا کام ہیں یہ ہاتھ
محنت کشوں کو رحمتِ باری بنا دیا
ہاتھوں نے کاہلوں کو بھکاری بنا دیا

اس مرثیہ کو نظیر نے جدید طرز پر پیش کیا ہے۔انھوں نے ہاتھ کے ذریعہ آج کے مسائل کو ہم سے رو بہ رو کرایا ہے۔ جو پس پردہ آدمی کے ہاتھوں کی اہمیت بتاتے ہوئے عمل کی تلقین کی ہے۔''تاریخ انقلاب کا سامان ہیں یہ ہاتھ'' یا ''ہاتھوں نے کاہلوں کو بھکاری بنا دیا'' اسی طرح کے بیت ہیں۔ان کا یہ مرثیہ ۸۴ بندوں پر مشتمل ہیں۔جس کی ابتداءوہ جدید رنگ سے کی ہے۔اس میں اجزاء ترکیبی کی قید کو قبول نہیں کیا،اور تاریخ کے آئینہ میں مرثیے کے بند نظم کرتے چلے جاتے ہیں۔مگر مرثیہ نظم کرتے کرتے ان میں روایتی رنگ نمایاں ہونے لگتا ہے اور وہ مرثیہ میں تمام اجزاء کو پابندی سے برتنے لگتے ہیں۔مثال کے طور رجز کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

ان کا غلام ہوں جو امیروں کے ہیں امیر　　ان کا ہر اک عمل ہے زمانے میں بے نظیر
دنیا کا علم جن کی نگاہوں کا ہے اسیر　　ڈیوڑھی پہ جن کے شاہ بھی آ کر بنے فقیر
کیا جانتے نہیں مرے بابا کا تم وقار
ان کے لئے ہی عرش سے اتری تھی ذوالفقار

ان کا ایک اور مرثیہ ''ہنسی'' کے عنوان سے ملتا ہے۔جو کہ حضرت علی اصغرؑ کے حال کا ہے۔اس مرثیہ میں نظیر نے کربلا کے دشت میں اصغرؑ کے تبسم اور اس کی صفات کو بیان کیا ہے۔اس مرثیہ میں بھی روایتی مرثیوں کی ہی طرح اجزائے ترکیبی کی پابندی کی گئی ہے۔مرثیہ کی خاص بات یہ ہے کہ نظیر نے مرثیہ میں شامل ساری باتوں کو ہنسی کے عنوان کے ذیل میں ہی نظم کی ہیں۔مثلاً جنگ کے سلسلے سے یا کربلا کی فتح کے حوالے سے جو بند پیش کئے گئے ہیں وہ ہنسی کے عنوان کے تحت ہی رقم کئے ہیں۔یہ بند ملاحظہ ہو جس میں چھ ماہ کے بچے کی جنگ کی آرزو کو بیان کیا گی ہے۔

صغیر بولا کہ مقتل میں مجھ کو جانے دو　　یزیدیت کے ارادوں کو سر اٹھانے دو
شہید ہونے کا میرے تو وقت آنے دو　　کہ حرملہ کو ذرا تیر تو چلانے دو

ہنسی کے لفظ کو غم کی کتاب کر دوں گا
میں بچپنے کو علی کا شباب کر دوں گا
مجھے فرات کے پانی کی آرزو کب ہے سمندروں کو روانی کی آرزو کب ہے
حقیقتوں کو کہانی کی آرزو کب ہے علی کے سن کو جوانی کی آرزو کب ہے
بھڑک اٹھے گی مری پیاس جب روانی میں
میں ہنس کے آگ لگا دوں گا بہتے پانی میں

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظیر گو کہ روایتی انداز کے مرثیہ گو ہیں مگر ان کے مرثیوں میں جدت اور نئی فکریں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔ اس طرح ان کے مرثیوں میں جدید اور روایتی دونوں رنگ ملتے ہیں۔

۴۵۔ عشرت لکھنوی :

مرثیہ نگاری کی دنیا میں عشرت رضوی کا نام منفرد مرثیہ گو کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ ان کا اصل نام کاظم حسین تھا۔ ان کی پیدائش ۱۵ ااکتوبر ۱۹۵۰ء کو شیش محل (لکھنؤ) کے ایک مہذب گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کے والد سید افضل حسین کیفی خود ایک کہنہ مشق کے شاعر تھے۔ ان کے دادا میر مہدی حسین کا شمار لکھنؤ کے بہترین سوزخوانوں میں ہوتا تھا۔ ان کی تعلیم کا آغاز نورالاسلام اسکول سے ہوا۔ وہاں سے ان کے والد نے ان کا داخلہ سلطان المدارس میں کروادیا جہاں وہ زیادہ دن نہ رہ سکے اور اسلامیہ انٹر کالج میں داخلہ لیا مگر وہاں بھی انھوں نے صرف ہائر سکینڈری تک ہی تعلیم حاصل کر سکے۔

ابتداء میں عشرت اپنا تخلص کاظم حسین کاظم کرتے تھے مگر ۱۹۷۱ء میں یادِ دبیر کی محفل سے انھوں نے اپنا تخلص تکمیل رضوی کے اصرار پر عشرتؔ رکھ لیا۔ اپنی شاعری کی ابتداء عشرت نے سلام سے کی، پھر نوحہ وقصائد میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کا مرثیوں کا مجموعہ بھی ''اشکوں کی زباں میں'' ملتا ہے۔ مرثیوں میں وہ موجودہ زمانے کے مسائل کو لے کر بے حد حساس ہیں۔ وہ مرثیوں کی تمہید میں دور حاضر کے حوالے سے بڑی اہم گفتگو کرتے نظر آتے ہیں، اور ایسے ایسے مسائل اٹھاتے ہیں جو واقعی آج کے دور کے ہر خاص و عام کے سامنے ہیں۔ آزادی ملک اور اس کے بعد کے پیدا ہونے والے مسائل پر تو بہتوں نے قلم آزمائی کی ہے، مگر آج کے دور کی پریشانیوں اور مسائل کے ذیل میں جو باتیں عشرت نے اپنے مرثیوں میں رقم کی ہیں وہ بہت کم ہی مرثیہ گو کے یہاں ملتا ہے۔ ان کا ایک مرثیہ ''پیکر خلوص'' انہیں باتوں کی تکمیل کرتا نظر آتا ہے۔ یہ مرثیہ ۵۲ بندوں پر مشتمل ہے۔ جس میں دور حاضرہ میں مٹتے ہوئے خلوص، گمراہوں میں ڈوبتے ہوئے سماج اور قوم میں بڑھتے ہوئے تفرقے کا بیان کیا ہے۔ اس مرثیہ کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیے۔

اب پیکر خلوص و مروت کوئی نہیں صد افتخار مذہب و ملت کوئی نہیں
آئینہ دار رشد و ہدایت کوئی نہیں اب نام کے حکیم ہیں حکمت کوئی نہیں

گمراہیوں میں ڈوبا ہوا جب سماج ہو
کیسے مریض عقل و خرد کا علاج ہو
اکھڑی ہوئی ہے سانس نظام حیات کی　　دشمن بنی ہوئی ہے نظر التفات کی
تصویر دھندلی سی ہے کائنات کی　　ملنا بہت محال ہے منزل نجات کی
راہیں اٹی ہیں وقت کے گردوغبار سے
اٹھتے نہیں ہیں پیر مصیبت کے بار سے
دنیا میں قتل عام کا بازار تیز ہے　　راہ سفر میں موت کی رفتار تیز ہے
عالم خموش جہل کی گفتار تیز ہے　　دہشت گری کا قافلہ سالار تیز ہے
نازاں ہیں اتنا ظلم وستم کے غرور پر
چھپ چھپ کے وار کرتا ہے ہر ذی شعور پر
وہ دور ہے کہ اپنے بھی لگتے ہیں اجنبی　　قاتل مصیبتیں ہیں نشانہ ہے آدمی
تیرہ شبی کو لوگ سمجھتے ہیں روشنی　　کانٹوں کے درمیان گزرتی ہے زندگی
وہ گل کھلائے گردش لیل و نہار نے
گلشن میں بڑھ کے آگ لگادی بہار نے

عشرت زمانے کے ان مایوس کن حالات کے ذکر کے بعد ان حالات سے لڑنے اور ان کا سامنا کرنے کے لئے کربلا کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔وہ کربلا کو دور جدید کی پریشانیوں میں مشعل راہ کی طرح سامنے رکھا ہے۔ان کے مطابق کربلا کو مدِنظر رکھ کر آج بھی بشر اپنے تمام غموں کا علاج کرسکتا ہے۔ان کا یہ بند دیکھئے۔

چاہو تو اپنا بگڑا مقدر سوار لو　　جتنی بھی چاہو دولتِ صبر و قرار لو
کچھ لمحے زندگی کے تو اچھے گزار لو　　دل سے حسین ابن علی کو پکار لو
کب تک یونہی بھٹکتے رہو گے حیات میں
موجود کربلا بھی ہے اس کائنات میں

عشرت کا ایک اور مرثیہ جو کہ انھوں نے جناب قاسم کے حال کا لکھا ہے۔اس مرثیہ کی تمہید میں بھی عشرت نے آج کے دور کی عکاسی کی ہے حالانکہ کہیں کہیں اس میں ان کا لہجہ شکایتی اور مایوس کن نظر آتا ہے۔آج کے دور کا آدمی چاہے وہ سیاست داں ہوں یا مذہبی پیشوا یا کوئی اور سب اپنے مفاد کے تحت چیزوں کا استعمال کررہے ہیں۔اس سے روایتی اور ظاہری مذہب پرستی بھی خالی نہیں ہے۔انہیں سب باتوں کے خلاف آواز بلند کر کے عشرت نے مرثیہ کو آگے بڑھایا ہے اور

کربلا کے حوالے سے لوگوں کو مایوسیوں سے باہر نکلنے صلاح دی ہے۔اوراس طرح وہ کربلا کے مقصد کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

سنو کہ کرب وبلا دے رہی ہے یہ آواز پیام امن تمہیں دے گئے ہیں شاہ حجاز
پڑھو حسین کے مقصد کی روشنی میں نماز بدل سکو تو بدل لو حیات کا انداز
مگر یہ سچ ہے کہ تقلید حر ضروری ہے
عمل کے بعد یہ سمجھو حیات نوری ہے

ان کے مرثیوں کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دور حاضر میں لکھنے والوں میں عشرت کے مرثیے تازگی کا احساس کراتے ہیں۔ان مرثیوں میں جدت بھی نظر آتی ہے اور جدیدیت بھی۔اور یہی خوبیاں ان کو انفرادیت بخشتی ہیں۔

ان سبھی مرثیہ نگاروں کی مرثیہ نگاری کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد انیسؔ و دبیرؔ مرثیہ کا وہ معیار تو نہ رہا اور نہ ہی مرثیہ اس بلندی پر پھر پہنچا جہاں اسے انیس و دبیر نے پہنچایا تھا۔لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مرثیہ میں کوئی نیا رخ یا بدلاؤ نہیں ہوا۔انیس و دبیر کے بعد مرثیہ نگاری میں اجزاء کی پابندی تقریباً ختم سی ہوگئی اور مرثیہ گو جدیدت کے نام پر مرثیہ میں نیا رنگ بھرنے کی کوشش کرتے رہے۔اس کے باوجود کچھ ایسے بھی مرثیہ نگار تھے جنھوں نے مرثیہ کو بنا کسی تبدیلی کے اس کے اصل رنگ کے ساتھ قبول کیا۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے بھی مرثیہ نگار تھے جنھوں نے مرثیہ کے انداز میں ہی تبدیلی کر کے اس کو جدیدیت کا تاج پہنایا۔اوراب جب کہ جدید مرثیہ کی عمر سوسال ہو رہی ہے اس کے باوجود جدید مرثیہ نے ہندوستان میں وہ مقام نہیں پایا جو اسکو پاکستان سے ملا۔حالانکہ جدید مرثیہ کا جنم ہندوستان میں ہی ہوا تھا۔۱۹۱۸ء میں جوشؔ ملیح آبادی نے ''آواز حق''، ۱۹۲۳ء میں نسیمؔ امروہوی نے پہلا مرثیہ لکھ کر جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ''تجھ میں اے باغ وطن وہ گلِ خوش رنگ نہیں'' کہا۔اوراس کے بعد بھی آل رضا اور بہت سے مرثیہ گوشعراء نے جدید مرثیہ کی روایت کو آگے بڑھایا،لیکن ابھی جدید مرثیہ کی بنیاد مضبوط بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ان لوگوں نے ہجرت کر لی۔اور پاکستان جانے سے وہاں مرثیہ تیزی سے پروان چڑھنے لگا۔یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں جدید مرثیہ کے عرفان میں تاخیر ہوئی۔

☆☆☆

حواشی :

۱) اردو مرثیہ کی ہیئت اور موضوع کے تجربات: شمشاد حیدر زیدی ص ۱۳۷۔
۲) اثبات و نفی: شمس الرحمٰن فاروقی، مکتبہ جامعہ، ص ۹۷۔
۳) اودھ میں اردو مرثیہ: ڈاکٹر ریاض الہاشم، ص ۲۱۱۔
۴) پروفیسر جعفر رضا: دبستان عشق کی مرثیہ گوئی، ص ۲۵۴ / شبستان، الہ آباد۔
۵) پروفیسر جعفر رضا: دبستان عشق کی مرثیہ گوئی، ص ۲۳۶ / شبستان، الہ آباد۔
۶) اردو مرثیے میں ہئیت اور موضوع کے تجربات: شمشاد حیدر زیدی ص ۱۶۹۔
۷) مرزا محمد جعفر اوجؔ لکھنوی، حیات اور ادبی کارنامے، ڈاکٹر سکندر آغا ص ۳۵۔
۸) اردو مرثیے میں ہئیت اور موضوع کے تجربات: شمشاد حیدر زیدی ص ۱۶۴۔
۹) اردو مرثیے میں ہئیت اور موضوع کے تجربات، شمشاد حیدر زیدی ص ۱۶۴۔
۱۰) جدید اردو مرثیہ: محمد رضا کاظم، ص ۳۷۔
۱۱) دکن میں اردو اور عزاداری: رشید موسوی، ص ۱۷۲۔
۱۲) تقسیم کے بعد جدید اردو مرثیے کا تہذیبی و تاریخی مطالعہ، ڈاکٹر قمر عابدی، ص ۲۵۰۔
۱۳) سید عاشور کاظمی، اردو مرثیہ کا سفر، ص ۴۲۱۔
۱۴) مرثیے میں ساجیت، عقیل رضوی، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ص ۴۲۔
۱۵) اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات، شمشاد حیدر زیدی، ص ۲۱۱۔
۱۶) امانت غم: گروہ اکبری کراچی، ص ۶۸۔
۱۷) اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات، شمشاد حیدر زیدی، ص ۲۴۲۔
۱۸) آفتاب غزل: سعید شہیدی، ص ۱۱۔
۱۹) اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات، شمشاد حیدر زیدی، ص ۲۱۹۔
۲۰) ذوالفقار، شمیم کرہانی: مقدمہ، پروفیسر احتشام حسین۔
۲۱) بیسویں صدی اور جدید مرثیہ: ہلال نقوی ص ۶۹۵۔
۲۲) نجم آفندی، تقریظ، زادِ آخرت، ص ۵۔
۲۳) مہدی نظمی فن اور شخصیت مرتبہ ناشر نقوی، ص ۲۳۔

۲۴)تقسیم کے بعد جدید اردو مرثیے کا تہذیبی و تاریخی مطالعہ،ڈاکٹر سید قمر عابدی،ص۱۸۲۔
۲۵)بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، ہلال نقوی ص۶۸۲۔
۲۶)گریہ فرات: پروفیسر سردار نقوی،ص۱۰۔
۲۷)گریہ فرات: پروفیسر سردار نقوی،ص۲۰۔
۲۸)اردو مرثیہ(تاریخ مرثیہ): سفارش حسین رضوی،ص۳۶۶۔

☆☆☆

بابِ چہارم
۱۹۷۰ کے بعد کے منتخب مرثیہ نگار

اردو مرثیہ دیگر اصناف سخن کی طرح مسلسل تغیر پذیر رہا ہے۔ کوئی عہد ایسا نہیں جس میں مرثیہ کو سماج سے ہم آہنگی نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ مرثیے کی تاریخ میں موجودہ ارتقاء پذیر دور کو دورِ جدید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کی سماجی و تہذیبی افادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے عصری تقاضوں کے پیشِ نظر موضوعات اور مضامین کے اعتبار سے مرثیہ کو ایک نئی نہج اور ایک نئے آہنگ سے آراستہ کیا ہے۔ جسے ادبی دنیا میں جدید مرثیہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس دور میں مرثیہ لکھنے والوں میں جوشؔ ملیح آبادی، مولانا نسیمؔ امروہوی، علامہ جمیل مظہری، علامہ نجم آفندی، آل رضا اور مہدیؔ نظمی کی شخصیات بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

۱۹۷۰ کے بعد یوں تو بہت سے شعراء نے اپنی پہچان بنائی مگر میں نے اپنی تحقیق کے لئے کچھ خاص مرثیہ نگاروں کا انتخاب کیا ہے۔ اور ان لوگوں کو میں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول میں احسنؔ داناپوری، وحیدؔ اختر، عظیم امروہوی اور ظہیر جعفری اور حصہ دوم میں ناشرؔ نقوی، احسنؔ شکارپوری، گوہرؔ لکھنوی اور باقرؔ محسن کے مرثیوں کے تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کی فن مرثیہ گوئی پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

حصہ اوّل

(۱) احسن داناپوری (۲) وحید اختر
(۳) عظیم امروہوی (۴) ظہیر جعفری

(۱) احسن رضوی داناپوری۔

احسن رضوی علمی اور ادبی دنیا میں ہی نہیں بلکہ فلمی دنیا میں بھی اپنی ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ انکی پیدائش بہار کے شہر داناپور کے محلّہ شاہ ٹولی میں ۱۵/دسمبر ۱۹۱۱ء میں ہوئی تھی۔ انکا تعلق چشتی نظامی کے صوفی گھرانے سے تھا۔ انکے والد کا نام حکیم سید بدرالدین تھا۔ ان کی تعلیم وہاں کے روایتی خانگی مدرسہ سے ہوئی۔ جہاں انھوں نے اردو، فارسی اور پھر عربی میں تعلیم حاصل کی۔ اس تعلیم کا یہ فائدہ ضرور تھا کہ جدید تعلیمی دستور کے مطابق درجے یا کلاس کو اجتماعی طور پر نہیں پڑھایا جاتا تھا بلکہ ہر طالب علم کو الگ الگ درس بھی دیا جاتا تھا۔ یعنی تعلیمی مدارج کلاس کے لحاظ سے نہیں بلکہ کتاب کے لحاظ سے طے کئے جاتے تھے۔

احسن کے گھر کا ماحول ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا اس لئے وہ بچپن میں ہی گھر کو خیر باد کر کے کلکتہ چلے آئے۔ کلکتہ میں وہ اپنے ماموں کے گھر کچھ روز رہے مگر ان کے خراب رویے نے ان کو وہ گھر بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ماموں کے گھر کو چھوڑنے کے بعد وہ کلکتہ میں ہی الگ مکان لے کر تلاشِ روزگار میں مصروف ہو گئے۔ کچھ عرصے کے

بعد وہ رنگون چلے گئے کہ رنگون اس زمانے میں مشرقی یو۔پی، بہار اور بنگال کا تجارتی مرکز بنا ہوا تھا۔لیکن رنگون کے نئے ماحول نے روزگار کے سلسلے میں احسن رضوی کی کوئی خاص مدد نہ کی ۔مجبور ہوکر وہ پیگو میں جواہرات کی کھان میں کام کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صحت بگڑنے لگی ۔اس لئے وہ پھر رنگون لوٹ آئے ۔ یہاں آکر انھیں ایک ہندوستانی فلم کمپنی میں ریفلیکٹر بوائے (Reflector Boy) کی ملازمت کرنی پڑی، جس کی اجرت تو بہت کم تھی ۔لیکن فائدہ یہ تھا کہ انکو رہنے کے اسٹوڈیو میں جگہ مل گئی تھی ۔مگر ایک دن مکالمے کی غلط زبان دیکھ کر یہ خاموش نہ رہ سکے اور ڈائرکٹر کوٹوک دیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔لیکن کچھ ہی روز بعد ان کی ملاقات رنگون کے بازار میں ڈائرکٹر راج ہنس سے ہوئی، جہاں ان کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔انھوں نے احسن رضوی کی اس جرأت کی قدر کی اور انہیں اپنا نائب بنالیا۔

احسن رضوی کی تخلیقی زندگی کا اگر ذکر کریں تو معلوم ہوتا کہ انھوں نے ۱۴۔۱۵ برس کی عمر سے ہی شاعری کرنی شروع کر دی تھی اور ۱۹۳۴ء سے ان کے کلام چھپنے بھی لگے تھے۔ یہ اپنی شاعری کی اصلاح آرزو لکھنوی سے کرتے تھے۔احسن نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی پھر نظمیں بھی لکھی اور بہت اچھی نظمیں لکھیں لیکن اس کا خاص وسیلۂ اظہار غزل ہی تھا۔ان کی غزل کی تعریف کرتے ہوئے محمود سروش لکھتے ہیں۔

> ''اسی میں انھوں نے ایک نیا اسلوب اختیار کیا اسی میں انھوں نے اپنے شعری لفظیات مقرر کئے اپنے اصطلحات یا آج کی زبان میں علامات تیار کئے،اور اپنے جذبات کی شدت کا اظہار کیا۔''[۱]

غزل کے علاوہ ان کا ایک قصائد کا مجموعہ ''تسنیم وکوثر'' بھی شائع ہوا۔اس کے بعد ''جوش فرات'' اور ''پیاسوں کی یاد'' نوحوں اور سلاموں کے مجموعہ شائع ہوئے۔نثر میں ''متقولین معاویہ'' کے نام سے ان کی ایک تحقیقی کتاب چھپی۔ غزلوں کا مجموعہ ''نشانِ منزل'' نشر ہوا۔اس کے بعد نوحوں کا ایک اور مجموعہ ''لہولہو'' منظر عام پر آیا،لیکن اب یہ ساری تصانیف نایاب ہیں۔ان کی مرثیے کا مجموعہ ''مطلع حیات'' مجھے جناب خورشید غازیپوری کی لائبریری سے دستیاب ہوا۔

ان کے مرثیہ کا مجموعہ ''مطلع حیات'' ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعہ میں احسن رضوی کے چودہ (۱۴) مرثیے شامل ہیں،جسکو ان کے فرزند مشہور رضوی نے ان کی موت کے بعد شائع کیا۔ یہ مرثیے احسن رضوی اپنے عمر کے آخری دور میں لکھے تھے جس کو آج ہم انکی یادگار کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ احسن داناپوری نے یہ مرثیے اپنے آخری دور میں تخلیق کئے ہیں اور ان کی وفات ۱۹۸۳ء میں ہوئی ہے،اس لحاظ سے میں اسکو ۱۹۷۰ء یا اس کے بعد کی تخلیق قیاس کر کے اسکو اپنے مقالے میں شامل کر رہی ہوں ۔ان مرثیوں میں احسن رضوی کے فن میں پختگی ،فصاحت زبان اور بلاغت بیان کی بہت عمدہ مثال ملتی ہیں۔ان کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے محمود سروش دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

> ''زیرنظر مجموعۂ مراثی ''مطلع حیات'' احسن کی زندگی کے آخری دور کی یادگار ہے۔وہ اپنے فن میں پختہ کار ہو چکے تھے۔ان کا لہجہ مقرر ہو چکا تھا۔کثرتِ غزل گوئی سے تغزل اور اسکی نغمگی ان کے منظومات ہی میں نہیں بلکہ نثر میں بھی سرایت کر چکی تھی اور

جب کسی شاعر پر کسی مخصوص صنف سخن کا اثر قائم ہو جاتا ہے،تو پھر وہ جو کچھ کہتا ہے،جس صنف سخن میں بھی طبع آزمائی کرتا ہے۔اس میں اس حاوی انداز کی جھلک ضرور نظر آجاتی ہے۔چنانچہ ان کے مرثیوں کے ایک ایک مصرے میں آپ کو وہی دروبست وہی لفظیات اور وہی علامات ملیں گے جو احسن کی شاعری اور بالخصوص غزل کی شاعری کا طرہ امتیاز ہیں۔''۲

(۱) خاموش ہے چراغِ تمنائے کائنات

اس مجموعہ کے پہلے مرثیے میں حضرت علیؑ کی غمگین کیفیت پیش کی گئی ہے۔جس کی ابتدا فطرت کے مناظر کی عکاسی سے ہوتی ہے۔یہ مرثیہ ۵۵ بندوں میں مشتمل ہے۔احسن نے اپنے کسی مرثیہ کو عنوان نہیں دیا ہے۔مرثیہ لکھنے کا ان کا انداز کچھ کچھ قدیم ہے،ایسا لگتا ہے کہ وہ مرثیے کو جدید رنگ میں رنگنے کے بعد بھی قدیم روایت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے ہیں۔مرثیہ کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے۔

خاموش ہے چراغِ تمنائے کائنات — بے نور ہے نگاہِ تماشائے کائنات
شالِ عزا میں لپٹی ہے لیلائے کائنات — طاری فضاپہ ہے غم مولائے کائنات
کھولی ہے شب نے زلف جو اس واردات پر
لہرا رہا ہے درد کا سایہ حیات پر

احسن رضوی نے حضرت علیؑ کے غم میں فطرت کس طرح اشکبار ہے،اس کی منظرکشی بہت خوبصورت انداز میں کی ہے۔مرثیہ میں احسن نے کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں مولائے کائنات کے غم کا اثر ان پر کیسا ہوا۔اس میں ہندوستانی روایت کا رنگ بھی ملتا ہے۔یہ بند دیکھئے۔

دل وسعت بساط مصائب سے تنگ ہے — آئینہ ٹوٹتی ہوئی بجلی سے دنگ ہے
اشکوں میں آج خونِ تمنّا کا رنگ ہے — جوہر بتا رہا ہے کہ شیشے میں زنگ ہے
پھیکا ہے رنگ جلوہ گہِ اعتبار کا
زیور اتر رہا ہے عروسِ بہار کا

احسن نے اس خوبصورت منظرنگاری کے ذریعہ مرثیہ کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔احسن یہاں موت اور حیات کے فلسفہ کا بیان سفر اور منزل کے ذریعہ کرتے ہیں۔موت ایک ایسی برحق شہ ہے جو ہر کسی کو آنی ہے،ہر عروج کو پست ہونا ہے،ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور جو باقی رہنے والا ہے وہ بلاشبہ واحد خدا کی ذات ہے۔ہم یہ جانتے ہیں کہ احسن غزل گو شاعر ہیں اسلئے ان کے مرثیوں میں بھی غزل کا رنگ صاف طور سے نمایاں نظر آتا ہے۔اس کے بعد احسن حضرت علیؑ کی عظمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی ذات ایسی ہے جو ہر چیز کا علم رکھتی ہے وہ موت و حیات پر لاریب ہیں اور صورت میں زندگی کو خوشنودیٔ خدا میں گزار دیتے ہیں۔ان کی شخصیت ایسی ہے کہ وہ جو چاہے خدا

کی مرضی سے کر سکتے ہیں۔ان کی موت فنا کا پیغام نہیں لاتی بلکہ شہادت ہی ان کی نئی زندگی ہے۔ایسی عظمت و بلند مرتبہ والے کی زندگی کے تعلق سے احسن لکھتے ہیں۔

ایسی حیات ایسی اجل کس نے پائی ہے　　جس کی بہا خدا ہے اُسی کی خدائی ہے
موجِ فنا ہے یا کہ نئی سانس آئی ہے　　مرنے کی طرح جیتے ہی یا رب دہائی ہے
جو اس ادا کو موت کہے ناشناس ہے
واللہ یہ تو زیست کی عینِ اساس ہے

اس کے بعد ایک بار پھر احسن زندگی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

جب ڈوب کے لہو میں اُبھرتی ہے زندگی　　ماہِ تمام بن کے نکھرتی ہے زندگی
جب ڈوب کے لہو میں اُبھرتی ہے زندگی　　ناز اپنے ہی نیاز پہ کرتی ہے زندگی
بزمِ ازل سے تابہ ابد روشنی کئے
جلتی ہے شمع موت کو بھی زندگی کئے

احسن مرثیے میں پیغمبروں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں ستاروں سے تشبیہ دیتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ جس طرح شمع جلانے پر اُجالا ہو جاتا ہے اسی طرح اس کائنات میں نبی بھی ہیں جو اپنے علم و درس سے دنیا کو روشن کئے ہوئے ہیں۔احسن ایک پختہ فن کے مالک ہیں اور اس مرثیے میں وہ اپنے فن کا استعمال بھرپور طریقے سے کرتے ہیں۔وہ اپنی باتوں کو کنایوں،علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ تحریر کرتے ہیں۔مرثیہ میں احسن نے تہذیبی صورت کو بھی بخوبی نظم کیا ہے۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

وہ نصف حسن جلوۂ نورِ عظیم ہے　　آئینہ جمال رسولِ کریم ہے
آواز جو خدا کی ہو ایسا کلیم ہے　　مشکل کشائے عقدۂ امید وبیم ہے
دیکھیں اگر فرشتے تو سجدہ کریں اسے
جھُک جھُک کے سب سلامِ تولّا کریں اسے

یہاں جُھک کر سلام کرنے کی روایت خالص لکھنؤ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ان کے علاوہ یہ خصوصیت میر انیسؔ کے مرثیوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔آگے پھر حضرت علیؑ کی عظمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ہر نبیؑ کے دور میں ان کی مدد کرتے رہے ہیں۔

خلقت کی صبح کا وہ ستارہ بنا ہوا　　سجدہ گذاریوں کا اشارہ بنا ہوا
طوفانِ نوحؑ میں تھا سہارا بنا ہوا　　بہرے کلیمؑ حسنِ نظارہ بنا ہوا
یوسفؑ کے پیرہن میں وہ بوئے سرور تھا
یعقوبؑ کی ترستی نگاہوں کا نور تھا

آ گے کے بندوں میں مصائب کا ذکر کرتے ہوئے شاعر اس وقت کا تذکرہ کرتا ہے جب حضرت علیؑ صبح کی نماز کے لئے گھر سے نکلتے ہیں۔اس وقت آسمان میں تارے بجھے بجھے سے تھے اور فضا میں اداسی چھائی تھی، گھر میں پلی ہوئی مرغابیاں ان کا دامن پکڑ کر روکنا چاہتی تھیں گویا ان کو حضرت علیؑ کی شہادت کا علم ہو گیا ہو۔پھر شاعر اس وقت کا بیان کرتا ہے جب امام مسجد میں تشریف لئے جاتے ہیں اور صبح کی نماز ادا کرتے ہیں اور موقع پا کر قاتل ان پر وار کر دیتا ہے۔مرثیہ کے آخر میں احسن روضۂ امیر المومنینؑ کی زیارت کی دعا کرتے ہیں۔

یہ مرثیہ ویسے تو روایت کی پاسداری نہیں کرتا۔احسن نے اس میں اجراء ترکیبی کی بندیشوں سے بھی دور رکھا ہے۔ان کے بعض مصرعے چوکانے والے ہیں۔اس مرثیہ میں خصوصی طور پر احسن نے موت وحیات کے فلسفہ کو ہی بیان کیا ہے۔زبان صاف اور سادہ ہے اور انداز بیان تغزل کا ہے۔

(۲) زندگی راز بھی ہے پردہ درراز بھی ہے

احسن رضوی نے دوسرے مرثیہ میں بھی حضرت علیؑ کا حال لکھا ہے جو کہ ۷۷ بندوں پر مشتمل ہے۔اس مرثیہ میں بھی شاعر موت وحیات کے فلسفہ کا بیان کیا ہے۔اس مرثیہ میں بھی انکے غزل کا انداز ہی نمایا ہے۔اور اس کے پڑھنے پر نظم کا دھوکا ہوتا ہے۔مرثیہ کی ابتدا احسن داناپوری اس بند سے کرتے ہیں۔

زندگی راز بھی ہے پردہ درراز بھی ہے یہ مشیت کی کرامت بھی ہے اعجاز بھی
ساز کا سوز بھی ہے گرمیٔ آواز بھی ہے نازِ انجام بھی ہے زخمۂ آغاز بھی
نقش بہتر جو بنیں رنگِ بقا بھرتی ہے
لوحِ تخلیق کی یہ خانہ پُری کرتی ہے

اس بند میں شاعر زندگی کی حقیقت کو روشناس کرانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ زندگی ایک راز کے مانند ہے اور جو اس کے بھید سے واقف ہو جائے گا وہ اس کے اصل مقصد کو بھی سمجھ لے گا۔زندگی کی حقیقت کے بعد شاعر دنیا کے فلسفے کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس کی حقیقت سے آشنا کراتا ہے۔اور کہتا ہے کہ یہاں اپنا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی یہ انسان کی منزل ہے۔دنیا کی حقیقت کو احسن داناپوری کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

مل کے کھو جاتی ہے بھولی ہوئی راہوں کی طرح
صاف پھر جاتی ہے دم بھر میں نگاہوں کی طرح

اس کے بعد احسن عمر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زیست وہ شہ ہے جو کبھی ہاتھ نہیں آتی اور آگے بڑھتی ہی جاتی ہے۔وقت اس کو بہت ہی تیز اور چست بناتا ہے اور دھوپ اسکو ڈھلتا ہوا سایا بتاتی ہے جو کبھی بڑھتا نہیں ہے ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔اس کے بعد احسن اپنی بات کا رخ موڑتے ہوئے ایک بار پھر زندگی کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں۔احسن داناپوری یہاں صنعت تلمیح کے ذریعہ زندگی کی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

عمل افروز ہوئی یہ دمِ عیسیٰ ہو کر   نفسِ نازہ دیا نازِ مسیحا ہو کر
طور روشن کیا شمعِ ید بیضا ہو کر   سامنے آ گئی یوسف کے زلیخا ہو کر
مصر سے یہ صلۂ اشک فشانی لائی
آنکھ کا نور تمنا کی جوانی لائی

مرثیہ میں ان بندوں کے علاوہ احسن نے کچھ بند جدید نقطۂ نظر اور انقلابی روش کے بھی بیان کئے ہیں۔جس میں وہ قوم کو جاگنے اور کچھ کر دکھانے کا پیغام دیتے ہیں۔وہ قوم کو زندگی کے اصل مقصد کی تلقین کرتے ہیں۔اس مرثیہ میں کہیں نہ کہیں اقبال کا رنگ نظر آتا ہے۔

زندگی سانس لئے جانے کا ہرگز نہیں نام   زندگی جذبۂ ایثار کا پہلا انعام
زندگی نغمۂ تسلیمِ حقیقت کا پیام   زندگی صفحۂ تخلیق پہ ہے نقشِ دوام
زندگی ان کی ہے مرنا جو گوارا کر لیں
تیغ کی زد پہ ٹھہرنا جو گوارہ کر لیں

حق پہ آنچ آئے تو جینا انھیں دوبھر ہو جائے   قدم اس طرح جمے ناؤ کا لنگر ہو جائے
ان کی ضد لوح پہ خود حرفِ مکرر ہو جائے   ہر روش ان کی زمانے کا مقدر ہو جائے
مٹ کے ہر نقشِ حقیقت کی جلی کرتے ہیں
فاش یہ زیست کے رازِ ازلی کرتے ہیں

احسن دانا پوری زندگی جینے کے طریقے کو حضرت علیؑ کی زندگی سے پیش کرتے ہوئے ان کی عظمت وفضیلت کا بیان کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ اگر انسان کو زندگی کا اصلی مقصد کو سمجھنا ہے تو درِ علی پہ آ کر سمجھے۔یہ وہی شخصیت ہے جس کے دم سے اسلام کو جِلا ملی۔حضرت علیؑ واحد ایسے شخص ہیں جنکی ولادت کے لئے خود کعبہ نے در بنا دیا۔یہ وہ علیؑ ہیں جو ہر مصیبت سے سب کو نجات دلاتے ہیں۔حضرت علیؑ کی فضیلت بیان کرنے کے بعد احسن اس وقت کا بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت علیؑ ماہِ رمضان میں فجر کی نماز کے لئے مسجد میں جاتے ہیں اور بطیں ان کا دامن پکڑ کر روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔

بے زبانوں نے جونہی شاہ کا رستہ روکا   لبِ ارشاد کھلے پھول کی صورت ہوئے وا
ہنس کے اس وقت بطوں سے شہ والا نے کہا   اے ادائے غمِ الفت کی ثنا ساؤ یہ کیا
راہ لو تم کہ مری منزلِ مقصد آئی
دل کہے دیتا ہے ارمانوں کی سرحد آئی

اس مرثیہ میں احسن نے حضرت علیؑ کا مسجد میں آذان دینا،ضرب لگنے اور زخمی ہونے کے بعد کے حالات کو بھی اپنے مخصوص انداز میں نظم کیا ہے۔ان کے مصائب کے بند بھی اپنے اندر غزل کی جھلک لئے ہوئے ہیں۔احسن مرثیہ کے

مصائب میں اعتدال برتتے ہیں، عام قدیم مرثیہ نگاروں کی طرح ان کی تکلیف مصائب کے بند میں بے جا چیخ پکار نہیں ملتی بلکہ حضرت علیؑ کے شایانِ شان میں غم والم کا اظہار کرتے ہیں۔ مرثیہ میں تشبیوں، استعاروں، علامتوں اور کنایوں کا استعمال بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ مرثیہ میں انقلابی رنگ کی جھلک ملتی ہے جس سے یہ قیاس لگایا جاسکتا ہے کہ احسن معاشرہ کے لوگوں اور خاص اپنے گھر کے لوگوں سے کس قدر ناراض تھے، اور اسی ناراضگی میں گھر کو بچپن میں ہی خیر باد کر دیا۔

(۳) فروغ مطلع انوار بائے بسم اللہ

احسن داناپور نے اپنا تیسرا مرثیہ بھی جو کہ پچپن (۵۵) بندوں میں تحریر کیا گیا ہے حضرت علیؑ کی شان میں ہی لکھا ہے۔ اس مرثیہ میں انھوں نے حضرت علیؑ کو بائے بسم اللہ سے علامت دی ہے۔ اور لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی ولادت سے ہی نور کو فروغ ملا ہے اور اس اظہار کا ضامن بھی خود علیؑ ہی ہیں۔ علیؑ 'ب' کے نیچے کا وہ نقطہ ہیں جس کے ہٹا دینے سے 'ب' کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے اور بنا 'ب' کے بسم اللہ لکھا ہی نہیں جاسکتا۔ احسن دانا پوری مرثیہ کا آغاز کچھ یوں کرتے ہیں۔

فروغ مطلع انوار بائے بسم اللہ　　کلید مخزن اسرارِ بائے بسم اللہ
کلید مخزن اسرارِ بائے بسم اللہ　　سر بلندیٔ افکار بائے بسم اللہ
سند کی مہر ہے توثیق عہد نامہ ہے
یہ نقطہ وہ ہے کہ سجدہ گزارخانہ ہے

اس ایک نقطے سے ہر دائرہ ہویدا ہے　　نشان بھی نہیں جس کا وہ نقش پیدا ہے
بیاض خاطر ہستی کا یہ سویدا ہے　　دل اس کے طرز رقم کا ازل سے شیدا ہے
کشش بڑھائے تو لوحِ ثبات بھر جائے
کھنچے کشش بڑھائے تو لوحِ ثبات بھر جائے

احسن اس 'ب' کے نقطہ یعنی حضرت علیؑ کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ ساری مشیت کا آغاز ہی اس نقطہ کے وجود میں آنے سے ہوا ہے، قدرت کا ایک ایک نظارہ کا ظہور بھی اسی نقطہ کے باعث ہوا ہے۔ اس پوری کائنات کا عرفان ہی اسی علیؑ کی وجہ سے ہے۔ احسن حضرت علیؑ کو کلام حق کی زینت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن شریف کو پڑھنا ہے تو پہلے بسم اللہ پڑھنا ہوگا، اور بسم اللہ کو پڑھنے کے لئے پہلے 'ب' کی اہمیت کو بھی سمجھنا ہوگا۔ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے احسن کہتے ہیں کہ اسی نقطہ یعنی حضرت علیؑ کے واسطے سے ہی ہم نے اپنی قسمت آزمائی، اور جتنا چاہا تھا اس سے زیادہ پایا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

اسی کو ہم نے بھی زیبِ طلب بنایا ہے　　انصیب اس کے وسیلے سے آزمایا ہے
قلیل مانگ لیا ہے کثیر پایا ہے　　ستارہ اوج پہ اسکے اثر سے آیا ہے
گلِ حدیقۂ مضموں کو اس نے بو بخشی
گہر بنا دئے نیستاں کو آبرو بخشی

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے احسن دانا پوری لکھتے ہیں کہ علیؑ ہی وہ شخص ہیں جس نے ہر قدم پہ اسلام کو جلا بخشی ہے۔ ہر عہد میں ہر نبی کو ہر آفات سے نجات دلائی ہے۔ چاہے وہ حضرت نوحؑ کی کشتی کو پار لگانا ہو یا حضرت موسیٰ کو دریائے نیل پہ راستہ بنا کر گزارنا ہو، چاہے سلمان کے تخت کو ہوا میں چلانا ہو یہ وہ واقعے ہیں جس میں حضرت علیؑ نے ہر قدم پر ان نبیوں کو ہر مصیبت سے نکالا ہے۔ آگے کے بندوں میں احسن دانا پوری نے ساقی نامہ کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس مرثیہ میں انھوں نے چہرا، سراپا، ساقی نامہ یعنی مرثیہ کے تمام اجزا کا استعمال کیا ہے۔ مرثیہ کے ساقی نامہ کا بند پر غور فرمائیے۔

یہ وہ شراب ہے جو زندگی کا حاصل ہے اسی شراب سے ایمانِ شوق کامل ہے
یہ وہ شراب ہے نام اس کا حلِ مشکل ہے جسارتوں کے ہر اک رکن میں یہ شامل ہے
جو اس شراب کے ساغر وصول ہو جائیں
ادا نماز ہو روزے قبول ہو جائیں

ساقی نامہ کے بعد احسن حضرت علی کا مسجد میں جانا، اپنے قاتل کو نماز کے لئے جگانا، پھر نماز پڑھنے کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد ان کی شہادت اور ندائے غیبی سے ان کے قتل ہو جانے کی خبر ملنے کا واقعہ تحریر کرتے ہیں۔ مرثیہ کے آخر میں امام حسینؑ کو بلانا اور ان کو کربلا کے واقعات سے آگاہ کرنا کو بھی بہت فنکارانہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔

کہا ظہور میں آتا ہے امر ربّانی رضا کے نور سے رخ اور ہونگے نورانی
لہو بہت ہے رگوں میں جو ہوگا اب پانی حسینؑ ہم نے تو رکھدی بنائے قربانی
ہے لوح فدیہ پہ سر اپنا بائے بسم اللہ
خدا کے نام پہ رکھا بجائے بسم اللہ

یہیں سے سلسۂ امتحاں کا ہے آغاز مرے لہو کی ہے سرخی کہ رنگِ ناز ونیاز
شہادتوں کے دریچے شگافِ زخم سے باز مآل دیکھتا ہوں میں کہ تم ہو سر افراز
سر اسکے نام پہ صدقے اتاردوں گا میں
وہ ایک مانگے بہتّر گذاردوں گا میں

اس کے بعد حضرت علیؑ کے موت کے بیت تحریر کرتے ہیں۔ اس مرثیہ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ احسن اپنے فن میں کس قدر قدرت رکھتے تھے۔ مرثیہ کا ایک ایک بند اپنے اندر پوری ایک تاریخ کو سموئے ہوئے ہیں۔ مرثیہ میں استعارے، کنایہ، علامت کے علاوہ تلمیح کا استعمال بھی بہت فنکارانہ اور استادانہ انداز میں کیا ہے۔

(۴) کنارے نہر شہِ دیں کا کارواں اترا

مجموعہ ''مطلع حیات'' کا یہ مرثیہ بہت کم ابیات پر مشتمل ہے۔ ان میں صرف تیس (۳۰) بند ہی رقم کئے گئے ہیں۔ اس مرثیہ کا انداز تحریر بھی مختلف ہے۔ اس میں احسن دانا پوری نے کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے قافلہ کا وارد ہونے اور دریا

کنارے خیمہ نصب کرنے اور پھر یزید کے حکم سے ہٹانے کا واقعہ فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔مرثیہ کا آغاز احسن رضوی اس بند سے کرتے ہیں۔

کنارے نہر شہِ دیں کا کارواں اترا زمیں پہ صبر وتحمل کا آسماں اُترا
خدا کی راہ میں کعبے کا پاسباں اترا جلو میں چاند لئے اپنی کہکشاں اترا
فضا میں جلوۂ محبوب ربّ اکبر ہے
زمین نورِ سماوات سے منوّر ہے

زمیں پکار اٹھی عقدے بہت عجیب کھلے جو آئی لب پہ دعا رازمن یجیب کھلے
در بہشت مری سطح سے قریب کھلے قدم حسینؑ کے آئے مرے نصیب کھلے
یہ حق ملا کہ مری خاک کیمیا ہو جائے
زباں پہ رکھ لے جو بیمار تو شفا ہو جائے

آگے کے بندوں میں احسن کربلا کی زمین، دریا فرات اور وہاں کی آب وہوا کا تذکرہ کرتے ہیں۔اس کے بعد شاعر کربلا کی عظمت بیان کرتا ہے اور پھر چینٹیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کو انسانوں پر فوقیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چینٹی جو انسان کو زندگی جینے کا ہنر سکھاتی ہے۔ یہ سکھاتی ہے کہ کمزور کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ کئی لحاظ سے یہ آدمی سے بہتر ہے۔ان میں کبھی نہ کسی مال وزر کی طلب ہوتی ہے اور نہ ہی یہ انسانوں کی طرح کاہل ہوتی ہیں۔ یہاں شاعر چینٹیوں کے ذریعہ سے انسانوں کو محنتی اور بے غرض اور باخلوص بننے کا پیغام دیتے ہیں۔

اس کے بعد احسن اس وقت کا بیان کرتے ہیں جب امام حسین زمین خرید کر نہر کے کنارے اپنے خیمے برپا کرتے ہیں اور تبھی ابنِ زیاد کا قاصد خیمے کو نہر سے ہٹانے کا پیغام لے کر آتا ہے، جس کو سن کر عباسؑ کو جلال آجاتا ہے۔جس کو امام حسینؑ روکتے ہیں۔ یہاں احسن حضرت عباسؑ کے جلال اور حضرت حسینؑ کا بھائی کو روکنے کے انداز کو بہت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

مجال کس کی جو خیمے یہاں سے کوئی ہٹائے جسے ہو جان سے جانا وہ سامنے آئے
زبان کھینچ لوں کوئی ہمیں جو آنکھیں دکھائے ترائی کس کی ؟ ابھی اسکا فیصلہ ہو جائے
مثالِ حرف غلط اسکا نام تک نہ رہے
نشاں حکومت فاسق کا شام تک نہ رہے

پکارا سرورؑ دیں نے کہ ٹھہر وٹھہر و یہ کیا زرا سی بات پہ تم کو جلال کیوں آیا
مطیع ِ امرِ مشیت ہیں صاحبان رضا خدا کی ہے یہی مرضی تو پھر رضاً بقضا
ہوا خلاف ہے بدلا ہوا زمانا ہے
ہمیں تو حکمِ الٰہی پہ سر جھکانا ہے

اس کے بعد احسن داناپوری حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کی گفتگو کے ذریعہ سے کربلا کے تمام واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ یہ مرثیہ ان کے تمام مرثیوں سے مختلف اور مختصر ہے۔ اس میں نہ تو رخصت و آمد کا ذکر ہوا ہے اور نہ ہی کسی جنگ وشہادت کا۔ اس مرثیہ کو احسن رضوی نے صرف ایک واقعہ پر ہی ختم کر دیا ہے۔ ان کے مرثیوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں اقبال کی سوچ اپنا سر اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

(۵) ہم صاحب بیاضِ حقیقت ہیں دوستوں

احسن داناپوری نے مجموعہ ''مطلع حیات'' کے پانچواں مرثیہ کا آغاز انھوں نے اس بند سے کیا ہے ''ہم صاحب بیاضِ حقیقت ہیں دوستوں''۔ اس مرثیہ کی تمہید انھوں نے ''ہم'' سے کی ہے، شاعر یہاں 'ہم' سے مراد شیعانِ حیدر کرار سے رکھتا ہے۔ اور اس مرثیہ میں جو باتیں بھی نظم کی ہیں اسی حوالے سے نظم کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم اس بیاض کے حقیقی مالک ہیں جس میں تفسیر شہادت امام حسینؑ تحریر ہے، اور اس مشیت میں ہمارے پیدا ہونے کا مقصد ہی شبیرؑ کا غم اور ماتم کرنا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بند ملاحظہ ہو۔

ہم کائنات دردکی عظمت ہیں دوستوں — درمانِ اعتبار کی دولت ہیں دوستوں
ہم دل ہیں اور دل کی ضرورت ہیں دوستوں — سر تا قدم یقینِ محبت ہیں داستوں
گونجی ہوئی ہے بزم جہاں غم کے بین سے
دنیا میں ایک رات بھی سوئے نہ چین سے

ہم آج سے نہیں ہیں ازل سے ہیں غم پسند — فطرت پکارتی ہے کہ دل ہے الم پسند
رنگِ ملال کم ہو تو گل ہیں وہ کم پسند — نرگس کے پھول سے بھی ہمیں چشمِ نم پسند
اظہارغم ہے آج مگر ربط کل سے ہے
قائم الم کا سلسلہ روز ازل سے ہے

احسن آگے حضرت علیؑ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ وہ نام ہے جس ذریعہ سے بندگی کی تمنّا دل میں جاگی ہے۔ جس کے وسیلہ سے حضرت آدمؑ کی توبہ کو پروردگار عالم نے قبول کی۔ جس کا نام لینے سے حضرت نوحؑ کی ناؤ پار ہوئی۔ جس کی وجہ سے دریائے نیل پہ رستہ بن گیا تھا اور موسیٰ اور ان کا قافلہ اس پر سے گزر گیا تھا۔ شاعر کہتا ہے یہ وہ نام ہے جسکے صدق دل سے لینے پر بشر کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد شاعر عزادار نے امام حسینؑ کے حوالے سے کچھ بند تحریر کرتے ہیں جس کو روایتی تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس کو انقلابی بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے باوجود یہ بند جذبوں کو جلا بخشنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ غمِ حسین میں انسان ہی نہیں فطرت بھی غم زدہ ہے۔ احسن داناپوری امام حسینؑ کے غم میں ڈوبی اس کائنات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کا غم ایسا ہے کہ جسکے لئے مشیّت نے ہمیں ہی نہیں بلکہ اس کائنات کے ہر ذرّہ کو بھی مبتلا کر دیا ہے۔ احسن نے حضرت حسینؑ کے غم میں ڈوبی ہوئی کائنات کی منظر کشی بہت عمدہ طریقے سے کی ہے۔ یہاں انھوں نے استعارہ اور حسن تعلیل کا استعمال بھی فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

نرگس نے دیکھا اپنی ہی چشمِ پُر آب میں	جوش الم سے بھر گیا پانی سراب میں
غم کے سبب تھی آتش گل پیچ و تاب میں	سنبل نے بال کھول دئے اضطراب میں
ماتم کیا چمن نے گلوں کے الاؤ پر
چھڑکا گلاب صبح کی شبنم نے گھاؤ پر

پھیکے چراغ پڑنے لگے بجھ گئے نجوم	ہر روشنی اُداس نظر آئی بالعموم
تھا منہ پہ چاند کے غم و اندوہ کا ہجوم	افلاک تک پہنچ گئی مظلومیت کی دھوم
تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں المناک ہو گئی
خط وہ پڑے کہ جیبِ سحر چاک ہو گئی

آگے کے بندوں میں احسن داناپوری اس سرزمین کا ذکر کرتے ہیں جہاں حسینؑ اوران کے اصحاب وانصار نے جنگ کر کے شہادت پائی ہے اور اپنے خون سے اس زمین کو گلزار بنا دیا ہے۔ پھر احسن نے مرثیہ میں واقعات کربلا اور خود امام حسینؑ کی عظمت وفضیلت کو جدید لب ولہجہ میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ وہ حسینؑ ہیں جنھوں نے کربلا میں اپنا سب کچھ لٹا کے نانا کے دین کی حفاظت کی ہے۔ اس بات کو احسن نے بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ بیت دیکھئے۔

''جس وقت آنچ لاکھوں کی محنت پہ آئی تھی
سب کچھ لٹا کے سب کی کمائی بچائی تھی''

امام مظلوم کربلا کی عظمت وفضیلت کے بیان کے بعد احسن مصائب کے بند تحریر کرتے ہیں۔ جس میں امام حسینؑ کے تمام اصحاب وانصار کا مختصر انداز میں بیان ملتا ہے۔ اس میں شبِ عاشور اور روز عاشور کے دن کے واقعات وحادثات کا ذکر کیا گیا ہے۔ حُرؑ کا فوج یزیدی کو چھوڑ کر فوجِ حسینی میں اپنے بیٹے، بھائی اور غلام کے ساتھ آنے اور پھر شہید ہونے کے منظر کو پر درد انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد عون ومحمد، قاسم، علی اکبر، حضرت عباسؑ اور علی اصغر کی شہادت کو پیش کرتے ہوئے حضرت امام مظلوم کربلا کی رخصت، میدان میں آمد، جنگ، شہادت اور بھائی کی لاش پر بہن زینبؑ کے بین کو لکھا ہے۔ احسن نے مرثیہ میں مصائب کے بند روایتی انداز میں تحریر کئے ہیں جو کہ مجلسی ماحول کے زیر اثر ہیں اس کے باوجود ایسے مصائب کے کچھ بند انھوں نے اپنے مخصوص رنگ میں کہے ہیں، جس میں تغزل کا رنگ صاف صاف نظر آتا ہے۔

عباسؑ مشک لیکے بڑھے جانب فرات	گھبرا کے گھاٹ چھوڑ گئی فوجِ بدصفات
مشک اس طرح بھری کہ نہ تھی جیسے کوئی بات	قربان تھی جری کی شجاعت پہ کائنات
غیظ آ گیا جو پیاس کے رنجِ شدید پر
چلّو میں بھر کے مارا تھا پانی یزید پر

اس مرثیہ میں کہیں کہیں ہمیں انیسؔ کی مرثیہ نگاری کی جھلک نظر آتی ہے۔ مرثیہ جدت اور پراثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

(۶) تصویرِ انقلابِ زمانہ نظر میں ہے

یہ مرثیہ احسن داناپوری کا اٹھاسی بندوں پر مشتمل ہے جسکو انھوں نے انقلابی رنگ میں لکھا ہے۔ جس کی ابتدا میں بدلتے زمانہ کے ذکر سے کیا ہے۔ جہاں وہ نور اور ظلمت کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نور یعنی کسی کی اچھائی سے برائی میں فرق کیا جاتا ہے، ضد سے بشر کی فطرت کا امتیاز سمجھا جاتا ہے، اگر آنکھوں سے آنسوں نہ نکلے تو انسان کے درد و غم اور اس کی خوشی نہیں سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد کے بندوں میں پروردگار عالم کی خوشنودی اور ان کی ریاضت کا ذکر تے ہیں پھر ان سے یہ دعا طلب کرتے ہیں کہ مجھے نہ تو بے روزگاری کا غم ہے اور نہ ہی دولت کی آرزو ہے، نہ ہی مجھے نام اور شہرت چاہئے، مجھے تو بس اپنے امام کی خدمت کرنے کی تمنّا ہے۔ ائے پروردگار میری محنت، میری خدمت کو قبول کر۔ اس کے بعد وہ اپنے استاد محترم جناب آرزوؔ کے متعلق کچھ بند تحریر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

میں ہوں چراغ مکتبِ عرفانِ آرزوؔ　　پروردۂ بہارِ گلستان آرزو
میری نظر ہے نکتۂ دیوان آرزو　　احسنؔ ہوں میں بصورتِ احسان آرزو
فیض کرم نے شکر کے قابل بنا دیا
دل کو سکھا سکھا کے ادب دل بنا دیا

صلاحِ حال ہو کے نئ زندگی ملی　　مقصد ملا، مراد ملی، آگہی ملی
نکتے نظر نواز ملے، روشنی ملی　　دن بھر کی دھوپ، رات کی پھر چاندنی ملی
غافل نہیں ہوں رحمت ربِّ انام سے
روشن کیا چراغ بزرگوں کے نام سے

ان بندوں میں شاعر اپنے استاد اور اپنے رب کا شکر یہ کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کو یہ مقام اور شہرت حاصل ہوئی ہے۔ ان بندوں میں کہیں نہ کہیں احسن کے احوال زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے بعد کے بندوں میں احسن ولادت رسولؐ اکرم کے وقت پوری کائنات میں جو خوشیوں کا رنگ پھیلا تھا اس کی منظر نگاری بڑے خوبصورتی سے پیش کی ہے۔ پھر معراج کا بیان کرتے ہیں اور معراج کی عظمت کچھ اس انداز سے تحریر کرتے ہیں۔ یہ بند دیکھئے۔

معراج یعنی سرورِ کل انبیاؐ کی رات　　معراج میہمانی شاہ ہداؐ کی رات
معراج جس کو چاہیئے کہنا خدا کی رات　　معراج، کیا کہوں ہے کیسی عطا کی رات
میلادِ فاطمہؑ کی بشارت کی رات ہے
تشکیل ذوالفقار کی صنعت کی رات ہے

آگے کے بندوں میں رسولؐ اکرم کی بیٹی جناب فاطمہؑ کی ولادت کا ذکر کیا گیا ہے پھر شب ہجرت کا ذکر کرتے ہوئے رسولؐ اور حضرت علیؑ کی محبت کو بیان کرتے ہیں جس میں ایک بھائی اپنے بھائی کی جان بچانے کے لئے خود اس کے

بستر پر اسکی شبیہ بن کر سو گیا تھا۔اس کے بعد بدلتے ہوئے زمانہ اور حضرت علیؑ اور رسولؐ کی محبت کا بیان کرتے ہوئے حضرت علیؑ کی عظمت وفضیلت کو بیان کیا گیا ہے۔

تلواروں کا محاصرہ بے کار ہو گیا　　پردہ نظر کا سایۂ دیوار ہو گیا
سونا علیؑ کا باعث تکرار ہو گیا　　اللہ اس ادا کا خریدار ہو گیا
گھر سے نکل کے سرور عالم تھے راہ میں
مولائے کائنات خدا کی پناہ میں

مرضیٔ حق پہ جان لڑائے ہوئے علیؑ　　سرکار دو جہاں کو بچائے ہوئے علی
قیمت ادائے فرض کی پائے ہوئے علی　　دونوں جہاں کو اپنا بنائے ہوئے علیؑ
سرورؐ خیالِ امن سے غارِ حرا میں تھے
حیدرؑ پس رسولؐ امانِ خدا میں تھے

احسن دانا پوری پھر خالق سے دعا کرتے ہوئے نظر آئے ہیں کہ مجھے وہ صبر عطا کر کہ اس بڑھتے ہوئے ظلم وغم کو سہتے ہوئے تیرا شکر ادا کر سکوں۔اس کے بعد کربلا کی سرزمین کا ذکر کرتے ہوئے شب عاشور کا بیان کرتے ہیں جہاں اسی رسولؐ اکرم کا نواسہ اپنی آخری رات گزار رہا ہے۔ان بندوں میں شاعر رات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا بہت خوبصورتی سے استعمال کرتا ہے۔

آئی ہے غم کی رات اندھرا کئے ہوئے　　لالے کو گل ، چراغ کو ٹھنڈا کئے ہوئے
دنیا سکون کی تہہ و بالا کئے ہوئے　　دونوں جہاں میں حشر سا برپا کئے ہوئے
دل کی طرح ہے چاند کا سینہ کٹا ہوا
ماتم میں زندگی کا گریبان پھٹا ہوا

ان بند میں احسن استعارے کا بہت خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں پھر وہ حضرت شبّیر کے متعلق لکھتے ہیں یہ اس رات کے بعد شہ مشرقین شہید ہو جایں گے اور تاریخ کائنات میں اس رات کا بیان ایک مصیبت وقیامت کی رات سے کیا جائے گا۔اس رات کے بیان کے ساتھ احسن اس واقعہ کا بھی بیان کرتے ہیں جب امام حسینؑ اپنے سارے انصار واقرو باء کو بلا کر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ ہم سب کی آخری مہلت کی رات ہے اور کل جنگ ہوگی لہذا تم میں سے جسکو بھی جانا ہے وہ جا سکتا ہے اور اگر روشنی میں جانے میں شرم آتی ہو تو لو میں چراغ کو بھی غل کر دیتا ہوں۔امام حسینؑ کے اس بیان سے ان کے سارے انصار واقرو باء میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور وہ سارے اپنے جان قربان کرنے کو اسی وقت تیار ہو جاتے ہیں۔ شاعر آگے اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ ان سارے انصار واقرو باء کو یہ علم بھی تھا کہ کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ یہاں شاعر نے جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں پیش کی ہے۔یہ بیان دیکھئے۔

واقف تھے سب کہ واقعہ کیا پیش آئیگا　　گذرے گی شب تو دن یہ قیامت دکھائیگا
وہ نامور جو رایتِ سروڑ اٹھائیگا　　ہاتھ اپنے ، علقمہ کے کنارے کٹائے گا
خونِ جگر بہائے گا آبِ رواں کے ساتھ
اٹھ جائے گا خود اپنی وفا کے نشاں کے ساتھ

اس کے بعد احسن ہر ایک شہید کی شہادت کو مختصراً انداز میں پیش کرتے ہوئے امام حسینؑ کی استغاثہ کا بیان کیا ہے جس کو سن کر ہر لاشہ میں حرارت ہوئی تھا۔ پھر شبیر کی شہادت بیان کرتے ہوئے ان کی بہن زینبؑ کا میدان جنگ میں آنے اور پھر شام غریباں کے مناظر کو احسن دانا پوری نے پر درد انداز میں بیان کیا ہے۔ جس کو سننے کے بعد سامعین اپنے جذبات پر قابوں نہ کرتے ہوئے آنسوں بہانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ احسن کی مرثیہ نگاری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مرثیہ کا آغاز تو جدید رنگ کے ساتھ کرتے ہیں لیکن جیسے جیسے مرثیہ آگے بڑھتا جاتا ہے اس میں قدیم رنگ اپنے آپ داخل ہونے لگتا ہے، جس سے مجلس رقط آمیز ہو جاتی ہے۔

(۷) قافلے آتے ہیں رکتے ہیں گزر جاتے ہیں

یہ مرثیہ احسن دانا پوری کے مجموعہ ''مطلع حیات'' کا ساتواں مرثیہ ہے جس کو ۸۷ بندوں میں لکھا گیا ہے۔ یہ مرثیہ حضرت حُرؑ کا امام حسینؑ کے قافلے میں شامل ہونا اور شہادت کے واقعہ پر مشتمل ہے۔ اس میں رات کو موت کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور آگے چل کر اس رات کو شبِ عاشور سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ مرثیہ کا ابتدائی بند احسن دانا پوری نے کچھ اس طرح تحریر کیا ہے۔

قافلے آتے ہیں رکتے ہیں گزر جاتے ہیں　　عارضی طور سے رستے میں ٹھہر جاتے ہیں
کسی منزل کسی ساحل پہ اُتر جاتے ہیں　　بادِیے بادِیہ پیماؤں سے بھر جاتے ہیں
زیست اک رات کے وقفے کے سوا کچھ بھی نہیں
اُٹھ گئے جب، تو یہ عالم یہ سرا کچھ بھی نہیں

مرثیہ کا آغاز شاعر نے زندگی کو سفر کی علامت بنا کر پیش کیا ہے جہاں قافلے آتے جاتے تو رہتے ہیں مگر یہاں ٹھہرنے والا کوئی نہیں ہے، یہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ قافلے عارضی طور پر رُک جاتے ہیں لیکن مستقل طور پر یہاں کوئی نہیں رہتا۔ زندگی کیا ہے کہ ایک وقفہ کے سوا کچھ نہیں ہے، اور جب بشر کو موت آ جاتی ہے تو اس کے لئے یہ دنیا اور یہ دنیا والے ختم ہو جاتے ہیں۔ آگے کے بندوں میں احسن دنیا کی بہاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تاروں سے روشن چمن اور وہ کہکشاں کی بہاریں، جب موت کا بُلاوہ آتا ہے تو یہ سب کچھ چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ وقت کسی بانگ درا کی مانند زندگی ختم ہونے کا پتہ دیتا رہتا ہے۔

آگے کے بندوں میں شاعر انسان کی ضعیفی کے وقت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب وقت گزرنے لگتا ہے تب انسان کو اس کے اعمال یاد آنے لگتے ہیں اس وقت اس کی تمام یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اس وقت بشر کو اسکا ضمیر

چٹکیاں لیتا ہے اور اس پر ایک خوف سا طاری ہو جاتا ہے۔شاعر یہاں موت سے پہلے کی انسانی کیفیتوں کی عکاسی بھرپور طریقے سے پیش کرتا ہے۔اس وقت انسان اپنے اعمال پر نظر ڈال کر پشیمان ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ کوئی ایسا نیک عمل مل جائے جس سے اسکی نجات ہو سکے۔ یہاں شاعر کی حرفِ نجات سے مراد حضرت امام حسینؑ سے محبت ہے۔اس بند میں احسن محاورہ کا استعمال بھی بہت خوبصورتی سے کرتے نظر آتے ہیں۔آگے کے بندوں میں شاعر توبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر انسان اپنے برے اعمال سے صدق دل سے توبہ کر لی تو اس کی نجات ہو جاتی ہے۔مرثیہ میں توبہ کا ذکر احسن دانا پوری نے کچھ اس انداز سے کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

توبہ کفّارۂ عصیاں ہے ندامت کی قسم ہاں مگر شرطِ تولّا ہے محبت کی قسم
بخشی جاتی ہیں خطائیں بھی شفاعت کی قسم حق بہر حال ہے حق اجرِ رسالت کی قسم
خط تسلیم سے تحریر بدل جاتی ہے
سر جھکا دیتے ہیں تقدیر بدل جاتی ہے

توبہ دوزخ سے بچاتی ہے گنہگاروں کو لاتی ہے دامنِ رحمت میں خطاکاروں کو
دے کے پروانہ معافی کا سزاواروں کو سرد کرتی ہے دھکتے ہوئے انگاروں کو
دل کو دل کرتی ہے کردار بنا دیتی ہے
پھول جب ٹوٹتی ہے ہار بنا دیتی ہے

آگے کے بندوں میں شاعر توبہ کرنے کا درس دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمیں جو بھی وقت ملے اس میں خدا کی عبادت میں گزارنا چاہیے اور اپنے مغفرت کی پروردگار سے دعا مانگنی چاہئے۔اپنی بات کا رخ کربلا کی طرف موڑتے ہوئے احسن تحریر کرتے ہیں کہ کربلا میں جنگ سے ایک رات کی مہلت عبادت کے واسطے شبّیر نے اس لئے لی تھی کہ شاید ان ظالموں کو حق اور باطل کی سمجھ آجائے اور وہ توبہ کر لیں۔اور ساری رات حضرت امام حسینؑ اور ان کے انصار و اقرباء نے اس طرح عبادت کی کہ سارا جنگل ان کی آوازوں سے گونجنے لگا۔احسن دانا پوری نے کربلا میں حسینؑ کے گزاری ہوئی رات کی منظر کشی اس خوبصورتی سے کی ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

چوم کر طالعِ بیدار کو چلنے لگی رات کروٹیں تاروں کے بستر پہ بدلنے لگی رات
وقت کے پھیلتے ہاتھوں سے نکلنے لگی رات اذنِ رخصت کے لئے جیسے مچلنے لگی رات
ایک چادر میں ہر اک لعل و گہر باندھ لیا
ڈوبتے تاروں نے سامانِ سفر باندھ لیا

رات کے ذکر کے بعد احسن صبح عاشورہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حُر کا ذکر کرتے ہیں جو اپنی غلطی پر نادم ہو کر اپنے بیٹے بھائی اور غلام کے ساتھ خیمۂ حسینی کی طرف آتا ہے۔دشمن اس کو لاکھ روکنے کی کوششیں کرتے ہیں مگر وہ ان کو روک نہیں پاتا ہے۔حُر امام حسینؑ کے قریب آکر ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگتے ہیں اور جنگ کی اجازت طلب کرتے

ہیں۔اس کے بعد شاعر حُر کی میدان جنگ میں جانے کی رخصت اور پھران کے جنگ کی منظر کشی اس انداز سے کرتا ہے کہ کربلا کے مناظر آنکھوں کے سامنے چھا جاتے ہیں۔حُر کی جنگ کا یہ منظر دیکھئے۔

اُف وہ موزی جنھیں مردانِ وغا نے مارا ۔۔۔ اژدھے تھے کہ انہیں حق کی عصا نے مارا
منہ پہ چڑھ آئے تھے شمشیر قضا نے مارا ۔۔۔ ہاتھ سے حُرؑ کے لعینوں کو خدا نے مارا
رگِ باطل سے بہت زہر نچوڑا حُرؑ نے
جو بھی پھنکارا اُسے زندہ نہ چھوڑا حُرؑ نے

اس کے بعد احسن حُرؑ کے گھوڑے سے گرنے، امام حسینؑ کو آواز دینے اور ان کا حُرؑ کی لاش پر پہنچنے کے واقعہ کا بیان کیا ہے۔پھر حُر کی شہادت اور ان کی لاش پر امام حسینؑ کے بین کو شاعر نے اس پر درد انداز سے بیان کیا ہے کہ سامعین اپنے بہتے ہوئے آنسوں کو روک نہیں پاتے ہیں۔مرثیہ میں استعارہ، علامت، تلمیح اور محاورے کا استعمال کیا گیا ہے۔زبان صاف اور سادہ ہے۔احسن داناپوری کا یہ مرثیہ قدیم روایتی طرز پر تحریر کیا گیا ہے۔

(۸) جلوہ مخفی تھا مگر محوِ تجلاّ کون تھا

احسن داناپوری کا آٹھواں مرثیہ جناب زینبؑ کے دونوں نونہال یعنی عون اور محمد کے حال کی شجاعت اور بہادری کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ان دونوں نے کربلا کے میدان میں وہ جنگ کی کہ دشمنوں کو جعفر طیار کی شجاعت یاد آ گئی۔اس مرثیہ میں انھوں نے ۷۶ بند تحریر کئے ہیں۔مرثیہ کا چہرہ احسن داناپوری نے بابا آدم اور حوّا کو بنایا ہے۔اور مرثیہ کا آغاز بھی انہیں سے کیا ہے۔احسن داناپوری نے مرثیہ کا آغاز کچھ اس انداز سے کیا ہے۔

جلوہ مخفی تھا مگر محوِ تجلاّ کون تھا ۔۔۔ آرزو مند نگارِ سرورِ عنا کون تھا
آتش گل پر دل اپنا رکھنے والا کون تھا ۔۔۔ زندگی بکھری پڑی تھی پھر بھی تنہاں کون تھا
نازنیں پیوند رنگِ آب و گل لگتا نہ تھا
آدمی جنّت میں تھا اور اس کا دل لگتا نہ تھا

شاعر یہاں جنت کا ذکر کرتا ہے جہاں حضرت آدم اداس ہیں۔ان کا دل نہیں لگتا جس کا سبب احسن جناب حوّا کو مانتے ہیں جن کی تخلیق ابھی رب العالمین نے کی بھی نہیں ہے۔یوں تو جنت میں وہ سب کچھ تھا جس کی انسان خواہش کرتا ہے۔ان سب مسرتوں کے ہونے کے باوجود کوئی بات کہنے اور سننے والا نہ تھا۔وہ نہ تھا جس سے وہ اپنے دل کا حال کہہ سکتے تھے۔شاعر حضرت آدم کے دل کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آدم جنّت میں حوّا کی خواہش کرتے ہوئے سوچتے ہیں کہ اگر میرے ساتھ کوئی ہوتا تو اس جنت کا نظارہ ہی کچھ اور ہوتا۔اس کے ساتھ میں خدا کے بنائے ہوئے حسن کی شان دیکھتا۔احسن حضرت آدم کی اس خواہش کو بہت دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

چاندنی چھٹکی تو ہوتی رنگ و نکہت کے لئے　　صبح کا تارا چمکتا صبحِ جنّت کے لئے
دل دھڑکتا تو کہیں جوشِ محبت کے لئے　　ٹوٹ جاتا آئینہ جلوے کی حیرت کے لئے
دفترِ بے معنی دل جس کا سرنامہ نہیں
کیسی جنّت ہے کہ اس جا کوئی ہنگامہ نہیں

دل تو ہے پہلو میں لیکن دل کے افسانے نہیں　　گرمئ صہبا سے جو پگھلیں وہ پیمانے نہیں
شمع کی تقدیر میں جیسے کہ پروانے نہیں　　ہم کسی سودا کے طالب ہیں تو دیوانے نہیں
رہ کے جنّت میں بھی جنت سے جو دل گھبرا گیا
غیرت تخلیق کو جیسے پسینہ آ گیا

پھر شاعر جناب حوّا کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حضرت آدم کی یہ پریشانی دیکھ کر خدا کو اس پر رحم آ گیا اور انھوں نے حوّا کی تخلیق کی۔ جس سے آدم کو پوری جنت مزّین نظر آنے لگی۔ آگے احسن عورت کی خوبصورتی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خدا نے عورت کی ایک ایسی شخصیت بنائی کہ جس کو پانے کے لئے بشر جنت کو ترک کرنے کو بھی تیار ہو گیا۔ اس کے بعد شاعر حضرت آدم کے دونوں بیٹوں کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کائنات کی پہلی قربانی کا تذکرہ کرتے ہیں، جہاں دنیا کا پہلا بھائی اپنے بھائی کی لاش اٹھاتا ہے، جہاں ایک باپ پہلی بار اپنے بیٹے کی یاد میں آنسوں بہاتا ہے۔ ہابیل کی موت اس دنیا کی پہلی موت تھی جس سے کائنات اسی جادے پر سفر کرتی آگے بڑھنے لگی۔ وہ عورت جس سے آدم نے پوری زمیں کو جنت بنانے کا سوچا تھا، وہ اب صرف مردوں کی نظروں کا تماشا بن گئی ہے۔ اس بندوں میں جہاں ایک طرف شاعر تلمیح کا ذکر کر رہا ہے تو دوسری طرف وہ عورت کے موجودہ حال کی عکاسی بھی کرتا نظر آتا ہے۔ جہاں ہر طرف عورتوں کا استحصال کیا جا رہا ہے۔

دلبری بڑھتی گئی اتنی کہ فتنہ ہو گئی　　زلف کی ایک ایک لٹ پھانسی کا پھندا ہو گئی
زندگی عورت کی نظروں کا تماشا ہو گئی　　موت جیسے تیغ ابرو کا اشارہ ہو گئی
خون کی بوندوں میں عورت رقص کی شیدا ہوئی
طشت میں سر آیا گھنگھروں میں جھنک پیدا ہوئی

اس کے بعد شاعر اس دور کا ذکر کرتا ہے جب لڑکی کو زندہ زمین میں دفنا دیا جاتا تھا۔ تہذیب پر جاہلیت کا اثر اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ انسان اور شیطان میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں حضرت رسولؐ اکرم نے اپنی بیٹی فاطمہ کو ایک مثال بنا کر ان جاہل قوم کے سامنے پیش کیا اور ان کو عورتوں کا سردار بنایا۔ احسن اس کے بعد جناب فاطمہؐ کی عظمت بیان کرتے ہوئے اس کی بیٹی جناب زینبؑ کا تذکرہ کرتے ہیں۔

مصائب کے بندوں میں احسن جناب زینبؑ کے دونوں بیٹوں عون و محمد کا ذکر کرتے ہیں جو کربلا کے بن میں اس لئے اداس بیٹھے ہیں کہ اس کے ماموں حضرت امام حسینؑ ان کو مرنے کی رضا نہیں دے رہے ہیں۔ یہ بچے اپنے ماموں

سے علم دلوانے کے لئے زینبؑ سے گزارش کرتے ہیں۔ یہاں شاعر ایک باوقار اور بہادر عورت کی ان کے بہادر بیٹوں سے گفتگوں کو پردرد انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

عرض کی بچوں نے ہم مرنے سے گھبراتے نہیں   آنے دیجے موت کو ہم بھی کہیں جاتے نہیں
دیکھئے ماموں ذرا بھی یاد فرماتے نہیں   دے رہے ہیں اذن سبوں کو ہم کو بلواتے نہیں
آپ سے اتنی گزارش ہے کرم فرمائیے
کہہ کے ماموں جان سے ہم کو علم دلوائیے

اچھی امّی ہم بزرگوں کو بھلا ہنسوائیں گے   دیکھئے گا سرخرو میداں سے ہو کر آئیں گے
آپ کہئے گا تو شہؑ بیشک کرم فرمائیں گے   یہ علم ہے، چار ہاتھوں سے پہاڑ اٹھ جائیں گے
اسطرح انکار سے کیا اپنے دل پھٹتے نہیں
آپ کو معلوم ہے ہم بات سے ہٹتے نہیں

ان بندوں کے بعد عون و محمد کا میدان جنگ میں جانے کے لئے رخصت کا بیان کرتے ہیں، پھر ان دونوں بچوں کی بہادرانہ جنگ کی منظر کشی حقیقت مندانہ انداز میں کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان بچوں کی شہادت اور پھر ماں کے بین کو پردرد انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ ان کا یہ مرثیہ بھی قدیم روایت کے رنگ میں نظر آتا ہے۔ زبان صاف اور انداز سادہ ہے۔ مرثیہ میں تلمیح، استعارہ اور محاورہ کا استعمال خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ مرثیہ میں احسن نے ہابیل کی شہادت کی تاریخ کو عون و محمد سے جاملایا ہے۔ مرثیہ میں ایک نئے اسلوب کا استعمال کیا ہے۔

(۹) محرم ہے کون جلوۂ حیرت طراز کا

یہ مرثیہ احسن داناپوری کے مجموعہ میں انسٹھ (۵۹) بندوں پر مشتمل ہے۔ جس میں حضرت امام حسن کے نونہال جناب قاسمؑ کی جنگ کا بیان جذباتی اور حقیقی انداز میں کیا ہے۔ اس مرثیہ کا آغاز احسن داناپوری نے قصیدہ کی طرز سے کیا ہے۔ مرثیہ کی ابتداء میں شاعر اہلبیت کی شان میں قصیدہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سوائے اہلبیت کے اس کائنات میں کون ایسا ہے جو کہ مشیت کے رازوں کا راز دار ہو۔ جو حسن کائنات کا دانا ہو، وہ کون ہے جو پابند طوق و زنجیر رہ کر بھی سجدۂ شکر ادا کرتا ہے۔ اہلبیت کی شان کو احسن داناپوری نے کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے۔

سر دے کے زندگی کا خریدار کون ہے   مٹ کر حیات نو کا طلب گار کون ہے
حلقہ میں گیسوؤں کے گرفتار کون ہے   کیا کیا ہیں پیچ واقف اسرار کون ہے
گذرا ہے کون تیغ و سلاسل کی راہ میں
پردے اٹھا دیئے گئے کس کی نگاہ میں

ہنستا ہے کون جنبشِ شمشیر دیکھ کر   کس نے قدم بڑھائے ہیں زنجیر دیکھ کر
راسخ ہے کون گردش تقدیر دیکھ کر   بوسے دیئے ہیں قتل کی تحریر دیکھ کر

اس نے لبوں سے قوتِ گفتار چھین لی
اس نے ستم کے ہاتھ سے تلوار چھین لی

شاعر آگے کے بندوں میں دور نقطہ چیں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم شیدائے حسینی ہیں اور ہمیں مصائب وغم وآلام میں زندگی جینے کی عادت ہے۔ شاعر یہاں شیدائے اہلبیت پر ہونے والے ظلم وستم کا تذکرہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے ہی خون کی دھاریں دجلہ سے نیل ندی میں جا کے ملتی ہے اور وہ ہمیں ہیں جسکو ظالموں نے زندہ فصیلوں میں چنوا دیا ہے۔ ہم زمانے کے اتنے غم سہ چکے ہیں کہ اب تو سختیاں بھی ہم سے شرمانے لگیں ہیں۔ ان بندوں میں احسن داناپوری نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

پانی ہوئی ہیں ہم سے زمانے کی سختیاں ہمنے اڑائیں ظلم کے دامن کی دھجیاں
افسانۂ حیات کی ہم سے ہیں سرخیاں مجلس میں ہم چراغ ہیں صحرا میں آندھیاں
ہم سنگ میں درآتے ہیں دیوار توڑ کے
دریا میں ناؤ کھیتے ہیں پتوار توڑ کے

مصائب کے بندوں میں احسن روز عاشور کا بیان کرتے ہیں جب امام حسینؑ کے سارے انصار واقرباء ایک ایک کر کے شہید ہو رہے ہیں اور امام حسنؑ کا بیٹا قاسمؑ حضرت شبیرؑ سے رن کی اجازت مانگ رہا ہے لیکن ان کو کسی صورت رضا نہیں ملتی۔ پھر انکو اس تعویز کی یاد آتی ہے جس کو انکے بابا نے قاسمؑ کے بازوں پہ باندھ رکھا تھا اور مصیبت کے وقت کھولنے کو کہا تھا۔ اس خط میں امام حسنؑ نے اپنے بھائی حسینؑ سے قاسمؑ کے مرنے کی رضامندی تحریر کی تھی۔ جس کو پڑھنے کے بعد حسینؑ اپنے آپ کو روک نہیں پائے اور رونے لگتے ہیں۔ شاعر نے یہاں جذبات نگاری کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔ ان کے مرثیہ کا طرز تحریر شروع تو جدید طرز سے ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے مرثیہ آگے بڑھتا ہے اس میں قدیم طرز کی رنگت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ جذبات نگاری کی یہ مثال دیکھئے۔

خط پڑھ رہے تھے غور سے شاہنشہ زمن مٹتی تھی اور ابھرتی تھی ماتھے کی ہر شکن
بادل میں غم کے چھپتی نہ تھی مہر کی کرن اور محوِ انتظار تھا لختِ دل حسن
مولا نے خط کو پڑھ لیا خاموش ہو گئے
سارے حروف اشکوں میں روپوش ہو گئے

قدیم مرثیوں کی طرح اس مرثیہ میں بھی احسن داناپوری نے مرثیہ کے تمام اجزاء کو برتا ہے۔ انھوں نے اس میں حضرت قاسمؑ کا خیمہ سے رخصت ہو کر میدان کارزار میں آنا، اور اپنا رجز بیان کرنے اور پھر جنگ کرنے کے بیان کو ترتیب دیا ہے۔ مرثیہ میں انھوں نے میدان جنگ کی منظرکشی اس انداز سے بیان کی ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے گرد پھرنے لگتا ہے۔ پھر ان کا گھوڑے سے گرنا اور حضرت شبیرؑ کو آواز دینا، ظالموں کا گھوڑوں کو قاسمؑ کے اُپر سے گزار دینا ایسے مناظر ہیں جس سے سامعین اپنے جذبات پر قابو نہیں کر پاتا اور آنسوں اپنے آپ نکل آتے ہیں۔

وہ لاش کیا کہیں کہ عجب اس کا حال تھا وہ لاش جسکو لاش بھی کہنا محال تھا
کیونکر اٹھائی جائے کٹھن اک سوال تھا یہ لاش تھی کہ پھول کوئی پائمال تھا
گھوڑوں سے راندوا کے ستمگر نے مارا تھا
قاسمؑ تھا جس کا نام وہ اب پارہ پارہ تھا

اس کے بعد جناب قاسمؑ کی لاش پر حسینؑ کا آنا اور پھر لاش کے ٹکڑوں کو عبا کے دامن میں چن کر خیمہ میں لانے کا بیان ہے جہاں ان کی پھوپھی زینبؑ خیمہ میں ان کو دولہا بنانے کا انتظار کر رہی ہیں۔ مرثیہ میں ہندوستانی رسم رواج کا بیان بھی کیا گیا ہے۔ جیسے کہ حضرت قاسمؑ کو مہندی لگانا جبکہ عرب میں ایسا کوئی رواج نہیں ملتا ہے۔ مرثیہ میں کچھ بندوں میں مبالغہ، تلمیح اور استعارہ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ زبان صاف سادہ اور عام فہم ہے جس سے مرثیہ کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

(۱۰) حق نے جب ثابت کیا نقشِ دوامِ زندگی

احسن دانا پوری نے اس مرثیہ میں خدا کی عظمت وشان بیان کرتے ہوئے کائنات کی تخلیق کا ذکر کیا ہے۔ یہ مرثیہ بہتر (۷۲) بندوں میں تحریر کیا گیا ہے۔ یہ مرثیہ حضرت عباسؑ علمدار کی شان میں لکھا گیا ہے۔ مرثیہ کی ابتدا میں وہ تخلیق کائنات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ نے جب دنیا کو بنایا اور اس زمین وآسمان، چاند اور تاروں کو وجود میں لایا گیا تو ان سب میں زندگی کا ایک پیغام بھی ڈال دیا گیا۔ جس سے بشر ہر چیز سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہے۔ اس مرثیہ کے ذریعہ شاعر ہر انسان کو زندگی جینے کا ہنر بیان کرتا ہے۔ شاعر نے اپنا پیغام زمانے میں کچھ اس انداز سے پہچایا ہے۔

مل گئی ہر موج کو جیسے زبانِ زندگی شور دریا تھا کہ تھا جوش بیان زندگی
ہر سفینے پر رواں تھا کاروان زندگی ایک اک ساحل پہ لہرایا نشان زندگی
سینۂ دریا پہ خط کھینچے گئے پتوار سے
سونے والے جاگ اٹھے زنجیر کی جھنکار سے

آگے کے بندوں میں شاعر تخلیق کائنات یعنی کائنات کی تخلیق کیسے کیسے ہوئی اس کا بیان شاعرانہ انداز میں کرتے ہیں۔ پھر احسن خدا کی دی ہوئی نعمت کا شکر شجر کے ذریعہ سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے خدا میری جتنی بھی ڈالیاں ہے سب تیری بندگی تسلیم کرتی ہیں۔ تو نے ہمیں عزت دی ہے، ساتھ ہی تو نے پھل اور دانے دیئے ہیں جس سے روٹی بنتی ہے لیکن ائے خدا تیرے بندے تیرا شکر ادا نہیں کرتے وہ تیری ساری نعمتوں سے لطف واندوز تو ہوتے ہیں پھر بھی وہ تیرا نام تک نہیں لیتے۔ شجر آگے کہتا ہے کہ بیشک اے مالک تو سارے جہان کا رازق ہے تو نے ہر جاندار کا رزق متعین کر رکھا ہے تو انکو بھی رزق دیتا ہے جو گوشہ نشیں ہے لیکن ائے رب العالمین ہمیں اس کی خبر نہ تھی کہ تو ہمارا رزق صرف سادہ پانی ہی رکھے گا۔ اس کے بعد شاعر ان لوگوں کا بھی ذکر کرتا ہے جنھوں نے پانی کو اپنی غذا بنائے تھے۔ یہاں احسن تلمیح کا استعمال کرتے ہوئے یہ بند تحریر کرتے ہیں۔

صرف پانی پر جئے ہیں کتنے ہی عالی صفات　　سامنے ہیں سب مثالیں یاد ہے اک ایک بات
زمزم اسمٰعیلؑ کو اور خضر کو آب حیات　　توڑ کر پانی سے فاقہ مطمئن حیدرؑ کی ذات
سینۂ گیتی پہ کیا سیال مرہم رکھ دیا
تو نے پانی پر مدارِ بزم عالم رکھ دیا

احسن پھر لکھتے ہیں کہ اے مالک تو نے رزق پانے کے دستور کو انسانوں کے لیے بہت آسان کر دیا ہے وہ تھوڑی سے محنت کر کے ہی روٹی حاصل کر لیتا ہے۔اس کے علاوہ اگر کوئی انساں بھوکا ہے تو وہ اس کو بھی کھانا کھیلا دیتا ہے۔اور حد تو یہ ہے کہ انسان اب آب و دانا کی تجارت بھی کرنے لگا ہے۔اس کے بعد احسن انسانوں سے شکایتی انداز میں مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ یتیم اور بیواؤں کا حق کیوں چھینا جا رہا ہے وہ کیوں مزدوری کریں۔جسکی ذمہ داری ہے وہ انکا حق کیوں نہیں انکو دیتا جبکہ خدا نے یتیم اور بیواؤں کا حق دینا واجب قرار دیا ہے۔پھر شاعر حضرت علیؑ کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ شب کی تاریکی میں غریبوں اور محتاجوں کے گھر اس طرح روٹیاں پہنچاتے تھے کہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

پاک رکھ کر اپنا دامن اسطرح جاتا ہے کون　　گھُپ اندھیرے میں عمل کی شمع لہراتا ہے کون
شب کے سنّاٹے میں محتاجوں کے گھر آتا ہے　　روٹیاں لادے ہوئے زنجیر کھڑکاتا ہے کون
رزق مل جاتا ہے رازق کا پتہ ملتا نہیں
حیدرِ کرّار ملتے ہیں خدا ملتا نہیں

اسکے بعد احسن مولائے کائنات کی عظمت کا تذکرہ بہت عمدہ بیتوں میں کرتے ہیں۔پھر وہ حضرت علیؑ کی آرزو اور امّ البنین کے بیٹے حضرت عباسؑ کا تذکرہ کرتے ہیں۔جو مولائے کائنات کے دل کی آرزو تھے۔جس کے لئے انھوں نے خود پروردگار عالم سے دعا کی تھی کہ مجھے ایک ایسا بیٹا عطا کر جو کربلا میں میرے حسینؑ کے کام آئے۔جس کو جناب فاطمہؑ کے اپنا بیٹا کہا ہے اور اس کے لئے دعا کی ہے۔اس بیٹے کے جرأت، شجاعت اور جلالت کا ذکر احسن اپنے مرثیہ میں کرتے ہیں۔ حضرت عباسؑ کے شجاعت کا بیان شاعر ان بیت میں کرتا ہے۔

یہ شجاعت کا دھنی شہروفا کا شہریار　　بعد امیر المومنین کے قوتِ پروردگار
یہ علمبردارِ لشکر شاہؑ کا طاعت گذار　　قہر میں بجلی تو ہے برداشت میں کوہِ وقار
آبرو پر آنچ آجائے تو جینا ہے محال
بھر کے چلّو پھینکنا آسان ،پینا ہے محال

حضرت عباسؑ کی شجاعت کے بیان کے بعد شاعر امام حسینؑ کے مرتبہ کا بیان کرتا ہے۔پھر حضرت عباسؑ کو شبیر کے لشکر کا علمدار بنانے کے واقعہ کا بیان ہوتا ہے۔اس کے بعد امام حسینؑ کے انصار و اقربا کی شہادت کا مختصر انداز میں بیان کرتے ہیں۔اب شاعر اس وقت کا ذکر کرتا ہے جب حسینی لشکر میں صرف علی اکبر، حضرت عباسؑ، علی اصغر اور خود حسینؑ

ہی رہ گئے ہیں۔تین دن سے سارے لوگ پیاسے ہیں۔حضرت عباس امام حسینؑ سے دریا سے پانی لانے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔اور بھتیجی سکینہ ان کو اجازت دلوادیتی ہیں۔حضرت عباسؑ کا گھوڑے پر سوار ہوکر دریا پہ جانا اور اس کے خوف سے سپاہیوں کا دریا چھوڑ کر بھاگ جانے کا ذکر احسن فصاحت و بلاغت سے کرتے ہیں۔

باگ پر تھا ہاتھ اور عقدہ کشائی پر نظر — تھے قدم اہِ خدا میں او ر خدائی پر نظر
بندگانِ زر کی حرص وکج ادائی پر نظر — دھیان میں صورت سکینہ کی ترائی پر نظر
غیظ میں جھنجھلا کے دریا کی طرف غازی بڑھا
ہل گیئں باگیں تو آندھی کی طرح تازی بڑھا

تھے کڑے تیور جو زور بازوے شبیر کے — حوصلے گھٹنے لگے خود لشکر بے پیر کے
تن میں رعشہ تھا تو رُخ مڑ مڑ گئے تھے تیر کے — گھاٹ پر عباسؑ پہنچے قلبِ لشکر چیر کے
پہرہ داروں کے قدم اُکھڑے کہ پہرہ اٹھ گیا
ہاتھ غازی کے بڑھے دشمن کا قبضہ اٹھ گیا

احسن داناپوری نے اس مرثیہ میں حضرت عباسؑ کا میدان میں جاتا،ترائی پر قبضہ کرنا،پانی بھرنا اور مشک لیکر واپس آنا اور پھر راستے میں ان کے بازوں کے کٹنے،مشک چھیدنے اور گھوڑے سے گرنے تک کے تمام واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔پھر حضرت امام حسینؑ کا عباسؑ کے پاس آنے اور عباسؑ کا لاش کو خیمہ میں نہ لیجانے کی وصیت کرنا ایسا واقعہ ہے جس میں شاعر جذبات نگاری کا استعمال شدس سے کرتا ہے۔اس مرثیہ میں انیس کی مرثیہ نگاری کی جھلک بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔مرثیہ کی زبان صاف اور لہجہ سادہ ہے۔

(۱۱) اے چشمِ شوق جلوۂ حق سے نقاب اٹھا

احسن داناپوری کا یہ مرثیہ چوسٹھ (۶۴) بندوں میں تحریر کیا گیا ہے جس میں حضرت علی اکبرؑ کے حال کا بیان ہے۔مرثیہ کا آغاز احسن داناپوری پروردگار عالم کے اس معجزہ سے کرتے ہیں جس میں حضرت موسیٰؑ کو خداوند عالم کے ظہور کو دیکھنا تھا۔اور اس اشتیاق نے ان کو کوہ طور پر پہنچا دیا تھا۔اس واقعہ کا بیان شاعر اس طرح سے کرتا ہے۔

اے چشمِ شوق جلوۂ حق سے نقاب اٹھا — پردے یہ دیکھنے کے ہیں رسم حجاب اٹھا
سرمۂ بنا کے خاک ِ در بو،تراب اٹھا — ضو سامنے ہے بس نگہِ کامیاب اٹھا
صورت ہے صاف آنکھوں میں نزدیک و دور کی
ہر پردہ نگاہ میں پتلی ہے نور کی

پیچھے دھواں سا ہے شعلہ ہے سامنے — پردہ چمک رہا ہے کہ جلوہ ہے سامنے
ضو کہہ رہی ہے عین نظارہ ہے سامنے — آنکھیں ہوں بند تو بھی اجالا ہو سامنے
اس خاک کو غضب کا علاقہ ہے نور سے

سُرمہ بنی ہے چمکی ہے جب برقِ طور سے

آگے کے بندوں میں احسن داناپوری بیان کرتے ہیں کہ جب پروردگارِ عالم نے اپنا نور ظاہر کیا تو ایسا لگا کہ ایک برق گری جس نے سارے خرمن کو جل ڈالا۔ اور اس قدر گرمی بڑھ گئی کہ ہوش نہ رہا اور یہ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ خداوند عالم کے نور سے آنکھوں کی بینائی چلی گئی یا کہ اس نور کا تاب نظر نہ لا سکی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہر سمت نور ہی نور ہے۔ پھر آگے کے بندوں میں احسن رسولؐ اکرم کی عظمت وفضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ سورج چاند اور تاروں میں جو ضیا دیکھائی دیتی ہے وہ انہیں کی ہے۔ اس بند کے آخری بیت میں احسن آئینہ کو ارض وسما یعنی زمین اور آسمان کا تشبیہ بنا کر پیش کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ اس ارض وسما پہ خداوند عالم کا کمال بظاہر نظر آتا ہے لیکن ان دو آئینوں میں جناب رسول خدا کا برق جمال نظر آتا ہے۔ احسن داناپوری رسولؐ خدا کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ان کے دنیا میں تشریف لانے کے اسباب بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ جب رسولؐ عرشِ بریں پر پہنچے تو ان کے نور کو دیکھ کر فرشتے سجدے میں جھک گئے۔ شاعر ان کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یوں تو رسولؐ خدا کے نور کی خلقت سب سے پہلے ہوئی ہے لیکن ان کو بطور رسولؐ دنیا میں سب سے آخر میں بھیجا گیا ہے۔ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں طور کے پہاڑ پر حضرت موسیٰؑ کو نور دکھا تھا وہ محمدؐ کا ہی نور تھا، جس کو دیکھ کر حضرت موسیٰ کی آنکھیں تاب نہ لا سکی اور بند ہو گئی تھیں۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

عرشِ بریں پہ انجمن آرا بنا ہوا اتنا بلند جیسے ستارا بنا ہوا
جبرئیل کی نگاہ کا تارا بنا ہوا خلقت کی روشنی کا منارا بنا ہوا
جو بعد میں چراغ ِ سرِ نخل طور تھا
قندیل ِ عرش میں وہ محمد کا نور تھا

شاعر آگے کے بند میں حضرت آدمؑ کی خلقت کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب خدا نے آدمؑ کا پتلا تیار کیا اور اس میں روح ڈالی اور اسکے ساتھ میں محمدؐ کے نور کی خلقت بھی کی تو سارے فریشتے سجدے میں جھک گئے لیکن جو (ابلیس) نہیں جھکا وہ شیطان بن گیا۔ ان واقعات کے علاوہ مرثیہ میں احسن داناپور نے محمد کی تشبیہ قرآن شریف کے سوروں سے بھی دی ہے۔

سورہ ہے نور کا کہ سراپائے مصطفےٰؐ واللیل تارِ زلفِ چلیپائے مصطفےٰؐ
والفجر صبح چشم دل افزائے مصطفےٰؐ والشمس طلعتِ رخِ زیبائے مصطفےٰؐ
رحمٰن ، شرح ِ رحمت ولطفِ عمیم ہے
قرآن کیا قصیدۂ خلق عظیم ہے

شاعر حضرت رسولؐ اکرم کے جمال کی تعریف کرتے ہوئے امام حسینؑ کے بیٹے علی اکبرؑ کے جمال کی تعریف کرتے ہیں جو کہ رسولؐ کی شبیہ ہیں ۔وہی نین ونقش، وہی جمال، وہی قد اور وہی آواز اور وہی انداز جو کہ رسولؐ کا تھا۔امام حسینؑ کو جب بھی اپنے نانا کی یاد آتی تھی تو وہ علی اکبرؑ کے چہرے کی زیارت کرتے تھے۔رسولؐ خدا اور علی اکبرؑ کی مشابہت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

اس لہجے پر درود اس آواز پر سلام صدقے اگر قعود تو قربان ہے قیام
ذکر خدا کے بعد جو لب پر ہیں دو کے نام کرتا ہے دل نماز زیارت کا اہتمام
حیراں ہے آئینہ علی اکبرؑ ہیں سامنے
خود جھک رہے ہیں سر کہ پیمبرؐ ہیں سامنے

مرثیہ میں رسولؐ کو چہرا بنانے کی وجہ ہی یہی ہے کہ علی اکبرؑ رسولؐ اکرم سے مشابہ تھے۔مرثیہ میں مصائب کے بند حضرت علی اکبرؑ کے تحریر کئے گئے ہیں جس میں ان کی خیمہ سے رخصت سے لیکر شہادت اور بین تک کے سارے اجزاء بہت عمدگی اور کامیابی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ۔اور مرثیہ کے آخر میں احسن خود کو قدیم مرثیہ گو تسلیم کرتے ہیں اور اس بات کی تصدیق بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے بزرگو کے ہی نقشِ قدم چل رہے ہیں ۔احسن کا یہ بہت ہی عمدہ مرثیہ ہے جس میں وہ حضرت رسولؐ خدا اور علی اکبرؑ کے مشابہت کو بیان کرتے ہوئے پوری کائنات میں محمدؐ کے جمال کا رنگ بھی دیکھایا ہے۔

(۱۲) نکتہ وہ سرِ لوح تمنا نظر آیا

۶۶ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ امام حسینؑ کے چھوٹے بیٹے حضرت علی اصغرؑ کے حال کا ہے۔جس میں احسن نے حضرت علیؑ کو چہرہ بنا کر پیش کیا ہے۔مرثیہ میں شاعر حضرت علیؑ کو نکتہ سے تشبیہیہ دیا ہے۔مرثیہ کا آغاز انھوں نے یوں کیا ہے۔

نکتہ وہ سرِ لوح تمنا نظر آیا روشن جو ہوا عرش کا تارا نظر آیا
تحریر مشیّت کا خلاصہ نظر آیا تفصیل کا اجمال میں خاکہ نظر آیا
ہے اس کے سبب نظم کی ہر بیت شرف میں
نکتہ پہ نظر میں ہے کہ گوہر ہے صدف میں

احسن نکتہ کی اہمیت وافادیت کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بغیر نکتہ کوئی بھی تحریر مکمل نہیں ہوسکتی۔اور اگر کسی مشکل سے بلا نکتہ کی تحریر لکھ لی جائے تو بھی وہ صرف ایک صنعت ہی بن کر رہ جاتی ہے۔احسن لکھتے ہیں کہ جس طرح بنا نکتہ سے کچھ لکھا نہیں جاسکتا اسی طرح بنا علیؑ کی ولایت کے کوئی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔آگے کہتے ہیں کہ جب تجلّی کی تکمیل کی منزل آئی تو اس وقت علیؑ کسی نور کی مانند محمدؐ کے ساتھ تھے۔اس بات کی تصدیق کے لئے احسن جنگ خیبر، خندق، بدر اور احد کے واقعات کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ ہر جنگ میں رسولِؐ اکرم سے ساتھ موجود تھے۔اور وہ ہر جنگ

میں غالب تھے۔شاعراس مصرعے کے بیت میں اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حضرت علیؑ کسی وقت بھی رسولؐ اکرم سے جدانہیں تھے حتہ کہ جب محمدؐ معراج پہ تھےاس وقت بھی حضرت علیؑ ان کے نزدیک موجود تھے۔(شاعر کے عقائد کے مطابق رسولؐ معراج پہ جس آواز سے گفتگو کررہے تھے وہ آواز علیؑ کی آواز سے مشابہ تھی)۔

آگے کے بند میں شاعر حضرت علیؑ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حضرت علیؑ جناب رسولؐ خدا کے نائب ہیں اوراس کائنات کے مولا ہیں۔جوحکم رسولؐ اکرم نے دنیا کو دیا تھاوہی حکم حضرت علیؑ نے بھی دیا۔یہ محمدؐ کے علم کا دریا ہیں اس لئے انھوں نے سرممبر سلونی کا دعوا کیا تھا۔یہ پوشیدہ رازوں کا جاننے والا ہےاس لئے ہی ان کا نام علیؑ ہے، جو کہ اللہ سے مماثلت رکھتا ہے۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

نائب شہِ کونین کا، کونین کا مولا جو حکم رسالت تھا وہی اس کا تھا خصبہ
یہ علم کا امنڈتا ہوا دریا دعوائے سلونی سرممبرا سے زیبا
محرم تھا یہ اسرارِ خفی رازِ جلی کا
اللہ سے ملتا ہوا تھا نام علی کا

احسن داناپوری حضرت علیؑ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے مصائب کی طرف بڑھتے ہیں۔چونکہ شاعر نے حضرت علیؑ اصغرؑ کا مصائب بیان کیا ہےاس لئے مصائب کی ابتداء میں وہ دونوں علیؑ میں ربط بیان کرتے ہیں۔یہ بند دیکھئے۔

وہ نکتۂ آغاز یہ انجام کا نکتہ وہ صبح کا نکتہ ہے تو یہ شام کا نکتہ
یہ روشنی جادۂ اسلام کا نکتہ ہے روشنی راہ طلب نام کا نکتہ
ہمنام خدا وہ ہے یہ ہم نام علی ہے
اک شمع ہے جو خون کے طوفاں میں جلی ہے

شاعر یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسلام کو بچانے کے جس کام کی شروعات حضرت علیؑ نے کی تھی اس کام کو تکمیل تک علی اصغرؑ نے پہنچایا ہے۔جہاں دین کو بچانے کے لئے حضرت علیؑ صبح میں شہید ہوئے تھے وہیں علی اصغرؑ نے شام میں جام شہادت پیا۔بیت میں وہ لکھتے ہیں کہ علیؑ ہمنام خدا ہیں یعنی علی کے معنی بھی علیٰ کے ہیں اور اللہ کے معنی بھی علیٰ کے ہیں۔وہی حضرت علی اصغرؑ بھی علی ہیں اور حضرت علیؑ بھی۔احسن داناپوری مصائب کو آگے بڑھاتے ہوئے سرورؑ کی تنہائی میں صرف علی اصغرؑ ہی ساتھ ہی اور وہی انکے مونس بھی تھے۔علی اصغرؑ کا ہی نام کربلا کے محضر شہادت کا آخری نام ہے۔یہی علی اصغرؑ ہیں جنھوں نے امام حسینؑ کی آواز پر مدد کے لئے جھولے سے خود کو گرادیا تھا۔احسن داناپوری علی اصغرؑ کی جرٔات اور محمدؐ کے گھرانے کی شجاعت کو بہت عمدہ مصرے میں پیش کرتے ہیں۔

جرأت کی کوئی حد کوئی ہمت کا ٹھکانا اعجاز ہی اعجاز ہے طفلی پہ نہ جانا
ممتاز ہے کونین ہے احمد کا گھرانا بچوں کے اشارے پہ بدل جائے زمانہ

سر دے دے کے اسلام کو اسلام کیا ہے
چھوٹوں نے بھی اس گھر کے بڑا کام کیا ہے

آگے کے بند میں شاعر شبیرؑ کی آواز استغاصہ کا بیان کیا ہے جسے سن کر حضرت علی اصغرؑ نے خود کو جھولے سے گرا دیا تھا۔ جب امام حسینؑ نے اصغرؑ کو گود میں لیکر میدان کی طرف چلے اس وقت کا بیان احسن دانا پوری نے اس انداز سے کیا ہے جو کہ جذبات نگاری کی زندہ مثال بن گئی ہے۔ یہ بند دیکھئے۔

سرورؑ نے رخِ مادر اصغرؑ پہ نظر کی دشوار مہم صبر سے تلقین سے سر کی
عازم ہوئے شہؑ راہ متعین تھی جدھر کی ماں کانپ گئی دیکھ کے منزل کو سفر کی
حسرت سے کبھی گود کبھی راہ کو دیکھا
خطِ قدمِ سرورؑ ذی جاہ کو دیکھا

جب امام حسینؑ علی اصغرؑ کو میدان میں لے جا کر دشمنوں سے سوالِ آب کرتے ہیں لیکن فوج شام اسکا کوئی جواب نہیں دیتی تو سرورؑ علی اصغرؑ سے حجت تمام کرنے کو کہتے ہیں اور یہ سنتے ہی علی اصغرؑ نے جو زبان ہونٹوں پہ پھرانا شروع کی تو اسکا جو اثر فوج پر ہوا اس کا بیان احسن فنکاری اور ہنرمندی سے کرتے ہیں۔

شہ نے کہا سنتے نہیں فریاد یہ میری پانی تو کہاں ملتی نہیں چھاؤں گھنیری
اصغرؑ میں کہوں کیا مری دنیا ہے اندھیری بچے نے یہ سنتے ہی زباں ہونٹوں پہ پھیری
خط پڑنے لگے دل پہ غم و رنج و الم کے
ماتھے پہ عرق آگئے سلطان امم کے

اصغرؑ نے پلٹ دی جو ہوا کانپ اٹھا لشکر دل سینے میں تھرانے لگے چشم ہوئی تر
تھی پیاس میں گرمی تو پگھلنے لگے پتھر اللہ رے خاموش جہادِ علی اصغرؑ
جو قلب کہ تھے سنگ انہیں موم کیا ہے
ہونٹوں پہ زباں پھیر کے زباں جیت لیا ہے

مرثیہ کے آخری کے بندوں میں شاعر علی اصغرؑ کی شہادت، اسکو خیمہ میں لانا، پھر واپس لے جا کر دفن کرنا، یہ ایسے مناظر ہیں جس کو سننے کے بعد صاحب اولاد سامعین اپنے آنسوں کو روک ہی نہیں سکتے۔ احسن دانا پوری نے مرثیہ میں نکتہ کو علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ مرثیہ میں احسن دانا پوری نے تخیل اور انداز بیان کے استعمال میں پوری ہنرمندی برتی ہے۔ مرثیہ میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور حسن تعلیل کے علاوہ محاورہ کا بھی استعمال کیا ہے۔

(۱۳) شامِ غم کے دوش پر شالِ عزا ہے چاندنی

یہ مرثیہ احسن دانا پوری کے مجموعہ ''مطلع حیات'' کا سب سے مختصر مرثیہ ہے جس میں انھوں نے صرف ستائیس

(۲۷) بند ہی شامل کئے ہیں ۔اس مرثیہ میں انھوں نے بعد جنگ کربلا اہل حرم کے لٹ جانے کے بعد کا منظر پیش کیا ہے۔ جب حسینی قافلے کے ساری بیبیاں خیمہ کے جل جانے کے بعد کھلے آسمان کے نیچے رات گزارنے پر مجبور ہیں۔شاعر نے اس وقت کی منظر نگاری اس انداز سے کی ہے کہ سارے مناظر کھلی آنکھوں سے سامنے گھومنے لگتے ہیں ۔مرثیہ میں شاعر نے چاندنی کو چہرا بنا کر پیش کیا ہے۔احسن داناپوری نے مرثیہ کا آغاز اس بند سے کیا ہے۔

شامِ غم کے دوش پر شالِ عزا ہے چاندنی   بے گھروں کے سر پہ غربت کی ردا ہے چاندنی
شمع یاد تشنہ کا ماں کی ضیا ہے چاندنی   چاند کی آنکھوں کا اشکِ بے بہا ہے چاندنی
اک صفِ ماتم بچھائے ہے بیاباں دیکھئے
خون میں ڈوبی ہوئی شامِ غریباں دیکھئے

مرثیہ میں اس جنگل کا بیان کیا ہے جہاں اہل حرم اپنے جلے ہوئے خیمہ کے شعلوں کے ساتھ بیٹھی رو رہی ہیں۔اس جنگل کے چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔وہ جوان کے ہی اپنے وارثوں کی ہیں۔وہ جو ابھی صبح تک ان کے ساتھ تھے اوراب وہ خوں میں نہائے اپنی جان شبّیر پر نثار کر چکے ہیں۔اس مرثیہ میں احسن داناپوری نے جو منظر نگاری کی ہے اس میں میر انیسؔ کی منظر نگاری کا رنگ نظر آتا ہے۔احسن کی منظر نگاری کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

تھک کے جیسے پر سمیٹے ہو فرشتہ موت کا   خوف کا ماحول ، عالم ہُو کا ، دہشت کی فضا
موت کی بستی میں کب ملتا تھا جینے کا پتا   سسکیوں میں آتی تھی رہ رہ کے رونے کی صدا
شہر خاموشاں بنی تھی کربلا خاموش تھی
تشنہ لب سوئے تھے نہرِ علقمہ خاموش تھی

ٹمٹماتے تھے کہیں دو ایک ، صحرا میں چراغ   وہ بھی جیسے جل رہے ہوں سینہ گیتی کے داغ
جھلملاتے تھے جو آنسو کانپ جاتا تھا دماغ   آشیاں اجڑے ہوئے تاراج تھا ہستی کا باغ
شامِ غم آئی تھی دل پر تیر برساتی ہوئی
چھِد رہی تھی سانس بھی سینے میں اب آتی ہوئی

شاعر نے مرثیہ میں اس وقت کا بیان کیا ہے جب شامِ غریباں کی اندھری رات میں قندیل روشن کئے جناب حُر کی زوجہ ان لوگوں کے لئے ماحضر لے کر آئی تھیں۔جن کو دیکھ کر زینبؑ اپنے آنسوں کو روک نہیں پاتی۔ جناب زینبؑ پانی کا ایک کوزہ سکینہ کو جگا کر دیتی ہیں،جسکو لے کر سکینہ رن میں جاتی ہیں،اپنے چھوٹے بھائی علی اصغر کو پانی پلانے۔ جناب زینب یہ دیکھ کر رونے لگتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اصغراب زندہ کہاں۔اس کے بعد احسن جناب زینبؑ کی زبانی کربلا کے ہر ایک شہیدوں کا مختصراً تذکرہ پیش کیا ہے اور آخر میں بین کا ایک بند تحریر کیا ہے۔مرثیہ میں استعارہ کا استعمال کیا گیا ہے۔اسلوب سادہ اور زبان صاف اور سادہ استعمال کی گئی ہے۔

(۱۴) چوم کے پاؤں کو زنجیر جدا ہوتی ہے

یہ مرثیہ اس مجموعہ کا آخری مرثیہ ہے۔جس میں احسن نے بہتر (۷۲) بند تحریر کئے ہیں۔اس مرثیہ میں انھوں نے کربلا کے بعد کا منظر بیان کیا ہے۔جس میں جناب سید سجاد کو شام کے قید خانہ سے رہا کرنے اور دفنِ شہدا کا ذکر ملتا ہے۔مرثیہ کا اغاز احسن زین العابدین کے تذکرہ سے کرتے ہیں۔اور اس وقت کا بیان کرتے ہیں جب قید خانے میں ان کے جسم سے زنجیر پاؤں سے بیڑی اور گلے سے طوق کو نکالا جاتا ہے۔یہ بند دیکھے۔

چوم کر پاؤں سے زنجیر جدا ہوتی ہے   ختم میعاد اسیرانِ بلا ہوتی ہے
مختلف کتنی سلاسل کی صدا ہوتی ہے   کبھی جھنکار کبھی بانگِ درا ہوتی ہے
آج جینے کی خبر پاتے ہیں مرنے والے
کتنی راہوں سے گذرتے ہیں گذرتے والے

اس کے بعد کے بندوں میں شاعر قیدیوں کے ماضی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس وقت کا بیان کرتا ہے جب یہ قافلہ یثرب سے چلا اور کعبہ میں قیام کیا مگر دشمنوں نے ان کو کعبہ میں رکنے نہ دیا اور گھیر کر کربلا معلا میں لائے جہاں جنگ کی اور پھر اہلِ حرم کو لوٹ کر کوفہ لائے۔کربلا سے کوفہ کے راستے میں اہل حرم کو بہت سختیاں سہنی پڑیں۔جب یہ قافلہ کربلا سے چلا تو راہ میں نہ جانے کتنی ماؤں کے بچے اُنٹوں سے گر کر شہید ہو گئے۔اس کا ذکر شاعر نے بڑے ہی غم ناک انداز میں بیان کیا ہے۔

کربلا سے جو چلے داغ ہی پاتے آئے   حلقے زنجیر مصائب کے بڑھاتے آئے
قیمتی جانیں تھیں وہ جن کو گنواتے آئے   شام تک ٹھوکریں تقدیر کی کھاتے آئے
جس طرف بھی قدم اربابِ وفا کے آئے
نئی تربت پہ نئی شمع جلاتے آئے

ہر طرف ایک نئے غم کا اضافہ دیکھا   جو بھی قسمت نے دکھایا وہ تماشا دیکھا
خاک آباد ہوئی دہر کو سوتا دیکھا   جب بڑھے ایک نئی قبر کا گوشہ دیکھا
خاک میں ملتے گئے گود میں سونے والے
بھر گئے دشت وہ آباد نہ ہونے والے

آگے کے بندوں میں شاعر اہلِ حرم پر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک گزرنے والے واقعات اور مظالم کا بیان کرتا ہے۔اس کے بعد ایک بار پھر قید خانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب زین العابدین کو دوبارہ دربار میں حاضر ہونے کا پیغام ملا تو ان کی پھوپھی زینبؑ بے چین ہو جاتی ہیں اور ان کی نظروں میں دربار کا وہ منظر گھوم جاتا ہے جب بھرے اور سجے دربار میں آلِ رسولؐ کو ننگے سر بلوایا گیا تھا۔اس کے بعد شاعر اس وقت کا بیان کرتا ہے جب زین العابدینؑ دربار میں پہنچتے ہیں تو ان کو دربار کا ماحول ہی بدلہ ہوا نظر آتا ہے۔نہ ہی دربار پہلے کی طرح سجا ہوا تھا اور نہ ہی

وہاں وہ کرسی نشیں تھے۔ یزید ندامت بھرے انداز میں بیٹھا تھا، اور سیدِ سجاؑد کو دیکھتے ہی وہ اپنے تخت سے کھڑا ہو گیا اور ان کو اپنے ہی ساتھ بیٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ یزید کی ندامت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ احسن عوام کو برائی پر سچائی کی فتح کا پیغام بھی دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ بند دیکھئے۔

کمتری داغِ حسد بن کیا بھر آتی ہے   ظلم پر طنیتِ انساں کو پھراُکساتی ہے
آگ تھوڑی سی ہواپا تے ہی لہراتی ہے   بزدلی ساتھ ہی پھر قلب میں جا پاتی ہے
شہؑ کا سراب تو شقی دیکھ کے گھبراتا تھا
گیسوئے پاک جو ہلتے تھے لرزجاتا تھا

احسن مرثیہ میں اہل حرم کی رہائی کا بیان کرتے ہوئے اس وقت کا بیان کرتے ہیں جب سیدانیوں کو ان کا لوٹا ہوا اسباب واپس ملتا ہے جسے دیکھ کر ایک کہرام سا مچ جاتا ہے۔ احسن نے یہاں جذبات نگاری کا استعمال بہت عمدگی سے کیا ہے۔ یہاں پر انھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے تلمیح اور استعارہ کا استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد شہیدوں کے سر ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ یزید سارے شہیدوں کا سر تو لوٹا دیتا ہے لیکن سرِ حسینؑ کو دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور بدلے میں اس سر کے خوں بہا دینا چاہتا ہے جس کے جواب میں حضرت زینبؑ نے یہ خطبہ پیش کیا۔ ملاحظہ ہو۔

خونِ سرورؑ کی بہا کون سی دولت ہوگی   کیا حکومت بدلِ رنگِ شہادت ہوگی
کون سی شئے ہے جو اس خون کی قیمت ہوگی   شانِ باطل کہیں ہم وزنِ حقیقت ہوگی
داور حشر کا جب فیصلہ جاری ہوگا
پلّا اس خون کا کونین پہ بھاری ہوگا

تنِ بے سر سے جدا ہو کے تو آ سکتے ہیں   سرِ بے تن کو بھلا چھوڑ کے جا سکتے ہیں
داداک ایک ستم کی یہیں پا سکتے ہیں   کربلا دوسری اس جا بھی بنا سکتے ہیں
مسلکِ جبر سے گذرے ہیں وہی طور سہی
ہیں جہاں اتنے سراتنے یہ وہاں اور سہی

اس خطبہ کو سننے کے بعد یزید پریشان ہو گیا اور اس نے امام حسینؑ کے سر کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔ آگے کے بندوں میں احسن ہندہ کا ذکر کرتے ہیں جو کہ یزید کی بیوی ہے اور حضرت امام حسینؑ کی شیدہ ہے۔ ہندہ ہی وہ عورت ہے جس نے اہلِ حرم کو قید خانہ سے رہائی دلوائی ہے۔ احسن نے یہاں حضرت زینبؑ اور ہندہ کی جو گفتگو پیش کی ہے وہ جذبات نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ پھر سارے شہیدوں کو مدفن کرنے کے مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ احسن کے مرثیوں میں قدیم رنگ کے ساتھ ساتھ فصاحت اور بلاغت بھی نظر آتی ہے۔ لیکن ان کے کسی کسی مرثیوں میں اس کے تمام اجزاء ندارت ہیں تو کسی کسی میں وہ باقائدگی کے ساتھ سارے اجزاء کو برتا گیا ہے۔

☆ احسن رضوی داناپوری کی مرثیہ نگاری :

احسن رضوی داناپوری نے آج علمی وادبی دنیا میں اپنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔انھوں نے بے شمار غزلیں، قصائداور نوحے وسلام تحریر کئے اور بدقسمتی سے آج سب ضائع ہو چکے ہیں۔ان کے مراثی کا مجموعہ دستیاب ہوا ہے۔جس میں ان کے چودہ (۱۴) مرثیے شامل ہیں۔یہ مرثیہ قدیم طرز کے معلوم ہوتے ہیں لیکن اس میں جدید رنگ میں نظر آتا ہے۔مرثیے کے مطالعہ سے ان کی ذہانت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔انھوں نے اپنے آخری دور میں مرثیہ کی تخلیق کی تھی۔اور اس دور میں وہ اپنے فن میں پختہ ہو چکے تھے اوراس کے سبب ان کے مرثیہ میں وہ تمام تر خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے مرثیہ میں ہونی چاہئے۔انھونے مرثیہ میں فصاحت وبلاغت کے ساتھ ساتھ صنائع وبدائع کا بھی بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ محاورہ کا استعمال بھی ان کے مرثیہ میں بہت عمدگی سے کیا گیا ہے۔ان کے مرثیہ کی ایک اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے قدیم مرثیہ نگاروں کی طرح اپنے مرثیوں میں عنوان کا استعمال نہیں کیا ہے لیکن مرثیہ میں جو اسلوب اور موضوعات کا استعمال کیا ہے، وہ جدیدیت سے قریب ہیں۔

موضوع۔احسن داناپوری نے اپنے تمام مرثیوں میں مختلف موضوعات کا استعمال کیا ہے۔کسی میں انھوں نے زندگی اوران کے مسائل کو موضوع بنایا ہے تو کہیں وہ مرثیہ میں انقلاب کو جگہ دیتے ہیں۔کسی مرثیے میں عمراور حیات کی بات کرتے ہیں تو کہیں عورت کو ہی موضوع بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے کچھ ایسے بھی مرثیے تحریر کئے ہیں جس میں بلا کسی موضوع سیدھے مصائب کا بیان ہے۔ان کا یہ مرثیہ ملاحظہ ہو جب میں وہ زندگی کو موضوع بنا کر درس دیتے نظر آتے ہیں۔

زندگی راز بھی ہے پردہ در راز بھی ہے — یہ مشیت کی کرامت بھی ہے اعجاز بھی ہے
ساز کا سوز بھی ہے گرمیٔ آواز بھی ہے — نازِ انجام بھی ہے زخمۂ آغاز بھی ہے
نقش بہتر جو بنیں رنگِ بقا بھرتی ہے
لوح تخلیق کی یہ خانہ پُری کرتی ہے

زندگی ہی سے ہے سب نقش و نگارگیتی — رونقِ صورتِ گل، رنگ بہار گیتی
نغمہ پیرا اسی زخمے سے ہے تارے گیتی — وح عالم ہے کہ یہ وجہِ قرار گیتی
زندگی گر نہ رہے کوئی بھی عالم نہ رہے
خندۂ گل نہ رہے گریۂ شبنم نہ رہے

اس کے علاوہ احسن داناپوری نے قدیم طرز کے موضوعات کا انتخاب بھی اپنے مرثیوں کے لئے کیا ہے۔جس میں کربلا، نقطہ اور حضرت محمدؐ کے نور کو بھی موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔

اسلوب۔ہر شاعر کا اسلوب منفرد ہوتا ہے۔اور وہی اس کی شناخت ہوتی ہے۔اسلوب سے شاعر کا معیار معین

کیا جاتا ہے۔احسن دانا پوری نے مرثیے میں بیانیہ اسلوب کا استعمال بھی کیا ہے اورڈرامائی انداز کا بھی۔ان کے مرثیے میں ربط وتسلسل کہیں بھی ٹوٹتا نظرنہیں آتا۔کلام میں انھوں نے نہایت ہی غم انگیز حالات کونہایت ہی سادہ مگر پراثر انداز میں بیان کیا ہے۔ان کی زبان بھی عام فہم زبان ہے۔مرثیے میں محاورہ،کنایہ اور صنائع وبدائع کا استعمال بھی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔اس کے علاوہ احسن کا تخیل اوران کا انداز بیان بہت ہی عمدہ ہے۔وہ اشاروں ہی اشاروں بہت ہی گہری بات کہہ جاتے ہیں جودل کوچھو جاتی ہے۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

دل وسعت بساط مصائب سے تنگ ہے　　آیئنہ ٹوٹتی ہوئی بجلی سے دنگ ہے
اشکوں میں آج خونِ تمنّا کا رنگ ہے　　جوہر بتا رہا ہیکہ شیشے میں زنگ ہے
پھیکا ہے رنگ جلوہ گہ اعتبار کا
زیور اُتر رہا ہے عروسِ بہار کا

بے کیف ہے فضائے گلستان زندگی　　بے رنگ رونقِ رخ امکان زندگی
بے قاعدہ ہیں سب سروسامان زندگی　　بے سوز سازِ نغمۂ احسان زندگی
چہرہ بجھا ہوا ہے عروس حیات کا
نور اُڑ گیا تمام رخِ کائنات کا

تلوار کی تعریف۔ احسن دانا پوری نے مرثیے قدیم طرز پرتحریر کئے ہیں جس کی وجہ سے ان کے مرثئے میں پورے اجزاء بڑی ہنرمندی سے پیش کئے گئے ہیں۔تلوار کی تعریف انھوں نے تقریباً سب ہی مرثیوں میں کی ہے اور بہت ہےخوبصورت انداز سے کی ہے۔

خود ذوالفقار چوم کے پنجہ اُدھر گئی　　جس سمت رن میں ہادیٔ دیں کی نظر گئی
نصرت رہی جو ساتھ تو آگے ظفر گئی　　کیا جانئے ہوا جو چلی تھی کدھر گئی
امداد شہ سے طالعِ دیں ارجمند تھا
تلوار خم تھی فتح کا پرچم بلند تھا

واقعہ نگاری۔ مرثیہ میں واقعہ نگاری سے مراد کوئی ایسے واقعہ سے ہوتا ہے، جو تاریخی ہو۔مثلاً حضرت موسیٰؑ کا واقعہ،فرعون کا واقعہ۔یہ ایسے واقعات ہیں جن کا تذکرہ شاعرتمہید میں یاکسی اورجگہ پر بیان کرتا ہے۔جس سے قاری اور سامعین کودرس ملے۔احسن دانا پوری نے بھی اپنے کئی مرثیوں میں واقعہ نگاری کا استعمال کیا ہے۔ایک مرثیہ میں وہ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کوتمہید بنا کرپیش کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

اے چشمِ شوق جلوۂ حق سے نقاب اٹھا　　پردے یہ دیکھنے کے ہیں رسمِ حجاب اٹھا
سُرمہ بنا کے خاکِ درِبو تراب اٹھا　　ضو سامنے ہے بس نگہ کامیاب اٹھا

صورت ہے صاف آنکھوں میں نزدیک ودور کی
ہر پردۂ نگاہ میں پتلی ہے نور کی
پیچھے دھواں سا ہے شعلہ ہے سامنے پردہ چمک رہا ہے کہ جلوہ ہے سامنے
ضو کہہ رہی ہے عین نظارہ ہے سامنے آنکھیں ہوں بند تو بھی اجالا ہے سامنے
اس خاک کو غضب کا علاقہ ہے نور سے
سُرمہ بنی ہے چمکی ہے جب برق طور سے

جذبات نگاری۔ جذبات مرثیہ کے کردار مثلاً حضرت علیؑ، امام حسینؑ، حضرت عباسؑ، حضرت علی اکبرؑ، حضرت زینبؑ، حضرت عون ومحمد غرض تمام مرد وخواتین کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرنا یا آئینہ داری کرنا جذبات نگاری کہلاتا ہے۔ شاعر کے قلم میں وہ قوت ہوتی ہے جوان کرداروں کی خوشی، غم، نفرت، جوش اور محبت کو الفاظ کے ذریعہ ایسے موثر انداز سے بیان کرتا ہے کہ ان کے دکھ درد کو پڑھ کر قاری کے دل میں بھی وہی جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔ انسان اس کے لئے ہمدردی محسوس کرنے لگتا ہے۔ احسن داناپوری نے بھی مرثیہ میں جذبات نگاری کو حقیقت مندانہ اندز میں تحریر کئے ہیں۔ جس کو سن نے کے بعد سامعین کی آنکھوں میں خود بہ خود آنسوں آجاتے ہیں۔ ایک مرثیہ میں انھوں نے اس وقت کا منظر بیان کیا ہے جب جناب اکبرؑ اپنے والد حضرت امام حسینؑ کے پاس پانی کا سوال کرنے آتے ہیں اور جواب میں امام حسینؑ ان کی زبان اپنے منھ میں رکھ دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اکبرؑ تڑپ کے ہٹ گئے اتنا فقط کہا کانٹے زباں پہ آپ کی مجھ سے بھی ہیں سوا
پھر آکے رن میں کشتہ کئے کتنے اشقیا کھا کر سنا کلیجے پہ مولا کو دی صدا
برچھی جگر سے کھینچ کے شہ تلملا گئے
لاش اس طرح اٹھائی کہ خوں میں نہا گئے

احسن داناپوری ایک ایسی شخصیت ہیں جس نے جدید دور میں رہتے ہوئے قدیم دور کی روایت کو مرثیے میں زندہ رکھا۔ انھوں نے جدید دور کے رجحانات کو قبول کرنے اور اسی طرز پہ مرثیہ نگاری کرنے کے بجائے قدیم طرز کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ ان کے تمام مرثیے کے مطالعہ کے بعد یہ بات صاف طور سے واضح ہو جاتی ہے کہ احسن داناپوری کا تخیل اوران کا انداز بیان نرالا اور دوسروں سے منفرد تھا۔ اور یہی خوبی ان کو دوسروں سے امتیاز بخشتی ہے۔

(۲) وحید اختر :

وحید اختر ذہین وفطین شخصیت کے مالک تھے۔ اردو ادب میں ان کا شمار صرف غزل گو اور نظم گو شاعر کی حیثیت سے نہیں ہوتا ہے بلکہ انھوں نے اپنی پہچان مرثیہ گو شاعر اور مرثیہ کے نقاد کی بھی بنائی ہے۔ ان کا پورا نام سید وحید اختر نقوی اور تخلص وحید اختؔر کرتے تھے۔ 'کوثر مظہری' نے اپنی کتاب ''وحید اختر'' میں ان کی پیدائش ۱۲/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو مومن پورہ،

اورنگ آباد مہاراشٹر تحریر کی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر ریاض الہاشم نے اپنی کتاب ''اودھ میں اردو مرثیہ'' میں ان کی جائے پیدائش حیدرآباد بتاتے ہیں۔ ان کا آبائی وطن نصیرآباد، جائس (یوپی) تھا۔ ان کے والد کا نام سید نذر عباس نقوی تھا۔ وحید اختر کا بچپن، لڑکپن اور جوانی تینوں سخت دشواریوں سے گزرے۔ وحید اختر کے علاوہ ان کے پانچ بھائی اور ایک بہن تھی۔ اس طرح چھوٹی سی رقم پر آٹھ افراد کی زندگی موقوف تھی۔ اس دور آزمائش میں انہیں اپنے پرائے کی حقیقت کو سمجھنے کا موقع بھی ملا اور غیروں کی محبت اور اپنوں کی بے مروتی سے سابقہ بھی پڑا، جس کا ذکر انھوں نے کئی جگہوں پہ کیا ہے۔

وحید اختر ۱۹۵۲ء میں بی اے کی تعلیم کی غرض سے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اس وقت ان کی والدہ بستر مرگ پہ تھیں۔ ان کی حیدرآباد پہنچنے سے پہلے ہی ان کی ماں کے انتقال کی خبر پہنچ چکی تھی۔ اس واقعہ کے کچھ ہی مہینوں کے بعد والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ حیدرآباد میں اپنی بے سروسامانی کا ذکر وہ بہت ہی دل سوز انداز میں پیش کرتے ہیں۔

''دور دور تک کوئی شجر سایہ دار مسافر نوازی کے لئے نہ تھا۔ چاروں طرف زندگی کا تپتا اور آگ برستا ہوا صحرا تھا۔ حیدرآباد کی متنوع، رنگا رنگ اور چمکتی دمکتی زندگی کے ہجوم میں اپنی بے سروسامانی اور تنہائی کا شدید احساس ہی میرا شریک تھا۔ اس احساس تنہائی کو میں نے تعلیم اور شاعری میں گم کر دیا۔'' [۳]

حیدرآباد کی ادبی فضا میں انھوں نے تقریباً آٹھ سال گزارے۔ چونکہ وہ بہت ذہین اور اسکالرشپ سے معمور شخصیت کے حامل تھے اس لئے جلد ہی انھیں کامیابی ملی اور یہ حیدرآباد کے حلقہ ادب میں شامل ہو گئے۔ جہاں انھیں شاذ تمکنت، سلیمان اریب، عالم خوندمیر، حسن عسکری، مجتبیٰ حسین اور مغنی تبسم وغیرہ جیسے احباب ملے۔ ۱۹۶۰ء میں خواجہ میر درد جیسے اہم موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جنرل ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں عارضی ریڈر پر تقرر ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں فلسفہ میں ریڈر، ۱۹۸۰ء میں پروفیسر اور ۱۹۹۰ء میں ڈین فیکلٹی آف آرٹ مقرر ہوئے۔

وحید اختر کی ازدواجی زندگی خوش گوار گزری۔ ان کی شادی ایک ایرانی خاتون مہ لقا سے ۱۹۶۲ء میں ہوئی تھی۔ ان کے تین بیٹے بھی تھے جن کا نام حسن، حسین اور محسن تھا۔ وحید اپنی بیوی اور بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنی ایک طویل نظم 'رات: چہرہ در چہرہ' کہی جو 'شب کا رزمیہ' میں شامل ہے۔ وحید اختر ۱۳ دسمبر ۱۹۹۶ء کو آغوش اجل میں چلے گئے۔

جہاں تک شعری ادب کا تعلق ہے، انھوں نے نظم، غزل، مرثیہ اور تنقید میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے نظموں کے کئی مجموعے ملتے ہیں۔ جن میں 'پتھروں کا مغنی'، 'شب کا رزمیہ'، 'زنجیر کا نغمہ' اور 'یاد' وغیرہ کے نام خاص ہیں۔ 'پتھروں کا مغنی' ان کا پہلا نظموں کا مجموعہ ہے۔ جسکو انھوں نے ۱۹۶۶ء میں تحریر کیا۔ جس میں ۱۹۵۳ء کے بعد کا کلام ہے۔ اس نظم میں پتھروں کو زندہ اور متحرک کردار بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اور ان کرداروں کے درمیان نظم کا راوی 'میں' خود ہی مطربِ خوش نوا ہے جو اپنے اور دوسروں کے غموں کو نغموں میں ڈھالتا ہے۔ نظم کے آخری حصے تک نظم واحد غائب کے

سہارے بڑھتی ہے۔لیکن آخری چار مصرعوں سے پہلے اس مصرعے پر پہنچ کر کہ ''پتھروں کی اسی انجمن کا مغنی ہوں میں'' واحد غائب متکلم میں مدغم ہوجاتا ہے۔ یہ فکر کی سیّالیت ہے جس کے سبب وحید اختر کی اس نظم میں صیغہ اپنے افکار کے ساتھ دوسرے صیغے میں ڈھل گیا ہے۔

وحید اختر نے اپنے غزل میں یاد، آئینہ، خواب، عشق، تنہائی اور ذات کو اپنے غزل کا موضوع بنایا ہے۔ان کی غزلوں کے اشعار میں غنائیت ہوتی ہے۔وحید اختر کی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام تر مجرد اور غیر مجرد تجربات انسانی کو تحقیقی حسّیت سے ہم آمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اور اس نوع کی مثالیں ان کی غزلوں میں بھری پڑی ہے۔اس کے علاوہ وحید اختر نے اپنی غزلوں میں کلاسکی رچاؤ کے ساتھ اپنے زمانے کے کرب کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔عصری حالات پر بھی ان کی نظر تھی۔ایک زندہ اسلوب میں زندہ اور توانا رامنی اور مادرائی موضوعات زندگی کو وحید اختر نے پیش کیا ہے۔وہ نظم کے ایک صاحب اسلوب شاعر تو ہیں ہی، ان کی غزلیں بھی اردو شعر و ادب کا قیمتی اثاثہ ہے۔ان کے دو شعر ملاحظہ ہو۔

بہت آہستگی سے پاؤں دھرنا وادیِ دل میں

کہیں دشتِ غزالاں ہے، کہیں شہر نگاراں ہے

ان کو روز اک تازہ حیلہ، ایک خنجر چاہیے

ہم کو روز اک جاں نئی اور اک نیا سر چاہیے

یوں مرثیہ نگاری میں انیسؔ اور دبیرؔ کا جو مقام ہے، وہ آج تک کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔مرثیہ ایک ایسا شعری بیانیہ ہے جس کو پوری طرح کامیابی کے ساتھ برتنا ہر شاعر کے بس میں نہیں ہوتا ہے۔مرزا محمد رفیع سوداؔ نے مرثیہ نگاری کو مشکل ترین صنف بتایا ہے۔اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر شاعر کا اپنا الگ شعری مزاج ہوتا ہے۔میر تقی میرؔ بہت بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ مرثیے بھی کہے مگر انکو غزل میں عظمت حاصل ہوئی۔سوداؔ نے بھی مرثیے کہے لیکن ان کو شہرت قصیدہ نے دلوائی۔اسی طرح غالبؔ پر شعری مزاج رکھنے کے باوجود مرثیہ اور مثنوی میں کوئی بڑا کارنامہ نہیں پیش کر سکے۔انیسؔ اور دبیرؔ تمام تر تخلیقی ادراک اور فنی رموز سے واقفیت کے باوجود غزل نگاری میں کوئی خاص نام نہیں پیدا کر سکے۔

وحید اختر کی تربیت مرثیہ خوانی اور مرثیہ نگاری کے ادارے میں ہوئی تھی۔اس لئے فطری طور پر اس صنف سخن سے ان کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔وحید اختر نے دس سال کی عمر سے ہی سلام اور نوحے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔لیکن مرثیہ نگاری لکھنے میں انھوں نے تھوڑی تاخیر کی ہے۔انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ چھبیس سال کی عمر میں لکھا، جسکی تصدیق وہ اپنی کتاب 'کربلا تا کربلا' میں کچھ یوں کرتے ہیں۔

''۶۱ء کے عشرۂ محرم میں اپنے آبائی وطن نصیر آباد (جائس) ضلع رائے بریلی گیا۔وہاں ایک عزیز محترم فخرِ قوم سید کلب عباس نے ایک روز چیلینج کر دیا کہ اب کوئی مرثیہ کیا لکھے گا مائیؔ صاحب تک نہ لکھ سکے۔کلب عباس صاحب میرے پھوپھا ہوتے تھے۔ اور مائیؔ جائسی سے بھی یہی رشتہ تھا۔دونوں میرے والد سے بھی عمر میں بہت بڑے

تھے۔جواب دینے کی جرائت ،ترقی پسندی وجدیدیت کے باوجود پیدا نہ ہوئی۔دن
بھرسوچتا رہا کہ یہ بات غلط ہے،رات بھر بیٹھ کر مرثیہ لکھا،'برسی نہیں نغموں کی گھٹائیں
کئی دن سے'۔حضرت علی اصغر کے حال میں۔مقصد جولانیٔ کا ثبوت دینے کے ساتھ
یہ بھی تھا کہ کسی بھی صنف کے لئے یہ سمجھنا کہ کسی شاعر یا شعرا کے ایک خانوادے پر
اس کا خاتمہ ہوگا،غلط ہے۔''[۹]

اس طرح انھوں نے مرثیہ نگاری کی صنف میں اپنا قدم رکھا اور ایک کے بعد ایک ۱۶ مرثیے لکھے۔۱۹۹۰ء میں مرثیوں کا مجموعہ''کربلا تا کربلا'' شائع ہوا۔ان مجموعہ میں ان کے صرف آٹھ مرثیہ شامل ہیں۔جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱)۔ چادرِ تطہیر۔ مریم سے بھی سوا ہے فضیلت بتولؑ کی (درحال سیدۃ نسا العامین حضرت فاطمہ زہراؑ)
۲)۔ قلعۂ کشا۔ قلعۂ تعمیر کیے دستِ ہوس کاری نے (درحال مولائے کائنات اسداللہ الغالب علیؑ ابن ابی طالب)
۳)۔ شہیدِ عطش۔ برسی نہیں نغموں کی گھٹائیں کئی دن سے (درحالِ علی اصغرؑ)
۴)۔ علمدارِ امن ۔ اے ساقیِ حیات ومسیحائے کاینات (درحال ابوالفضل العباسؑ)
۵)۔ سالارِ قافلۂ شوق۔ ہے قافلۂ جرأت رفتار سفر میں (درحال سیدالشہد احسین ابنِ علیؑ)
۶)۔ تیغ زبانِ زینبؑ۔ رات یہ حق کے چراغوں پہ بہت بھاری ہے(درحال ثانی زہراؑ زینبؑ کبریٰ بنتِ علی)
۷)۔ شہادت نطق۔ یارب! مری زبان کو جرأت بیاں کی دے (درحال شبیہہ پیمبرؐ علی اکبر ابن الحسینؑ)
۸)۔ کربلا!اے کربلا۔ کربلا!اے کربلا!اے کربلا!اے کربلا! (درحال مظلومان شہادت)

جب کہ خود بقول وحید اختر ان کے مرثیے کی کل تعداد ۱۳ ہے۔لیکن ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی نے''اردو مرثیہ انیس کے بعد میں''میں لکھا ہے کہ انھوں نے تقریباً ۱۶ مرثیے کہے ہیں۔جو'کربلا تا کربلا' میں شامل نہیں ہیں۔ان کے مطلعے اس طرح ہیں۔

۱)۔ پھر اے قلم قدرت اظہار رواں ہو (مدینے سے سفر اور واپسی)
۲)۔ باعثِ خلقت کل عالمیان ہیں احمد (حضرت مسلم بن عقیل کے حال پر)
۳)۔ شبِ شہادت اہل نجات ہیں بیدار (حضرت قاسمؑ کے حال میں)
۴)۔ صحبتیں تھامتی ہیں دامنِ بیمار کہاں (امام زین العابدینؑ کے حال میں)(حصہ اول)
۵)۔ صحبتیں تھامتی ہیں دامنِ بیمار کہاں (امام زین العابدینؑ کے حال میں)(حصہ دوم)
۶)۔ بند ہے قفل در ساقیِ صہبائے ولا (روز عاشورہ شہادت امام حسینؑ)
۷)۔ لے کر علم شعاعوں کے جب آفتاب اٹھا (حضرت عباسؑ کے حال میں)
۸)۔ کس قیامت کی گھڑی بعد شہیداں آئی (بحوالہ ہلال نقوی)

اس طرح وحید اختر کے مرثیے کی تعداد ۱۶ تک پہنچتی ہے۔لیکن مجھے ان کے صرف وہی ۸ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جو کہ کربلا تا کربلا میں شامل ہیں۔

چادر تطہیر۔ یہ کربلا تا کربلا میں شامل کیا ہوا پہلا مرثیہ ہے جو درحال جناب فاطمہؑ کا ہے۔ یہ مرثیہ ۱۶۸ بندوں میں مشتمل ہے۔اس مرثیہ میں ''چادر'' کو عصمت اور عفت کا استعارہ بنایا گیا ہے وحید اختر نے اس مرثیہ میں وضاحت کی ہے کہ آیۂ تطہیر کی شان نزول حدیث کساء میں بیان کی گئی ہے ،جس کے مطابق رسولؐ نے بیٹی کے گھر تشریف فرما ہو کر آپ کی چادر اُڑھی تو اس میں صرف فاطمہ،علیؑ ،اور حسن وحسینؑ کو جگہ ملی ،اور جبریل ان پانچ نفوس قدسیہ کے لئے ہر رجس سے پاک ہونے کی نوید لائے ۔اس کے علاوہ وحید اختر اس بات کا بھی بیان کرتے ہیں کہ اقبال نے جناب سیدہ کے نسبتوں کی بنا پر حضرت مریمؑ سے افضل مانا ہے۔رسولؐ اسلام ،حضرت علیؑ اور حسنین سے جنہیں صرف حضرت عیسیٰؑ کی ماں ہونے کا شرف حاصل تھا۔

مرثیہ کا آغاز وحید اختر جناب فاطمہ زہراؑ کی عظمت کے بیان سے کرتے ہیں۔کہ وہ بتولؑ کہ جن کے بابا رسولؐ ہوں ،جن کے شوہر علیؑ ہوں ،جن کے بچے حسنؑ اور حسینؑ ہوں ،جن کی بیٹیاں زینبؑ وکلثومؑ ہوں ،وہ بتولؑ کہ جس کی ثنا کے لیے خود آیۂ تطہیر آئی ہو۔وہ فاطمہ زہراؑ کہ جن کی تسلیم کے لیے جبریل آتے تھے ،جن کی تعظیم کے لئے خود رسولؐ کھڑے ہو جاتے تھے۔اس فاطمہ زہراؑ کی چادر کا مرتبہ اتنا ہے کہ اگر اس چادر کو دھو کر نچوڑ دیں تو اس پانی سے فرشتے وضو کر لیں۔یہاں وحید چادر فاطمہ کے ذریعہ قربانئے آل محمد اور ان کی عملی زندگی کا ذکر کرتے ہیں۔

چادر یہ بوتراب کی عظمت کی ہے گواہ — شاہ نجف کے فقر و دیانت کی ہے گواہ
فاقوں کی لاج محنت وعظمت کی ہے گواہ — یہ چکّی پیسنے کی ریاضت کی ہے گواہ
خیبر شکن کی بے زرہی کی زرہ ہے یہ
عقدہ کشا کے رشتۂ حق کی گرہ ہے یہ

ہے یہ جہیز قرۃُ العین شہِ رسل — شاخِ نہال مالِ خدیجہؑ کا برگ گل
چادر ہے یا کہ لخت دل فخر جز د وکل — ہے بادبانِ کشتیٔ امت اِرم کا پل
قرطاسِ صلح حضرت شبّر ہے یہ ردا
شبیر کے شہیدوں کا محضر ہے یہ ردا

عاشور کی شعاعوں کی چادر یہی ردا — تا عصر تھی شہیدوں کے سر پر یہی ردا
تھی نعش پوش قاسمؑ و اکبر یہی ردا — آئے تھے رن میں اوڑھ کے اصغرؑ یہی ردا
اک پل جدا ہوئی نہ تنِ پاش پاش سے
لپٹی رہی حسینؑ کی پامال لاش سے

اس کے بعد وحید اختر فاطمہ زہراؑ کی چکّی کا بیان کرتے ہوئے اس کی عظمت بیان کرتے ہیں۔انھوں نے چکّی کو تقدس اور محنت کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔چکّی جسے جناب فاطمہؑ خود پیستی تھیں،حالانکہ جناب فضّہ خادمہ کے طور پر موجود تھیں مگر ایک روز فضّہ امور خانہ داری انجام دیتی تھیں تو دوسرے روز جناب سیدہؑ۔عملی زندگی کا اس سے بہتر نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس کے صدقے میں کائنات خلق کی گئی ہو وہیں کنیز کے ساتھ کنیز برابری سے کام کرتی ہیں۔اس مساوات کے حوالے سے یہ بند ملاحظہ ہو۔

گھر میں نہ ہونے دی کبھی تفریق خاص و عام خود ایک روز کرتی تھیں ،اک دن کنیز کام
آرام ایک دن نہ لیا صبح تا بہ شام دعوت کو اہل زر کی سمجھتی رہی حرام
مسند نشین صبر کا تکیہ خدا پہ ہے
عزلت گزین فقر کا بستر رضا پہ ہے

چکّی کے حوالے سے وحید اختر کتاب ''کربلا تا کربلا'' میں لکھتے ہیں۔

''مرثیے میں دوسری علامت ''چکّی'' ہے۔یہ خاندان رسالت کی زنانِ باشرف کو دنیا کے محنت کش عوام سے جوڑتی اور ان کا رہبر، ملجا و ماویٰ بناتی ہے۔انیسؔ سے مرثیے کی جو روایت چلی اس میں ان دونوں علامتوں کی معنویت کو اس طرح اجاگر نہیں کیا گیا، جو ان کا حق تھا۔''[5]

چکّی کی عظمت بیان کرنے کے بعد وحید ایک بار پھر سیدہؑ کے وقار کی تعریف کرتے ہیں۔اس کے بعد وہ ایک روایت بیان کرتے ہیں،جس میں ایک یہودی کی لڑکی کی شادی میں جناب فاطمہ اس کے گھر پیوند دار چادر اُڑھ کر تشریف لے جاتی ہیں۔اوران کے نور کی تاب نہ لا کر ساری عورتیں بیہوش ہو جاتی ہیں۔بعد میں سبھی عورتوں کو ہوش آجاتا ہے۔لیکن دلہن کو ہوش نہیں آتا۔جناب سیدہؑ مصلیٰ بچھا کر خدا سے دعا کرتی ہیں اور وہ دلہن زندہ ہو جاتی ہے۔اور گھر میں جتنے بھی افراد موجود تھے سب مع دلہن ایمان لاتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں۔اسلام قبول کرنے کے بعد اس دلہن کا نام امّ حبیبہ رکھا جاتا ہے۔اس کا بیان وحید اختر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

یہ مسکرائیں ، پڑگئی مردہ بدن میں جاں دل دھڑکا،سانس آئی ،ہوئی نبض پھر رواں
کروٹ بدل کے خواب سے چونکی عروس یاں تسلیم فاطمہؑ کو جھکی زندگی وہاں
اب دیکھا روئے پاک تو کلمہ زباں پہ تھا
جہاں تھا کفر، اب ایماں وہاں پہ تھا
پروانہ وار اٹھ کے ہوئی شمع پر نثار عصمت کا کلمہ پڑھ کے ہوئی حق کی حلقہ دار
چادر ہے فاطمہؑ کی کہ ایمان کا حصار نظریں بھی اس سے مس ہوں تو ملتا ہے اعتبار

اُمّ حبیبہ ہوگئی مشہور شہر میں
پایا شرف کنیزیِ زہراؑ کا دہر میں

یہ وہی امّ حبیبہ ہے کہ جب کربلا سے اسیروں کا قافلہ کوفہ کے بازار سے گزرتا ہے، اور اس کو خبر ملتی ہے کہ قافلہ اہلبیت آ رہا ہے تو وہ تیاریوں میں مصروف ہو جاتی ہے کہ حسینؑ اور ان کے حرم کا استقبال کرے گی، مگر جب وہ اہلبیت کو اسیری کے عالم میں دیکھتی ہے تو تڑپ جاتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد وحید رسولؐ اکرم کی وفات کے بعد جناب سیدہ کے بین کا بیان کرتے ہیں۔ یہاں وحید اختر نے جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ باپ کے غم میں بیٹی کا رونا اور اس پر ہمسائیوں کا یہ کہنا کہ نہ رویا کریں کس حد درجہ تکلیف دہ ہوتا ہے اس کا اندازہ مرثیہ کے اس بین سے لگایا جا سکتا ہے۔

دن بھر جناب فاطمہؑ جاں اپنی کھوتی ہیں — باغ بقیع میں دُرِ غم جا کے بوتی ہیں
راتوں کو خود کو روک کے گھٹ گھٹ کے روتی ہیں — پر آس پاس نیندیں پریشان ہوتی ہیں
کہتے ہیں امتی کہ نبیؐ کو نہ روئیے
اے شاہزادی اتنا کسی کو نہ روئیے

ہم سایگاں کے شکوے پہ زہراؑ نے یہ کہا — کہہ دیجئے اہل شہر سے اے شاہِ لافتا
اک دو دن اور امتی سن لیں مری بکا — رو رو کے پھر نہ لے گا کوئی نامِ مصطفاؐ
بابا سے چھٹ کے ڈھائی مہینے گزر گئے
سینے میں دم الٹتا ہے، ہم کیوں نہ مر گئے

اس کے بعد وحید جناب فاطمہؑ کے قبل وفات کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر وحید بتولؑ کے آخری ایام کا واقعہ بیان کرتے ہیں، جس میں فاطمہؑ اپنے شوہر حضرت علیؑ سے وصیت کرتی ہیں کہ وہ ان کو خود غسل و کفن دیں جنازہ رات کی تاریکی میں اٹھائے۔ دفن بھی خود ہی کریں۔ اس کے بعد حسنین کے دل خراش بین پیش کرتے ہیں جس سے قاری کی آنکھوں میں آنسو خود بہ خود آ جاتا ہے۔ اس کے بعد وحید امام حسنؑ کی شہادت اور ان کے کلیجے کے ٹکڑے کے گرنے کو بیان کرتے ہوئے امام حسینؑ کی مدینہ سے رخصت کو بیان کرتے ہیں۔ پھر ان کی شہادت اور اہل حرم کے لٹنے کو بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس قافلہ کا کوفہ کے بازار میں گزرنے اور تماشائیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد وحید امّ حبیبہ کا اہل حرم کے قافلے کو دیکھنے اور جناب زینبؑ سے حالات دریافت کرنے کا بیان کرتے ہیں۔ اس مساوات کے حوالے سے یہ بند ملاحظہ ہو۔

امّ حبیبہ بولی یہ کیا انقلاب ہے؟ — کوفے میں ننگے پاؤں بنِ بوتراب ہے
زنجیر میں وصیٔ رسالت مآبؐ ہے — سچ کہتے ہیں کہ دہر میں سراسر سراب ہے
محتاج قبر لاشۂ سلطان دیں رہے

ملک ِ خدا یزید کے زیر نگیں رہے

زینبؑ یہ بولیں رونے کو ایک عمر ہے پڑی ہے مختصر بہت یہ ملاقات کی گھڑی
آگے کی منزیں ہیں ابھی اور بھی کڑی حسرت کی پھانس کیوں ترے دل میں رہے اڑی

مہمانی کے ہیں جتنے بھی اسباب کر بہم
پھر ہوں گے تیرے گھر نہ شہیدوں کے سر بہم

مرثیہ میں وحید اختر نے بنیادی روایتوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے،مرثیہ میں تلمیحات اور استعاروں کا استعمال بھی بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

قلعہ کشا۔قلعہ کشا اس مجموعہ کا دوسرا مرثیہ ہے۔ جو حضرت علیؑ کے حال میں لکھا گیا ہے۔ یہ مرثیہ ۱۳۵ بندوں میں تحریر کیا گیا ہے۔اس مرثیہ کے متعلق وحید اختر خود لکھتے ہیں۔

''مولا مشکل کشا کی ذاتِ گرامی بت شکن بھی ہے اور قلعہ شکن بھی۔قلعہ استعارہ ہے ظلم، طاقت، ہوسِ زر و اقتدار، شاہی، سرمایہ داری کا اور اسی کے ساتھ قلعہ شکن ہونے والوں کے اس خوف و ہراس کا بھی، جو انھیں انقلاب آفریں قوتوں کے سامنے محسوس ہوتا ہے۔قلعہ ہر دور کے استحصال و انتشار کی نمائندگی کرتا ہے۔اور قلعہ شکن اس انسانی ،انقلابی قوتوں کا جو انسانی تہذیب کے قافلۂ ارتقا میں ہر رکاوٹ پر غالب آئی اور تہذیب و تمدن، اخلاق و اقدار، علم و ادب کی رہنمائی کرتی رہی ہے۔''[۶]

اس طرح وحید اختر کردار حضرت علیؑ اور ان کے القاب کے ذیل میں آج کے چیلنجز اور تہذیب و سیاست کو دیکھتے ہیں اور اس جدید فکر کو مرثیہ میں بخوبی برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس مرثیہ میں موجودہ دور کے حالات کی عکاسی صاف صاف نظر آتی ہے۔سیاست کی آندھیاں، ملک کا بٹوارا، ظلم و تشدد سب کو وحید نے اس مرثیہ کا موضوع بنایا ہے۔انھوں نے مرثیہ کا آغاز ہی اس بند سے کیا ہے۔

قلعے تعمیر کیے دستِ ہوس کاری نے سرحدیں آگ کی کھینچی ہیں ستم گاری نے
شہروں کو بیچ دیا طمع کی ناداری نے ملکوں کو بانٹا ہے سرمایہ کی عیاری نے

خوں پہ بنیاد رکھی عیش نے دارائی کی
ظلم نے آنسوؤں سے انجمن آرائی کی

تھی زمیں صحن کشادہ تو اسے تنگ کیا تھی خوش آہنگ ہوا، اس کو بد آہنگ کیا
تھی فضا رنگ کا طوفاں،اسے نے رنگ کیا فطرت آئینہ تھی، اس کو گروِ زنگ کیا

آسماں شیشۂ ساعت تھا اسے چور کیا
چاند خورشید لقا تھا، اسے بے نور کیا

وحیداختر آگے کے بندوں میں ملک کا تقسیم ہونا، سرمایہ کی عیاری، پورے تقسیم کے حالات بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد سیاست کے ذریعہ ملکوں کی تقسیم کے ساتھ ساتھ رنگ ونسل کی جوتہذیب مغرب میں رائج ہے اس پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔اس کے بعد وحید آگے کے بندوں میں جمہوریت کے نقصانات اور بنام جمہوریت دولت کی حکومت کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے بعد وحید آج ملک میں الکشن میں منتخب لوگ جس معیار کے ہیں اور پارلیمنٹ میں پہنچے مجرم لوگ جو قانون بناتے ہیں، اس پر بھی چوٹ کرتے ہیں۔اس کے بعد وحید گریز کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

رنگ اورنسل کی دیوار میں ہے قید آدم طلب نقرہ و گوہر کے ہیں قلعے محکم
بیٹھے ہیں کعبۂ دل میں ہوسِ زر کے صنم بزدلی چومتی ہے دولت وطاقت کے قدم
کب تک انساں رہے طاعت میں ہر اک شاہی کی
دیر ہے ضربتِ شمشیر یداللٰہی کی

اس کے بعد کے بندوں میں وحید مولائے کائنات کی مدح وثنا کرتے نظر آتے ہیں۔پھر وہ حضرت علیؑ کی عملی زندگی، عوام کے لئے ہمدردی اور انکی محنت کشی کا ذکر کرتے ہیں۔اور چاہتے ہیں کہ ان کے ماننے والے بھی علم کو اپنی زندگی کا نصب العین مقصد بنائیں۔اور یہی جدید مرثیہ کا مقصد بھی ہے کہ انسان کو عمل کی طرف متوجہ کرایا جائے۔وحید آگے حضرت علیؑ کے عظمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

روشنائی کے لئے لائیں سمندر پانی کرے افلاک کی تخئیل ورق گردانی
سارے الفاظ کریں مل کے قصیدہ خوانی سارے اشجار قلم بن کے کریں جولانی
ایک ہی وصفِ علیؑ پھر بھی رقم ہو نہ سکے
منقبت کا حق ادا، حق کی قسم ہو نہ سکے

اوپر کے بندوں میں وحید لکھتے ہیں کہ اگر سارے آسمان مل کر ورق بن جائیں، سارے سمندر کا پانی روشنائی بن جائے، اور سب شجر مل کر قلم بن جائے اور سارے الفاظ مل کر حضرت علیؑ کی قصیدہ خوانی کریں پھر بھی وہ علی کی ایک وصف بھی نہ لکھ پائیں گے۔اس مرثیہ میں وحید نے ساقی نامہ کا بھی استعمال بہت عمدہ الفاظ میں کیا ہے۔ساقی نامہ کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

انبیاء وعرفاء وشعرا کے ساقی افصحِ خلق، زبان فصحا کے ساقی
مرشدِ روح امیں ،نقط خدا کے ساقی زمزم و کوثر وتسلیم و بقا کے ساقی
فکر کو اک رمقِ یداللٰہی دے
نقط کو جوھر تیغ اسداللٰہی دے

وحید حضرت علیؑ کی ولادت کی دعا مانگتے ہوئے ان کا انتظار کرتے نظر آتے ہیں کہ جب علیؑ آئیں گے تو قصرِ

نمرود اور شدّاد کی جنت گر جائے گی۔ اور جب علی کی تلوار چلے گی تو ظلم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد وحید اختر حضرت علیؑ کے فضائل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علی نے امیروں کی عیش وعشرت پر لعنت کی ہے۔ وہ ہمیشہ مزدوروں کو دوست رکھتے ہیں۔ وحید آگے کہتے ہیں کہ علیؑ نے کبھی مال امت سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے بچوں اور غلاموں میں فرق نہیں کرتے، وہ غلاموں کو بھی وہی غذا دیتے ہیں جو اپنے بچوں کو دیتے ہیں۔ وہ خود بھوکے رہ کر بھی دوسروں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ حضرت علیؑ کا دن روزوں اور ان کی راتیں عبادتوں میں بسر ہوتی ہے۔ حضرت علیؑ کی تعریف بیان کرنے کے بعد وحید اختر ان کے والدین ان کی زوجہ اور بچوں کی عظمت بیان کرتے ہیں۔ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وحید کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانا ہے مگر حضرت علیؑ وہ واحد شخص ہیں جن کو نصیری خدا تسلیم کرتا ہے۔

اس کے بعد وحید اختر علیؑ کے اٹھارویں روزے کے واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ جب علیؑ بے چینی کے عالم میں رہتے ہیں تو ان کی بیٹی کلثوم ان سے پریشانی کا سبب دریافت کرتی ہیں جس کے جواب میں حضرت علیؑ ان کو موت کا فلسفہ سناتے ہیں۔

نفسِ حق نے کہا ''درپیش ہے آج ایسا سفر جس سے واپس نہیں آتا کبھی کوئی بھی بشر
جانا ہے مجھ کو بہت جلد حضور داور دیکھتا ہوں کہ قضا آ کے کھڑی ہے در پر
موت ہر لحہ لگی رہتی ہے انسان کے ساتھ
آج ہے لپٹی ہوئی تار رگ جاں کے ساتھ

اس کے بعد وحید نے جناب کلثومؑ کے سوال پر بزبان مولائے کائنات موت اور زندگی کے فلسفہ کو اس مرثیہ میں نظم کرتے ہیں۔ موت سے مقابلہ اور اصل زندگی کیا ہے اس پر گفتگو ملاحظہ ہو۔

بولیں کلثوم ''اے صاحبِ عرفانِ حیات آپ ہیں محرم گنجینۂ اسرارِ حیات
آپ کے سامنے معدم بھی ہیں موجودات ماورا زندگی وموت سے ہے آپ کی ذات
کہیے کچھ دردگساری کا سلیقہ کیا ہے؟
موت کے سامنے جینے کا طریقہ کیا ہے؟''

کہا مولا نے کہ ''اے جانِ پدر، جان امام زیست ہے اہل تمنا کے لیے جہد دوام
ہر نفس دردگساروں کے لیے صبر کا جام ہو نہ گر حق کی رضا آرزوئے مرگ حرام
یوں رہو زندہ کہ ہر سانس عبادت ہو جائے
زندگی مرضئ حق ، موت شہادت ہو جائے

زندگی اہل نظر کے لیے عبرت کا ساماں کر کے گم اپنے کو اک لحہ بھی جینا ہے زیاں
حرّیت تج کے ملے قصرِ شہی تو زنداں قیمتِ گوہرِ عزّت سے ہے کم دولتِ جاں
زندگی خاکِ مدینہ بھی ہے، کوفہ بھی ہے

کربلا بھی، حرم خانۂ کعبہ بھی ہے‘‘

مرثیہ کے آخر میں وحید حضرت علیؑ کو ضرب لگنے اور ان کی شہادت کو بیان کرتے ہیں جو بہت تفصیلی اور دل گداز ہے۔اور ایک طرح سے اس مرثیہ میں کوفہ کی منظوم تاریخ بھی ہے۔واقعہ اور جذبات نگاری پر وحید اختر کو پورے طور پر قدرت حاصل ہے۔ بیان میں تسلسل اور روانی کے ساتھ ساتھ مرثیہ کے مکالمے میں ڈرامائی انداز سے روایتیں نظم کی گئیں ہیں۔

شہید عطش۔کربلا تا کربلا میں ان کا تیسرا مرثیہ ’’شہید عطش‘‘ ہے۔لیکن اصل میں یہ وحید اختر کی زندگی کا پہلا مرثیہ ہے جسکو انھوں نے ۱۹۶۱ء میں تحریر کیا تھا۔یہ مرثیہ کربلا کے ننھے مجاہد حضرت علی اصغرؑ کے حال پر تحریر کیا گیا ہے۔اس مرثیہ میں ۹۵ بند شامل کئے گئے ہیں۔جو کہ ان کے اور مرثیوں سے کم ہیں۔وحید اختر نے اس مرثیہ میں پیاس کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔جدید شاعری میں علی اصغرؑ کی شہادت کو مظلومی کا وہ آخری نقطہ سمجھا جاتا ہے جس پر تمام کربلا والوں کی پیاس سمٹ آئی تھی۔مرثیہ کا ذکر وحید اختر ’’کربلا تا کربلا‘‘ میں کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

> ’’یہ مرثیہ پیاس اور شیر خوارگی کے خون کی داستان ہے۔اسی لحاظ سے گھٹاؤں کے نہ برسنے کی شکایت سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔قحطِ باراں وآب ہمارے دور میں جنگ کے تباہ کن ہتھیاروں کی کثرت اور امیدِ امن کے فقدان کا بھی استعارہ ہے۔ ہماری صدی نے جو مصائب اور جنگیں جھیلی ہیں، وہ پوری انسانی تاریخ نے اپنی طویل عمر میں کبھی تصور بھی نہ کی تھیں۔مرثیے کا چہرہ اسی عالم آشوب سے عبارت ہے۔‘‘[۷]

مرثیہ کے چہرے میں وحید اختر نے موجودہ حالات، ظلم، تشدد و ناانصافی کا ذکر کیا ہے۔آگے کے بندوں میں وحید لکھتے ہیں کہ موجودہ عہد کا ہر انسان ڈر کے سائے میں جی رہا ہے، نہ جانے کب موت آجائے اس ڈر سے اسکی نیند اڑی ہے۔’’ذرے کا بھی دل ٹوٹے تو ہل جاتی ہے دنیا‘‘ سے وحید کی مراد ائٹم بم کے دہانے پہ بیٹھی دنیا سے ہے۔اگر ایک بم بھی پھٹ جائے تو پورا ملک تباہ ہوسکتا ہے۔اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وحید لکھتے ہیں کہ آج کے انسان کو سمجھنا بہت محال ہے کہ کون اپنا ہے اور کون پرایا۔انسان ایک دوسرے کی صحبت سے بچتا نظر آتا ہے۔آج کسی میں نہ مروت بچی ہے اور نہ کسی میں ایمان باقی ہے۔ہر کوئی اپنے میں پریشان نظر آتا ہے۔وحید اختر انسانیت کے فقدان اور موجودہ مسائل کی فکر میں ڈوبے ہوئے تاریخ کے صفحوں کو جب پلٹتے ہیں تو وہاں بھی ان کو وہی کچھ نظر آتا ہے، جو موجودہ دور میں ہو رہا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

تاریخ کے ہر صفحے پہ ٹوٹا ہے نیا قہر بن باس ملے رام کو، گوتم کو غم دہر
عیسیٰ تو چڑھے دار پہ، سقراط پیئے زہر پیاسا پسر ساقی کوثر ہو لب نہر
مہتاب شبِ چار دہم چاندنی مانگے
چوکھٹ پہ اندھیروں کی سحر روشنی مانگے

خسرو کا محل دولت شیریں سے غنی ہو فرہاد کے تیشے کو غم خود شکنی ہو
جو شخص سرفراز ہے گردن زدنی ہو بوئے گل تر وقف غریب الوطنی ہو
کانٹے تو لہو پی کے ہوں سیراب و سرفراز
شاہین فلک سیر ہو صید غم ِ پرواز

اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وحید کہتے ہیں کہ ہر عہد میں ظالموں کی حکمرانی رہتی ہے۔کم ظرفوں سے ہی حاکموں کی سخاوت منسوب رہتی ہے۔اور جو بھی ان کو نہیں مانتا انکو، جو ان کے قید ستم سے نہیں ڈرتا اسی کو قدم قدم پہ اذیت پہچائی جاتی ہے اور سچ بولنے پہ زبانوں کو کٹوا دیا جاتا ہے۔اس کے بعد وحید لکھتے ہیں کہ اب ضرورت ہے کہ اس عہد کے فرعون سے لڑا جائے ،نمرود کی آگ سے گزر جایا جائے ،شدّاد کی جنّت کو ٹھوکر مار کر تخریب کو تعمیر کے آداب سکھائیں۔وحید جدید لب ولہجہ میں ایک بار پھر ظلم سے ٹکرانے کی بات کرتے ہیں۔اور حوصلہ حسینؑ ابن علیؑ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

''ہر رنگ میں موجود یزیدانِ زماں ہیں
دنیا متلاشی ہے کہ شبّیر کہاں ہیں''

وحید اس کے بعد کربلا کا ذکر کرتے ہیں اس دشت بلا نے بھی ایسے منظر دیکھے ہیں جو دنیا بھلائے نہیں بھول سکتی۔جب اس سرزمین پر ایک قافلہ اترا تھا،جس میں کچھ بچے، کچھ عورتیں اور مردوں میں صرف بہتّر لوگ تھے۔یہ سبھی حق کے لیے اپنے جانیں قربان کرنے آئے تھے۔اور ان سے لڑنے کے لئے دوسری طرف لاکھوں کا لشکر تھا۔ان قافلے والوں کی عظمت کا بیان کرتے ہوئے وحید حضرت امام حسینؑ کے اصحاب اور اعزّا کی شہادت کا ذکر کرتے ہیں۔وحید حسینؑ کا موازنہ پیغمبرؐ اور نبیوں سے کرتے ہیں۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

جس منزل دشوار میں رہ جاتے پیمبر جس موجۂ گرداب سے تھا نوحؑ کو بھی ڈر
یعقوبؑ و براہیمؑ بھی کھاتے جہاں ٹھوکر جو صدمہ ہوا رحمتِ عالم کو بھی دوبھر
اس عہدۂ مشکل سے بھی شبّیر بر آئے
نعش ِ گل رعنا پہ سنبھالے جگر آئے

تاریخ میں بے مثل ہے صبرِ شہ والا عیسیٰؑ نے تن تنہا لہو اپنا اچھالا
سقراط نے بھی خود ہی پی زہر کا پیالا شانِ پسر فاطمہؑ ہے سب سے دوبالا
ہر کشتے کے ساتھ آپ ہوئے کشتۂ داور
پیتا نہ کوئی جام شہادت کے بہتر

آگے کے بندوں میں وحید شبّیر کے خطبے کا بیان کرتے ہوئے صدائے استغاسا کا ذکر کرتے ہیں۔جسکو سن کے ہر شہید کا لاشہ حسینؑ کی مدد کے لئے تڑپنے لگا۔

ہے کون معینِ دل بے چارہ و بے یار ہے کون رفیق شہ بے یاوروں انصار
ہے کون محمدؐ کی امانت کا نگہدار ہے کون بن فاطمہؑ زہرا کا مددگار
کیا بولتے پتھر، نہ سماعت نہ زباں تھی
کہنے کو تو لبیک بس اک ننھی سی جاں تھی

یاں گنجِ شہیداں میں ہوئی لاشوں میں ہلچل واں سن کے صدا باپ کی اصغرؑ ہوئے بے کل
آمادۂ نصرت ہوئے، کی دیر نہ اک پل چھوٹے تھے بہت جا نہ سکے خود سوئے مقتل
یوں تڑپے کہ گہوارے سے باہر اچھل آئے
خشک آنکھوں کے صحرا سے بھی آنسو نکل آئے

وحید آگے کے بندوں حضرت علی اصغرؑ کی رخصت اور پھر ان کی شہادت کا بیان تفصیل سے کرتے تھے۔اصغرؑ کی لاش کو دفن کرتے ہوئے باپ کی جذبات نگاری کا بہت عمدگی سے مظاہرہ کرتے ہیں۔مرثیہ میں ہندی زبان کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔تلمیح ،استعارہ اور تشبیہ کا استعمال بھی بہت خوبصورتی سے ملتا ہے۔

علمدار امن۔ وحید کا مرثیہ ''علمدار امن'' ان کی کتاب کا چوتھا مرثیہ ہے جو ابوالفضل عباسؑ کے حال کا ہے۔کربلا میں امام حسینؑ کے مختصر سی فوج کے علمدار حضرت عباسؑ تھے،اور یہ لشکر حق کا پیرو تھا اور امن اس کا مقصد تھا اس لئے اس کا نام 'لشکر امن' پڑا۔اس مرثیہ کو وحید ۱۳۴ بندوں میں تحریر کیا ہے۔مرثیہ کے چہرے کے بندوں میں انسان کی عظمت اور اسکی طاقت کا بیان کیا گیا ہے۔وحید لکھتے ہیں کہ اگر انسان چاہے تو کیا کچھ نہیں کر سکتا ہے۔انسان کے ہاتھ میں خاک،آتش،آب اور فلک کی زمام ہے۔وہ جو چاہے ان سے بنا سکتا ہے حتیٰ کہ وہ پانی سے بجلی بھی نکال سکتا ہے۔وہ جس سمت بھی چاہے وقت کی رفتار کو موڑ سکتا ہے۔وحید کہتے ہیں کہ انسان ہی واحد وہ شہ ہے جس پہ ہر خشک وتر کا راز ظاہر ہے۔انسان اگر نہ ہو تو دنیا میں تیرگی پھیل جائیگی۔وحید آگے کہتے ہیں اس دنیائے فساد میں بشر کی خلقت اک رحمت کی طرح ہوئی ہے۔اس دنیا کی تمام نعمتوں میں انسان آخر نعمت بن کر وارد ہوا ہے۔انسان کی ذات کی تعریف وحید کچھ اس انداز سے بھی کرتے ہیں۔

انسان ہی کی ذات طلسمات خشک و تر فطرت میں اس کی دست وگریباں ہیں خیر وشر
عرفانِ نفس ہو تو انا لحق کہے بشر یزداں کا بھی حریف بنے ٹھان لے اگر
اضداد کی ہے جنگ اگر کائنات میں
انساں ہی کائنات ہے خود اپنی ذات میں

انساں خدا اشناس بھی، شیطاں گزیدہ بھی آبِ حیات نوش بھی ہے،سم چشیدہ بھی
بینائی حیات بھی ہے،کو ر دیدہ بھی خالق نئے جہانوں کا بھی، آفریدہ بھی
تقویمِ کائنات کا یہ منتہا بھی ہے

تخریب کائنات کا یہ دیوتا بھی ہے

اس کے بعد وحید طویل انداز میں ساقی نامہ کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔مرثیہ میں ساقی نامہ نظم کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جدید فکر کے باوجود وحید روایت مرثیہ نگاری پر اسی طرح سے گامزن ہیں جس طرح قدیم مرثیہ نگار تھے۔ساقی نامہ کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

پیک اجل کو ساغر آب حیات دے تیغ جفا کو نرمی نکہت صفات دے
پائے شکستگی کو مقامِ ثبات دے بے مایگی کی جھولی میں کل کائنات دے
اختر شمار ہجر کی راتوں کو خواب دے
ہر جام میں گھلا ہوا اک آفتاب دے

ساقی نامہ کے بعد وحید اختر شکایت زمانہ اور موجودہ عہد کے حالات و مسائل کو بڑے پر اثر انداز میں نظم کرتے ہیں۔مرثیہ میں جدید مسائل جس شدت کے ساتھ وحید نے پیش کیے ہیں شاید ہی کسی اور کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔یہی وہ فن ہے کہ جسکی وجہ سے وحید دوسرے مرثیہ نگاروں سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

دنیا جو آج جنگ کے ڈر سے ہے بے اماں اس کو دکھائیں قبلہ گہہِ امن دو جہاں
آلاتِ حرب کو جو سمجھتے ہیں حرزِ جاں ان کو دکھائیں لشکرِ بے تیغ کا نشاں
وہ پرچم بلند جو گردوں شکار ہے
با مشک ِ خشک دجلہ و جیحوں شکار ہے

اس کے بعد مرثیہ نگار علم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ وہ علم ہے جو حق کا پاسدار ہے،حق علم کے ساتھ ہے اس کی گواہی خود رسولؐ اکرم دیتے ہیں۔وحید علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ علم ہر جنگ میں علیؑ کے ساتھ رہا ہے چاہے وہ بدر،خندق،حنین ہو یا خیبر۔ہر جگہ یہ علیؑ کی فتح کا علان کرتا نظر آتا ہے۔علم کی فضیلت کا انداز اس بند سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ملاحظہ ہو۔

یہ وہ علم جو بن کے عدو کی اجل گیا جب بھی اٹھا، نہالِ صداقت سنبھل گیا
گرمی سے اس کے دار کی پتھر پگھال گیا جب بھی اٹھا، نہالِ صداقت سنبھل گیا
کیسی زمین عرش بھی زیرِ قدم رہا
فتحِ مبیں اُدھر تھی جدھر یہ علم رہا

وحید کہتے ہیں کہ یہی وہ علم ہے جو کربلا کے میدان میں حضرت عباسؑ کے ہاتھوں کی زینت بنا تھا۔یہ علم کمزوروں کا زور اور ضعیفوں کی ڈھارس بھی تھا۔مظلوموں کا سہارا اور بیواؤں کا حق شناس بھی تھا۔علم کے بعد وحید علمدار حسینؑ حضرت عباسؑ کی عظمت وفضیلت کا بیان کرتے ہیں۔وحید حضرت عباسؑ کے قد وقال انکی شجاعت اور ان کے تلوار کی بھی

تعریف کرتے ہیں۔اس کے بعد شبِ عاشور کے اس واقعہ کا ذکر ہیں جب زہیر ابن قین عباسؑ سے اذن جنگ نہ ملنے کا ذکر کرتے ہیں تو جناب عباسؑ جواب میں کہتے ہیں کہ۔

فرمایا'' اے زہیر! اجازت جو دیں امام تم دیکھ لینا ضربتِ عباسؑ تشنہ کام
نظروں میں ہے حباب سے کم تر سپاہِ شام اُلٹے نہ گر زمین تو بے کار ہے حسام
دیکھا ہے تم نے وار علیؑ سے امام کا
اب معرکہ بھی دیکھنا اُن کے غلام کا''

اس واقعہ کے بعد وحید روز عاشور کا ذکر کرتے ہوئے جناب عباسؑ کا امام حسینؑ سے اذنِ وغا مانگنے کا بیان کرتے ہیں ۔جب عباسؑ خیمہ میں جاتے ہیں تو وہاں بچوں کی حالات پیاس سے بہت خراب تھی۔اس لئے جناب عباسؑ پانی لانے کے جاتے ہیں۔پانی لانے میں ان کی شہادت کا ذکر وحید بہت تفصیل سے کرتے ہیں۔ایک بھائی کا بھائی سے گفتگو کرنے کو وحید بہت پر درد انداز میں بیان کیا ہے۔جسکو سننے کے بعد سامعین اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پاتے ہیں۔ملاحظہ ہو۔

فرمایا شہ نے مجھ کو یہ حسرت رہی سدا اک بار مجھ کو بھائی بھی کہہ دیجئے ذرا
بولے کہ جس زبان سے آقا کہا کیا اب اس پہ کیسے لاؤں کوئی حرف دوسرا
پھرتے نہیں ہیں مرد کبھی اپنی بات سے
چھوڑوں گا میں غلامی کا دامن نہ ہات سے

یہ کہہ کے سر ہٹا لیا زانوئے شاہ سے بولے کہ آنکھیں پاؤں سے مل لینے دیجئے
آقا کی گود میں تو غلاموں کا سر رہے آئے گا کون آپ کے سر کو سنبھالنے
بولے حسینؑ تیری وفا میرے ساتھ ہے
جس کا نہیں کوئی بھی ،خدا اس کے ساتھ ہے

سن کر یہ تڑپے حضرت عباسؑ خستہ تن حسرت سے دیکھتے رہے روئے شہ زمن
ہچکی جو آئی زخموں میں بڑھنے لگی چبھن دم سرد ہوگیا تو گئی پیاس کی جلن
شبّیر جھک کے بھائی کا منہ چومنے رہے
اُٹھ کر بھی دیر تک وہیں روتے کھڑے رہے

وحید مرثیہ کو پر درد بنانے کے لیے اس میں تلمیح ،تشبیہ اور استعارہ کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔زبان صاف اور سادہ ہے۔وحید مرثیہ کے انداز بیان کو قدیم روایت سے پیش کرتے ہیں۔یہ مرثیہ ادبیت کے لحاظ سے عمدہ مرثیہ ہے،اس میں شاعرانہ پیرائے بھی بیان کئے گئے ہیں۔

سالارِ قافلۂ شوق۔ وحید اختر کا پانچواں مرثیہ ''سالارِ قافلۂ شوق'' ہے جو ۱۴۴ بندوں پر مشتمل ہے۔یہ ان کا

علاماتی مرثیہ ہے۔ یہ مرثیہ امام حسینؑ کے احوال کا مرثیہ ہے، جس میں انھوں نے امام حسینؑ کے مدینہ سے کربلا تک کے سفر کو تحریر کیا ہے۔ اس مرثیہ کے حوالے سے وحید اختر خود لکھتے ہیں۔

''کربلا مسلسل سفر کا نام ہے۔ کربلا سے فکر و عمل کے جو دھارے دہم محرم ۶۱ھ کو پھوٹے تھے انھوں نے مختلف سمتوں میں سفر کیا، ایک دھارا تصوف کی فکر بنا' دوسرے نے علم کلام میں جبر اختیار اور عدل کے مباحث کی شکل میں بنی امیہ سے لے کر بنی عباس کی ملوکیت تک پرواز کے لئے نظریاتی حربے کا کام کیا، تیسرے دھارے نے امر ابل معروف اور نہی عن المنکر کے اصول کی تعمیل میں ظلم کے خلاف جہاد بالسیف کی شکلیں اختیار کیں۔ یہی سفر انسانی تاریخ کے سینے میں آج بھی جاری ہے۔''۸

وحید اختر سفر کے حوالے سے مرثیہ کا آغاز کرتے ہیں۔ اور ایک ایسے قافلے کا بیان کرتے ہیں جسکی کوئی منزل نہیں ہے۔ وحید اختر نے اس کربلا کے سفر کو ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب سے جوڑتے ہیں جو علمی طاقت کے خلاف آواز حق تھی۔ مرثیہ کا آغاز وحیدان بندوں سے کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ہے قافلۂ جرأتِ رفتار سفر میں منزل کا نشاں بھی نہیں اس راہ گزر میں
تا حدّ نظر ریگِ بیاباں ہے نظر میں سایہ ہے نہ پانی رہِ پر پیچ و خطر میں
گردوں ہے شرربار ، زمیں آگ کا دریا
پھیلا ہوا ہے دور و قریں آگ کا دریا

سفر کے بعد وحید قافلہ والوں کی عظمت کا بیان کرتے ہیں کہ اس قافلہ میں کچھ بزرگ، کچھ جوان اور کچھ طفل بھی ہیں، جو ظلمات کی تیرگی کو مٹانے کے لئے شمع بن کر چلے ہیں۔ آگے کے بندوں میں وحید اس سفر میں چلنے کی شرط بتاتے ہیں کہ اس سفر میں وہی شامل ہوسکتا ہے جو اپنا گھر پھکنے کی ہمّت رکھتا ہے، جو سر کٹانے کا حوصلہ رکھتا ہے، جو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹانے کی طاقت کرتا ہو وہی اس قافلہ میں شامل ہوسکتا ہے۔ وحید اختر ظلم کے سفر کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ساتھ میں اس کے نتیجہ کا بھی ذکر کرتے ہیں جس سے ہتھیاروں کے ذخیرے وجود میں آئے اور دنیا تباہی کی دہانے پر جا پہنچی ہے۔ وحید کہتے ہیں کہ ہر دور میں یہ قافلہ ظلم کو مٹانے کے لئے سفر کرتا ہے۔ بس اس کے عنوان بدل جاتے ہیں۔ ہر دور میں ظلم سر اٹھا کر مظلوموں کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس بیان کو وحید کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

یہ قافلۂ شوق ازل سے ہے روانہ کہتے ہیں اسے اہلِ نظر روحِ زمانہ
ہر دور میں ساتھ اس کے تھے افراد یگانہ عنوان بدلتا رہا ہر پل یہ فسانہ
عنوان بدلتے رہے، افسانہ وہی ہے
میکش نئے آتے رہے، پیمانہ وہی ہے

اس مے سے گراں تر کوئی انعام نہیں ہے　　محروم ہے جو اس سے، خوش انجام نہیں ہے
خود اس سے الگ وقت کا پیغام نہیں ہے　　اس مے سے تہی جام، مرا جام نہیں ہے
تاریخ اسے نام نئے دیتی رہی ہے
ہم کہتے ہیں، یہ حبِّ حسینؑ ابن علیؑ ہے

آگے کے بندوں میں وحید وقت کی اہمیت کو بتاتے ہوئے اپنے وقت کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان کی سرد جنگ (کولڈ وار) کا بھی ذکر اسی نظم کے سفر کے حوالے سے کرتے ہیں۔

صدیوں کا سفر کر کے بھی ظلم آج وہیں ہے　　پستی میں اسیر آج بھی ہر نفرت و کیں ہے
جو موت کا تاجر ہے، تباہی سے قریں ہے　　ہر اسلحۂ مرگ سے بے زار زمیں ہے
ہتھیاروں کا گودام ہے ناسور زمیں کا
آوازۂ حق آج بھی ہے نور زمیں کا

اس کے بعد وحید اختر کربلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کربلا دیکھ کہ تو نے جسے ستایا تھا، جو تیری زمین پہ مارا گیا تھا وہ آج مر کر بھی امر ہے۔ تو دیکھ کہ جو تیرے ماننے والے تھے آج انکی قبر کے نشان بھی نہیں ملتے اور عترت شاہ شہید مر کر بھی تیری زمیں کو معتبر بنا گئے۔ پھر وحید حُر کا حضرت حسینؑ کا راستہ روکنا اور حضرت شبیرؑ کا حر کے لشکر کو پانی پلانے کے واقع کو تفصیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ پھر اس سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے وحید کربلا میں اس قافلہ کے وارد ہونے کے مناظر کو بیان کرتے ہیں۔ کربلا کی خاک اور نہر فرات کا ذکر بھی وحید اختر نے خوبصورت انداز سے کیا ہے۔ اس کے بعد کربلا میں فوج اعدا کا آنا، جنگ کے لیے للکارنا اور امام حسینؑ کا ایک شب کی مہلت مانگنا کا بیان بھی وحید نے پر اثر انداز میں کیا ہے۔ اور شبّیرؑ کا اپنے رفیقوں سے یہ کہنا کہ جو چاہے جا سکتا ہے میں تم پہ سے بیعت اٹھا لیتا ہوں، ایسا واقعہ جس کا مختصر بیان بہت مرثیہ گو کے مرثیوں میں ملتا ہے لیکن اسکا تفصیلی بیان بہت کم مرثیہ نگاروں کے یہاں نظر آتا ہے۔ یہ منظر وحید کے یہاں بہت خوبصورتی سے دیکھنے کو ملتا ہے۔

یاں تاروں کی جھرمٹ میں ہے مہتابِ امامت　　ہے چہرے کے انوار سے اشعاعِ محبت
لب تشنہ کی باتوں میں ہے دریائے سخاوت　　الفاظ ہیں الہام، زباں روحِ صداقت
فرماتے ہیں اصحاب سے رخصت کی یہ شب ہے
جو چاہے چلا جائے اجازت کی یہ شب ہے

ہے کل کی سحر میرے لئے بابِ شہادت　　ہو جائیں گے کل قتل سب اربابِ محبت
جس پر ہو گراں بار مرا حلقۂ بیعت　　وہ اٹھ کے چلا جائے کہ ہے پردۂ ظلمت
میں شمع بجھا دیتا ہوں پروانے بکھر جائیں
جو چاہیں شہادت کے سفینے سے اتر جائیں

چشم نگراں بند ہوئی شمع بجھا دی ہر دل میں محبت کی نئی جوت جگا دی
اصحاب کو اس طرح جو جانے کی رضا دی آزادیٔ کردار کی زنجیر پنھا دی
ثابت قدم ایسے تھے یہ پیمان وفا میں
اٹھا نہ کوئی آئی نہ لغزش کسی پا میں

اس کے بعد وحید اختر امام حسینؑ کے خطبے کا بیان کرتے ہیں۔ یہ وہ خطبہ ہے جو شہادت سے قبل امام حسینؑ نے فوج یزیدی کو مخاطب کر کے دیا تھا۔ یہ اس مرثیہ کا اہم حصہ ہے۔ اس کے بعد امام حسینؑ کے اصحاب اور انصار کی شہادت کو مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر حضرت شبیرؑ کا خیمہ میں رخصت آخر کو آنا، اور میدان میں رجز بیان کرنا کو برتا گیا ہے۔ اس کے بعد جنگ، شہادت اور بین کے جز میں وحید نے جذبات نگاری کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔ مرثیہ میں علامتیں، تشبیہ، استعارہ اور تلمیح کا استعمال بخوبی کیا گیا ہے۔ مرثیہ میں اردو زبان کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ہندی زبان کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔

وحید کے مرثیہ میں سماجی وتہذیبی تصویر، نفاست اور شائستگی، عورت مرد، آقا اور غلام، عزیز اور دوست کے انداز تکلم بڑے خوبصورت انداز میں ملتے ہیں۔ انھوں نے کربلا کے سارے واقعات کو تہذیبی منظر نامے میں پیش کیا ہے۔ وحید اختر کے مرثیہ کی تعریف پروفیسر سید عقیل رضوی اپنے کتاب میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

> ''وحید اختر کے مرثیوں میں جدّت کی تمام صورتیں ایک منجھے ہوئے توازن کے ساتھ آئی ہیں۔ کوئی بھی مرثیہ نگار مرثیوں کے منظر نامہ کو نہیں بدل سکتا مگر انھیں اپنے ڈھنگ سے Perceive کرنے اور پیش کرنے کا یقیناً اسے اختیار ہوتا ہے۔ وحید اختر نے مرثیوں میں الفاظ کو بھی روایت (Convention) سے نکالا ہے اور خارجی مناظر، جذبات، اظہاریت سب میں ایک نیا لک (Look) دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود مرثیے کی مقصدیت ان کے مرثیوں میں ساتھ ساتھ چلی ہے اور واقعات کی ریل (Reel) بھی وہی مہیج جذبات ہوتی ہے۔ وحید اختر نے صرف فکری تاسف پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ بیانیہ اظہار بھی ساتھ لیا ہے۔ مناظر اپنے تجربے، شاعری کے نئے Perception کے ساتھ ہیں (یعنی کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا) والا نہ Perception ہے اور نہ Conception مگر وہ مناظر ہی رہتے ہیں، خیالی اور استعاراتی تصویریں نہیں بنتے۔''۹

تیغِ زبانِ زینب۔ یہ وحید کا چھٹا مرثیہ ہے۔ اس مرثیہ کو انھوں نے ۱۸۹ بندوں میں تحریر کیا ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ جناب زینبؑ کے حال کا ہے۔ اس مرثیہ میں جناب زینبؑ کے خطبے کا ہے، جو انھوں نے شام کے دربار میں دیا تھا۔ اس مرثیہ کے تعلق سے وحید اختر کتاب 'کربلا تا کربلاؔ' میں لکھتے ہیں کہ۔

''اس مرثیے میں حضرت زینبؑ نے کوفے اور دربار یزید میں جو خطبات دیے تھے، ان کو شاعرانہ آرائشوں کے ساتھ اردو شعر کی زبان میں ڈھالنے کی سعی کی گئی ہے۔ آپ کی جرأتِ اظہار آج بھی ہر ظلم کے خلاف جہاد باللسان کا بہترین نمونہ ہے۔'' ۱۰؎

مرثیہ کا آغاز وحید اختر نے اس بند سے کیا ہے۔

رات یہ حق کے چراغوں پہ بہت بھاری ہے سانس لینے میں بھی ایمان کو دشواری ہے
کشمکش مرگ و مسیحائی میں جاری ہے چارہ گر آ بھی چکیں ،کوچ کی تیاری ہے
نشۂ فتح میں باطل ہے کہ آتا ہے یزید
مسندِ عدل پہ حق اپنا جتاتا ہے یزید

مرثیہ کا آغاز وحید اختر اس وقت سے کرتے ہیں جب دنیا سے رسولؐ اسلام رحلت فرما چکے ہیں۔ اب دنیا سے عدل وانصاف اٹھ چکا ہے اور اس کی جگہ بے ایمانی اور ظلم نے لے لی ہے۔ ہر طرف زور و جبر پھیلا ہوا ہے۔ ایمان کوڑیوں کے دام بک رہا ہے۔ قوم اس ظلم و جبر کی زنجیر سے بیزار ہے اور دعا کرتی نظر آتی ہے۔

کوئی رستہ ہو کہ حالات کی زنجیر کٹے کوئی تیشہ کہ غمِ ذات کی زنجیر کٹے
کوئی شعلہ ہو کہ ظلمات کی زنجیر کٹے کوئی سورج ہو کہ اس رات کی زنجیر کٹے
کوئی رہبر ہو تو یہ قید کی دیوار گرے
جبر کے ہاتھ پہ خود جبر کی تلوار گرے

اس کے بعد وحید اختر حضرت علیؑ کی عظمت بیان کرتے ہوئے ان کی شہادت کے بعد قوم کے حال کا بیان کرتے ہیں اور پھر امام حسینؑ کے مدینے سے روانگی کا حال بیان کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان قافلے والوں کی عظمت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد وحید اختر بھائی بہن کے رشتے کی خوبصورتی کو بیان کرتے ہوئے امام حسینؑ اور جناب زینبؑ کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہیں۔

بھائی بچپن سے ہی غمخوار رہا خواہر کا اس کے سر سے جو کبھی دھوپ میں سایہ سرکا
بھائی نے سایہ کیا ڈوڑ کے خود چادر کا فاطمہؑ سے نہیں کم رتبہ اس دختر کا
سیکھا زینبؑ نے سبق حق کا لسانِ حق سے
پائی ہے جرأتِ گفتار زبانِ حق سے

گود میں کھیلی ہیں یہ رحمتِ دو عالم کے سیکھے ہیں سارے چلن سیدۂ اکرم کے
جزب دل میں کیئے انداز سکونِ غم کے تڑپے ہیں شیر خدا ،اشک جو ان کے چمکے
روئی ہیں یہ تو ہنسایا ہے نبیؐ نے ان کو

روٹھی ہیں یہ تو منایا ہے علیؑ نے ان کو

وحید اختر مرثیہ کو آگے بڑھاتے ہوئے جناب زینبؑ کی عظمت وفضیلت کو تفصیلی انداز میں بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد اس قافلہ کا ذکر کرتے ہیں جو مدینے سے چلا تھا اور کربلا کی سرزمین پر وارد ہوا۔پھر کربلا کو مخاطب کرتے ہوئے وحید اس قافلہ کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔وحید اختر نے پھر کربلا کے جنگ اور امام حسینؑ کے انصار واقرباء کی رخصت اور شہادت کا مختصر انداز میں ذکر کرتے ہیں۔پھر جناب زینبؑ کے دونوں بیٹوں عون اور محمد کی جنگ اور شہادت کا واقعہ تفصیل سے تحریر کرتے ہیں۔پھر زینبؑ کا اپنے بیٹوں کی لاش پہ بین کو وحید اختر پر درد انداز میں بیان کرتے ہیں۔یہاں انھوں نے جذبات نگاری کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔

دل کو یاد آتی ہیں بیٹوں کی پیاری باتیں   آ گئیں لوٹ کے آنکھوں میں کٹی سب راتیں
لایا ہر گزرا ہوا لمحہ نئی سوغاتیں   جھوم اُٹھیں آنکھوں کے صحرا میں کئی برساتیں
روئیں تو شاہ کا غم ہو گا فزوں' دھیان ہے یہ
ہاجرہؑ ! دیکھ لو قربانیوں کی شان ہے یہ

بعد کے بندوں میں وحید اختر نے حضرت عباسؑ اور امام حسینؑ کی شہادت کو مختصر طور پر بیان کیا ہے، پھر خیموں کے جلنے اور اہل حرم کے لٹنے کے واقعات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔اسکے بعد شام غریباں کے مناظر،حضرت علیؑ کی رہوار پہ آمد اور جلال زینبؑ کو وحید اختر نے حقیقت مندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

اپنی شب گشت میں زینبؑ نے یہ دیکھا اک بار   کوئی آتا ہے سوئے خیمہ ٔ آلِ اطہار
کہا زینبؑ نے ''نہ آ اس طرف اے شاہ سوار   تھک کے سوئے ہیں ابھی سوختہ جاں سینہ فگار
لٹ چکی خیمہ سرا ' مال و گہر پاس نہیں
کوئی بھی چیز بجز دیدۂ تر پاس نہیں''

آنے والے نے نہ روکا مگر اپنا رہوار   بنتِ حیدر نے غضبنا کی سے دیکھا اک بار
غیظ کے تیوروں میں شیرِ خدا کے آثار   تھام لی بڑھ کے لجامِ فرسِ شاہسوار
اور فرمایا'' قدم اب نہ بڑھانا آگے
ہے یہی حدِ ادب ' اس سے نہ آنا آگے''

اپنے رہوار کو راکب نے وہیں روک لیا   اُلٹی چہرے سے نقاب اور یہ زینبؑ سے کہا
''تیری غیرت پہ مری جان ترا باپ فدا   تیری نصرت کے لئے آیا ہے خود شیرِ خدا
آج میں خیموں کے اطراف پھروں گا بیٹی
تو کر آرام ' میں بیدار رہوں گا بیٹی''

اس کے بعد ایک باپ سے بیٹی کے دلخراش بین کو تحریر کیا گیا ہے۔ اس مرثیہ میں وحید اختر یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بعد شہادت حسینؑ حضرت زین العابدینؑ کی بیماری کے باعث اسیروں کے قافلہ سالاری حضرت زینبؑ کو ملی۔ کوفہ کے بازار سے ابن زیاد کے دربار شام تک کے صبر آزما سفر، دمشق کے ہجوم اور دربار ملوکیت میں ساری دنیا کے سامنے یزید کی ادبیوں کو وحید اختر مختصراً بیان کیا ہے۔ پھر وحید اختر کوفہ اور پھر یزید کے دربار میں جناب زینبؑ کے خطبے کو بیان کیا ہے۔ جسنے یزید کے دربار میں تلوار کا کام کیا ہے۔ اس خطبے کے ذریعہ جناب زینبؑ نے اپنے بھائی حسینؑ کے پیغام حق وصداقت کو شام اور کوفہ میں پھلایا ہے۔ جناب زینبؑ کی گویائی سے یزید کے دربار میں کہرام سا مچ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ زینبؑ نہیں بلکہ خود علیؑ بول رہے ہیں۔ لسان زینبؑ نے حسینؑ اور عباسؑ کی شمشیروں سے بھی بڑا کام کیا۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

مسند آرائے حکومت سے کیا ایسے کلام جیسے حاکم نہیں، ہو سامنے اک ادنیٰ غلام
غیظ نے کھینچ لی یوں تیغ خطابت سے نیام عرش سے جیسے علیؑ کے لئے اُتری یو حُسام
آب وہ تیغ زباں میں تھی، اُلٹتے تھے دل
ہونٹ بھی ہلتے ہوئے ڈرتے تھے، کٹتے تھے دل

حضرت زینبؑ کے ان خطبات کو وحید اختر نے شعری زبان میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ان خطابوں کا دربار یزید میں جو اثر ہوا، اس احساس شکست کو بھی انھوں نے صاف اور رواں زبان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد کے بندوں میں وحید اختر نے یزید کا اہل حرم کو قید کا حکم دینا، قید زنداں میں حسینؑ کی بیٹی کا اپنے باپ کے لیے رونا اور قضا کرنا اور ماں کا بیٹی کی لاش پہ ماتم کرنا، ان تمام واقعات کو بیان کیا ہے۔ اس مرثیہ کے تعلق سے کوثر مظہری لکھتے ہیں۔

''حضرت زینبؑ نے حضرتِ حسینؑ کے پیغام حق وصداقت کو کوفہ وشام کے لوگوں تک پہنچایا۔ ان کی یہ تبلیغ صداقت معرکۂ کربلا کے بعد ایک ٹھوس مقصد بن گئی۔ وحید اختر نے اپنے اس مرثیہ میں شعری اوصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے زبان اور نطق کی حیثیت کو برقرار رکھا ہے۔''[۱۱]

شہادت نطق۔ یہ مرثیہ جناب علی اکبر کے حال کا ہے۔ جس میں ۱۹۲ بند شامل ہیں۔ اس مرثیہ میں وحید اختر نے خاموشی اور گویائی کے بیان میں سیاسی اور سماجی زندگی کے بہت سے اہم گوشوں کو گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ اور حقائق کی روشنی میں سکوت کے نقائص اور اس سے پیدا ہونے والے نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے گویائی کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس مرثیہ کے تعلق سے وحید اختر خود لکھتے ہیں۔

''خدا جانے کس طرح ہمارے معاشرے میں یہ خیال عام ہو گیا کہ سکوت عقل وخیر ہے اور نطق وجہِ فساد۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کی ایک نمایاں صفت کلام ہے اور اس کے سارے پیامبر نطقِ خدا ہی کے امین تھے۔ دراصل ہر ظالم نظامِ سیاست ومعاشرت انسانوں کو خاموش رہنے کی تعلیم دیتا ہے کہ اس میں اس کی عافیت ہے۔ زبان کھولنا

تنقید اور بغاوت سمجھا جاتا ہے۔نطق نور ہے،فکر ہے،آزادی ہے،جرأت ہے،فن ہے،تہذیب ہے،اسکے برخلاف سکوت تیرگی ہے،سیاسی ہے،بزدلی و مصلحت ہے،ظلم ہے،ہوس ہے،غلامی ہے،قتل فن وتہذیب ہے۔اسی لئے سارتر نے فرانس پرنازی جرمنی کے قبضے کو''سکوت کی سلطنت'' کا نام دیا ہے۔''[۱۲]

مرثیہ کے آغاز وحید اختر خدا سے نطق کے لئے دعا مانگتے ہوئے کرتے ہیں۔مرثیہ کے چہرے میں جہاں انھوں نے سکوت کی بھیانک صورتوں کا ذکر کیا ہے وہیں اردو زبان کے المیہ کو بھی بیان کیا ہے۔سکوت کے حوالے سے یہ بند ملاحظہ ہو۔

عالم کو بے وقوف بناتی ہے خاموشی تمئیز حسن و قبح مٹاتی ہے خاموشی
خیر اور شر کا فرق اٹھاتی ہے خاموشی حکمت کو زہر جہل پلاتی ہے خاموشی
ہر اک شہید ظلم شہیدِ سکوت ہے
ظالم ہے جس جگہ بھی یزیدِ سکوت ہے

آگے کے بندوں میں وحید اختر نے سکوت کے الگ الگ رنگ بیان کئے ہیں۔اس کے بعد وحید اختر سخن اور نطق کی تعریف بیان کرتے ہیں اس ساتھ ہی ساتھ نطق اور خاموشی کا تضاد بھی نظم کرتے ہیں ۔پھر وحید دعا کرتے ہیں کہ یا رسولؐ اس زبان پر سخت وقت ہے،اس پر زوال چھا رہا ہے تو مدد کر اور اس زبان کو بچاؤ۔پھر اردو زبان کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ وہی زبان ہے جو کبھی ہند میں خاص و عام کی زبان ہوا کرتی تھی ۔یہ زبان ہے جسکی پاکیزگی گنگا اور جمنا کی طرح ہے۔جسکی توقیر گومتی کی طرح ہے۔شاعر آگے کہتا ہے کہ یہی وہ زبان ہے جو محبت کا پیغام دیتی ہے،آزادئ خیال اور شرافت کی زبان ہے۔اسی زبان سے عشق کا اظہار بھی ہوتا ہے۔لیکن آج اس زبان پر زوال چھا رہا ہے۔اور اس کو مٹادینے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔اس مرثیہ کا سب سے اہم حصہ اردو زبان کا المیہ ہے،اور بھرپور انداز میں وحید اختر نے اردو زبان کے حوالے سے اس مرثیہ میں باتیں کی ہیں۔تقسیم کے بعد ہندوستان میں اردو کے ساتھ جو سلوک ہوا اس کا بھی درد اس میں جھلکتا ہے۔یہ زبان آزادی کے بعد سیاست کی نظر ہوگئی،اس سیاست دانوں نے ایک مذہب سے جوڑ کر اسے دیکھنا شروع کر دیا اور اسے نقصان پہنچانے لگے۔وحید اختر کہتے ہیں کہ جب سے اس ملک سے فرنگی گئے ہیں،اس ملک سے بھی زبان کو نکالا جارہا ہے۔لوگ اس زبان کی آشنگی سے انکار کررہے ہیں۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

زنجیر جب سے قید فرنگی کی ہے کٹی یہ قید ہر مقام سے آزاد ہوگئی
آیئن نے کہا کہ ترا گھر ہے بے گھری بن باس پایا لفظوں نے یہ دیکھتی رہی
جو آشنا تھے، شکل بھی پہچانتے نہیں
اپنے ہی گھر کے بچے اسے جانتے نہیں

کچھ گونگے بہرے بیٹھے اسے پوجتے رہے　　بے وارث اس کو جان کے سب لوٹتے رہے
سب قائدانِ قوم اسے بیچتے رہے　　بے وارث اس کو جان کے سب لوٹتے رہے
غیروں نے اس کے دفن کا فرماں اُدھر دیا
اپنوں نے اس کی ہستی سے انکار کر دیا

مرتی زباں کا کوئی زباں داں نہیں ہوا　　فاقے پڑے تو کوئی بھی پرساں نہیں ہوا
جز حرفِ شوق کوئی غزل خواں نہیں ہوا　　اک بے بسی تھی اور کوئی گریاں نہیں ہوا
پایا جو کچھ تو سیکڑوں غم خوار آگئے
ترکے میں حصہ لینے کو حقدار آگئے

اس کے بعد وحید اختر اس زبان کو ہمیشہ سلامت رہنے اور پھلنے پھولنے کی خدا سے دعا کرتے ہیں۔اس کے بعد کے بندوں میں وحید اختر اس گھر کا بیان کرتے ہیں جو نطق کا مکاں ہے اور وہ گھر رسولؐ اکرم کا ہے۔جس کے در پہ فرشتے بھیک مانگنے آتے ہیں۔آگے کے بندوں میں انھوں نے اس گھر کی فضیلت اور عظمت بیان کی ہے۔اس کے بعد امام حسینؑ کے اس خواب کا بیان کیا گیا ہے جس میں قضا کے قریب آنے کی پیشنگوئی ہوئی تھی۔اور وہ جناب علی اکبر کا امتحان لیتے ہیں اور انکو ثابت قدم بھی پاتے ہیں۔پھر وحید اختر جناب علی اکبر کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت علی اکبر کی شباہت ،قد و قامت اور آن بان رسولؐ اکرم کی ہے۔ان کی گویائی رسولؐ کی اور اس گویائی میں بلاغت کا انداز علی کا ہے۔ان کی خصلت رسول کی اور شجاعت علی کی ہے۔وحید اختر حضرت علی اکبر کی تعریف ان خوبصورت بیتوں میں کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو۔

بچپن میں ان کو دیکھ کے ہمت جواں ہوئی　　جب گٹنیوں چلے تو شجاعت جواں ہوئی
ساتھ ان کے ہر دعائے رسالت جواں ہوئی　　یہ جب جواں ہوئے تو شہادت جواں ہوئی
تخلیق کائنات ہے جیسے رسولؐ سے
باغِ حسینؑ تازہ ہے اس ایک پھول سے

یہ ہیں جواں تو حق کی ریاضت جوان ہے　　ماں کا غرور ،بہنوں کی چاہت جوان ہے
زینبؑ کی ایک عمر کی محنت جوان ہے　　غربت میں ابن زہراؑ کی دولت جوان ہے
سب کی دعا یہ ثمرۂ حق لازوال ہو
اس شاخِ گل کو دیکھ کے دنیا نہال ہو

وحید اختر آگے کے بندوں میں کربلا میں علی اکبر کی اذان کا ذکر کرتے ہیں،اور کہتے ہیں کہ اکبر کی اذان شبّیر کے کلام کی طاقت تھی۔یہی اذان تھی جس کو سن کے حُر دشمنوں کی فوج سے راہ راست پہ آ گیا۔وحید اختر اس مرثیہ میں نطق کے سلسلے کو کربلا کی علی اکبر کی اذان سے جوڑتے ہیں کہ اصل میں یہ علی اکبر کی اذان سکوت کے منھ پہ نطق کا بھر پور طمانچہ ہے۔

اکبر کی تھی اذان کہ شمشیر نطق تھی   گردن میں ظلم و کذب کے زنجیر نطق تھی
نادم تھا خودسکوت، وہ تاثیر نطق تھی   منکر در،و دخواں تھے وہ توقیر نطق تھی
ظلمات خاموشی میں پیمبر تھی یہ اذاں
لب تشنگی میں ساقیِ کوثر تھی یہ اذاں

اس کے بعد حضرت علی اکبر کی رخصت، میدان میں بیان رجز اور شہادت کا بیان کیا گیا ہے۔ جس میں وحید اختر نے جذبات نگاری کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔ وحید بیٹے کی لاش پہ بوڑھے باپ کے بین کو دردناک بیت میں بیان کرتے ہیں جس سے سامعین اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پاتا ہے۔ مرثیہ میں فصاحت اور بلاغت کا استعمال بھی بخوبی کیا گیا ہے۔ مرثیہ میں وحید اختر نے استعارہ اور تشبیہ کی عمدہ مثال بیان کی ہے۔

کربلا اے کربلا۔ یہ وحید اختر کا اٹھواں مرثیہ ہے جس کو انھوں نے ۱۹۱ بندوں میں تحریر کیا ہے۔ یہ مرثیہ وحید اختر کا شاہکار مرثیہ ہے۔ یہ مرثیہ کربلا کے شہیدوں کے حال کا ہے۔ ان میں زہیر قین، ابن مظاہر، حرابن یزید ومسیّب خزاعی کے احوال نظم ہیں۔ اس مرثیہ میں وحید احترنے کربلا کو بطور استعارہ استعمال کر کے کربلا کی مذہبی، علمی اور منطقی بلندی کا اظہار کیا ہے۔ اس مرثیہ کے تعلق سے وحید اختر 'کربلا تا کربلا' میں کچھ یوں لکھتے ہیں۔

> ''روایتی مراثی کی طرح اس مرثیے میں کسی ایک شہید کا بیان نہیں، بلکہ ان ناصرانِ حسینؑ کا ذکر ہے جنھیں امام نے خود طلب کیا۔ کچھ کربلا تک پہنچ گئے، کچھ راہ میں رہ گئے۔ کربلا استعارہ ہے منزلِ شہادت کا جو اپنے ناصروں کو آواز دیتی ہے، اب یہ ناصرِ حق کی توفیق پر ہے کہ اسے پالے یا راستے میں تھک کر رہ جائے۔''[۱۳]

مرثیہ کا آغاز میں وحید اختر کربلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے کربلا تو ایک غیر آباد قریہ تھا، تو کس طرح آباد ہوئی، تیری زمین ایسی امتحان کی زمین ہے جس سے اولیا بھی خود کو بچاتے آئے ہیں۔ تیری زمین سے گزر کر ہر نبیوں کو غم میں مبتلا ہونا پڑا ہے۔ تیری ہی زمین پر نوح کا سفینہ پھنس گیا تھا۔ تیری یہ زمین برسوں سے کسی کے غم کا انتظار کر رہی تھی۔ وحید اختر آگے کہتے ہیں کہ اے کربلا تو کس طرح اتنی عظیم بن گئی کہ تیری ایک مٹھی خاک بھی پوری کائنات کے برابر بن گئی۔ شاعر کے ان سوالوں کے جواب میں کربلا جواب دیتی ہے کہ میری زمین ایسی ہے جس پہ انسان کے ضمیر کا امتحان لیا جاتا ہے۔ آگے اپنی عظمت کی بلندی کے سبب کو بیان کرتے ہوئے کربلا کہتی ہے کہ۔

جبر کے پروردگار آئے تو لائے تشنگی   صبر کے پروردگار آئے تو لائے زندگی
رات کے حلقہ بگوش آئے تو آئی خفتگی   صبح کے سجدہ گزار آئے تو لائے نغمگی
حرص کے کاسہ بکف آئے تو صحرا بن گئے
پیاس کے سرمایہ دار آئے تو دریا بن گئے

ظرف تھا جن کا تہی ، پھرے بٹھائے ہر طرف ظرف تھا جن کا سمندر ،آئے وہ ساغر بکف
جو تھے چاہِ زمزم وکوثر کے ساقی کے خلف کربلا کو کر گئے فیضِ رواں ،بحرِ شرف

کربلا پیمانۂ ظرفِ جہاں ہے آج بھی
تشنگی کا ایک دریائے رواں ہے آج بھی

عدل ازل کی آگہی ہے او رابد کا آشنا وہ گریزاں موجِ لمحاتِ گریزاں سے رہا
وقت کے سر چشمۂ تخلیق کا حاکم بنا اس لئے اب تک رضائے وقت ہے اس کی رضا

کربلا دستِ ستم میں حق کی قربانی بنا
دسترس میں عدل کی آیا تو لافانی بنا

آگے کے بندوں میں وحید اختر کربلا کی عظمت بیان کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ کربلا وہ ہے جسکو معراجیت حسینؑ اور ان کی قربانیوں نے بخشی ہے۔کربلا چادر زہراؑ کا وقار ہے، کربلا حیدرؑ کی فکر کا نام ہے، کربلا حضرت امام حسینؑ کے انصاف کا نام ہے۔پھر اس کے اقسام بھی بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد وحید اختر اس قافلے کا ذکر کرتے ہیں جو کربلا میں قربانی دینے جا رہا ہے۔اس قافلے میں شیر خوار بچوں سے لیکر بوڑھے تک ہیں، فاطمہؑ زہرا کی بیٹیوں کے ساتھ ساتھ ان کی بہویں بھی ساتھ ہیں۔

اس کے بعد وحید اختر ظہیر کا ذکر کرتے ہیں جسکو امام حسینؑ خط لکھ کر کربلا میں مدد کے لیے بلاتے ہیں۔اس قافلے کو راستے میں حُرؑ کے لشکر نے روکا۔پھر حضرت حسینؑ کو ان کے بھائی مسلم ابن عقیل کی شہادت کی خبر ملتی ہے۔جو ان کو غمگین کر دیتی ہے۔اس کے بعد وحید اختر حبیبؑ ابن مظاہر کا تذکرہ کرتے ہیں جو امام حسینؑ کے بچپن کے رفیق تھے۔جن کو بلانے کے لئے جناب زینبؑ نے امام حسینؑ سے ذکر کیا تھا۔

وہ حبیبؑ ابن مظاہر،شہ کے بچپن کا رفیق معدنِ عشق حسینی کا درخشندہ عقیق
مرتبہ جس کا بلند اور معرفت جس کی عمیق جس پہ احمدؐ مہرباں تھے،جس پہ حیدر تھے شفیق

موت اسے چھو کر حیاتِ نو کا زینہ بن گئی
زندگی اس کی شہادت کا قرینہ بن گئی

مسلکِ شبّیرؑ کا ایسا شہید بے مثال جس کی دوری کا رہا شاہِ شہیداں کو ملال
جس کو بلوانے کا آیا بنتِ زہراؑ کو خیال ناصرِ حق نے کیا خود جس سے نصرت کا سوال

وہ یگانہ جس کی نصرت پر نبیؐ کو تھا یقیں
وہ مجاہد تیغ پر جس کی علیؑ کو تھا یقیں

اس کے بعد وحید اختر حبیبؑ کی شان وعظمت کا بیان کرتے ہیں۔اور کربلا میں ان کی آمد اور استقبال کا بھی بیان کرتے ہیں۔حبیبؑ کے بعد وحید اختر حُر کا ذکر کرتے ہیں۔جس نے حسینی قافلے کا راستہ روک کر انہیں کربلا جانے پر مجبور کر

دیا تھا۔ وہی حُر صبح عاشور نادم ہوکر حسینی لشکر میں پلٹ آتا ہے۔اور اکیلا نہیں آیا ہے بلکہ اپنے بیٹے اور غلام کو ساتھ لیکر آتا ہے۔ پھر وحید اختر مسّیب کا ذکر کرتے ہیں ۔جسکو حسینؑ کے خط لکھ کر کربلا مدد کے لئے بلوایا تھا۔وحید اختر اس مسّیب کے ذریعہ کربلا کے پورے واقعہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مرثیہ میں وحید اختر لکھتے ہیں کہ حسینؑ کے ناصروں میں ایک نام مسّیب کا بھی تھا، جو اپنا ایک لشکر لیکر حسینؑ کی نصرت کو کربلا کی طرف چلا تھا۔اور راستے میں ایک رات کا آرام انکی زندگی بھر کی محرومی کی تمہید بن گیا۔ یہ اپنے رفیقوں کے اسرار پر مجبوراً ستانے کو ٹھہرے، اور یہ شب شبِ عاشور تھی۔صبح ہونے سے پہلے ہی انھوں نے سفر کے لیے کوچ کیا۔راہ میں ہر منزل پر ہرکارے کربلا کی خبر دیتے رہے۔کربلا کے واقعات کو وحید اختر نے بہت عمدگی کے ساتھ ہرکاروں کی زبانی پیش کیا ہے۔اس مرثیہ کا خاتمہ منزلِ طلب سے محرومی کے ذکر پر ہوتا ہے۔

☆ وحید اختر کی مرثیہ نگاری :

وحید اختر ایک ذہین وفطین شخص تھے۔اور ان کی یہ ذہانت ان کے مرثیوں میں نظر آتی ہے۔وحید اختر کی فکر میں ایک تسلسل ہے جو ان کی غزل، نظم اور مرثیے میں قائم ہے۔ان کے ذہن میں اپنے زمانے کی شہر آشوبیت جاگزیں تھی۔ وحید اختر نے مرثیوں میں حالات حاضرہ کو بطور چہرہ پیش کرنے کے چلن کو مستحکم کیا ہے۔چہرے میں مناظر قدرت، تعلّی اور مناجات کے بند انیسؔ اور دبیرؔ یا دوسرے قدیم مرثیہ گویوں کے یہاں ملتے ہیں۔اگر بغائر دیکھیں تو حالات حاضرہ اور زمانے کی ستم ظریفی کا رشتہ سانحۂ کربلا سے استوار کرنے کا ایک جواز بھی ہے۔وحید اختر کی اس خوبی کا ذکر احمد کفیل نے اپنے مقالے ’جدید اور مرثیہ: روایت وانحراف‘ میں لکھا ہے کہ۔

> ’’ حالات حاضرہ کے لیے کربلا کی معنویت ،امن عالم کی ضرورت اور جنگ کی تباہ کاریوں پر تنقید ان کے مرثیوں کا مرکزی موقف ہے۔‘‘ [۱۴]

موضوع۔ وحید اختر نے اپنے تمام مرثیوں میں علیحدہ علیحدہ موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔یوں تو انھوں نے ۱۶ مرثیے تحریر کیے ہیں لیکن میں نے وحید اختر کے صرف ان آٹھ مرثیوں پر تبصرہ کیا ہے جس کو انھوں نے اپنی کتاب کربلا تا کربلا میں شامل کیا ہے۔ان مرثیوں میں انھوں نے حالات حاضرہ، امن، نطق، پیاس اور چادر تطہیر کو موضوع بنایا ہے۔اس کے علاوہ واقعات کربلا کے متعلق کرداروں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔جس میں حضرت عباسؑ کا دریا پر جانا، سکینہ کا پانی کے لیے فریاد کرنا، علی اصغر کا پیاس سے بے تاب ہونا، علی اصغر کا مسکرا کر گلے پر تیر کھانا، نیز اہل حرم کی قید اور رہائی کو شامل کیا گیا ہے۔شہادت امام حسین کے بعد یزیدی فوج کا غیر انسانی برتاؤ یعنی اہل حرم کو قید کر کے کوفہ بازار میں گھومانا ، جہاں تماشائیوں کا ایک ہجوم تھا۔اس موقع پر جناب زینبؑ کا خطبہ دینا اور تماشائیوں کو صاف لفظوں میں بتا دینا کہ آج تم لوگوں کے سامنے مجبور اور قیدی بنا کر ہمیں جس طرح پیش کیا جا رہا ہے ان میں کوئی بھی غیر معروف شخصیتیں نہیں ہیں بلکہ وہ سب تمہارے نبیؐ کی آل وہی تو ہیں۔ یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

کس قدر غیظ سے فرماتی ہیں بنت حیدر ''حاکمِ ذلّت و ادبار زمیں ! دیکھ ادھر
کھول لب اور بتا، کون ہے جانِ داور کور آنکھوں ہی سے کہہ کون ہے خالقِ کی نظر
کون قرآن کا ہے اور ہے قرآں کس کا
کون محبوب ہے یزداں کا، ہے ایماں کس کا

تو نے کی آج پیاماتِ خدا کی تکذیب تیری باتوں میں ہے آیات خدا کی تکذیب
خود ستائی ہے تیری ذاتِ خدا کی تکذیب ہے عمل تیرا عباداتِ خدا کی تکذیب
ہے خلیفہ تو بڑی چیز تو انساں بھی نہیں
ہو زباں تو کہیں حیواں کہ تو ، حیواں بھی نہیں''

اسلوب۔ جہاں تک اسلوب کی بات آتی ہے اردو شاعری میں ان کا ایک خاص رنگ اور مقام ہے۔ انھوں نے بیابیہ اسلوب میں بھی مرثیے لکھے ہیں اور ڈرامائی انداز میں بھی۔ اس کے مرثیوں میں ربط اور تسلسل کہیں نہیں ٹوٹتا ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نہایت غم انگیز اور اندوناک واقعات کو نہایت بڑے سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی زبان عام فہم زبان نہیں ہے۔ مرثیوں میں انھوں نے کنائیوں، استعاروں اور تشبیوں کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

لازم ہے کہ اس دور کے فرعونوں سے ٹکرائیں واجب ہے کہ نمرودوں کے دوزخ سے گزر جائیں
مل جائے جو شدّادوں کی جنّت بھی تو ٹھکرائیں تخریب کو تعمیر کے آداب بھی سکھلائیں
ہر رنگ میں موجود یزیدانِ زماں ہیں
دنیا متلاشی ہے کہ شبّیر کہاں ہیں

تلوار کی تعریف۔ وحید اختر نے اپنے مرثیے میں تلوار کی تعریف اس طرح کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تلوار تھی کہ ابر میں بجلی مچلتی تھی وہ دھار تھی نگاہ بھی جس پر پھسلتی تھی
رگ رگ میں جوئے غیض اُچھلتی اُبلتی تھی آواز ایک اک بن مو' سے نکلتی تھی
مولا کہیں تو سیل کا رخ موڑ دیں ابھی
تیغ جفا، غرورِ ستم توڑ دیں ابھی

ساقی نامہ۔ وحید اختر نے بھی اپنے مرثیوں میں ساقی نامہ تحریر کیا ہے۔ کربلا تا کربلا کے کچھ مرثیوں میں اس جز کو تحریر کیا گیا ہے۔

چشمِ خرد نواز سے دے جام شعلہ رو نرگس کی چشم سے بھی جو نازک ہو وہ سبو
مے ریز' عطر بیز' جنو خیز' مشک بُو جس سے نمازِ عشق کی خاطر کریں وضو

ہر گھونٹ ہو عبادتِ قلبِ گداختہ
پیمانہ وہ کہ شیشۂ جاں کا ہو ساختہ

منظر نگاری۔ کسی خاص واقعے یا کسی خاص تصویر منظر نگاری کے ضمن میں آتی ہے۔ وحید اختر کے یہاں منظر نگاری کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

ایک منزل ہی چلا ہوگا ابھی یہ کارواں صبح نے روشن کیے آکر زمین و آسماں
روشنی کے لمس سے شبنم ہوئی یوں پر فشاں بھیگی پلکوں پر ہو جیسے مسکراہٹ نغمہ خواں
کھل گیئں کلیوں کی آنکھیں روشنی کی چاپ سے
طبلۂ گل گونج اٹھا دستِ صبا کی تھاپ سے

جذبات نگاری۔ واقعہ نگاری کی ایک قسم جذبات نگاری بھی ہے۔ اس کا اثر انسان کے جذبات واحساسات پر سیدھا ہوتا ہے۔ ایک شخص جس نے کسی واقعہ کو اپنی نظروں سے نہیں دیکھا ہے لیکن جب وہ کسی دوسرے کی زبان سے اُسے سنتا ہے تو اس کے ذہن پر وہی تصویر ابھر کر آجاتی ہے۔ اور وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا ہوگا۔ وحید اختر کے مرثیوں میں جذبات نگاری کی عمدہ مثال ملتی ہے۔ وحید اختر نے ایک باپ اور بیٹی کے جذبات، بھائی اور بہن کے جذبات کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ بعد شہادت امام حسینؑ سکینہ کا باپ کے لیے جذبات کو دیکھئے۔

دوڑ کر گود میں سر شہ کا سکینہ نے لیا چوم کر باپ کے لب زخمِ تمنّا کو سیا
دیر تک شربت ِ دیدار نگاہوں سے پیا ماتمِ کرب و بلا ملِ کے اسیروں نے کیا
روز عاشور پھرا سینۂ صد پاش لئے
کربلا آئی ہے زنداں میں ہر اک لاش لئے

سب تو چلاتے ہیں لیکن ہے سکینہ خاموش کہتی ہے سوتے ہیں بابا، انھیں کچھ بھی نہیں ہوش
بی بیوں کس لئے ہے گریۂ و زاری کا جوش اب نہ چھوڑیں گے شہ دیں کبھی میری آغوش
جاگ اٹھیں وہ تو میں حال اپنا سناؤنگی نہ اب
ان کو غم ہوگا، میں زخم اپنے دکھاؤنگی نہ اب

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں ڈاکٹر وحید اختر جدید مرثیہ اور جدید فکر کے ایک اہم ستون ہیں۔ ان کے تمام مرثیے اپنے آپ میں ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مرثیوں میں حالات حاضرہ، سیاسی و سماجی زبوں حالی اور طبقائی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ ان کی زبان قدیم مرثیوں کی زبان اور طرز ادا سے کافی ملتی ہے۔ کہیں کہیں زبان میں کھردرا پن بھی ظاہر ہوتا ہے۔ وحید اختر کی مرثیہ نگاری کے تعلق سے ڈاکٹر سید قمر عابدی لکھتے ہیں۔

''وحید اختر کے آٹھ (۸) مرثیے اس مجموعے میں شامل ہیں، جبکہ اس سے زیادہ

مرثیے انھوں نے لکھے ہیں۔ان کے مرثیے جدید فکر کے مرثیے ہیں مگر طوالت کے
لحاظ سے وہ قدیم مرثیوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں ۔ چہرہ میں فلسفہ اور حالاتِ
زمانہ سے متعلق موضوعات کا شدّت سے ذکر ہے اور تہذیبی صورتوں کا بھی خیال رکھا
گیا ہے۔مگر کہیں کہیں زبان کھردری بھی نظر آتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ مضمون کو زبردستی
شعری پیرائے میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس وجہ سے مصروں کے بہاؤ
میں کہیں کہیں رکاوٹ دکھائی دیتی ہے۔جہاں تک مضامین کی بات ہے یقیناً ڈاکٹر
وحید اختر نے ان مضامین کو اپنی فکر کے سہارے مرثیوں میں برتا ہے۔جو شائد اس
سے پہلے مرثیے کے لئے اچھوتے تھے۔''[۱۶]

(۳) ڈاکٹر عظیم امروہوی ۔

اردو ادب کے جدید مرثیہ نگاروں میں ڈاکٹر عظیم امروہوی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ان کا تعلق امروہہ کے ایک بڑے زمیندار گھرانے سے ہے۔انکی ولادت ۲۹/اپریل ۱۹۴۵ء کو امروہہ میں ہوئی تھی۔ان کا نام عظیم حیدر ہے۔جب عظیم کی عمر تقریباً ڈھائی سال کی تھی تب ان کی والدہ انتقال کرگئی تھیں، نتیجتاً ان کی پرورش ان کے ننہال میں ہوئی جو کہ امروہہ میں ہی ہے۔اپنی ماں کی موت کا ذکر عظیم کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

> ''میں تقریباً ڈھائی سال کی عمر میں آغوشِ مادری سے محروم ہو گیا تھا۔ ہر چند کی نانی
> مرحومہ کی شفقت نے مجھے اس محرومی کا کافی حد تک احساس نہیں ہونے دیا اور کم سنی
> میں اپنی نانی مرحومہ کو ہی میں ماں سمجھتا رہا۔''[۱۷]

عظیم کی ابتدائی تعلیم ان کے نانا مختار حسین نقوی اور اکرم حسین نقوی کے زیرِ نگرانی ہوئی۔۱۹۶۲ء میں امام المدارس انٹر کالج امروہہ سے ہائی اسکول،۱۹۶۴ء میں ہندو کالج سے انٹر اور ۱۹۶۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔کام پاس کیا۔پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری عظیم نے روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے لی۔اس کے علاوہ جامعہ اردو علی گڑھ سے انھوں نے ادیب کامل،الہ آباد سے دبیر فاضل کی ڈگری حاصل کی۔عظیم نے اپنی ملازمت کا سلسلہ حکومت ہند کے محکمۂ خراک میں ۱۹۶۸ء سے شروع کیا۔اور اسی محکمہ سے اکاونٹ آفیسر و انتظامیہ آفیسر کی حیثیت سے نوکری کرنے کے بعد ۲۰۰۵ء میں سبکدوش ہوئے۔

عظیم امروہوی نے اپنی شاعری کا آغاز ۹۔۱۰ برس کی عمر سے ہی کر دیا تھا۔جب تک وہ امروہہ میں رہے اصلاح بیت مولانا سید محمد عبادت کلیم سے کیا کرتے تھے۔لیکن جب یہ لکھنؤ مقیم ہوئے تو وہاں عاصیؔ لکھنوی اور فضلؔ لکھنوی سے اصلاح کرتے تھے۔عظیم امروہوی نے تقریباً سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔نثر اور نظم میں تقریباً آٹھ کتابیں ہندوستان و پاکستان میں شائع ہو چکیں ہیں۔عظیم کی انہیں خوبیوں کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ۔

''عظیم امروہوی صاحب بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔شاعر بھی نہایت قادرالکلام ہیں اور مختلف اصناف سخن میں داد دے کر اپنا سکّہ جما چکے ہیں۔انھوں نے جدید وضع کے مرثیہ بھی کہے ہیں۔جن سے علوے نفس، ایثار و قربانی،خودداری،حق گوئی، بے با کی، پامردی، بلند ہمتی اور سرفروشی کی اعلیٰ اقدار کی ترویج کو تقویت ملتی ہے۔''۱۸؎

مرثیہ کے علاوہ عظیم امروہوی کے سلام اور قصیدہ کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی ۳۰ سے بھی زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں،جن میں تحریک نینوا، میرے خوابوں کا جہاں،شرع غم،حسین اور زندگی،مفسر نور،آفتاب انقلاب،نقش حیات،طواف نور، رسولیات،ہلال غم ،یادیں،معراج سخن،شمیم عطش،سلام عظیم ،اتحاد اسلامی،مرثیہ نگارانِ امروہہ اور مراثی عظیم خاص ہیں۔حسین اور زندگی اور قرآن اور حسین ان کا مرثیہ ہے جو کتاب کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ سلامِ عظیم ان کے سلاموں کا مجموعہ ہے جس میں ۱۶۱ سلام اور ۲۵ سلامیہ نظمیں شامل ہیں۔مراثیِ عظیم میں ان کے اب تک کے تمام مرثیے ملتے ہیں۔اس کتاب میں عظیم کے ۲۵ مرثیے موجود ہیں، جو اپنے موضوع،اندازفکر،اسلوب اور لب ولہجہ کی انفرادیت کی بنا پر اہمیت کے حامل ہیں۔ان مرثیوں میں جدید فکر اور اثری تقاضے واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔زیادہ تر یہ مرثیے موضوعاتی ہیں،مثلاً حسینؑ اور اتحاد، فاتحِ نفس،حسینؑ اور رسول،حسینؑ اور قرآن، ہوا اور چراغ،اسلام اور فسادات، اسلام اور وقت شناسی،قرآن وفا،فرض اور کربلا اور عظمت علم۔عظیم امروہوی کی اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ۔

''مرثیہ عظیم''بہت پسند آیا۔اس کی زبان الفاظ کی نشست و برخاست ترکیبوں کی بندیش اور شکوہ الفاظ کا انتخاب واقعی قابل تعریف ہے۔ ہندوستانی مرثیہ گو شعراء میں عظیم امروہوی کو اپنے رنگ کی وجہ سے انفرادیت حاصل ہے۔''۱۹؎

حسین اور زندگی۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے مرثیہ نگاری کی ابتدا ۱۹۷۲ء میں''حسین اور زندگی'' سے کیا تھا۔اور یہ پورا مرثیہ ۱۹۷۵ء میں انجمن جاں نثاران حسینؑ امروہہ کے زیر اہتمام روہیلہ پرنٹ رامپور سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔یہ مرثیہ ۶۵ بندوں پر مشتمل ہے۔مرثیہ کی ابتداء عظیم امروہوی زندگی کی مختلف تعریفیں،تصویریں اور تعبیریں پیش کر کے کرتے ہیں۔زندگی کی تعریف کرنے کا ہنر عظیم کے پاس بہت عمدہ ملتا ہے۔

'' زندگانی کے مسائل سے ڈرے جاتے ہیں
پھر بھی جینے کو سب انسان ،مرے جاتے ہیں''

اس کے بعد مرثیہ میں زندگی کے بارے میں دانشوروں اور مفکروں کے کیا نظریات ہیں اس کا بیان بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ گوتم کا ہی رستہ ہے حیات — کوئی کہتا ہے کہ نانک کا ہی جادہ ہے حیات
کوئی کہتا ہے دیانند کی شردھا ہے حیات — کوئی کہتا ہے کہ تقدیر کا لکھّا ہے حیات

زندگی وہ بھی جو تقدیر بدلنے والی
زندگی وہ بھی جو شعلوں میں ہے چلنے والی

کوئی کہتا ہے کہ سقراطؔ کا پیالہ ہے حیات کوئی کہتا ہے فلاطون کا جادہ ہے حیات
کوئی کہتا ہے کہ لینن کا ہی کہنا ہے حیات کوئی کہتا ہے ارسطوکا عقیدہ ہے حیات
کوئی کہتا ہے کمیونزم کا شہکار ہے یہ
انیجلؔ و مارکسؔ کا سرمایۂ افکار ہے یہ

اس کے علاوہ اس مرثیہ میں عظیم امروہوی نے حقیقت زندگی سے رسول اور آلِ رسول کی واقفیت کو بیان کیا ہے۔ پھر مدح امام حسین، پیغام حسین اور پھر مختصر طور پر کربلا میں دیگر شہیدوں کی جنگ کو بیان کرتے ہوئے امام حسینؑ کی میدان وغا میں جانے کی رخصت کو بیان کیا ہے۔ رخصت کے بندوں میں ایک باپ اور بیٹی کے بچھڑنے کو پر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مرثیہ میں جنگ اور پھر امام حسینؑ کی شہادت بیان کی گئی ہے۔ مرثیہ میں بین کے بند میں پیش کئے گئے ہیں جو بہت پر اثر ہیں۔

رو کے زینب یہ پکاری مرے پیارے اٹھو فاطمہ زہرا کے اے راج دلارے اٹھو
اے حسینؑ ابن علیؑ دیں کے سہارے اٹھو فلک حق و صداقت کے ستارے اٹھو
اٹھو بھیّا یہ بہن تم پہ ہو واری اٹھو
دیکھو اماں کی بھی آئی ہے سواری اٹھو

دوسرے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کی طرح عظیم کے اس مرثیہ کے مصائب کے بندوں میں بیجا چیخ پکار نہیں ملتی بلکہ اہلبیت کے شایانِ شان غم والم کا اظہار پاتا ہے۔ مرثیہ میں انھوں نے قدیم مرثیوں کی طرح پورے اجزاء کا استعمال تو کرتے ہیں مگر ساقی نامہ سے گریز کرتے نظر آتے ہیں اس کے علاوہ کہیں کہیں ربط وتسلسل کی کمی بھی نظر آتی ہے، مگر چونکہ یہ عظیم امروہوی کا پہلا مرثیہ ہے اسلئے ظاہر ہے کہ اس میں وہ پختگی نہیں ملے گی جو انکے دوسرے مرثیوں میں ملتی ہے۔

حسینؑ اور رسولؐ۔ ان کا دوسرا مرثیہ ''حسینؑ اور رسول'' ہے جسکو انھوں نے ۱۹۷۵ء میں مکمل کیا۔ اس سے پہلے اس کے مرثیہ کے کچھ بند کئی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور ان کے تمام مرثیوں میں یہ مرثیہ سب سے زیادہ شائع ہوا ہے۔ یہ مرثیہ ٦٦ بندوں پر مشتمل ہے۔ مرثیہ کا آغاز عظیم قبل اسلام غیر اخلاقی انسانی زندگی کو پیش کرتے ہوئے کرتے ہیں۔ جس میں معاشرے میں ہو رہے انسانی قدروں کے فقدان کو بیان کیا گیا ہے۔

ہر سمت تیرگی تھی کہیں روشنی نہ تھی ہر گام رہزنی تھی فقط رہبری نہ تھی
ہر موڑ پر تھا جہل مگر آگہی نہ تھی محفوظ آدمی کی غرض، زندگی نہ تھی
خوں ریزی وفساد کے ڈیرے تھے ہر طرف
منصف تھے خال خال لٹیرے تھے ہر طرف

قبل اسلام جہالت کا دور تھا اور اس وقت لوگ کئی کئی خداؤں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ انسانی زندگی میں بے راہ روی پھیلی ہوئی تھی، اور انسانیت کسی مصلح کو پکار رہی تھی۔ ایسے میں آمنہ کے لال نے لبیک کہا اور معاشرے میں پیغام اسلام پھیلانے لگا، جس سے انسانی قدروں میں فروغ ہوا۔ اس کے بعد مرثیہ میں عظیم کے کچھ نعتیہ اشعار کا شمار کیا ہے۔ پھر مدح حسین بیان کرتے ہوئے رسول اکرم اور حسینؑ مظلوم کی مماثلت کو پیش کیا ہے۔

''وہ دین کا چمن ہیں، یہ اس کی شمیم ہیں
خُلق ِ عظیم وہ ہیں یہ ذبحِ عظیم ہیں''

اس کے بعد مرثیہ میں کارنامہ حسینی کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ جس میں حسین کا مدینہ چھوڑنے، خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹانے اور اسلام بچانے کا ذکر کیا ہے۔ پھر تلوار کی تعریف کرتے ہوئے عظیم نے ذوالفقار اور فقروں میں یکسانیت بتائی ہے۔

''فقروں کی طرح چبھتی تھی ہر گام ذوالفقار
اس وجہ سے خدا نے رکھا نام ذوالفقار''

بعد تلوار کی تعریف عظیم چار بندوں میں جنگ کے مناظر بیان کرتے ہوئے شہادت کا بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ظالم شہ کے سوکھے گلے کو کاٹتا ہے پھر بھی حسینؑ اپنے نانا کی امت کی بخشش کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ بین کے جز کو عظیم نے بہت پر اثر طریقے سے بیان کئے ہیں جسے سن کے سامعین کی آنکھیں خود بہ خود نم ہو جاتی ہیں۔

بتلاؤ جا کے بالی سکینہ سے کیا کہوں کلثوم سے میں اور رُقیہ سے کیا کہوں
بانوئے نیک نام سے لیلیٰ سے کیا کہوں بھیا! بتاؤ عابدؑ خستہ سے کیا کہوں
دیکھو تو بھائی کتنی پریشان ہے بہن
جنگل ہے اور بے سرو سامان ہے بہن
میں کب سے دے رہی ہوں دہائی جواب دو دیتا نہیں ہے کچھ بھی دکھائی جواب دو
جائے کدھر یہ غم کی ستائی جواب دو بھائی جواب دو، مرے بھائی جواب دو
زہراؑ پکاریں زینبؑ دلگیر الوداع
مقتل میں سو گیا مرا شبیرؑ الوداع

مرثیہ کے آخری بندوں میں عظیم نے بارگاہِ نبی میں اپنی مرثیہ قبول ہونے کی اور دوبارہ کربلا کی زیارت کرنے کی دعا کرتے ہیں۔ جو مئی ۲۰۱۳ء میں قبول بھی ہوگئی۔ عظیم نے اس مرثیہ کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں تفکر اور تصوّف کی چاشنی نظر آتی ہے۔ اور اس طرح انھوں نے ایک نئے انداز سے مرثیہ کو پیش کیا ہے۔ اس میں مرثیہ کے قریب قریب سبھی عناصر پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ رخصت، سراپا، آمد، جنگ، شہادت اور بین کے مناظر کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

حسینؑ اور قرآن۔ عظیم امروہوی کا ایک مرثیہ ''حسینؑ اور قرآن'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پہ عظیم سے پہلے بھی دلوّ رام کوثرؔی نے ۱۹۲۸ء اور نسیم امروہوی نے ۱۹۷۶ء میں مرثیہ کہہ چکے ہیں۔ اور اگر ان تینوں کی مرثیہ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نسیم اور عظیم کا مرثیہ بہت الگ ہے مگر دِلّو رام کوثرؔی کے مرثیہ کے کچھ مصرے عظیم کے مرثیہ کے مصرے کے ساتھ یکسانیت رکھتے ہیں مثلاً

دِلّو رام کوثری۔	یوسف کا سورہ ہے علی اکبرؑ سامہ لقا
عظیم امروہوی۔	یوسف کا سورہ، صورت ہمشکلِ مصطفیٰ
اسی طرح دلّو رام کوثری ۔	حرِ دلیر سورۂ توبہ ضرور ہے
عظیم امروہوی۔	حرِ جری ہیں، سورۂ توبہ بنے ہوئے

''حسینؑ اور قرآن''، عظیم امروہوی کے شاہکار مرثیوں میں سے ایک ہیں۔ اس مرثیہ میں ۲۷ بند شامل ہیں۔ مرثیہ کے آغاز میں انھوں نے علم کی ابتدا اور آسمانی کتابوں کے بارے میں بتایا ہے۔ اس مرثیہ میں انھوں نے قرآن کے نازل ہونے سے قبل جو آسمانی کتابیں زمین پر تھیں اور اس کے علاوہ وہ تمام مذاہب کی نمائندہ کتابوں، خاص طور سے ہندو مذہب کی کتابوں کا بڑے اچھے انداز میں تذکرہ کیا ہے۔

اتنی قدیم تیس صدی کی ہے یہ کتاب ایلیاڈؔ کا دیا جسے یونان نے خطاب
اس دور کی حیا ت میں لایا جو انقلاب ہے اپنے وقت کا وہ صحیفہ بھی لا جواب
اپنی جگہ پہ کرشن کی گیؔتا بھی فرد ہے
مغرب کی خاک جس کے مقابل میں گرد ہے

عظمت کا چاروں ویدوںؔ کی ہے معترف جہاں رامائن ایسی نظم جو ہے نازشِ جہاں
پھر بھی گروگرنتؔی بھی اک نقشِ جاوداں یہ سب ہیں خوب چشمِ حقیقت میں بے گماں
ان سب میں ذکر ہے اُسی پروردگار کا
سب دے رہی ہیں درس محبت کا، پیار کا

اس کے بعد عظیم امروہوی قرآن حکیم کے ذیل میں، اس سے قبل نازل ہوئی تینوں آسمانی کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

توریتؔ جس کا نام ہے حق کا پیام ہے بے مثل زبوؔر کا بہت اعلیٰ مقام ہے
انجیلؔ عیسوی بھی خدا کا کلام ہے ان میں مگر پیامِ ازل نا تمام ہے
لازم یہ تھا کتاب وہ اب معتبر ملے
دامن میں جس کے خلق کو ہر خشک وتر ملے

اس بند کے بعد عظیم قرآن کے ذیل میں بند تحریر کرتے ہیں کہ قرآن کا آنا کیوں اہم تھا آنے کے کیا وجوہات

تھے اور وہ انسان کے لئے کیوں ضروری ہے۔ پھر وہ جدید علوم، سائنس وغیرہ کے حوالے سے قرآن کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ قرآن کے نزول کی ابتدا اور اختتام کا ذکر، اس کے پارے، منازل، سورتوں کا معلوماتی تذکرہ بھی وہ اس مرثیہ میں بڑی فنکاری کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی قرآن کا اس دور کی ضرورتوں کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے عظیم نے بڑے بند پیش کئے ہیں۔ قرآن کے حوالے سے بند نظم کرنے کے بعد عظیم قرآن اور اہلِ بیت اور قرآن اور حسینؑ کے حوالے سے بند پیش کرتے ہیں۔

فرما گئے ہیں صاف یہ سردارِ انبیاء دو چیزیں چھوڑ کر میں تمہارے لئے چلا
ان سے ہی مل سکے گا تمہیں حق کا راستہ آپس میں یہ کبھی نہیں ہونے کے ہیں جدا
دنیا میں رہ کے دین کا رستہ دکھائیں گے
کوثر پہ ساتھ ساتھ مرے پاس آئیں گے

قرآں ہے راز، معنئِ قرآں ہیں اہلبیتؑ یعنی زبانِ فخر رسولاں ہیں اہلبیتؑ
جانِ عمل ہیں پیکر ایماں ہیں اہلبیت نکتہ شناس مرضی یزداں ہیں اہلبیت
یہ جس مقام پر بھی ہیں قرآں سمیت ہیں
قرآن جس جگہ ہے وہیں اہلبیتؑ ہیں

اس کے بعد عظیم قرآن کی بے حرمتی کے دور کا بیان کرتے ہیں، پھر امام حسینؑ کی منقبت جدید انداز میں بیان کرتے ہوئے اپنے انصار واقروباء کی شہادت کا ذکر کرتے ہیں اور آخر میں شہادت علی اصغر کا بین بڑے پراثر انداز میں کرتے ہیں۔

یہ سن کے حرملہ نے سنبھالی وہیں کماں جوڑا پھر اس میں تیر ستمگر نے نا گہاں
تا کا جو حلق اصغر بے شیر و بے زباں کانپے طبق زمیں کے، لرز اٹھے آسماں
ظالم کا تیر گردنِ بے شیر پر چلا
آگے بڑھا تو بازوئے شبیرؑ پر چلا

اس مرثیہ میں انھوں نے زبان سادہ اور صاف استعمال کی ہے۔ مرثیہ میں جدید فکر کے مدنظر مصائب میں اعتدال ملتا ہے۔ بے جا چیخ پکار و آہ و بکا نہیں ہے مگر مصائب سن کر سامعین اپنے آنسوؤں کو روک بھی نہیں پاتا ہے۔ مرثیہ میں عظیم نے مصائب کے بند بہت کم رقم کئے ہیں جو تشنگی کا احساس ضرور کراتے ہیں۔

سفر تشنگئ عشق۔ عظیم امروہوی کا ایک مرثیہ ''سفر تشنگئ عشق'' بھی ہے جو ۱۹۹۱ء میں شیعہ لکھنؤ محرم نمبر میں شائع ہوا تھا۔ یہ انکا ایک شاہکار مرثیہ ہے جو علامات کی صورت میں ہے۔ جسکو علامتی مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔ اس مرثیہ کے تعلق سے عظیم امروہوی اپنی کتاب ''مراثی عظیم'' میں لکھتے ہیں کہ۔

''اردو شاعری میں علامتی اظہار کا سلسلہ باقاعدہ طور پر اب کافی لمبے عرصے تک جاری ہے۔ جب یہ سلسلہ بڑھتا رہا تو ایک دن خیال آیا کہ اس اعتبار سے مرثیہ کہاں پیچھے رہے۔ اردو شاعری کی دیگر اصناف سخن میں جب علامتی اظہار اختیار کیا جا سکتا ہے تو مرثیہ میں بھی یہ بات ممکن ہے اور یہ اسلوب ایک بیانیہ نظم میں اختیار کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ یہی سوچ کر یہ مرثیہ کہنا شروع کیا اور اس کوشش میں خدا کا شکر ہے کامیابی بھی حاصل ہوئی۔''[20]

اس مرثیہ کا عنوان سفر ہے اور عظیم مرثیہ کی ابتدا بھی سفر کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ کائنات کی ہر شے سفر میں ہے اور اگر ایک بھی شے رک گئی تو یہ دینا درہم و برہم ہو جائے گی۔ ہر شے کے لئے سفر کی ضرورت کو بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ۔

جینے کے لیے نقل مکانی ہے ضروری　　یہ گردشِ افلاک و زمانی ہے ضروری
ذی روح کو جس طرح سے پانی ہے ضروری　　پانی کو بھی ویسے ہی روانی ہے ضروری
کوئی نہ یہاں پر کسی عنوان ہے زندہ
گر خون سفر میں ہے تو انسان ہے زندہ

مرثیہ کو آگے بڑھاتے ہوئے عظیم حسینؑ کے قافلے کے سفر کے آغاز کو بیان کرتے ہیں۔ اور ان قافلے والوں کی تعارف وتوصیف بیان کرتے ہیں۔ اور ان کے عزم اور ارادے کا بیان کرتے ہیں۔ ان کے اصلحہ کی خوبی اور ان کو بدن پہ سجانے کا بیان کرتے ہوئے عظیم عصرے یزید کی جھلک بھی دکھاتے ہیں۔ اس کے بعد میدان جنگ کے مناظر کا بیان کرتے ہیں۔ عظیم جنگ کے میدان میں حسینؑ کی علامت نور، تشنگئ عشق کے آقا اور رہنما سے دیتے ہیں۔ بیان میدانِ جنگ کے بعد عظیم نے پانی اور پیاس کی جنگ کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے جو ان کی محنت اور عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔ پانی اور پیاس کی جنگ کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

تاریخ کی یہ سب سے انوکھی ہے کہانی　　چھینی ہے رگِ خشک نے خنجر سے روانی
سیرابیوں سے جیت گئی تشنہ دہانی　　ہے تاج عطش سر پہ تو ٹھوکر میں ہے پانی
اس پیاس کا دنیا میں تو ثانی نہ ملے گا
تا حشر بھی اب ظلم کو پانی نہ ملے گا

اک پیاس نے ہی چھین لی دریا کی ترائی　　اور راہ سے کانٹوں کی ہر اک فوج بھگائی
پانی کے کلیجے میں عجب آگ لگائی　　اس طرح سے پانی کی مٹائی ہے خدائی
ہر لب پہ اسی پیاس کا چرچا ہے ابھی تک
پانی پہ بھی اس پیاس کا قبضہ ہے ابھی تک

وہ پیاس تو ہر ایک مصیبت سے لڑی ہے　　وہ جاہلیت اور جہالت سے لڑی ہے
وہ پیاس تو سورج کی تمازت سے لڑی ہے　　وہ پیاس تو انساں کی رعونت سے لڑی ہے
اس پیاس نے نیزے کی انی موڑ کے رکھ دی
اس پیاس نے تیروں کی کمر توڑ کے رکھ دی

پیاس اور پانی کی جنگ کے بعد عظیم نور اور ظلمت کی جنگ کو بیان کرتے ہیں یہاں نور حسینؑ اور ظلمت یزیدی فوج ہے۔ جس پہ نور اور پیاس کی فتح ہوتی ہے۔ پھر خیام حسینی میں آگ لگنا اور نیروں کی انی پر شہیدوں کے سروں کو چڑھانے کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اہل حرم کے قید ہونے اور ان کے بے پردگی کے بیان کو بہت دردناک انداز میں پیش کیا ہے۔ قربانی حسینؑ کا کائنات پہ جو اثر ہوا ہے اس کا بیان عظیم کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

اک درد پہاڑوں کے بھی سینے میں اٹھا ہے　　اور ارض و سماوات سے گریہ کی صدا ہے
حد ہے کسی ذی روح نے پانی نہ پیا ہے　　وہ غم ہے کہ ہر ذرے کا دل بیٹھ چکا ہے
اک بولتا قرآن جو خاموش ہوا ہے
کعبہ بھی اسی غم میں سیہ پوش ہوا ہے

عظیم مرثیہ کے آخر میں اپنی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔ ویسے یہ بھی سچ ہے کہ مرثیہ نگاری کی تاریخ میں شاید ہی کسی مرثیہ نگار نے علاماتی مرثیہ کی تخلیق کی ہوگی۔ مرثیہ میں ندرت اور جدّت صاف نظر آتی ہے۔ مرثیہ کی زبان بھی صاف اور سادہ استعمال کی گئی ہے۔ عظیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے سید معروف حسین نقوی لکھتے ہیں کہ۔

''خدا کا شکر ہے کہ اس جدید دور میں بھی دو ایسے مرثیہ نگار ہیں جن کے کلام کو فخر کے ساتھ انیسؔ اور دبیرؔ کے مقابل رکھ سکتے ہیں۔ ان میں ایک نام ڈاکٹر وحیدؔ اختر کا ہے اور دوسرا نام بلا شبہ صرف اور صرف عظیم امروہوی کا ہوسکتا ہے۔'' ۲۱

حسینؑ اور اتحاد۔ عظیم امروہوی کا ایک اور مرثیہ ''حسینؑ اور اتحاد'' کے عنوان سے بھی ملتا ہے۔ یہ مرثیہ ۶۹ بندوں پر مشتمل ہے۔ جسکو عظیم نے ۱۹۸۳ء میں لکھنا شروع کیا اور تقریباً ایک سال میں اسکو مکمل بھی کرلیا۔ یہ مرثیہ آج کے مسلمان قوم میں اتحاد کی کمی کا احساس دلاتی ہے۔ مرثیہ کے عنوان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ جوشؔ کے انقلابی مرثیہ ''حسینؑ اور انقلاب'' کے طرز کا ہے، اور مرثیہ کی بحر بھی وہی ہے۔ اس مرثیہ کے تعلق سے عظیم لکھتے ہیں کہ۔

''جب جب قوم وملت اور ملک میں شیرازہ منتشر ہوتا محسوس ہوتا ہے اور دکھائی دیتا ہے تب تب اتحاد قومی اور اتحاد ملک کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے احساسات نے اس مرثیہ کے کہنے کی تحریک پیدا کی اور یہ مرثیہ شروع ہوگیا۔ اس مرثیہ کے کہنے کے دوران یہ بھی احساس ہوا کہ اسلام نے خاص طور سے اتحاد کی تعلیم دی ہے اور ملت

اسلامیہ ہی سب سے زیادہ غیر متحد ہے۔''۲۲؎

مرثیہ کے ابتدائی بند اتحاد کی وضاحت اور ضرورت کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔اور پھر ہمارے معاشرے اور خاص کر مسلمان قوم میں اتحاد کی ضرورت اور اہمیت کو بیان کیا ہے۔مرثیہ میں عظیم نے اتحاد کی تشریح کرتے ہوئے اس کے فوائد کو بیان کیا ہے،اور بتایا ہے کہ اتحاد ہی وہ شہ ہے کہ جس سے معاشرے میں عزت اور وقار باقی رہتا ہے۔اور ساتھ ہی اتحاد کے فقدان سے ہونے والے نقصانات کو بھی تحریر کیا ہے۔عظیم آج قوم میں اتحاد نہ ہونے پر نازاضگی کا بھی اظہار کرتے ہیں۔عظیم مسلمانوں کو ملت سے رہنے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں ملت واتحاد نہ ہوگا تو دوسری قومیں اس کو ٹیرارسٹ قرار دیتے ہوئے یوں ہی اس کا استحصال کرتی رہے گی۔

جب ہم نے حق کا کردیا فرمان منتشر مسلک ہیں منتشر کہیں ایمان منتشر
بھڑکائے سے ہیں ،غیروں کے نادان منتشر ہیں آج سب سے بڑھ کے مسلمان منتشر
دنیا نے ہر برائی کا الزام رکھ دیا
حد ہے کہ ٹیرارسٹ بھی اک نام رکھ دیا

مرجھا چکے ہیں گلشن عزو شرف کے گل ہے تیل گھر میں پھر بھی ہیں اپنے چراغ گل
ہم نے بھلا دیا ہے پیامِ شہِ رسل جاگی اگر نہ قوم تو پھر قوم کا ہے قل
کیوں ذہن آج، فتنہ گروں کا غلام ہے
کیوں دستِ غیر میں یہ معاشی نظام ہے

''ہے تیل گھر میں'' سے مراد عظیم قرآن مجید اور اسلامی کتابوں سے ہے جس میں زندگی کے جینے کے طور طریقے اور رسول اکرم کے پیغامات درج ہیں مگر انسان ان سب چیزوں کو نظر انداز کئے بے غیرتی کی زندگی جیئے جارہا ہے۔اور بتاتے ہیں کہ دین اسلام میں جو عبادات مقرر کی گئی ہے اس میں بھی اتحاد کا درس پوشیدہ ہے۔اس کے بعد عظیم رسول کے اتحاد کے پیغام کو تحریر کرتے ہوئے مدحت حضرت علیؑ بیان کرتے ہیں۔پھر امام حسینؑ کی وہ تعلیم جو انھوں نے اتحاد کے تعلق سے دی تھی بیان کرتے ہیں۔

شبیّر کا ہے درس، سدا متحد رہو جینے کا ہے اسی میں مزا، متحد رہو
انساں کی ہے اسی میں بقا ،متحد رہو آتی ہے کربلا سے صدا متحد رہو
جو قوم متحد ہے وہی کامیاب ہے
گر متحد نہیں ہے،تو مٹی خراب ہے

اس کے بعد کربلا میں مجاہدین کس طرح سے اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کا بھی بیان کرتے ہیں۔پھر امام حسینؑ کے فضائل بیان کرتے ہوئے کربلا میں حسینؑ کے انصار اور بنی ہاشم کی شہادت کا ذکر کرتے ہیں۔اس کے بعد شامِ غریباں کے مناظر کو دردناک انداز میں بیان کرتے ہیں۔مرثیہ کے مقطع کے بند میں عظیم قوم میں اتحاد قائم ہونے کی دعا کرتے

ہیں۔

فاتحِ نفس۔ عظیم کا اگلا مرثیہ ''فاتحِ نفس'' ہے۔جس کا مطلب اپنے نفس پر فتح پانا ہے۔ یہ مرثیہ حضرت علیؑ کی شان میں لکھا گیا ہے، جس میں حضرت علیؑ کو بحیثیت فاتحِ نفس پیش کیا گیا ہے۔ مرثیہ کے شروع میں شجاعت کا معنی بتاتے ہوئے نفس پر قدرت حاصل کرنے اور نفسِ امّارہ سے جنگ کے فوائد بتائے گئے ہیں۔ یہ مرثیہ ۷۵ بندوں پر مشتمل ہے۔ مرثیہ میں عظیم نے نفس کے بارے میں رسول اکرم، حضرت علیؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ کے جو قول ملتے ہیں اس کا بیان بھی عمدہ جملوں میں کیا ہے۔

نفس سے جنگ حقیقت میں ہے انسان کی ڈھال — نفس کے واسطے کیا کیا ہیں نبی کے اقوال
نفس سے جنگ چھڑاتی ہے رہِ بد اعمال — نفس سے جنگ عطا کرتی ہے تقوے کو کمال
ہے یہی جادہ تسلیم و رضا کی پہچان
اپنے ہے نفس کی پہچان، خدا کی پہچان

نفس سے جنگ ہمیشہ رکھو اس طرح سے یاد — کر گئے ہیں بخدا موسی کاظمؑ ارشاد
نفس بر پا نہ کرے، دل کی حویلی میں فساد — جس طرح دشمن ا سلام سے ہوتا ہے جہاد
نہ زمانے سے لڑو، اور نہ دنیا سے لڑو
نفس کی اپنے ہر اک خواہش بے جا سے لڑو

نفس سے جنگ ہے معیار شریف النسبی — نفس کے باب میں مشہور ہیں اقوال علی
نفس سے جنگ ہے دراصل دلیل حسبی — نفس سے جنگ حقیقت میں ہے ایک دیدہ وری
دوسروں کو جو کرے زیر، قوی ہوتا ہے
نفس پر فتح جو پائے، تو ولی ہوتا ہے

اس کے بعد عظیم امروہوی ہجرت کی شب کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح علیؑ رسول کے بستر پہ سو جاتے ہیں جس سے رسول کی جان دشمنوں سے بچ جاتی ہے۔ عظیم عمرو ابن عبدود سے جنگ کا واقعہ بھی بیان کرتے ہیں۔ جس میں حضرت علیؑ نے اپنے غصہ آنے پر دشمن کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اپنا غصہ تھا جو ذاتی، نہ اتارا اس دم
نفس مارا وہاں، دشمن کو نہ مارا اس دم

عظیم حضرت علیؑ کی جنگ کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ علیؑ اپنے دشمن پر تلوار چلانے سے پہلے اس کی آنے والی سات پشتوں پر نظر ڈالتے ہیں، کہ اگر ان میں ایک بھی مومن ہوگا تو وہ اس دشمن کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اس طرح رہ اسلام کے مستقبل کو سوارتے ہیں ۔اس کے بعد رسول اکرم کی وفات کے بعد علیؑ کے صبر وضبط کو بیان کرتے ہیں۔ پھر علیؑ کی مسجد کوفہ میں شہادت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی سخاوت کی تعریف کرتے ہیں کہ علیؑ زخمی حالت میں بھی

اپنے حصّہ کا شربت اپنے دشمن کو پلوا دیتے ہیں۔

گھر میں اللہ کے، مولا کی یہ نکلی حسرت زخم روزے میں جو کھایا تو نہ سنبھلی حالت
پھر بھی قاتل کے لئے دل میں نہ ابھری نفرت یہی فرمایا تھا، جب سامنے آیا شربت
مارا جائے مرا قاتل ، نہ ستایا جائے
پہلے شربت بن ملجم کو پلایا جائے

اس کے بعد عظیم مسلمان قوم کا ذکر کرتے ہیں کہ قوم نفس پرست ہوگئی ہے۔آج ہم سب نفس کے غلام بن چکے ہیں۔چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہی ہم کو جلال آنے لگتا ہے۔ ہمارا نفس ہم کو امّارا کی طرف لے جاتا ہے جس سے ہم کسی مجبور اور بے بس پر رعب جمانے لگتے ہیں۔عظیم امروہی اسی نفس امّارہ کو قابو میں رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ اگر ہم نے حضرت علیؑ سے نفس پر قابو کرنا سیکھ لیتے تو آج یہ فتنہ فساد نہ ہوتا۔اس کے بعد عظیم مدحت حضرت علیؑ بیان کرتے ہوئے امام حسینؑ کا جہاد نفس پیش کرتے ہیں۔

مصائب کے موضوع میں عظیم نے امام حسینؑ کی مدینہ سے ہجرت سے لے کر کربلا میں فرات سے خیمے ہٹانے تک کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد حضرت عباسؑ کا پانی لانے کے لئے جانے کی اجازت طلب کرنے کا ذکر بھی کرتے ہیں۔اس کے بعد عباسؑ کے شہادت کا ذکر بڑے دردناک انداز میں پیش کرتے ہیں۔پھر شبیّر کے پر درد بین بھی تحریر کرتے ہیں۔

آ کے شبیّر پکارے مرے بھائی عباس مجھ کو قسمت نے یہ حالت جو دکھائی عباسؑ
اس سے پہلے مجھے کیوں موت نہ آئی عباسؑ تم نے دریا کی ترائی جو بسائی عباس
مجھ کو اس دہشت ستم خیز میں تنہا چھوڑا
درمیاں ہائے ، لعینوں کے اکیلا چھوڑا

عظیم کا یہ مرثیہ کئی اسلامی واقعاتوں کی یاد دلاتا ہے۔اجزائے ترکیبی کی بندشیں اس میں نظر نہیں آتیں مگر مرثیہ میں جدید رنگ صاف طور سے دیکھا جاسکتا ہے۔اس کی زبان صاف اور سادہ استعمال کی گئی ہے۔عظیم کے مرثیہ نگاری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے مراثی مختصر ہوتے ہے جو ۷۰ سے ۸۰ بند تک ہی محدود رہتے ہیں۔جس سے سامعین بیزار نہیں ہوتے ہیں۔عظیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ۔

> ''عظیم امروہوی صاحب بڑی خوبیوں کے مالک ہیں ۔شاعر بھی نہایت قادرالکلام ہیں اور مختلف اصناف سخن میں داد دے کر اپنا سکہ جما چکے ہیں۔انھوں نے جدید وضع کے مرثیے بھی کہے ہیں۔جن سے علوئے نفس،خودداری،ایثار وقربانی،حق گوئی،بے باکی،پامردی،بلند ہمتی اور سرفروشی کی اعلیٰ اقدار کی ترویج کو تقویت ملتی ہے۔'' ۲۳

عبادت اور خاتونِ جنّت۔عظیم امروہوی کا ایک مرثیہ ''عبادت اور خاتونِ جنّت'' کے عنوان سے ملتا

ہے۔جس میں ۵۶ بندوں کا شمار کیا گیا ہے۔یہ مرثیہ ان کے باقی مرثیوں سے مختصر ہے۔عظیم مرثیہ کا آغاز عبادت سے کرتے ہیں۔اور لکھتے ہیں کہ عبادت ہی بشر کی زندگی ہے۔پھر انسان کی خلقت کا مقصد بیان کرتے ہیں کہ خدا نے چاہا کہ میری عبادت ہو تو اس نے جن وانس کی تخلیق کی۔اور اسکو خالق کی بندگی کا حکم دیا۔اس کے بعد عظیم یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر انسان ہر دم عبادت میں لگا رہے گا تو وہ اپنی دیگر ضرورتوں کو کیسے پورا کرے گا۔اور اس جواب بھی خود ہی دیتے ہیں۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

المختصر، جو صرف عبادت کرے بشر — اک دوسرے کی کوئی نہ خدمت کرے بشر
کوئی کرے نہ کام ، نہ محنت کرے بشر — پوری کہاں سے اپنی ضرورت کرے بشر
ہو جائے آدمی پہ اک آزار ، زندگی
پھر ہو بشر کے واسطے دشوار ، زندگی
د راصل سب کے کام بھی آنا ہے ،عابدون — بھٹکے ہوئے کو راہ دکھانا ہے، عابدون
بھوکے کو پیٹ بھر کے کھلانا ہے ، عابدون — غیروں کے درد وغم کو بٹانا ہے ، عابدون
جس میں خدا کی مرضی وقربت ہے دوستوں!
وہ ہر عمل بشر کا عبادت ہے دوستوں!

عظیم اس کے بعد نماز کی تشریح کرتے ہیں اور نماز کے مقصد اور اس کی افادیت کو بیان کرتے ہیں۔عظیم بتاتے ہیں کہ نماز ہی وہ چیز ہے جو عبد کو معبود سے ملاتی ہے۔نماز وہ شہ ہے جو امیر اور غریب کے فرق کو مٹا کر کولوں کے دلوں میں اتحاد پیدا کرتی ہے،نماز آداب زندگی بھی سکھاتی ہے۔لیکن جو نماز کو نظر انداز کرتے ہیں ان کو نظروں سے بھی گرا دیتی ہے۔

نفرت دلوں میں ہے تو مٹا دے گی یہ نماز — آدابِ زندگی بھی سکھا دے گی یہ نماز
لیکن نظر سے جس کو گرا دے گی یہ نماز — مردُودِ بارگاہ بنا دے گی یہ نماز
سجدے کا جس کے واسطے فرمان ہو گیا
سجدہ نہیں کیا ہے تو شیطان ہو گیا

عظیم انسان کو تارک الصلات ہونے کی تدریس دیتے ہوئے حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ کی نماز کے بارے میں بتاتے ہیں۔اور پھر جناب فاطمہؑ کی مدح وثنا کرتے ہیں۔اس کے بعد جناب فاطمہؑ کے باپ،شوہر اور اولاد کے حوالے سے فضائل بیان کرتے ہیں۔عظیم کربلا میں امام حسینؑ کے انصار واقربا کی شہادت کو علامتی طور پہ پیش کرتے ہوئے حسینؑ کے دردناک منظر کو بیان کرتے ہیں۔

مصروف شکر حق رہے اس طرح سے امام — سجدے میں سر ہے اور ہے لب پر خدا کا نام
تیر آ رہے ہیں جتنے بھی سوئے شہ انام — وہ تیر کیا ہیں بلکہ شہادت کے ہیں وہ،جام
وہ زخم ہیں کہ جن سے بدن چور چور ہے

ظلمت میں اب گھرا ہوا خالق کا نور ہے

اس طرح سے نماز ادا کی امام نے　　اور حق کی یوں بلند صدا کی امام نے
امت کے واسطے بھی دعا کی امام نے　　کچھ غم کیا، نہ آہ و بکا کی امام نے
سر دے دیا حسین ؑ نے خالق کی راہ میں
اس طرح سے نماز پڑھی قتل گاہ میں

پھر عظیم مومنین کے نمازی ہونے کی دعا کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی بیٹی زعیم فاطمہؑ کے لئے بھی دعا کرتے ہیں کہ وہ عکس سیرت فاطمہؑ بنے۔اس مرثیہ میں عظیم نے نماز کی اہمیت وافادیت کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔مرثیہ کی زبان تاثیر میں ڈوبی ہے، جو درد وغم کے جذبات واحساس میں لبریز ہے۔مرثیہ کا لب ولہجہ بہت رقت آمیز ہے اور اس کا انداز بیان بھی دلکش ہے۔

حسینؑ اور صبر۔ایک مرثیہ ''حسینؑ اور صبر'' کے عنوان سے بھی ملتا ہے جسکی تخلیق عظیم امروہوی نے ۱۹۸۲ء میں کی تھی۔ یہ مرثیہ ۵۵ بندوں میں لکھا گیا ہے۔اس مرثیہ کی تخلیق کے بارے میں عظیم لکھتے ہیں کہ۔

''آج سے تقریباً چالیس سال قبل قرآن مجید کی مندرجہ آیت پر کسی عالم دین کی تقریر سنی تھی، جس نے بہت متاثر کیا تھا۔اسی وقت ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اس موضوع کو کسی مرثیے کے چہرے میں بیان کیا جائے۔اور اسی دن یہ مصرع کہا تھا کہ۔
ع۔ دلیلِ عظمت انساں ہے صبر کی دولت''
(آیت کریمہ انا اللہ ما الصّابرین، ترجمہ: اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔جسکا ذکر عظیم نے مرثیہ کے خلاصہ میں کیا ہے)۲۴

مرثیہ کا آغاز عظیم قرآن مجید کی آیتہٗ کریمہ انا اللہ ماالصّابرین کی شاعرانہ تشریح وتفسیر سے کرتے ہیں۔عظیم صبر اور صابروں کی تعاریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صبر وہ شہ ہے کہ جس کے سامنے خدانہ مسلمان کو دیکھتا ہے اور نہ ہے وہ مومن کو دکھتا ہے بلکہ وہ صرف صابرین کو دیکھتا ہے۔صبر کی تشریح عظیم کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

بشر کے خُلق کی پہچان صبر ہوتا ہے　　راہِ نجات کا سامان صبر ہوتا ہے
جہاں بھی ہوتا ہے ایمان صبر ہوتا ہے　　کتاب عشق کا عنوان صبر ہوتا ہے
خدا بھی صبر کو اتنا پسند کرتا ہے
کہ صابرین کو وہ ارجمند کرتا ہے

پیمبروں کی وراثت کو صبر کہتے ہیں　　مزاج کار رسالت کو صبر کہتے ہیں
اک امتحان امامت کو صبر کہتے ہیں　　رسول پاک کی سیرت کو صبر کہتے ہیں
خوشی خوشی جو اٹھاتے ہیں صبر ہوتا ہے

جو بوجھ بن گیا دل پر تو جبر ہوتا ہے

وطن سے دوری و غربت کو صبر کہتے ہیں علیؑ کے گھر کی قناعت کو صبر کہتے ہیں
رسولؐ پاک کی ہجرت کو صبر کہتے ہیں خدا کے دیں کی ضرورت کو صبر کہتے ہیں
ہر ایک شے سے جہاں کی گراں یہ ہوتا ہے
مگر ہر ایک بشر سے کہاں یہ ہوتا ہے

اس کے بعد عظیم صبر کی اہمیت وافادیت اوراس کی عظمت کا بیان کرتے ہیں۔ پھر انسان کے بےصبرا ہونے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے بےصبر ہونے کے برے نتائج بتاتے ہیں۔ عظیم کربلا کے صبر یعنی حسینؑ اوران کے ساتھیوں کے صبر کا بیان کرتے ہوئے اسے نرالہ بتاتے ہیں کہ جو صبر کربلا میں کیا گیا اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔اس کے بعد امام حسینؑ کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ پھر کربلا کا سب سے چھوٹا شہید اور حسین کا بیٹا علی اصغرؑ کا گلے پہ تیر کھا کے مسکرانے تعریف کرتے ہیں۔

جہانِ صبر میں اصغر کا بھی جواب نہیں عطش کے باب میں ،ایسا عطش مآب نہیں
ستم کا تیر ہے، بچے کو جام آب نہیں اور اس کے بعد بھی چہرے پہ اخطراب نہیں
کہاں پہ طفل زمانے میں ایسے ہوتے ہیں
فقط نبی کے گھرانے میں ایسے ہوتے ہیں

عظیم مرثیہ میں علی اصغر کا رجز بیان کرتے ہیں کہ کس طرح وہ بےزبان ہوتے ہوئے بھی خود کا تعارف کرواتے ہیں۔اس کے بعد کربلا کے صبر کے مظاہرے کو بیان کرتے ہیں ،اور پھر حسینؑ کے اصحاب وانصار کی شہادت کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

عظیم کے مرثیہ میں غنائیت، جذباتیت،سوزگداز اور نازک خیالی موجود ہے۔مرثیہ کا موضوع بھی منفرد ہے۔مرثیہ میں صبر کو عظیم نے مختلف طرح سے واضح کیا ہے جس سے سامعین محو ہو جاتے ہیں۔مرثیہ کی زبان سادہ ہے،اور مرثیہ میں تسلسل کے ساتھ صبر اور حسینؑ کے رشتے کو بیان کیا گیا ہے۔

حسینؑ اور مسلم۔ ''حسینؑ اور مسلم'' موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی غیر اخلاقی ،غیر ایمانی اور پست سیرتی کے خلاف لکھا ہوا مرثیہ ہے۔جن میں مسلمانوں کے حالات زار اوران کی بدحالی پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے اس سے نجات پانے کا راستہ بتایا ہے۔مرثیہ ۶۲ بندوں میں لکھا گیا ہے،جس کا آغاز عظیم مسلمان کون ہے اور موجودہ حال میں وہ کیا ہیں کیا کرتے ہیں۔ عظیم بتاتے ہیں کہ مسلمان محمدؐ کے ورثہ دار ہیں اور یہ سکھایا گیا ہے کہ ذلّت کی زندگی جینے سے موت بہتر ہے مگر آج مسلمان اس بات کو بھول گیا ہے اور وہ اپنی ہی قوم کا دشمن بن چکا ہے۔

ہماری قوم کا دیکھے جو کوئی غور سے حال　　ہمارا شغل نظر آئے اس کو جنگ وجدال
کسی سے حق پہ لڑیں یہ نہیں ہماری مجال　　خود ایک دوسرے کو کر رہے ہیں ہم پامال
برائی دیکھ کے بھائی کی مسکراتے ہیں
یونہی تو قوموں پہ اکثر زوال آتے ہیں

آگے عظیم نام نہاد مسلمانوں پر خاص طور سے تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اور تبصرے کے پس پردہ وہ اصلاح ملت کا مقصد بھی بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد مسلمان کے مختلف فرقوں کے بیچ اختلافات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں۔عظیم کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں شرم وحیا نہ جانے کہاں کھوگئی ہے، نہ ان میں کسی کی فکر ہے اور نہ ہی کسی ذلت سے خوار ہی ہوتے ہیں۔

ہماری قوم کے اوپر عجیب غفلت ہے　　قدم قدم پہ ہر اک بات میں سیاست ہے
ہمارے پاس نہ دولت ہے اور نہ عزت ہے　　جہاں پہ قوم کھڑی ہے مقام غیرت ہے
کہیں نظر نہیں آتی ہے روشنی یا رب
یہ کس مقام پہ آئی ہے زندگی یا رب

عظیم لکھنؤ کی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے وہاں ہونے والے بین المسلمین فسادات کا ذکر کرتے ہیں۔وہ لکھنؤ جو اپنی تہذیب اور علم وادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اس کو فتنہ گروں نے لوٹ لیا۔وہاں کی تہذیب مٹا دی۔شاعر یہاں کیفؔی آعظمی کی نظم ''عزا میں بہتے تھے آنسو'' کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں لکھنؤ وہ شہر ہے جہاں سب مل کے مجلسوں میں آنسوں بہاتے تھے مگر اب آنسوں کے بجائے خون بہایا جاتا ہے۔

تباہ کر دیا دین و ادب کا سرمایہ　　لہو کہیں رگِ احساس میں نہ گرمایا
بہن کو لوٹ کے بھائی نہ کوئی شرمایا　　یہ کیفؔی اعظمی نے ٹھیک ہی تو فرمایا
عزا میں بہتے تھے آنسو یہاں لہو تو نہیں
یہ ہوگا اور کوئی شہر، لکھنؤ تو نہیں

لکھنؤ کے مسلمانوں پر رنج وغم اور ملال کا اظہار کرتے ہوئے عظیم اسلامی تعلیمات کو فراموش کرنے کے نتائج کو پیش کیا ہے۔اور کہتے ہیں کہ آج مسلمان حضرت امام حسینؑ کے کردار کی تأسی کے بجائے اس سے دوری اختیار کر رہے ہیں۔اس کے بعد امام حسینؑ کی مدح میں کچھ بیت کہتے ہیں پھر ساقی نامہ بیان کرتے ہیں۔حالانکہ اس کے پہلے کے مرثیوں میں عظیم نے ساقی نامہ کے شعر نہیں لکھے ہیں۔مرثیہ کو آگے بڑھاتے ہوئے عظیم غدیر خم کے واقعہ کا ذکر کرتے ہیں اور امام کی مدح بھی کرتے ہیں۔اس کے بعد شہادت کے جز تحریر کرتے ہوئے علی اصغر کی شہادت بیان کرتے ہیں۔مقطع کے بند میں عظیم ملت اسلامیہ کے باعمل اور باوقار ہونے کی دعا کرتے ہیں۔

مرثیہ میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے حالات کا ذکر بڑی سچائی کے پیش کیا ہے، آج جو مسلمانوں میں آپسی کشیدی ہے، فرقوں میں اتحاد کے بجائے جو انتشار اور یکجہتی کے بجائے نفرت اور دشمنی بڑھ رہی ہے، اس کا تذکرہ سچائی سے کیا ہے۔ مرثیہ میں اقبال کی نظم ''جواب شکوہ'' کا اثرات دیکھائی دیتے ہیں۔

حدیث دل۔ عظیم کا ایک مرثیہ ''حدیث دل'' کے عنوان سے بھی ملتا ہے۔ جس میں انھوں نے ۲۷ بند تحریر کئے ہیں۔ مرثیہ کا آغاز عظیم دل کی حقیقت سے کرتے ہیں اور دل کی تشریح بھی کرتے ہیں۔ پھر دل کے اقسام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم کے واقعہ پر علامتی طور پر روشنی ڈالتے ہیں۔ عظیم دل کے بیان کے ساتھ عقل کا بھی ذکر کرتے ہیں اور دونوں کا فرق بھی بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد دل کو بے لگام کرنے کے نتائج پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ عظیم قرآن کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ دل کا تذکرہ قرآن کی دس سوروں اور اکیس آیتوں میں کیا گیا ہے۔

اہلِ دل کھول کے دیکھے گا جو دل سے قرآں — سورے آئیں گے نظر یونس و آلِ عمراں
اور انفال۔ حدید۔ و حج۔ و رعد ِ تاباں — اور ہیں سورہ المومن واعراف عیاں
نواں سورہ جو ہے وہ سورہِ البقرہ ہے
دسویں سورے کا جو ہے نام وہ التوبہ ہے

دل کی اکیس جو قرآں نے بتائیں قسمات — سب وہ قسمات میں ہیں مبنی بہ صفات
سخت وہ ہیں کہ جن کو نہیں ہوتے صدمات — ایسے تاریک ہیں وہ جیسے کہ تاریک ہو رات
سخت دل جتنے ہیں پتھر سے برے ہوتے ہیں
تیر و تلوار سے خنجر سے برے ہوتے ہیں

اس کے بعد عظیم نے دل کے لئے ارشادِ معصومینؑ کا بھی ذکر کیا ہے۔ پھر جنگ احد کے واقعہ بیان کیا ہے جس میں رسولؐ اکرم کے چچا جناب حمزہ شہید ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی شہادت کے بعد ظالم ان کے سینے سے دل نکال کر ہندہ کو دے دیتے ہیں ہندہ جو کہ رسولؐ کی دشمن تھی اس نے دل کو چبایا۔

فوج باطل نے کیا پھر یہ ارادہ ناپاک — وہ ستمگر، وہ جفا کار، وہ ظالم سفّاک
بعد حمزہ کی شہادت کے ہوئے وہ بیباک — سنگ دل ایسے تھے وہ لاش کا سینہ کیا چاک
ظالموں نے کیا ایسا تہہ و بالا دل کو
سینۂ حضرت حمزہ سے نکالا دل کو

مطمئن جب نہ ہوئی ظلم و ستم سے ہندہ — دل نکلوا کے بھی بے چین تھا، دل ہندہ کا
ٹکڑے ٹکڑے ہوا دل اس نے چبایا ایسا — اور ان ٹکڑوں کو اک ہار بنا کر پہنا
دلِ حمزہ جو چبایا تو جگر خارا ہے
دلِ تاریخ پہ یہ چلتا ہوا آرا ہے

اس کے بعد عظیم رسول کریم کے قلب پر قرآن کے نازول کو بیان کرتے ہیں۔ پھر کربلا میں حسینؑ اور ان کے اصحاب وانصار کے دل کی تعریف بیان کرتے ہوئے امام حسینؑ کے دل کی مدح کرتے ہیں۔ سراپا کے بندوں میں عظیم علی اکبر کا تذکرہ کرتے ہیں، پھران کا جنگ میں جانے کے لئے اذن طلب کرنے کا بھی بیان کرتے ہیں۔ پھرتلوار کی تعریف کرتے ہیں اور علی اکبر کی جنگ کے مناظر پیش کرتے ہیں۔علی اکبر کی شہادت کو عظیم،اور مقطع کے بند میں مسلمانوں کے دلوں کو منور کرنے کی دعا کرتے ہیں۔

عظیم کے کلام میں فکری عنصر اور فن بہت علیٰ درجہ کا معلوم ہوتا ہے۔ مرثیہ میں جنگ کے مناظر،منظر نگاری، جذبات نگاری اور رزمیہ میں تلوار کی تعریف بہت عمدگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ شہادت کے بندوں میں درد وغم صاف نظر آتا ہے۔ عظیم نے مرثیہ میں تاریخ واقعات کو بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس مرثیہ میں کہیں کہیں انیسؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔

حسینؑ اور قربانی۔ عظیم امروہوی کا ایک مرثیہ ''حسینؑ اور قربانی'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے،جس میں ۶۵ بند شامل ہیں۔ یہ مرثیہ قربانی کے موضوع سے لکھا گیا ہے جس میں قربانی کا صحیح مفہوم اور اس کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ مرثیہ کا آغاز قربانی کی ابتداء یعنی ہابیل اور قابیل کے واقعہ سے کیا گیا ہے۔اور پھر قربانی کے فلسفے کو بیان کیا گیا ہے۔ عظیم نے مرثیہ میں قربانی کی تاریخ بھی بیان کی ہے اور اسلام میں جو قربانی کا مفہوم بتایا گیا ہے اس کا بھی بیان کرتے ہیں۔

ہاں کسی کے کام آجانا ہی قربانی تو ہے　　دوسروں کے غم کو اپنانا ہی قربانی تو ہے
دشمنوں پر رحم فرمانا ہی قربانی تو ہے　　مقصدِ خلقت بجالانا ہی قربانی تو ہے
اصل قربانی ہے یہ اہل نظر کے واسطے
درس ہے اسلام کا نوعِ بشر کے واسطے

عظیم مرثیہ میں حضرت ابراہیم اور اسماعیل کا واقعہ پیش کرتے ہیں۔اور میدانِ مِنیٰ اور کربلا کے میدان کا تعلق بیان کرتے ہوئے اس سے مماثلت کا بیان بھی کرتے ہیں۔

ہے مِنیٰ تخئیل اور اس کی حقیقت کربلا　　ہے مِنیٰ آغاز، انجام عقیدت ،کربلا
ہے مِنیٰ راہِ خوشی ، راہِ مصیبت کربلا　　ہے مِنیٰ جائے اماں،جائے شہادت کربلا
خواب کی منزل مِنیٰ ہے، کربلا تعبیر ہے
وہ شہادت کا ہے قرآں،اور یہ تفسیر ہے

عظیم کربلا کو قربانی کی درس گاہ بتاتے ہیں کہ قربانی تو صحیح معنی میں کربلا میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں ایک ہی دن میں حسینؑ نے ۷۲ جانوں کی قربانی راہ خدا میں پیش کی ہیں۔ رخصت کے بندوں میں عظیم علی اکبر کی رخصت اور ان کے جنگ کے مناظر کو پیش کرتے ہیں۔اور ان کی شہادت کے بڑے دردناک انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ پھر حسینؑ کے انصار

اوراقربا کی قربانی کا تذکرہ کرتے ہوئے حسینؑ کی شہادت اوران کی بہن حضرت زینبؑ کے پر درد بین کو پیش کرتے ہیں۔اورآخری بند میں قوم کے جذبہ ایثاراورقربانی کے لئے دعا کرتے ہیں۔

عظیم نے مرثیہ میں قربانی کو بہت عمدہ طریقے سے سمجھایا ہے۔اورکربلا کو ہماری درس گاہ بتایا ہے۔مرثیہ میں بیانیہ رنگ نمایاں ہے۔حضرت ابراہیمؑ واسماعیل کے واقعات کو بہت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔مرثیہ میں رزمیہ رنگ بھی حقیقت مندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

حسینؑ اور کربلا۔اپنے ایک مرثیہ میں عظیم نے کربلا کو موضوع بناتے ہوئے ''حسینؑ اور کربلا'' عنوان رکھااور اس مرثیہ کوانھوں نے ۶۱ بندوں میں پورا کیا۔اس مرثیہ کے تعلق سے وہ خود لکھتے ہیں۔

''بہر حال ایک دن علامہ ذیشان حیدر جوادی مرحوم کی ایک مختصر سی کتاب زمین کربلا کے موضوع پر پڑھ رہا تھا جو مرحوم نے مجھے ۱۹۷۲ء میں الہ آباد میں عنایت فرمائی تھی۔(جب میں محفل نور میں شرکت کے لئے الہ آباد گیا تھا)اس کے مطالعے کے بعد یہ تحریک پیدا ہوئی کہ مرثیہ کہا جائے۔حالانکہ یہ مرثیہ ۱۹۷۵ء کے بھی بعد مکمل ہوا۔''۲۵

مرثیہ کے آغاز میں زمین کی حقیقت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ۔

درحقیقت وجہِ اعمال بشر ہے ،یہ زمیں آدمؑ وحوا کی پہلی رہ گزر ہے یہ زمیں
ہے کہیں منزل، کہیں راہِ سفر ہے یہ زمیں لاش کی ضامن ہے اتنی معتبر ہے یہ زمیں
آدمی کے واسطے وجہِ بقا بھی ہے یہی
ابتدا بھی ہے یہی اور انتہا بھی ہے یہی

مرثیہ میں عظیم زمین کربلا کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کومصائب اورآلام کی زمین بتاتے ہیں۔پھرکربلا کے مدح وثنا میں چند بند تحریر کرتے ہیں۔اس کے بعد حضرت امام حسینؑ کے فضائل کا بیان کرتے ہیں۔مرثیہ میں ساقی نامہ کا بھی مختصر بیان کیا گیا ہے۔شہادت کے جز میں عظیم کربلا کے تمام شہیدوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

کربلا تجھ پر سبھی پیروجواں قرباں ہوئے کربلا تجھ پر جو آئے میہماں قرباں ہوئے
درحقیقت نازشِ کون و مکاں قرباں ہوئے کربلا تیری زمیں پر آسماں قرباں ہوئے
کربلا تجھ پر ہر اک سرورؑ کا ناصر لٹ گیا
کربلا آیا تھا جو تجھ پر مسافر لٹ گیا

مقطع کے بند میں عظیم اپنے استاد نسیم امرہوی کا ذکر کرتے ہوئے انکو مرثیہ کا جز بین کا ماہر بتاتے ہیں۔پھر نجف،کربلااور مدینہ جانے کی دعا کرتے ہیں۔(جو بعد میں پوری بھی ہوگئی)۔مرثیہ کی زبان صاف اور سادہ استعمال کی گئی

ہے۔ چہرا کے بندوں میں زمین کا بیان پراثر انداز میں کیا گیا ہے۔

عظمت علم۔ اپنے اگلے مرثیہ میں عظیم نے علم کو موضوع بنایا ہے۔ جسکا عنوان ''عظمت علم'' ہے۔ یہ مرثیہ علم کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ یہ مرثیہ عظیم کے تمام مرثیوں میں سب سے ضخیم ہے۔ اس میں ۸۶ بند شامل ہیں۔ مرثیہ کی ابتدا عظیم علم کی اہمیت، افادیت اور اسکی عظمت بیان کرتے بتاتے ہیں کہ علم ہی وہ شہ ہے جس سے تمام انسانی مسائل کا حل ڈھونڈھا جاسکتا ہے۔ علم ہی ہر ترقی اور ارتقا کا ذریعہ ہے۔ اس کے بعد عظیم علم اور جہل کا موازنہ کرتے نظر آتے ہیں۔

جہل تخریب ہے دراصل تو تعمیر ہے علم   جہل تذلیل کا باعث ہے تو ،توقیر ہے علم
جہل بے مایہ تو سب سے بڑی جاگیر ہے علم   جہل ظلمات ہی ظلمات ہے، تنویر ہے علم
جہل ہے ایک مرض، علم دوا ہے یاروں!
علم کے دم سے، زمانے کو شفا ہے یاروں!

اس کے بعد عظیم قرآن کے علم کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر عظیم مدینۃ العلم اور باب العلم کے بارے میں اقوال پیش کرتے ہیں۔ عظیم امام محمد باقرؑ کا قول پیش کرتے ہیں۔ عظیم آج کے مسلمانوں کے حالات زار کی وجہ بتاتے ہیں کہ مسلمان قرآن کی تعلیم کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد عظیم کربلا کی جنگ کو علم اور جہل کے نمائندوں کی جنگ بتاتے ہیں۔ اور اس کا بیان عظیم بہت خوبصورت بیتوں میں کرتے ہیں۔

اور چاہا کہ بڑھے جہل کی قدر و قیمت   اہل قرآں سے جہالت نے جو مانگی بیعت
جہل مدہوش تھا، اور چھائی تھی اس پرنخوت   علم جھک جائے زمانے میں بزور قوت
جہل کے دل کا ارادہ جو تھا، ناکام ہوا
پوچھ لو اس کو مورّخ سے جو انجام ہوا

اس کے بعد عظیم حضرت عباسؑ کی مدح میں بیت پیش کرتے ہیں۔ اور حضرت حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے یکجا فضائل پیش کرتے ہیں۔ پھر حسینی لشکر کے علم کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آمد کے جز میں عظیم حضرت عباسؑ کی میدان میں آمد کو بیان کرتے ہیں۔ پھر تلوار کی تعریف کرتے ہیں۔ حضرت عباسؑ کی شجاعت جنگ کی تصویر کشی کرتے ہیں اور پھر ان کی شہادت کا بیان پردرد انداز میں کرتے ہیں۔ عظیم حضرت عباسؑ کی لاش پہ حضرت حسینؑ کے دلخراش بین پیش کرتے ہیں۔ مقطع کے بند میں عظیم بھائی سے بھائی کی محبت اور اہل ملت کے باکردار اور وفادار ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ مرثیہ میں سلاست اور روانی موجود ہے، زبان صاف اور سہل ہے۔ مرثیہ کی زبان کے بارے میں وہ خود مانتے ہیں کہ مرثیہ کی زبان آسان ہونی چاہئے۔

''جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ کوشش دانستہ رہی ہے کہ زبان میں سلاست اختیار کی جائے اور سہل ہو۔ اور بیان ژولیدگی سے بچا رہے کیونکہ آج

کے سامع اور قاری کا وہ معیار نہیں ہے جو سو سال قبل یا پچاس سال قبل بھی تھا کسی بھی واقعے یا پیغام کی ترسیل کے لئے یہ ملحوظ رکھنا ضروری بھی ہے۔'' ۲۶؎

قرآن وفا۔ عظیم نے '' قرآن وفا '' کے عنوان سے بھی ایک مرثیہ کی تخلیق کی ہے، جس کے سراپا میں حضرت عباسؑ کا تذکرہ کیا ہے۔ عظیم مرثیہ کی ابتدا وفا کی تعریف سے کرتے ہیں اور وفا کی تشریح وہ قرآن کے حوالے سے کرتے ہیں۔ وفا کو سمجھانے کے لئے عظیم انبیاءؑ کی وفا اور ان کے معجزے کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔

اس نے ہی یوشعؑ و ادریسؑ کو رتبہ بخشا   اس وفا سے ہی تھا اعجازِ عصائے موسیٰؑ
اس وفا سے ہی سلیمانؑ کو بھی تخت ملا   اس سے ہی یونسؑ والیاسؑ پہ تھی حق کی عطا
خضرؑ کو راہِ صداقت بھی دکھاتی ہے وفا
اور عیسیٰؑ کو مسیحا بھی بناتی ہے وفا

وفا کی تشریح کے لیے عظیم نے حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کے انبیاؤں کا ذکر کیا ہے۔ اور دین اسلام میں وفا کی تعلیم کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ انبیاؤں کی وفا کے بعد عظیم رسول کریمؐ کی وفا اور حضرت امام حسینؑ کی وفا کا بیان بھی کرتے ہیں۔ پھر ابو طالبؑ کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ میں ان کی وفا اور ان کے ایمان کی اہمیت کو بتایا ہے۔ اس کے بعد حضرت عباسؑ کی مدح پیش کرتے ہوئے انکا جنگ کرنے کی اجازت طلب کرنے کو بیان کیا گیا ہے۔ سراپا بیان کرتے ہوئے عباسؑ کی میدان میں جانے کی رخصت کی ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ پھر میدان جنگ میں عباسؑ کی آمد اور انکے رجز پڑھنے کو خوبصورت بیت میں پیش کیا ہے۔

ایک للکار میں سب فوج کے اوسان گئے   میں ہوں عباسؑ علیؑ تم مجھے پہچان گئے
آج لوہا میری شمشیر کا تم مان گئے   وارث و جانِ یداللہ ہوں، یہ جان گئے
اسداللہ کی کیا حرب کوئی یاد آئی
بدر و خندق کی تمہیں ضرب کوئی یاد آئی

باقی مرثیوں کی طرح عظیم اس مرثیہ میں بھی تلوار کی تعریف کرتے ہیں اور جنگ کی تصویر کشی بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔ پھر شہادت اور حضرت عباسؑ کی لاش پر بھائی حسینؑ کے بین کے دلخراش انداز میں پیش کیا ہے۔ عظیم کا یہ مرثیہ بہت رقت آمیز اور دلخراش ہے۔ اس کے ایک ایک شعر سے درد و غم کا اندازہ ہوتا ہے۔ مرثیہ میں ڈرامائی انداز بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ زبان میں صفائی اور روانی پائی جاتی ہے۔ مرثیہ کا انداز بیان شگفتہ اور پرزور ہے۔

علیؑ اور عدالت۔ ایک مرثیہ عظیم کا ''علیؑ اور عدالت'' کے عنوان سے بھی ملتا ہے۔ اس میں ۶۸ بند شامل ہیں۔ مرثیہ کا آغاز عظیم صفاتِ الٰہیٰ سے کرتے ہیں۔ پھر روز اول سے عدل کی ضرورت کو بیان کرتے ہیں۔ اور عدل فطرت انسانی میں شامل ہے اس بات کا اظہار کرتے ہیں۔ قدیم عرب میں عدل کے نظام کا بیان کرتے ہوئے حضرت داؤدؑ کے

واقعہ کا بیان کرتے ہیں۔اس کے علاوہ عظیم نے قرآن کریم کے حوالے سے عدل کی تشریح کرتے ہیں اور سورہ مائدہ،سورہ نسا،سورہ نجم اور سورہ احزاب کا ذکر کرتے ہیں۔اور عدل کے لئے قرآن کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں۔پھر عظیم رسالتمآب کے عہد میں عدل کے اہم واقعات کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں مشکل مقدمات کے فیصلے کا ذکر کرتے ہیں۔پھر حضرت علیؑ کے دور حکومت میں عدل کے واقعات اور فیصلے کا بیان کیا ہے۔عظیم مدح حضرت علیؑ کرتے ہیں۔اور عدل کے سلسلے میں حضرت علیؑ کے بنائے ہوئے اصول کو بیان کرتے ہیں۔

مولا کو جب ملا تھا خلافت کا تخت و تاج ہر ایک کے بیان میں، حلف کو دیا رواج

تا کہ خدا کے خوف سے ڈرتا رہے سماج رسمِ حلف یہ جب سے ہی جاری یونہی ہے آج

یوں منصفی کو رتبۂ اعلیٰ عطا کیا

قرآن کی ہی رُ و سے ہر اک فیصلہ کیا

عظیم مسجد کوفہ میں حضرت علیؑ کی ضربت لگنے کے واقعہ کو دردناک انداز میں پیش کرتے ہیں۔ضربت لگنے کے بعد ان کے بیٹوں کا بلکنا اور حضرت علیؑ کا بیٹوں کو سمجھانے اور صبر کی تلقین دینے کا واقعہ باپ اور بیٹوں کے محبت کی سچی تصویر کشی کرتا ہے۔شہادت کے جز میں عظیم حضرت عباسؑ کی شہادت کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی لاش پہ حضرت حسینؑ کے بین کو پیش کرتے ہیں جو بھائی سے بھائی کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔

عظیم کا یہ مرثیہ درد وغم کے جذبات واحساسات سے لبریز ہے۔ان میں انھوں نے بیانیہ انداز پیش کیا ہے۔لب ولہجہ بہت رقت آمیز ہے جو شاعر کی قادرالکلامی کو ظاہر کرتا ہے۔

ماں اور کربلا کی مائیں۔عظیم نے ایک مرثیہ ماں کا بھی لکھا ہے جس کا عنوان انھوں نے ”ماں اور کربلا کی مائیں“ رکھا ہے۔ماں دنیا کی ایک ایسی مخلوق ہے جسکا کوئی ثانی نہیں ہے۔عظیم نے ماں کو نہیں دیکھا لیکن ماں کے پیار کو انھوں نے اپنی نانی میں محسوس کیا ہے۔ماں کی عظمت بیان کرنے کے لئے انھوں نے یہ مرثیہ تحریر کیا ہے۔مرثیہ کا آغاز عظیم ماں کی ضرورت اور اسکی اہمیت بتاتے ہوئے کرتے ہیں۔عظیم ماں کو بچے کی پہلی رہنما بتاتے ہیں۔

دنیا میں ہر بشر کی مجازی خدا ہے ماں پہلی جہاں میں اس کے لئے رہنما ہے ماں

ہر دردِ لا علاج کی بیشک دوا ہے ماں بچے کے حق میں اپنے مجسم دعا ہے ماں

سانچے میں اعتماد کے بھی ڈھالتی ہے یہ

دل کا پلا پلا کے لہو، پالتی ہے یہ

ماں بچوں کا سائبان ہوتی ہے،اور بچوں کے آگئے وہ اپنا ہر دکھ درد بھول جاتی ہے۔اسی بات کا ذکر عظیم نے کیا ہے اور ماں کی خدمات کو بیان کرتے ہیں۔ماں اپنے بچے کے واسطے ہر امتحان دیتی ہے،ہر مشکلوں کو پار کرتی ہے۔اس کے بعد عظیم ماں کی عظمت بیان کرتے ہوئے ماں کے بارے میں مفکرین کے اقوال کو تحریر کرتے ہوئے نادر بادشاہ،داتا گنج بخش،اقبال،لقمان اور ورڈزیل کی بھی رائے بیان کرتے ہیں۔۔عظیم ماں میں خدا کی شکل کا بیان کرتے ہیں کہ ماں میں

رازق، خالق، پروردگار، ستار اور غفار ہوتا ہے۔ جو الگ الگ وقت میں الگ الگ شکل اختیار کر لیتی ہے۔

انسان کو خدا بھی ملا ماں کی شکل میں — جس نے وجود خلق کیا، ماں کی شکل میں
رحمٰن اور رحیم بنا، ماں کی شکل میں — رازق بھی بن گیا ہے خدا، میں کی شکل میں
رازق بھی بن گیا ہے خدا، میں کی شکل میں
یہ شیر جب پلائے تو رازق کا کام ہے

اس کے بعد عظیم کربلا والوں کی ماؤں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ہمت اور حوصلے کی داد دیتے ہیں کہ ماں ہمیشہ اپنے بچوں کی سلامتی اور زندگی کی دعائیں کرتی ہے مگر کربلا کی مائیں خود اپنے بچوں کو تیار کر کے مرنے کے لئے بھیج رہی تھیں۔ عظیم ام البنین مادر حضرت عباسؑ، مادر عمر بن جنادہ، مادر عون ومحمد، مادر قاسم، مادر علی اصغر اور مادر علی اکبر جیسی ایک ایک شہید اور ان کی ماں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ پھر علی اکبرؑ کی شہادت بیان کرتے ہوئے مقطع کا بند تحریر کرتے ہیں جسمیں ملت کی ماؤں کے لئے دعا کرتے ہیں۔

عظیم کا یہ مرثیہ بیانیہ طرز پہ لکھا ہوا ہے۔ عظیم نے مرثیہ میں ان ماں کو موضوع بناتے ہوئے اس کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہوا اور چراغ۔ عظیم کا مرثیہ ''ہوا اور چراغ'' علامتی طرز پہ لکھا ہوا ہے۔ یہ مرثیہ ۵۷ بندوں پر مشتمل ہے۔ مرثیہ میں ہوا کی اہمیت اور اسکی ضرورت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہوا جہاں ایک طرف انسان کے لئے بیحد ضروری ہے، وہیں وہ جب آندھی طوفان بن کر آتی ہے تو سب کچھ تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ مرثیہ میں ہوا اور چراغ کو ظالم اور مظلوم کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ عظیم قرآن مجید کے حوالے سے ہوا کا ذکر کرتے ہوئے اسکی اہمیت اور افادیت کو بیان کرتے ہیں۔ پھر سائنسی نقطہ نظر سے ہوا کا بیان کرتے ہیں۔ اور اسکی فیض رسانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ عظیم جناب سلیمانؑ اور جعفر صادقؑ کے اقوال کو بیان کرتے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے بھی یہ فرمایا — کہ زندگی پہ ضروری ہوا کا ہے سایہ
حیات کے لیے سب سے بڑا یہ سرمایہ — ہر ایک زخم کا مرہم ہوا کو بتلایا
بشر کے واسطے بیشک یہی ضروری ہے
ہوا تو صاف بھی شفاف بھی ضروری ہے

ہوا کے اردو زبان کے محاورے کے بارے میں بتاتے ہوئے ایک محاورے کی مدد سے مرثیہ نگار شعراء کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ مرثیہ کی ہوا کے لئے نہ ولیؔ کو ساز گار مانتے ہیں اور نہ میرؔ کو، بلکہ وہ انیسؔ اور دبیرؔ کو ہی مرثیہ کی روح مانتے ہیں۔ مرثیہ نگاری میں کون کون مشہور ہوا اس کا ذکر عظیم بہت خوبصورت بیت میں کرتے ہیں۔

ہوا شمیمؔ کی ہے، اور ہوا سلیسؔ کی ہے — ہوا ہے عشقؔ وتعشقؔ کی اور نفیسؔ کی ہے
ہوا ہے انسؔ کی عارفؔ کی اور رئیسؔ کی ہے — ہوا ہے اوجؔ کی اور وارثِ انیسؔ کی ہے

وہ مست بادۂ عرفاں، رشیدؔ کی ہے ہوا
وحید عصر تھے وہ یوں وحیدؔ کی ہے ہوا

جدید مرثیے کے گلستاں میں جس کا سفر ہوا نسیمؔ کی جس کے لیے، نسیم سحر
جمیلؔ مظہری کی بھی ہوا کا جس میں گزر ہے نجم و آلِ رضاؔ کی ہواؤں کا بھی اثر

ہوا جو ہوش میں لائے، ہوا جو ہوش کی ہے
وہ سب سے تیز ہوا ہے تو صرف جوشؔ کی ہے

عظیم جدید مرثیہ نگار کا ذکر کرتے ہوئے ان سب میں سب سے بلند پایہ کا شاعر جوشؔ ملیح آبادی کو مانتے ہیں۔ اس کے بعد عظیم ہوا اور چراغ کا بطور علامت استعمال کرتے ہوئے ظالم اور مظلوم کی جنگ کو بیان کرتے ہیں۔ پھر اسیرانِ کربلا کا دربار یزیدی میں جانے کے مناظر کو پیش کرتے ہوئے جذبات نگاری کا استعمال کرتے ہیں۔ دربار میں ایک بیٹی سے باپ کی محبت کے امتحان کو پر درد انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد حسینؑ کی چار سالہ بیٹی سکینہ کی قید خانے میں وفات بیان کرتے ہیں۔

یہ بیانیہ طرز پہ لکھا ہوا علامتی مرثیہ ہے۔ مرثیہ میں محاوروں کا استعمال بھی ملتا ہے۔ مرثیہ میں قرآن شریف اور تاریخِ احادیث کا بیان ملتا ہے۔

حسینؑ اور امن۔ ''حسینؑ اور امن''، عظیم کا ۶۲ بندوں میں تحریر کیا ہوا مرثیہ ہے۔ جس میں انھوں نے امن کو موضوع بنایا ہے۔ اور معاشرے میں امن کی ضرورت سے مرثیہ کا آغاز کیا ہے۔ پھر امن کی تعریف وتشریح کرتے ہوئے امن کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ وہ امن ہی ہے جس سے دل میں سکون اور ماحول خوشگوار بنا رہتا ہے۔ امن وہیں ملتا ہے جہاں ذی شعور لوگ رہتے ہیں۔ عظیم امن کے فقدان پر اپنے غم وملال کا اظہار بھی کرتے ہیں اور دہشت اور بدامنی کے نقصانات بھی بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ عظیم امن سے ساتھ جنگ کا موازنہ کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ جنگ کو شیطان کی راہ اور امن کو حضرت آدمؑ کی راہ بتاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ رسولؐ اور آئمہ معصومینؑ کے حوالے سے امن کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہندوستان ہی وہ جائے امن ہے جسکو امام حسینؑ نے منتخب کیا تھا۔

اس واسطے حسینؑ نے یہ فیصلہ کیا حق کے لئے تلاش کروں امن کی جگہ
چاہا کہ راستہ ملے ہندوستان کا اس بات سے امام کی معلوم یہ ہوا

ایسا مقام جس پہ کہ امن و امان تھا
شبیر کی نظر میں وہ ہندوستان تھا

عظیم امن کو اسلام کا پیغام بتاتے ہوئے اسلام کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ عظیم اسلام کی تشریح علامتی طور پر کرتے ہیں۔

اسلام معرفت کے ایاغوں کا نام ہے

نیزوں پہ کچھ سروں کے چراغوں کا نام ہے

اس کے بعد عظیم مدح امام حسینؑ بیان کرتے ہیں۔اور دشمنِ امن یعنی ظلمات کا انجام بیان کرتے ہیں۔شہادت کے جز میں عظیم حسینؑ کے انصار اور اقربا کی شہادت بیان کرتے ہیں۔اور پھر علی اصغر کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے مقطع کے بند میں انھوں نے کربلا کو امن کا گہوارہ اور ''یا حسین'' کو امن کا نعرہ بتایا ہے۔

عظیم کے مرثیہ میں غنائیت، جذباتیت،سوز گداز موجود ہے۔عظیم کے موضوع کا انتخاب بہت منفرد ہے۔وہ موجودہ حال کے مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے موضوع کا چناؤ کرتے ہیں۔ان کے مرثیہ میں تبلیغی نظریات اور قوم کے اصلاحی مضامین ملتے ہیں۔

طب اور ائمہؑ۔ عظیم کا مرثیہ ''طب اور ائمہؑ'' ۹۴۔۱۹۹۳ء میں لکھا گیا ہے،جس میں ۲۷ بند شامل ہیں۔مرثیہ میں طب کو موضوع بناتے ہوئے عظیم ائمہؑ کے طب کے علم کو بیان کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ جو راز سائنس نے آج ڈھونڈھا ہے وہ امام صدیوں پہلے ہی بتا چکے ہیں۔عظیم امام جعفر صادقؑ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انکو انسانی جسم کے اندرون کے بارے میں سب معلومات تھی۔انھوں نے پہلے ہی انسان کی اندرونی اجزا کے بارے میں بتا چکے تھے۔

ہیں دو سو چھے بدن میں ہر انساں کے ہڈیاں — یہ تو امام جعفرِ صادقؑ کا ہے بیاں
صادق کے اس بیاں میں کسی کو نہیں گماں — سائنس نے شمار یہ اس دم کیا کہاں
بے پوسٹ مارٹم کے جو گنتی بتائی ہے
سائنس کی نظر میں وہ صدیوں میں آئی ہے

عظیم منصور بادشاہ کے دربار کا وہ واقعہ بیان کرتے ہیں،جس میں طبیب ہند کا امام جعفر صادقؑ سے ملاقات ہوتی ہے۔اور وہ ان سے اپنے اعلیٰ طبیب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔جس کے جواب میں امام اس سے کچھ سوالات کرتے ہیں ۔جس کا وہ جواب نہیں دے پاتا ہے اور وہ امام کے عالم طب ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔عظیم امام علی رضاؑ کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امام نے غذائی اشیا کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا وہ بعد میں صحیح ثابت ہوا۔اس کے بعد عظیم قرآن کے حوالے سے کھانا کھانے کے آداب کا بیان کیا ہے۔اور ساتھ ہی صحت کے سلسلے میں حضرت علیؑ کے بتائے ہوئے اصولوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔عظیم تمام ائمہؑ کے بتائے ہوئے امراض کے دواؤں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔اس کے بعد امام زین العابدینؑ کی مدح و ثنا کرتے ہوئے ان کی خدمات کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔پھر دربار یزیدی میں سید سجادؑ کے خطبہ کو بھی بیان کرتے ہیں،اور ان کے ہی راستہ پہ چلنے کی ہدایت دیتے ہیں۔عظیم قوم کی کوتاہی اور غفلت پر ملال کا اظہار کرتے ہیں۔عظیم امروہوی ملت کی بے عملی اور کردار کی کمزوریوں کا تذکرہ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

کہنے کو تو ہیں سید سجادؑ کے غلام — لیکن ہمارے واسطے ہے غور کا مقام
لیکن ہمارے ان سے بہت مختلف ہیں کام — سجدوں کو جن پہ ناز وہ سجادؑ ہیں امام
ان کے تو سر پہ سجدۂ خالق کا تاج ہے

ان کے تو سر پہ سجدۂ خالق کا تاج ہے
لیکن ہمارا سر درِ دولت پہ آج ہے

سجدہ ہمارا آج، سیاست کے در پہ ہے ۔۔۔ سجدہ ہمارا بغض وکدورت کے در پہ ہے
سجدہ ہمارا ،مال کے دولت کے در پہ ہے ۔۔۔ سجدہ ہمارا آج، عداوت کے در پہ ہے
جب ہم قریب ، دین کی بنیاد کے نہیں
پھر جان و دل سے سید سجادؑ کے نہیں

نفرت کے در کے پاس محبت کے در سے دور ۔۔۔ ذلت کے در کے پاس ہیں، عزت کے در سے دور
ہیں گمرہی کے در پہ، ہدایت کے در سے دور ۔۔۔ غیبت کے در کے پاس ہیں، مدہت کے در سے دور
اب کتنی دور راہِ عمل سے کھڑے ہیں ہم
اس پر بھی یہ گماں ہے، کہ سب سے بڑے ہیں ہم

مرثیہ میں عظیم حسینؑ کی قربانیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔اور پھر ترک وطن اور سفر کی صعوبتوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔عظیم کربلا کا واقعہ بھی بیان کرتے ہوئے اسیروں کے قافلے کا تذکرہ کرتے ہیں۔اس کے بعد وہ مصائب کے بندوں میں کربلا کے شہیدوں کا ذکر کرتے ہیں۔

یہ مرثیہ بیانیہ طرز پہ لکھا گیا ہے۔عظیم نے مرثیہ میں انسانی بیماریوں اور اس کے علاج کا بھی تذکرہ کیا ہے تاکہ سامعین کو عبرت حاصل ہو سکے۔اس میں ائمہؑ کے طبّی قول کو بیت میں بہت خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ان کے کلام میں روانی ہے،ان کے لفظوں کا انتخاب اور ان کی نشست بہت حسین انداز میں ملتی ہے۔

اسلام اور فسادات۔عظیم کا ایک اور مرثیہ ''اسلام اور فسادات'' کے عنوان سے بھی ملتا ہے۔مرثیہ میں فسادات کا چہرا بیان کیا گیا ہے۔مرثیہ کا آغاز عظیم ملک میں ہونے والے فسادات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اس کی منظرکشی کی ہے۔عظیم فسادات سے ہونے والے جانی ومالی نقصانات کا بیان بھی کرتے ہیں۔

گھر جل گیا کوئی کہیں سامان جل گیا ۔۔۔ حسرت جلی غریب کی ارمان جل گیا
نفرت کی آگ بڑھ گئی انسان جل گیا ۔۔۔ مسجد میں بم پھٹا ہے تو قرآن جل گیا
رشتے تمام انس و محبت کے توڑ کے
انسانیت کو رکھ دیا کس نے بھنبوڑ کے

اس کے بعد عظیم سرکاری محافظین کی جانب دارانہ کاروائی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہیں۔اور اہل سیاست اور حکمرانوں کی صرف بیان بازی اور دغلہ پن کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس ملک میں قانون کو پیروں تلے روندا جارہا ہے۔گاندھی کے فلسفے کا مزاق اڑایا جارہا ہے۔عظیم یہ پوچھتے ہیں کہ۔

وہ شانتی کا دیش وہ دنیا کہاں گئی

اے دوستوں! بتاؤ اہنسا کہا گئی

عظیم افسوس جتاتے ہوئے کہتے ہیں یہ فساد ایسی پاک و پاکیزہ زمین پہ ہو رہا ہے جہاں ایک چھوٹے سے جانور کا خون بہانا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے، جہاں امن واتحاد کا پیغام دینے والے دیوتا رہتے ہیں، ایسی زمیں پر بسنے والے لوگ آج فتنہ وفساد کررہے ہیں۔آخر یہ خون خرابہ اور فسادات کب تک ہوتے رہے گے۔ابھی تو اس ظلم وفسادات کا زوال ہوگا۔اور اس زاول کے لئے کربلا جیسے کرداروں کی ضرورت ہے۔

لیکن ثبات و صبر کی دیوار چاہئے عزم وعمل کی تیغ شرر بار چاہئے
جو اہل حق کی ہے وہی رفتار چاہئے کردار، کربلا کا سا کردار چاہئے
ہر شاخِ ظلم و جور بھی خود ٹوٹ جائے گی
دستِ جفا سے ، تیغِ ستم چھوٹ جائے گی

اس کے بعد عظیم کربلا کی تعلیمات کا ذکر کرتے ہیں۔پھر اسلام کا ذکر کرتے ہوئے اسلام کی تشریح کرتے ہیں۔ پھر حضرت حسینؑ کے فضائل کا بیان کرتے ہیں۔اور مصائب کے بندوں میں اہلبیت کا تذکرہ کرتے ہیں۔دعائیہ بند لکھتے ہوئے عظیم یہ دعا کرتے ہیں کہ اب کبھی فساد نہ ہوں اور روئے زمیں پہ راحت اور امن پھلا ہو۔مرثیہ کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عظیم کی فکر کس درجہ صحیح ہے۔الفاظ کے استعمال میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔مرثیہ کو پڑھنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ عظیم جدید حسّیت کے مرثیہ گوءشاعر ہیں۔

حسینؑ اور حرّیت۔ یہ عظیم کا ایک طویل مرثیہ ہے جس میں بندوں تعداد ۸۴ ہے۔اس مرثیہ کو انھوں نے ۸۶۔۱۹۸۵ء کے آس پاس تحریر کیا تھا۔مرثیہ میں حُرّیت یعنی آزادی کو موجوع بنایا گیا ہے۔اس مرثیہ کے بارے میں عظیم لکھتے ہیں کہ۔

''۱۵/اگست یوم آزادیٔ وطن کے موقع پر چھوٹی چھوٹی نظمیں اکثر کہیں جو اخبارات میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ایک بار اچانک یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اس موضوع پر ایک مرثیہ کہا جائے۔کیوں نکہ کربلا کے کرداروں میں ایک کردار حضرت حُر کا ایسا ہے کہ جو اس موضوع یعنی آزادی سے تعلق بھی رکھتا ہے اور مناسبت بھی ہے۔لہٰذہ یہ مرثیہ کہا اور پھر ملک کی آزادی سے متعلق جو اخبارات اور رسائل کے نمبر نکلے ان میں اس مرثیہ کے چہرے کے بند شائع ہوئے۔'' ۲۷

مرثیہ کی ابتدا میں عظیم آزادی کی اہمیت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر آزاد ہوتا ہے۔اس کے بعد وہ مفکرین اور دانشوروں کا آزادی کے بارے میں جو خیال پر روشنی ڈالتے ہیں۔اور آزادی کے افادیت اور اسکے نقصانات بھی بیان کرتے ہیں۔آگے عظیم کہتے ہیں کہ آزادی پر عقل کا پہرہ رہنا بہت ضروری ہے۔

جہاں دیدہ وراں میں نظر اسیر نہیں　　حجر اسیر نہیں او رشجر اسیر نہیں
یہ آسمان کے شمس و قمر اسیر نہیں　　مطیعِ حق ہیں ، کسی کے مگر اسیر نہیں
رہِ حیات میں فکرو نظر ضروری ہے
عمل پہ عقل کا پہرہ مگر ضر وری ہے

اس کے بعد عظیم عقل کی حقیقت اور اس کی کارفرمائیاں بیان کرتے ہے کہ عقل آدمی کے لئے بہت ضروری ہے۔ عقل ہی وہ شہ ہے جس سے انسان ہر اچھے برے کی شناسائی کراتا ہے۔ انسان کی صحیح راہ کی رہبری کراتا ہے۔ پھر عظیم اسلام میں حُریت کے جو تصور ہیں اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد شریعتِ اسلام میں جو پابندیاں لگائی گئیں ہیں اس کو بہت خوبصورت اور سہل انداز میں سمجھایا ہے۔ عظیم اسلامی نظام کا مفہوم بتاتے ہیں اور اس کے بعد حسینؑ کے فضائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ پھر یزید کا بیعت کا مطالبہ کرنے اور امام حسینؑ کے انکار کرنے کے واقعہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ عظیم شب عاشور میں حسینؑ کے درس آزادی کا ذکر کرتے ہوئے یاور وانصار کے جان کے تحفظ کی اجازت بھی بیان کرتے ہیں۔ عظیم انصار کے جذبۂ فداکاری کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

غرض، حسینؑ نے ہر طرح سے یہی چاہا　　کہ میرے ساتھ کسی اور کا کٹے نہ گلا
قسم خدا کی وہاں سے مگر ، کوئی نہ ہلا　　ہر ایک یاور و انصار کا یہ کہنا تھا
ہزار بار بھی ہوں قتل، تب بھی حسرت ہو
کہ ایک بار ابھی اور پھر شہادت ہو

عظیم آمد کے جز میں حُر کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا معافی طلب کرنا اور اذنِ جنگ طلب کرنے کو بہت پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ پھر حُر کی فاتحانہ جنگ کی منظر کشی کرتے ہیں اور ان کی شہادت بیان کرتے ہیں۔

فرض اور کربلا۔ عظیم کا مرثیہ ''فرض اور کربلا'' ۶۰ بندوں پہ مشتمل ہے۔ یہ مرثیہ فرض اور کربلا کے فرض شناسوں کا بیان کرتا ہے۔ مرثیہ کا آغاز عظیم انسانی زندگی میں فرض کی اہمیت اور افادیت بتاتے ہوئے کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنے فرض کی ادائیگی کو سمجھے اور اسے پورا کرے تو بہت سے مسائل کا حل بہ آسانی ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد عظیم فرض شناسی کی انسانی زندگی میں ضرورت اور اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں۔ عظیم کہتے ہیں کہ انسان کی طرح ہی حیوانوں میں بھی فرض کی ادائیگی کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنے فرض کو بخوبی انجام دیتے ہیں۔ فرض کی ادائیگی میں ہی ہماری قوم کا راض چھوپا ہے۔

عظیم جناب ابوطالب کا ذکر کرتے ہوئے اس کی فرض شناسی اور اس کی ادائیگی کا بیان کرتے ہیں۔ عظیم جناب ابوطالب کی مدح وثنا کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

ابوطالب ہیں حقیقت میں فرائض کے امام　　دے گئے فرض کا جو اپنے عمل سے پیغام
فرض اللہ کی جانب سے جو تھا ان کا کام　　بھول سکتا نہیں تا حشر بھی اس کو اسلام

فرض کا درس زمانے کو اسی در سے ملا
پھر اک آئین فرائض بھی پیمبرؐ سے ملا

عظیم فرض ادا نہ کرنے کے نقصانات بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ملک میں فرض کی ادائیگی میں غفلت برتنے سے انسان کے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ بھائی بھائی میں نا اتفاقی ہو جاتی ہے۔عظیم اسلام کے حوالے سے فرض ادائیگی کے فرائض کا بیان کرتے ہوئے کربلا کو فرض کا درس گاہ بتاتے ہیں۔ وہ حضرت عباسؑ کی مدح کرتے ہوئے ان کے فرائض کا تذکرہ کرتے ہیں۔ پھر حضرت عباسؑ کی جنگ کے مناظر کا بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد شہادت اور پھر عباسؑ کی لاش پہ حضرت امام حسینؑ کے بین کو پیش کرتے ہیں۔مرثیہ بہت رقت آمیز ہے۔

اسلام اور وقت شناسی۔ عظیم کا مرثیہ ''اسلام اور وقت شناسی'' وقت کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کرتا ہے۔۲۷ بندوں میں تحریر یہ مرثیہ اپنے ابتدا میں وقت کی ضرورت کو بیان کرتا ہے۔اور پھر اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔مرثیہ میں عظیم وقت کی حقیقت بیان کرتے ہوتے کہتے ہیں کہ وقت انسان کی ہر مصیبت اور پریشانیوں کو دور کر دیتا ہے۔وقت کی حقیقت عظیم کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

ہے مطمئن بھی وقت پریشان بھی ہے وقت — رونق کدہ بھی وقت ہے سنسان بھی ہے وقت
ہے سرخرو بھی وقت، پشیمان بھی ہے وقت — آباد بھی ہے وقت تو ویران بھی ہے وقت
ہر قدردان وقت پہ راحم بھی وقت ہے
ہر بے عمل کے واسطے ظالم بھی وقت ہے

پھیلا بشر کا ہاتھ اگر وقت پڑ گیا — دشمن سے کی ہے بات اگر وقت پڑ گیا
بدلی ہے کل حیات اگر وقت پڑ گیا — دن بھی لگا ہے رات اگر وقت پڑ گیا
اکثر سفر میں دھوپ تھی، ساون نہیں پڑا
بگڑا ہے جب بھی وقت تو کچھ بن نہیں پڑا

عظیم مرثیہ میں وقت کی تغیر پسندی کے ساتھ ساتھ وقت کا ہر شے کے تغیر ہونے کا سبب بھی بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد عظیم وقت کی بربادی کے نتائج بیان کرتے ہوئے انسان کو وقت کی قدر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔اور وقت کے صحیح استعمال سے ہونے والے فوائد کا بھی ذکر کرتے ہیں۔اس کے بعد عظیم اسلام میں وقت کی جو اہمیت اور قدر و قیمت بتائی گئی ہے اس کا بیان مرثیہ میں غنائیت کے انداز میں کیا گیا ہے۔

عظیم مرثیہ میں رسول اعظمؐ کے معراج جانے کے واقعہ کو بیانیہ انداز میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ رجعت شمس کا واقعہ بھی بیان کرتے ہیں۔ پھر چاند کے شق ہونے کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ پھر مدح امام حسینؑ بیان کرتے ہوئے انکی مدینہ سے رخصت ہو کر کربلا پہنچنے تک کے تمام واقعاتوں کا ذکر حقیقت مندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔عظیم کربلا میں خیمہ کا دریا کے کنارے سے ہٹانے کو وقت کی دلیل بتاتے ہیں۔اس کے بعد کربلا کے تمام شہیدوں کی شہادت کا ذکر بہت مختصر

انداز میں کرتے ہوئے امام حسینؑ کی شہادت کا بیان دردناک انداز میں کرتے ہیں۔ پھر بھائی کی لاش پہ بہن کے بین اور باپ کی لاش پہ ایک بیٹی کے بین کو عظیم نے رقت آمیز انداز میں بیان کیا ہے، جس سے سامعین اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پاتا ہے۔

یہ مرثیہ بھی بیانیہ اسلوب پہ تحریر کیا گیا ہے۔ مرثیہ سادہ اور صاف انداز میں کیا ہے۔ اس میں محاوروں کا استعمال بھی ملتا ہے۔ عظیم کے مرثیہ میں حسن کلام بھی موجود ہے اور سوز گداز بھی۔ جوان کو ایک قادرالکلام شاعر بناتا ہے۔

حسینؑ اور عصر حاضر۔ عظیم کا یہ مرثیہ ۵۵ بندوں پر مشتمل ہے۔ مرثیہ کے آغاز میں عظیم عصرِ حاضر کی منظر کشی کرتے ہیں ۔اور بتاتے ہیں کہ موجودہ دور میں انسانی کرداروں کا زوال ہو رہا ہے۔ اخلاقی اقداری کی پامالی ہو رہی ہے۔ اوراس سے بچنے کے لئے انسان کی اندر جزبۂ حسینی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد عظیم حسینؑ کی مدح کرتے ہیں۔ عظیم تہذیبی قدروں کے زوال کا ذکر کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

قبر بکتی ہے کہیں ، اور کفن بکتا ہے زلف بکتی ہے کہیں، اور بدن بکتا ہے
شعر بکتے ہیں کہیں اور سخن بکتا ہے فکر بکتی ہے کہیں ، اور کہیں فن بکتا ہے
کج کُلا ہوں نے بھی خود اپنا بھرم بیچ دیا
شاعروں اور ادیبوں نے قلم بیچ دیا

اہل ایماں میں وہ ایماں کی حرارت نہ رہی حافظ و قاری کی بے لوث تلاوت نہ رہی
مولوی رہ گئے ، لیکن وہ امامت نہ رہی قاضیٔ شہر کے بھی پاس شریعت نہ رہی
یہ عبائیں ، یہ قبائیں ، یہ عمامے لے لو
چاہے جس بھاؤ بھی بازار سے فتوے لے لو

اس کے بعد عظیم معاشرے میں ہو رہے نقصانات اور تغیرات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں انسانوں میں کربلا سے جو درس ملتا ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور ساتھ ہی وہ تعلیمات کربلا کی اہمیت اور ضرورت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ عظیم مرثیہ میں اللہ سے یہ دعا کرتے نظر آتے ہیں کہ اس دنیا میں ایک ایسے اپنے بندے کو بھیجے جو ہمیں علم و بصیرت عطا کرے۔ پھر عظیم امام حسینؑ کی جنگ کی منظر کشی کرتے ہیں۔ پھر ان کی شہادت بیان کرتے ہیں اور بین کے جز میں جناب زینبؑ کے بین کو بیان کرتے ہیں۔ عظیم کے کلام میں ندرت ہے اور ساتھ ہی اس میں روایتیں نظم کی گئیں ہیں۔ جس سے بیان وسیع ہو گیا ہے۔

☆ عظیم امروہوی کی مرثیہ نگاری :

عظیم نے اب تک کل ۲۴ مرثیے کہے ہیں۔ جو اپنے جداگانہ موضوعات کے بنا پر اپنی الگ اہمیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک عظیم کی شعری اصناف میں مشق سخن کا تعلق ہے اس میں ان کا نام بحیثیت رباعی گو، سلام گو اور مرثیہ گو شاعر کے لیا

جاتا ہے۔لیکن اس وقت مجھے صرف ان کی مرثیہ گوئی کے تعلق سے بات کرنی ہے۔عظیم کے مرثیوں میں جدید فکر اور عصری تقاضے واضح طور پر دیکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے مرثیوں میں تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ ساتھ محاوروں کا بھی بہت خوبصورتی سے ذکر کیا ہے۔ان کے تمام مرثیہ موضوعاتی طرز پر لکھے گئے ہیں۔عظیم نے اپنے تمام مرثیوں میں قرآن کے حوالے سے اپنے موضوع کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

موضوع۔ موضوع کے حوالے سے اگر عظیم کے مرثیہ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ان کے تمام مرثیوں میں علیحدہ موضوع بیان کیا گیا ہے۔عظیم نے دو مرثیوں میں قرآن کو موضوع بنایا ہے۔ایک مرثیہ انھوں نے فسادات کو موضوع بنا کر لکھا ہے، جس میں فساد کی تفصیلات اور اس ہونے والے جانی اور مالی نقصانات کا ذکر کیا ہے۔

پھر گلستاں میں چلنے لگی ہے نسیم گرم ۔۔۔ حد ہے نکل رہی ہے گلوں سے شمیم گرم
تاج غنیم گرم ہے ، تخت غنیم گرم ۔۔۔ ہے یہ زمین گرم فلک بھی عظیم گرم
مظلوم اور غریب کے کب درد مند ہیں
شعلے اگل رہے ہیں ،جو دہشت پسند ہیں

انسانیت کا دور ہی اک دم بدل گیا ۔۔۔ آدمؑ کی راہ سے بنی آدم بدل جس
عظیم میں تھا من و چین وہ عالم بدل گیا ۔۔۔ بارش ہوئی جو خون کی ، موسم بدل گیا
پھلا وہ آسمان پہ بارود کا دھواں
اٹھا ہو جیسے آتش نمرود کا دھواں

امرہوی نے اپنے مرثیے ان موضوعات پہ لکھے ہیں جو آج ہمارے معاشرے کے مسائل ہیں اور جن کو سلجھانا ہمارے لئے بہت ضروری ہو گیا ہے۔مثلاً مسلمان ،حُریت ،فسادات ،اتحاد، زندگی اور امن۔یہ ایسے موضوع ہیں جن کو سمجھنا آج ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔اور عظیم ان سب مسائل کو حسینؑ کے کردار کی روشنی میں سمجھنے کی تلقین کرتے ہیں۔اور اسی لئے وہ اپنے مرثیے کا عنوان بھی ویسا رکھتے ہیں۔جیسے حسینؑ اور اتحاد، حسینؑ اور مسلم، حسینؑ اور حریت، حسینؑ اور وقت شناسی وغیرہ۔عظیم ''حسینؑ اور مسلم'' میں اپنے قوم کے جو حالات بیان کرتے ہیں اس کو ملاحظہ فرمائیے۔

ہماری قوم کے اوپر عجیب غفلت ہے ۔۔۔ قدم قدم پہ ہر اک بات میں سیاست ہے
ہمارے پاس نہ دولت ہے اور نہ عزت ہے ۔۔۔ جہاں پہ قوم کھڑی ہے مقام غیرت ہے
کہیں نظر نہیں آتی ہے روشنی یا رب
یہ کس مقام پہ آئی ہے زندگی یا رب

آج بدلتے ہوئے وقت اور حالات میں جب اقوام مسلم ہر طرف سے ظلم وستم کا نشانہ بن رہی ہے اس عالم میں عظیم کا یہ پیغام اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود ہے۔عظیم نے ایک مرثیہ کا موضوع طب کو بھی بنایا ہے یہ ایک اچھوتا موضوع ہے۔انھوں نے اس میں ائمہ کے طب کے حوالے سے کہے گئے اقوال کا بیان کیا ہے۔ جو ان کو انفرادیت بخشتا

ہے۔

اسلوب۔ اسلوب کا استعمال نظم ونثر کے لئے شروع سے ہی ہوتا آیا ہے۔اسلوب کے سلسلے میں گوپی چند نارنگ اپنی کتاب''ادبی تنقیداوراسلوبیات''میں لکھتے ہیں۔

''اردو میں اسلوب کا تصورنسبتاً نیا ہے۔تاہم''زبان وبیان''،انداز،انداز بیان،طرز بیان،طرزتحریر،لہجہ،رنگ،رنگ سخن وغیرہ اصطلاحیں اسلوب یااس سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کی جاتی رہی ہے۔یعنی کسی بھی شاعر یا مصنف کے انداز بیان کے خصائص کیا ہیں،یا کسی صنف یا ہیئت میں کس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے۔یا کسی عہد میں زبان کیسی تھی اوراس کے خصائص کیا تھے وغیرہ۔یہ سب اسلوب کے مباحث ہیں۔ادب کی کوئی پہچان اسلوب کے بغیر مکمل نہیں۔'' ۲۸

عظیم کا اسلوب اورطرز ادا فطرت سے حد درجہ قریب ہی نہیں بلکہ اس سے ہم آہنگ بھی ہے۔ان کے یہاں ہندوستانی مزاج اورطرز معاشرت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ روزمرہ اورعوام الناس کی زبان کا برمحل استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔عظیم کے مرثیے بیانیہ اورعلامتی طرز سے لکھے گئے ہیں۔ان میں واقعات کوقرآن اورحدیث کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔انھوں نے اپنے زیادہ تر مرثیوں میں اس کے اجزاء کے استعمال کو باقاعدگی سے برتا ہے۔عظیم نے مرثیے میں محاوروں،استعاروں اورتشبیہوں کا استعمال بھی کیا ہے۔

رعب کہتا تھا،کہ حیدرؑ کا پسر آتا ہے　　چہرہ کہتا تھا،کہ ہاشم کا قمر آتا ہے
ڈھنگ کہتا تھا،کہ بے خوف وخطر آتا ہے　　عزم کہتا تھا، پئے فتح و ظفر آتا ہے
غیظ نے اٹھ کے صدادی کہ دلیر آتا ہے
ہوا میدان میں غل، شیروں کا شیر آتا ہے

تلوارکی تعریف۔ عظیم نے اپنے ۲۴ مرثیے میں سے صرف پانچ مرثیوں میں ہی تلوارکی تعریف کی ہے۔تلوارکی تعریف کے یہ بند ملاحظہ ہو۔

اللہ کا دیا ہوا انعام ذوالفقار　　چلتی تھی بن کے موت کا پیغام ذوالفقار
فقروں کی طرح چبھتی تھی ہر گام ذوالفقار　　اس وجہ سے خدا نے رکھا نام ذوالفقار
جبریل لے کے آئے فلک سے نبیؐ کے پاس
پہنچی نبیؐ کے علم کی صورت علیؑ کے پاس

ساقی نامہ۔ عظیم نے اپنے صرف دومرثیوں میں ساقی نامہ کا استعمال کیا ہے۔ایک ''حسینؑ اور مسلمؑ''اور دوسرا''حسینؑ اور کربلا''۔حسینؑ اور مسلم میں عظیم نے آٹھ بندوں میں ساقی نامہ پیش کیا ہے،جبکہ حسینؑ اور کربلا میں صرف

دو بندوں میں ہی ساقی نامہ کا پیش کیا ہے۔

لبوں پہ نامِ حسینؑ اپنے آگیا ساقی ہمیں شراب مودّت ذرا پلا ساقی
کہ آج پینی پلانی ہے سب روا ساقی وہ مے کہ کہتے ہیں جس کو مئے ولا ساقی
نشے میں جس کے ہمیشہ کی کامرانی ہو
وہ مے کہ پرچم اسلام میں جو چھانی ہو

رزمیہ۔ عظیم نے رزمیہ کا بیان اپنے تقریباً سبھی مرثیوں میں کیا ہے۔ان کے رزمیہ کا بند ملاحظہ ہو۔

خوب چن چن کے ہر اک اہل سقر کو مارا زیر جو ہو نہ سکے ،ایسے زَبر کو مارا
پیش پیش ان میں جو تھا، بانیٔ شر کو مارا ہاتھ تلوار کا پیاسے نے جدھر کو مارا
چھا گیا سامنے آنکھوں کے اندھیرا فوراً
موت نے آکے سیہ بخت کو گھیرا فوراً

واقعہ نگاری۔ کسی بھی حالات کو تاریخی پس منظر میں بیان کرنے کو واقعہ نگاری کہتے ہیں۔اس کی دوسری قسم یہ ہے کہ واقعہ نگار کسی واقعہ کے تمام جزئیات اور حالات کو اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہے۔عظیم نے بھی مرثیوں میں بہت سے واقعات کا بیان کیا ہے۔ان میں ایک واقعہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا ہے جس کو انھوں نے مرثیہ ''حسینؑ اور قربانی'' میں بیان کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

جب خلیل پاک نے اک روز دیکھا خواب میں نذر دو فرزند صالح، حکم آیا خواب میں
اپنے ہاتھوں سے گلا بیٹے کا کاٹا خواب میں محوِ حیرت تھے بہت اور کچھ نہ سوچا خواب میں
تین دن تک خواب یہ دیکھا خلیل اللہ نے
الغرض بیٹے سے پھر پوچھا خلیل اللہ نے

رائے ابراہیمؑ نے بیٹے سے لی اس واسطے کارنامہ تاکہ دونوں کا یہ قربانی بنے
گر خلیلِ رب نہ اسماعیلؑ سے یہ پوچھتے صرف ان کا امتحاں تاریخ کہہ دیتی اسے
بولے اسمٰعیلؑ، جو حکمِ خدا ہے کیجئے
جو رضائے رب، وہی میری رضا ہے کیجئے

منظر نگاری۔ عام واقعہ نگاری یا منظر نگاری میں بڑا فرق یہ ہے کہ منظر نگاری مختلف واقعات یا متعدد واقعہ کا جُز ہوتا ہے۔ان سب کے ملنے سے جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ منظر ہوتا ہے۔مثلاً طلوع آفتاب کے وقت ہم صرف آفتاب کو نہیں دیکھتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہم شفق اور اڑتے ہوئے پرندوں کو بھی دیکھتے ہیں۔یوں تو عظیم نے منظر نگاری کا بیان اپنے مرثیوں میں بہت زیادہ نہیں کیا ہے مگر جو بھی کیا ہے وہ بہت عمدگی سے کیا ہے۔ان کی کچھ منظر نگاری ملاحظہ

ہو۔

وہ کربلا میں اندھیروں کی اک بھیانک رات　　　وہ سائیں سائیں کا منظر، وہ ہر طرف ظلمات
وہ وقت وہ تھا کہ تھی تنگ اہل حق پہ حیات　　　سیاہ شام میں مدہوش سب تھے لات ومنات
اس ایک رات میں سب کچھ سکھا گئے شبیر
جو حُریت کا سبق تھا پڑھا گئے شبیر

ایک اور منظر نگاری دیکھئے۔

خیمے میں اہل بیت کے کہرام ہے بپا　　　بچے تڑپ رہے ہیں کہ پانی نہیں ملا
بے ہوش ایک سمت ہیں بیمار کربلا　　　یوں دشت نینوا میں محمدؐ کا گھر لٹا
مظلوم سے غریب سے پیاسے سے کی دغا
نانا کے دوستوں نے نواسے سے کی دغا

رزمیہ۔ عظیم نے اپنے سبھی مرثیوں میں رزمیہ پہلو کو بہت حقیقت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے سامعین کی آنکھوں کے سامنے پورا منظر چھا جاتا ہے۔ عظیم نے حضرت امام حسینؑ کی جنگ کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

جس کی طرف اٹھا شہ کرب و بلا کا ہاتھ　　　گردن دبا کے اس کی پکارا قضا کا ہاتھ
دیکھا شریر؟ دلبر شیر خدا کا ہاتھ　　　ظالم ابھی یہ ہاتھ ہے صبر و رضا کا ہاتھ
بھرپور وار ہو تو قیامت بپا کریں
لیکن نبیؐ سے صبر کا وعدہ ہے کیا کریں

ایک اور جنگ کا منظر ملاحظہ ہو۔

بڑھ کے اکبر نے جو دشمن پر کئی وار کیے　　　دشمنِ حق جو تھے ٹھنڈے کیے فی النّار کیے
ایک کے دو، علی اکبر نے کئی بار کیے　　　سامنے آگئے جب دو، تو وہیں چار کیے
شکل وصورت سے تو لگتے تھے پیمبرؐ کی طرح
وار میداں میں کیے فاتحِ خیبر کی طرح

اس طرح عظیم کے مرثیہ کے مطالعہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عظیم موجودہ دور کے ان منفرد مرثیہ نگاروں میں سے ہیں جن کے مرثیے صرف مجلسوں میں رونے رولانے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ وہ ہمارے معاشرے کی اصلاح بھی کرتے ہیں۔ عظیم کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے رئیس امروہوی لکھتے ہیں۔

''جدید مرثیہ نگاروں میں قدر اول کی اہمیت نوجوان شاعر عظیم امروہوی کو حاصل ہے۔ عظیم امروہوی کی عمر شاعری زیادہ نہیں ہے لیکن اس کم عرصے میں ہی اس جواں فکر شاعر نے صنف مرثیہ میں جو اضافے کیے ہیں ان کو دیکھ کر مسرت بھی ہوتی ہے

اور حیرت بھی۔ان کے مراثی علمی وادبی منظوم مقالے ہیں۔'' ۲۹

عظیم امروہوی کے مرثیوں کے مطالعہ اور ناقدین کی رائے سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عظیم امروہوی جدید مرثیہ نگاری کی تاریخ میں اہم مقام کے حامل ہیں۔

☆ سید مسعود الحسن ''ظہیؔر جعفری''۔

ظہیر جعفری کا تعلق تو مدراس سے ہے،لیکن یہ مقیم حیدرآباد میں ہیں۔ان کی پیدائش مدراس میں ۱۹۳۷ء کو ہوئی۔ان کے والد سید نورالحسن جعفری ''ظاہر دہلوی'' خود ایک اچھے شاعر تھے،اور یہی ذوق شاعری ظہیر جعفری کو ورثہ میں ملی۔ان کی والدہ عباسی بیگم جو کہ مدراس سے ہی تعلق رکھتی تھیں، بہت ہی نیک خاتون تھیں۔ظہیر جعفری کے تعارف میں ان کی استاد محترم تجم آفندی لکھتے ہیں۔

> ''سید مسعود الحسن ظہیؔر جعفری جو اس نظم کے مصنف ہیں دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ کے والد بزرگوار ۳۵،۴۰ برس بیشتر دہلی سے مدراس آکر مقیم ہو گئے تھے۔آپ کے والدِ مرحوم بھی شاعر تھے اور یہ ذوقِ شعر ظہیر صاحب کو انہیں سے ورثہ میں ملا ہے۔'' ۳۰

ظہیر جعفری نے اپنی تعلیم مدراس میں ہی پوری کی اور ۱۹۶۸ء میں مدراس کو خیر باد کر کے حیدرآباد آ گئے۔ انھوں نے اپنی شاعری کی آغاز ب۲۰ یا ۲۲ برس کی عمر سے شروع کیا۔اور ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے اب تک تقریباً ۳۰۷ غزلیں تحریر کی ہیں۔اس کے علاوہ آزاد نظمیں ،نظیں ،سلام ،منقبت ،نوحے اور مرثیے بھی کہیں ہیں۔ انھوں نیاب تک چار مرثیے تحریر کئے ہیں۔

یوسف کربلا ۔

یہ ظہیر جعفری کا پہلا مرثیہ ہے جس کوانھوں نے حضرت علی اکبرؑ کے حال پر تحریر کیا ہے۔یہ مرثیہ ظہیر جعفری نے اپنے جوان بیٹا جس کا نام بھی انھوں نے علی اکبر ہی رکھا تھا، کے سانپ کاٹنے سے مرنے پر تحریر کیا ہے۔جس کا سن بھی اٹھارہ کانہیں ہوا تھا۔یہ ان کا سب سے مختصر مرثیہ ہے جس میں ۲۸ بند شامل ہیں۔مرثیہ کی فنی خوبیوں کو پرکھا جائے اس کو نظم کہنا غلط نہ ہوگا۔اس مرثیہ کی تعریف میں ڈاکٹر سید اختر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ۔

> '' آج ظہیؔر جعفری صاحب کی نظم ''یوسفِ کربلا'' میری نظر سے گزری اس نظم میں شاعری سے زیادہ جذبۂ مودّت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔اور یہ معلوم ہو کر کہ یہ موصوف کی پہلی کوشش ہے میں اسے بہت زیادہ قابلِ داد سمجھتا ہوں۔فنّی اعتبار سے بھی یہ نظم معیاری کہی جاسکتی ہے۔'' ۳۱

مرثیہ کی ابتدا ظہیر جعفری ذکر جمال علی اکبرؑ سے کرتے ہیں اور انکے حسن کی تشبیہ جمال یوسف سے دیتے

ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ اس کائنات میں حسن یوسف کے علاوہ ایک اور داستان بھی کہی جاتی ہے اور وہ جناب علی اکبرؑ کی خوبصورتی کی داستان ہے۔شاعر جناب علی اکبر کے حسن کو جناب یوسف کے جمال سے بھی زیادہ مانتے ہیں۔جناب علی اکبرؑ ہم شبیہہ مصطفیٰؐ ہیں اور اسکا ذکر شاعر اس انداز سے کرتا ہے۔

فخرِ یوسف ، مظہرحق ، نازش کل انبیا　　آئینہ رو، آئینہ پیکر ، محمد مصطفاؐ
ہر نبی کے حسن کی تصویر جس کا حسن تھا　　انتہا یہ ہے کہ تھا وہ حاصلِ صنعِ خدا
جب یہ دنیا دم قدم سے اس کے خالی ہوگئی
تھا یہ عالم ہر نگاہِ شوق جیسے سوگئی

وفات رسولِ اکرمؐ جب دنیا جمال مصطفیٰؐ سے خالی ہوگئی تو حسینؑ ابن علیؑ کے یہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی جو حسن میں،صورت میں، رفتار میں اور گفتار میں رسولؐ کی شبیہہ تھا۔ان کی خوبصورتی دیکھ کر لوگ بہت خوش ہوئے اس بچے کے شبیرؑ پیشنگوئی کرتے ہیں کہ یہ بچہ کمسنی میں تین دن کی بھوک پیاس سہ کر نیزوں سے مارا جائےگا۔اس کے بعد ظہیر جعفری اس وقت کا ذکر کرتے ہیں جب کربلا میں سارے انصار و اقرباء شہید ہو چکے ہیں،اور حضرت علی اکبرؑ باپ سے مرنے کی رضا کے لئے آتے ہیں۔ظہیر جعفری نے علی اکبرؑ کی رخصت کو مختصراً انداز میں بیان کیا ہے۔لیکن جذبات نگاری کا مظاہرہ بھی بہت عمدگی سے کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

جانبِ میداں جو یہ جان و دلِ سرورؑ چلے　　غل اٹھا پھر سوئے خیبر حیدرؑ صفدر چلے
نصرت حق کے لئے ہمشکلِ پیغمبرؐ چلے　　ساتھ یہ کہتے ہوئے با چشم نم سرورؑ چلے
چل ذرا آہستہ آہستہ میرے آرام جاں
دو گھڑی کے بعد پھر یہ چاند سی صورت کہاں

مرثیہ میں جنگ کی منظرکشی بھی شاعر نے ایک دو بندوں میں سمیٹتے ہوئے انکی شہادت کو بیان کیا ہے۔لیکن مرثیہ میں بین کے زیادہ بند تحریر کئے گئے ہیں۔جیسا کہ اُپر بتایا جا چکا ہے کہ ظہیر جعفری نے یہ مرثیہ اپنے جوان بیٹا کے مرنے پر لکھا تھا تو ایسا لگتا ہے کہ مرثیہ میں جو بین انھوں نے بیان کیا ہے وہ دراصل ان کا خود کا بین ہے۔جس کو انھوں نے حضرت شبیّرؑ کی زبانی بیان کی ہوں۔مرثیہ میں زبان صاف اور سادہ ہے۔

پانی ۔

پانی ان کا دوسرا مرثیہ ہے جس کو انھوں نے اٹھاسی بندوں میں تحریر کیا ہے۔پانی وہ شہ ہے جس کی وجہ سے ساری کائنات زندہ ہے۔یہ مرثیہ حضرت عباسؑ علمدار کی شان میں لکھا گیا ہے۔پانی کی اہمیت اور اسکی افادیت ہر شہ کے لئے ضروری ہے اور اس کی ضرورت کو شاعر نے مرثیہ میں الگ الگ انداز سے بیان کیا ہے۔مرثیہ میں شاعر نے موجودہ دور میں پانی کو لیکر جو مسائل ہیں اسکی طرف روشنی ڈالی ہے۔مرثیہ میں انھوں نے سب سے پہلے کائنات کے ہر ذی شعور کے لئے پانی کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ظہیر جعفری نے مرثیہ میں مطلع کا بند یوں بیان کیا ہے۔

پانی سے فیض خالقِ قیوم بے گماں　　اس کی نوازشات کا ممکن نہیں بیاں
چشمے، یہ آبشار ،یہ جھیلیں ،یہ ندیاں　　سب ہیں عطائے خاص خداوندِ دو جہاں
پانی ہی زندگی کے چمن کی بہار ہے

ظہیر جعفری لکھتے یں کہ پانی کی خلقت کر کے خداوند نے ذی حیات پر احسان کیا ہے۔وہ خداوند جس کی تصرفات کی انسان کی زندگی میں کوئی خدنہیں ہے۔اس خدا کی پانی میں مخلوق جا بجا نظر آتی ہے حتہ کہ وہ مچھوں کی نفسوں کی صدا بھی سنتا ہے۔اس کے بعد پانی کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بشر کے لئے پانی سے گریز ممکن نہیں ہے۔کیونکہ پانی ہی ہر ذی شعور کی زندگی کا سہارا ہے۔یہ پانی ہی ہے جس پر تمام حیات انسانی منحصر ہے۔پانی کی نظر میں کوئی ہندو مسلمان نہیں ہوتا اور نہ ہی پانی کی کوئی ذات پات ہوتی ہے نہ اسکا کوئی دین ہوتا ہے۔یہ تو انسان ہے جو فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔

آگے کے بند میں ظہیر جعفر خداوند کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعلیٰ کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سمندروں کی تہہ میں ایک پوری کائنات کی تخلیق کر رکھی ہے۔ایک پوری دنیا بنا رکھی ہے جس میں مچھلی سے لیکر مختلف مختلف نباتات موجود ہیں۔یہ وہی اللہ ہے جسکی ذات نے پہاڑ سے بھی پانی کا چشمہ جاری کر رکھا ہے۔نباتات کے لئے پانی کی اہمیت ظہیر جعفری اس طرح بیان کرتے ہیں۔

پانی بغیر صحن ِ چمن دشت ِ خاردار　　پانی سہارا دے تو نکھرتے ہیں لالہ زار
اک رہگذارِ آب ہے دامانِ کوہسار　　پانی کی اک قبیل کو کہتے ہیں آبشار
پانی کا کوہساروں سے گرنا زمین پر
اک مُہر ہے وجو د خدا کے یقین پر
پانی بغیر دامنِ ہستی بھی تار تار　　پانی بغیر ذہنِ بشر میں بھی خلفشار
پانی بغیر فکر و خرد کو نہیں قرار　　اب کیا کہوں میں پیاس کے ماروں کا حال زار
احساس تشنگی کی اذیت نہ پوچھئے
ا قہر ہے یہ پیاس کی شدّت نہ پوچھئے

ظہیر جعفری مرثیہ میں مولائے کائنات حضرت علیؑ کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں انھوں نے اپنی قوم کی پیاس بجھاتے کے لئے کنویں کھودوائے تھے کہ اس پانی سے ہر کوئی سیر آب ہو سکے لیکن دشمنوں نے انکی آل و اولاد کو تین دن پیاسہ رکھ کر قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد شاعر حضرت عباسؑ کی عظمت کا بیان کرتے ان کا تعروف اس انداز سے کرتے ہیں۔

عباسؑ اعتبارِ امام زمن کا نام　　مربوط جس کے نام سے ہے پنجتنؑ کا نام
باقی ہے جس کے دم سے وفا کے چمن کا نام　　عباسؑ ہے خزاں میں بہارِ چمن کا نام

وہ نام جسکا ضامنِ جاہ وحشم علیؑ
جس زاویئے سے دیکھئے سر تا قدم علیؑ

حضرت عباسؑ کی عظمت کے بعد شاعران کی ماں حضرت ام البنینؑ کی تعریف بیان کرتے ہیں۔جس نے عباسؑ کی رگ رگ میں وفاداری بھری ہے،جسکو حضرت امام حسینؑ اپنی ماں کہتے ہیں۔مدح عباسؑ کے بعد ظہیر جعفری کربلا کی عظمت بہت ہنرمندی سے تحریر کرتے ہیں۔جس کی تخلیق حسینؑ کی شہادت کے واسطے ہوئی ہے۔اس کے بعد شاعر مسائب کے بند تحریر کرتے ہوئے مدینہ سے حسینیؑ قافلے کی روانگی کا تذکرہ کرتے ہیں۔وہ حسینی قافلے میں جانے والوں کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس قافلے میں حضرت امام حسینؑ کے بیٹے علی اکبرؑ اور حضرت عباسؑ ہیں،جناب زینبؑ کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے عون ومحمد بھی شامل ہیں۔قافلے کے تمام لوگوں کا بیان شاعر اس طرح کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

ہیں قافلے میں عونؑ و محمدؑ سے نونہال انصار میں حسینؑ کے شامل حسنؑ کا لال
آغوش میں ربابؑ کی اصغر سا خوش جمال شبیرؑ سے بچھڑنے کا صغراؑ کو تھا ملال
دیکھا نہ تھا کبھی جو وہی دیکھتی رہی
سب چل پڑے وہ در پہ کھڑی دیکھتی رہی

تھیں محملوں میں زینبؑ و کلثومؑ باوقار امِّ ربابؑ و زوجۂ عباسؑ نامدار
کبراؑ ،سکینہؑ، فرواؑ و فضہؑ بھی تھیں سوار شبیرؑ پر رضائے مشیت تھی آشکار
ایسے چلے کہ پھر نہ مدینے کا رخ کیا
فرزندِ بوترابؑ نے کعبے کا رخ کیا

ظہیر جعفری قافلۂ حسینیؑ کے کعبہ میں پہنچنے کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب یہ قافلہ کعبہ میں پہنچے،اور حج کا قصد رکھتے تھے لیکن دشمنوں کی سازشوں کے تحت حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے کعبہ سے روانہ ہو گئے۔راستے میں حُر ان کا راستہ راکتا ہے اور اس قافلہ کو کربلا جانے پر مجبور کرتے ہیں۔اس کے بعد وارد کربلا کا تذکرہ کرتے ہوئے ظہیر جعفری حضرت عباسؑ کا خیمہ ہٹائے جانے پر جلال کا ذکر کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو۔

بس غیظ میں طبیعت عباسؑ آگئی پڑنے لگی حیات پر پرچھائیں موت کی
جب گفتگو کی حد سے' بہت بات بڑھ چلی شیرِ خدا کے شیر نے تلوار کھینچ لی
کانپا فلک،زمین کی چھاتی دھڑک اٹھی
اک برقِ بے اماں سرِ ساحل چمک اٹھی

مرثیہ میں حضرت عباسؑ کو علم ملنے اور میدان میں پانی لانے جانے کے بیان کے ساتھ ساتھ جنگ کرنے اور حضرت عباسؑ کی شہادت کا بیان تفصیل سے کیا ہے۔بھائی کی لاش پہ حضرت امام حسینؑ کا کمر کو تھامے آنا اور بھائی کی لاش پہ بین کرنے کا بیان پر درد انداز میں کرتے ہیں۔خیمہ میں حضرت عباسؑ کی لاش کا آنا اور تمام بیبیوں کا دلخراش بین کو بیان

کرتے ہیں۔مرثیہ میں تشبیہ اور استعارہ کا استعمال عمدگی سے کیا گیا ہے۔

بصیرت ۔

''بصیرت'' عنوان کے تحت لکھا گیا یہ مرثیہ حضرت حُر کے حال کا ہے۔بصیرت یعنی دل کی بینائی، جس کو دیکھ کر حضرت حُر کربلا میں روز عاشور دشمنوں کی فوج سے نکل کر حق کی جانب (امام حسینؑ) آ گئے تھے۔شاعر نے یہاں بصیرت کو حق کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے، اور حضرت رسولؐ اکرم سے امام حسینؑ تک سلسلہ در سلسلہ حق پر چلنے والوں کا تذکرہ کیا ہے۔مرثیہ کے آغاز میں ظہیر جعفری شاہ مدینہ یعنی حضرت امام حسینؑ سے دعا کرتے نظر آتے ہیں کہ میری فکر محدود ہے، یا شاہ میری بصیرت میں اضافہ کیجئے۔مطلع کا یہ بند دیکھئے۔

محدود میری فکر ہے یا شاہ مدینہ ہو مجھ کو عطا مرثیہ کہنے کا کرینہ
انچا ہے بہت ندرتِ افکار کا زینہ ڈوبے نہ کبھی میری بصیرت کا سفینہ
طے ہو یہ بصیرت کا سفر فضل خدا سے
اور اس کا تسلسل ہو غمِ کرب وبلا سے

مرثیہ میں بصیرت کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ظہیر جعفری لکھتے ہیں کہ بصیرت بشر کو تہذیب سے روشناس کراتی ہے۔بھٹکے ہوئے ذہنوں کو راہ پر لا کر ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتی ہے۔پھر شاعر قبل رسولؐ مکہ کا احوال بیان کرتے ہیں کہ قبل عہد رسولؐ بشر میں بصیرت نہ تھی۔بصیرت کیا ان میں انساں کی بصارت بھی نہ تھی۔پھر وہاں محمدؐ کا نزول ہوا اور انھوں نے بشر کو حوان سے انسان بنایا۔جاہلیت کو مٹایا یہی سبب ہے کہ ابوجہل ان کا دشمن ہو گیا۔

مرثیہ میں ظہیر جعفری نے بصیرت کو سلسلہ در سلسلہ بیان کیا ہے۔محمدؐ کے بعد علیؑ اور فاطمہؑ کی بصیرت کا بیان کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ بعد وفاتِ رسولؐ فاطمہؑ کا حق چھین کیا گیا۔انکے رونے پر پابندی لگائی گئی، پہلو پر دروازہ گرایا گیا، جس سے ان کے شکم میں محسن کی شہادت ہوگئی۔لیکن انھوں نے حق کو چھوڑا نہیں بصیرت کو کم نہیں ہونے دیا۔حضرت علیؑ کی گلے میں رسّی ڈال کر کھینچا گیا لیکن انھوں نے بصیرت کے دامن کو نہیں چھوڑا۔شاعر جنگِ صفین کے واقعہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔اس کے بعد حضرت امام علیؑ کی شہادت کی سازشوں اور ان کے قتل کا بیان کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

مشہور حریفانِ بصیرت کی ہے سازش تا حدِ نظر درہم و دینار کی بارش
مسجد کی فضا ، خونِ بصیرت کی وہ تابش کردار وہ دشمن بھی کرے جس کی ستائش
قاتل پہ کرم اپنے کیا ،حق کے ولی نے
شربت سے نواز ابنِ ملجم کو علیؑ نے

حضرت سلمان، قنبر، میثم اور ابوزر کی بصیرت کے ساتھ ساتھ ظہیر جعفری امام حسنؑ کے دور کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دورِ حسنؑ میں بھی حق اور باطل کی جنگ جاری تھی اور حق کو مٹانے کی سازشیں بُنی جا رہی تھیں۔اور بعد شہادت امام حسنؑ امام حسینؑ کو بھی مدینہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا اور حسینؑ نے اپنے نانا رسولؐ اکرم کی بصیرت کو بچانے کے لئے مدینہ کو خیر باد کیا

،ملّہ میں حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے کربلا کی تپتی سرزمین میں بستی بسالی۔

مرثیہ میں حضرت حُر کی بصیرت کا جاگنا اور فوجِ یزید سے حق کی طرف آنے کا بیان ظہیر جعفری نے بہت عمدگی اور ہنر مندی سے کیا ہے۔ حُر کی تعریف اور شجاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے شبِ عاشور حضرت حُر کی حالت اضطراب کا بیان یوں کرتے ہیں۔

وہ رات کہ جو حُر کی طبیعت پہ گراں تھی تنویرِ سحر جس کے حجابوں میں نہاں تھی
دل سینے میں بے چین تھا اور سانس رواں تھی تا خیرِ سحر حُر کے لئے آفت ِجاں تھی
کب تک رہی یہ شورشِ جذبات نہ پوچھو
کس کرب کے عالم میں کٹی رات نہ پوچھو

لہجے میں علیؑ کے وہ اذانِ علیؑ اکبر سنتے ہی جسے جاگ اٹھا حُر کا مقدر
نکلا وہ جری چھوڑ کے جب شام کا لشکر ہمراہ تھے فرزند و غلام اور برادر
لشکر میں مچاتے ہوئے ہلچل سی چلا حر
سورج تھا، صفیں چیر کے بادل کی چلا حُر

مرثیہ میں شاعر کربلا میں ہونے والی جنگ کو حضرت امام حسینؑ کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ اور پھر حُر کی رخصت، میدان میں آمد اور گھوڑے و تلوار کی تعریف کو بیان کیا ہے۔ ظہیر جعفری کا یہ پہلا ایسا مرثیہ ہے جس میں انھوں نے مرثیہ کے پورے اجزاء کو تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے دونوں مرثیے میں نہ تو تلوار کی تعریف ملتی ہے اور نہ ہی رہوار کی۔ رجز میں شاعر حضرت حُر کے ذریعہ شبّیر اور ان کے آل کی عظمت کا بیان کرتے ہیں، جس کو سن کر فوجِ یزیدی سے یہ جواب آتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

واقف ہوں میں کردار حسینؑ ابنِ علیؑ سے گھر بار لٹا سکتے ہیں یہ اپنی خوشی سے
رتبے میں نہیں کم یہ پیمبرؐ سے نبیؐ سے ہاں سامنا ان کا ہے مگر مجھ سے شقی سے
حیراں ہو شقاوت بھی وہ حال کروں گا
لاش ان کی اسی دشت میں پامال کروں گا

یہ سن نے کے بعد حُر نے لشکر پر حملہ کی اور بہت بہادرانہ انداز میں جنگ کی۔ جنگ کی تصویر کشی ظہیر جعفری نے حقیقت مندانہ انداز میں کی ہے جس سے جنگ کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ شہادت کے بعد بین کے بیت بھی ظہیر جعفری نے اچھے تحریر کئے ہیں۔ ظہیر جعفری کا یہ مرثیہ ان کے سب مرثیوں میں ابتریت رکھتا ہے۔ مرثیہ میں عنصر بھی پورے استعمال کئے گئے ہیں اور صنائع و بدائع کا استعمال بھی ملتا ہے۔

☆ ظہیر جعفری کی مرثیہ نگاری :

ظہیر جعفری عمدہ شاعر ہیں ان کی غزلیں، ان کے قصیدے بہت عمدہ ہیں۔ انھوں نے آزاد نظموں کی بھی ہنر

مندانہ انداز میں تخلیق کی ہے۔ مرثیہ میں بھی بصیرت ان کا سب سے اچھا مرثیہ ہے۔ جو عناصر ایک نظم کو مرثیہ میں تبدیل کرتے ہیں وہ سارے عناصر ان کے پہلے اور دوسرے مرثیہ میں نظر نہیں آتے لیکن ان کے تیسرے مرثیہ میں سارے عناصر خونصورتی سے استعمال ہوئے نظر آتے ہیں۔

موضوع۔ مرثیہ میں علی اکبرؑ ،حضرت حُرؑ اور حضرت عباسؑ ابن علیؑ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مرثیے میں پانی اور بصیرت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ پانی جو کہ موجودہ عہد کا ابھرتا ہوا مسلہ بنتا جا رہا ہے، پانی کی قلّت آنے والے نسل کے خطرہ بن سکتی ہے۔ اسی پانی کی قیمت کو ظہیر جعفری نے مرثیہ میں بتانے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی ہر ذی شعور کے لئے پانی کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

پانی پہ منحصر جو بشر کی حیات ہے ہندو کی بات ہے نہ مسلماں کی بات ہے
پانی کا دین ہے نہ کوئی ذات پات ہے گنگا ہے، رودِ نیل ہے، نہر فرات ہے
ہم کو تو اپنی پیاس بجھانا ہے دوستوں
پانی جہاں کہیں بھی ہو پانی ہے دوستوں

پانی بغیر دامنِ ہستی بھی تار تار پانی بغیر ذہنِ بشر میں بھی خلفشار
پانی بغیر فکر و خرد کو نہیں قرار اب کیا کہوں میں پیاس کے ماروں کا حال زار
احساس تشنگی کی اذیت نہ پوچھئے
کیا قہر ہے یہ پیاس کی شدّت نہ پوچھئے

اسلوب۔ اردو میں اسلوب کا تصور نسبتاً نیا ہے۔ تاہم ''زبان و بیان''، انداز، انداز بیان، طرز بیان، طرز تحریر، لہجہ، رنگ، رنگ سخن وغیرہ اصطلاحیں اسلوب یا اس سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کی جاتی رہی ہے۔ ظہیر جعفری کے مرثیہ کا اسلوب بیانیہ ہے۔ طرز بیان بھی سادہ ہے۔ مرثیہ میں تشبیہ اور استعارہ کا استعمال بھی ملتا ہے۔

ہر دور میں ہی اہل بصیرت پہ کھولا راز مرہونِ بصیرت ہے اک فکر کی پرواز
یہ نغمۂ غم درد میں ڈوبے ہوئے یہ ساز یہ اشکِ عزا ہیں غم شبّیر کا اعجاز
جو اشک غمِ سبطِ پیمبرؐ میں بہے گا
آغوشِ بصیرت میں وہ پروان چڑھے گا

تلوار کی تعریف۔ ظہیر نے اپنے صرف ایک مرثیہ میں ہی تلوار کی تعریف بیان کی ہے۔ وہ مرثیہ حضرت حُرؑ کا ہے۔

جوہر کے تھے اس تیغ کی سب ماننے والے کیا حُرؑ کی وغا کا ہے اثر جاننے والے
ہر ضربت قہار کو پہچاننے والے زندہ تھے ابھی دشتِ اجل چھاننے والے

اک ایک کو اس تیغ نے للکار کے مارا
آیا جو شقی سامنے دم مار کے مارا

گھوڑے کی تعریف۔ مرثیہ میں گھوڑے کی تعریف کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

لشکر کی طرف بڑھنے لگا حُرؑ کا جو رہوار — تھی چال کچھ ایسی کہ کہیں شعلۂ رفتار
رُح خرمنِ باطل کا کئے برقِ شرر بار — ہرگام پہ آنکھوں سے عیاں غیظ کے آثار
آندھی تھی کہ طوفان تھا یا موج بلا تھی
وہ شورشِ رفتار کہ سکتے میں ہوا تھی

رزمیہ۔ یہ وہ عناصر ہے جو مرثیہ میں ہیرو کی بہادری کو ظاہر کرتا ہے۔ حضرت عباسؑ کے مرثیہ ''پانی'' میں شاعر نے حضرت عباسؑ کی جنگ وہ فنکرانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ حضرت عباسؑ کو امام حسینؑ نے جنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ لیکن حضرت عباسؑ نے دریا سے فوجِ شقی کو ہٹانے کے لئے اپنے نیزہ سے جو وار کیا تھا اس کا بیان ملاحظہ ہو۔

حملہ وہ جس سے جنگ کی کایا پلٹ گئی — پوری بساطِ ظلم یزیدی الٹ گئی
نیزہ کی زد میں آئی تھی جو فوج کٹ گئی — جو بچ گئی وہ ساحلِ دریا سے ہٹ گئی
ساحل پہ نورِ نازشِ فخرِ خلیل ہے
گویا کلیمِ طور سرِ رودِ نیل ہے

مرثیہ نگاری کی نعمت ظہیر جعفری کو ورثہ میں ملی۔ جس کی جھلک ان کے مرثیوں میں نظر بھی آتی ہے۔ مرثیہ میں تلمیح، تشبیہ اور استعارہ کا استعمال بہت عمدگی اور فنکرانہ انداز سے کیا ہے۔ ظہیر جعفری نے مرثیہ میں کوئی نیا کارنامہ نہیں انجام دیا ہے۔

حصہ دوّم

(۱) ناشر نقوی　　(۲) احسن شکارپوری

(۳) گوہر لکھنوی　　(۴) باقر محسن

(۱) ڈاکٹر ناشر نقوی ۔

ڈاکٹر ناشر نقوی کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ یہ پتھروں کے انبار سے ہیرا تلاشنے کا فن رکھتے ہیں۔ اور ایسے فنکار کا ہمارے ادب میں ہونا باعث فخر ہے۔ ان کا پورا نام سید ناشر حسین نقوی اور جائے پیدائش امروہا ہے جہاں یہ ۱۵/ جولائی ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ناظر حسین زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ناشر نقوی نے اپنی ابتدائی تعلیم کا بڑا حصہ انتہائی پر آشوب حالات میں امام المدارس انٹر کالج میں پورا کیا۔ انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد روہیلکھنڈ یونیورسٹی سے بی اے، پھر اردو سے ایم اے کیا۔

ایم۔اے کرنے کے بعد ناشر نقوی تلاش معاش میں دہلی چلے گئے۔ جہاں انھیں مہدی نظمی جیسے مشفق استاد کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ اسی زمانے میں ناشر نقوی کی وابستگی صحافت کی دنیا سے ہوئی جہاں ان کا قلم سے رشتہ اور مضبوط ہوا۔ رفیقوں کے اسرار پر انھوں نے ۱۹۹۳ء میں پنجابی یونیورسٹی چندی گڑھ سے ''اردو پنجاب اور سکھ شعرا'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ موجودہ وقت میں یہ پنجابی ہونیورسٹی پٹیالہ۔ پنجاب میں صدر شعبہ اردو کے عہدے پر فائز ہیں۔

ناشر نقوی نے اپنی شاعری کی ابتدا منقبت سے کی۔ انکو بچپن سے ہی قصیدہ اور سلام پڑھنے کا شوق تھا اور اسی شوق نے ناشر نقوی کو آج اردو ادب کے بڑے شاعروں میں کھڑا کر دیا۔ اپنی شاعری کی ابتدا کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ۔

> ''اماں کی گود سے بابا کی انگلی پکڑ کر مجلسوں میں جانے تک مجھے انیسؔ اور دبیرؔ کی بہت سی رباعیاں از بر ہو چکی تھیں۔ پانچ برس کی عمر میں انیسؔ و دبیرؔ کی رباعیوں اور پھر مرثیوں کو تحت اللفظ خوانی کے ساتھ پڑھتے ہوئے میں مجلسوں کا ذاکر بن گیا۔ اسی وابستگی نے مجھے سخن فہم سے سخن ور بنا دیا۔ مجلسوں کے علاوہ میرے شہر میں منعقد ہونے والی قصیدوں کی سالانہ محفلوں نے بھی فکر و عمل پر صیقل کی ہے۔ پچھلے ۸۰ برس سے جاری محلے کی سالانہ منقبتی محفل میں لڑکپن سے ہی میں قصیدہ پڑھا کرتا تھا۔ میرا قصیدہ کبھی میرے بابا اور کبھی ماموں کہہ دیا کرتے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں ان دونوں نے میرے دسویں کلاس میں فیل ہو جانے کی وجہ سے سزا کے طور پر نئی منقبت کہہ کر نہیں دی تو مجھے بھی طیش آ گیا اور میں نے گھر کی سدری میں بیٹھ کر امام زین العابدینؑ کی

شان میں سات اشعار کی ایک منقبت خود ہی کہی اور پورے طنطنے کے ساتھ پڑھی۔

خودی نے ساتھ دیا بے خودی نے ساتھ دیا
بقدر ظرف مرا ہر کسی نے ساتھ دیا
اسیر ہو کے جو بیمار کربلا سے چلا
تو شام تک ترا بے کس پھوپھی نے ساتھ دیا

کیوں کہ میں علان کر چکا تھا کہ یہ میری اپنی کاوش ہے اس لئے مجھے داد بھی خوب خوب ملی اگلے دن میرے بابا اور ماموں دونوں نے مجھے شاباشی دی۔'' ۳۲

یوں تو ناشر نقوی نے اردو ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے وہ ایک وقت میں شاعر، مصنف، محقق اور مرثیہ نگار سب ہیں۔ وہ ایک زود نویس شخصیت کے مالک ہیں۔ انکی اب تک ۱۶ سے بھی زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جس میں غزلیں، نظمیں، سلام، منقبت، مرثیے، تحقیق اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ان کتابوں میں تشنگی ۱۹۷۸، وسیلہ ۱۹۸۲۔ آفاقیت ۱۹۸۴، لالہ زارِ صبح ۱۹۸۷، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ۱۹۸۷، بساط فکر ۱۹۹۲، اردو پنجاب اور سکھ شعراء ۱۹۹۹، پنجاب اور اردو افسانہ ۲۰۰۴، دیدہ وری ۲۰۰۵ اور انگنائی ۲۰۰۹ خاص ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی بہت سی کتابیں منظر عام پر مقبول ہوئی ہیں۔ ناشر نقوی نے پی ایچ ڈی کے لئے جو مقالہ لکھا تھا وہ 'اردو کے سکھ شعراء۔ ایک تجزیاتی مطالعہ' کے نام سے ایک کتابی صورت میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔ اس کتاب میں انھوں نے ایک سو سکھ شعراء کے حالات زندگی اور ان کی اردو شاعری کے نمونے تحریر کئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ بھی بہت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

ناشر نقوی کی ایک کتاب 'انگنائی' جو کہ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی، غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں مختلف اصناف سخن کی نمائندگی ملتی ہے۔ یعنی اس میں نعت، قصیدہ، قطعہ، مثنوی، مسدس اور مخمس سب شامل ہیں۔

ناشر نقوی کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ یوں تو ناشر نقوی نے تمام صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی پسندیدہ صنف مرثیہ اور غزل ہے۔ اوائل عمری سے ہی ان کا رجحان غزل کی طرف رہا ہے۔ اور معاشقے کی حد تک انکی جو وابستگی غزل سے رہی ہے وہ کسی دوسری صنف سخن کے ساتھ نہیں ملتی۔ ناشر نقوی کو غزل میں جدید لب ولہجہ اور نئی غزل کے مخصوص انداز و آہنگ کے ذریعہ اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے میں جو مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی غزل کو زندگی کا ترجمان بنا دیا ہے۔ انھوں نے اپنی غزل کے ذریعہ عہد ماضی کے پر آشوب حالات اور اپنی عسرت و ناداری کا بیان کچھ اس انداز سے کیا ہے۔

خموش رہتے ہوئے بھی طپش تو رہتی ہے
حیات کیسے بھی گزرے کشش تو رہتی ہے

......

یہیں کہیں پہ پرانا مکان تھا اپنا
جو چھت نہ تھی نہ سہی آسمان تھا اپنا

......

وہ چار بیگھے کا ٹکڑا بھی ہو گیا گروی
بہت دنوں کا بقایا لگان تھا اپنا

ناشر نقوی کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔غزل کی طرح انھوں نے عمدہ قسم کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔جو کہ مختلف موضوعات پر لکھی گئی ہیں،جس میں 'سلامتی'، 'پنجاب'، 'تمازت'، 'عید کا چاند'، 'نومینس لینڈ'، '۲۱ویں صدی' اور 'بیوہ ماں' خاص ہیں۔'سلامتی' ان کی نہایت خوبصورت نظم ہے جس میں وہ ظلم کرنے والوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آتے ہیں۔'پنجاب' میں ناشر نقوی نے پنجاب کی پوری تاریخ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔'تمازت' میں ناشر نقوی نے ہجرت کے ایک نئے پہلو کو بیان کیا ہے۔'عید کا چاند' میں انھوں نے اپنے محبوب کو چاند کی صورت میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔'۲۱ویں صدی' میں وہ بلندیوں اور ترقیوں کی جانب انسان کے بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ بہت اچھی طرح سنتے ہیں۔نظم 'بیوہ ماں' میں وہ ایک لائق فرزند کے فرائض انجام دیتے نظر آتے ہیں،اور اپنی تمام ترقی،نام وشہرت کو ماں کی دعاؤں کا نتیجہ بتاتے ہیں۔نظم کے کچھ بند ملاحظہ ہو۔

میری ماں جس کی کوششوں کے طفیل
جس کے دل کی دعاؤں کا ہے یہ کھیل
زندگی میں میں کامیاب ہوا
گلشن خواب کا گلاب ہوا
ماں کی دل کی دعا کا ہے اعجاز
زندگی میں ہوا ہوں سرفراز

ناشر نقوی کی بیشتر نظموں میں عورت کی بے چارگی اور بے بسی کا ذکر ملتا ہے۔ان کی ایک اور نظم 'جلیاں والا باغ' ان مظلوموں اور نہتے لوگوں کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے جن پر جنرل ڈائر کی قیادت میں گولیاں برسائی گئی تھیں۔ناشر نقوی کی مرثیہ نگاری کی بات کی جائے تو ان کے اب تک تین مجموعہ مراثی کے منظر عام پر آچکے ہیں،جن میں آفاقیت ۱۹۸۴ء، لالہ زار صبح ۱۹۸۷ء اور دیدہ وری ۲۰۰۵ء قابل ذکر ہیں۔'آفاقیت' ایک ایسا مرثیہ ہے جس نے جدید اردو مرثیہ نگاری میں نیا سنگ میل قائم کیا ہے۔اس مرثیہ میں ناشر نقوی نے آغاز سے انجام تک لہجے کا نیا آہنگ اور اسلوب کا استعمال کیا ہے۔''لالہ زار صبح'' مجموعہ میں ناشر نقوی کے سات مراثی شامل ہیں۔ناشر نقوی نے اپنے مرثیوں کو نئے معنی دینے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے مرثیے کے عنوان بالکل نئے اور اچھوتے رکھے ہیں مثلاً 'وہ آنکھ' کو عنوان بنا کر یوں مرثیہ کہتے ہیں کہ ان کا مرثیہ نہ صرف مراثی کی خصوصیت کو ہی پورا نہیں کرتا ہے بلکہ خاطر خواہ علم ودانش کی مثال بھی معلوم

ہوتا ہے۔ناشر نقوی کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد سیادت فہمی لکھتے ہیں۔

''ناشر نقوی نے مہدی نظمی کی صحبتوں میں رہ کر جدید مرثیے ہی کو اپنے فن کی علامت قرار دیا اور مختلف مضوعات پر مراثی لکھ کر جدید مرثیہ نگاروں میں اپنا مقام پیدا کیا۔جدید مرثیے کی دنیا میں اپنے انداز و آہنگ کے اعتبار سے انکے یہاں مرثیے کے دو ایسے عظیم فنکاروں کا فنی امتیاز پایا جاتا ہے جنہیں جدید مرثیے کے اہم ستونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔چنانچہ ناشؔر کے مراثی میں رنگ و آہنگ،ندرتِ زبان و بیان اور برجستگی الفاظ وتراکیب دیکھ کر مہدی نظمی کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور موضوعات ومضامین کی ندرت مولانا نسیم سے والہانہ وابستگی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔''۳۳؎

سرچشمۂ افکار۔''دیدہ وری''ناشر نقوی کے جدید مرثیوں کا مجموعہ ہے۔جس میں انھوں نے چھ مرثیے 'سرچشمۂ افکار'،'دیدہ وری'،'ادراکِ وفا'،'احساس اور عباس'،'قلم کی شہادت'اور'وقت۔ہم اور حسینؑ' کے عنوان سے شامل کئے ہیں۔اس مجموعہ کا پہلا مرثیہ'سرچشمۂ افکار'ہے جو اکہتر (۷۱) بندوں پر مشتمل ہے۔اس مرثیہ میں مرثیہ نگاری کی تعریف اور اس کی تاریخ کا بیان کیا گیا ہے۔واضح طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ مرثیہ گوئی کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور کن مراحل سے گزر کر کہاں کہاں ہوتا ہوا موجودہ عہد تک پہنچا ہے،اور کس کس اہل ہنر نے اسکی خدمت کر کے اس کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔مرثیہ کا آغاز ناشر نقوی اس بند سے کرتے ہیں۔

جان ہے افکار کی ہر تجزیہ شبیرؑ کا   جانِ جانانِ محبت تذکرہ شبّیرؑ کا
جانِ اصنافِ سخن ہے مرثیہ شبیرؑ کا   جاں نثاروں کی کہانی حوصلہ شبیرؑ کا
میؔر وغالبؔ ناخدایانِ سخن کی جان ہے
مرثیہ وہ فن ہے جس پر شاعری قربان ہے

آگے کے بندوں میں ناشر نقوی مرثیہ کی روایت اور اسکی تاریخ بیان کرتے ہیں۔وہ امام شافعؔی،حسّاؔن،نصرتؔی، وجہؔی،قطبؔ،غواصؔی اور سعدی وغیرہ کو مرثیہ نگاری کے بڑے مرثیہ گو بتایا ہے۔ناشر دکن کو مرثیہ نگاری کی جائے پیدائش بتاتے ہیں۔جسے علم کا باطن کہا جاتا ہے،جہاں نجم آفندی اور باقر امانت خانی جیسے بڑے مرثیہ گو پیدا ہوئے ہیں جنکی مثال نہیں ملتی۔اس کے بعد ناشر نقوی لکھنؤ شہر کا تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

ہر زمانے میں دبستانِ ادب اور فکر گیر   لکھنؤ شہر مہذبؔ، شاعری جس کا خمیر
فضلؔ وانورؔ اور تعشؔق، شاہ کے غم کے خبیر   اوجؔ وثاقبؔ کا اثؔر شاعر ہوئے ہر دل عزیز
کیسے کیسے ذاخرِ فن مونسؔ و دلگیر تھے
عہد سازانِ ادب تھے عاشقِ شبّیرؑ تھے
یعنی اک تحریک ہستی کی بہ عنوانِ سخن   مرثیہ جانِ تخیل مرثیہ جانِ سخن

ضامنِ حُسنِ بیاں، شہر نگارانِ سخن فاتحِ افکار ندرت، مردِ میدانِ سخن
اُنسیت پائی انیسِ کربلا کے ذکر سے
دبدبہ اس کو ملا ہے اک دبیرِ فکر سے

آگے کے بند میں ناشرنقوی انیسؔ اوران کے بیٹوں کی مرثیہ نگاری کا ذکر کرتے ہیں۔ساتھ ہی انھوں نے میر انیسؔ کے مرثیہ ''نمکِ خوان تکلم ہے فصاحت میری'' کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے بیٹوں نے بھی مرثیہ نگاری کا فن انیسؔ سے ہی سیکھا ہے۔پھر ناشرنقوی ضمیرؔاور دبیرؔکی مرثیہ گوئی کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔اس کے بعد وہ جوشؔ ملیح آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے مرثیے کے الفاظوں میں ایک طرح کی گھن گرج کا احساس ہوتا ہے انھوں نے نئے نئے الفاظ اور نئے آہنگ کا استعمال کیا ہے۔جسکی وجہ سے انکے مرثیے میں جدیدیت کا رنگ نظر آتا ہے۔

گھن گرج الفاظ کی،غوغا،تڑپ شورش،سروش غلغلہ ،طوفاں،تلاطم اور فضائیں سب خموش
برچھیاں، بھالے،کٹاریں،سائیں سائیں ہوش ہوش اپنے آہنگِ ادا میں منفرد ہے اب بھی جوشؔ
مرثیے روشن ہیں اب بھی خانۂ ممنون میں
جسکے فکرے دوڑتے ہیں آدمی کے خون میں

ناشرنقوی جوشؔ کے بعد اپنے استاد مہدی نظمیؔ کے علم وحکمت اورنسیمؔ امروہوی کی خوش بیانی کا ذکر کرتے ہوئے مرثیے کے ان تمام عظیم المرتبت بزرگوں کوسلام کرتے نظر آتے ہیں جنکی خدمت کے ذریعہ آج مرثیہ اس مقام پر پہنچا ہے۔اس کے بعد ناشرنقوی اپنے وطن امروہہ کی تعریف اوروہاں پیدا ہونے والے عظیم مرثیہ نگاروکا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ناشر اپنی سرزمین امروہہ کومخاطب کرتے ہوئے خود کے بارے میں کچھ اس انداز سے کہتے ہیں۔ملاحظہ ہو۔

تیری خاکِ پاک کا ناچیز ذرہ میں بھی ہوں تو سراپائے ادب ہے تیرا حصہ میں بھی ہوں
تجھ میں ہے تاریخ پوشیدہ تو لمحہ میں بھی ہوں تو اگر ہے بکھرا بکھرا،ریزہ ریزہ میں بھی ہوں
تو نے بخشی ہے فضیلت شاہ کا ذاکر ہوں میں
مرثیہ گوئی کی خدمت کیلئے ناشرؔ ہوں میں

آگے کے بندوں میں اپنے وطن کی مٹی کی تعریف بیان کرتے ہوئے اسکی عظمت وفضیلت کا بیان کرتے ہیں۔یہ بند دیکھئے۔

خاک کی عظمت پرکھئے کس قدر ہے مشکبار خاک کے پتلے کو دیتی ہے فضیلت اور وقار
خاک سے ہی آدمی کی ذات ہے پرانکسار خاک کے صدقے سے ہی انساں بنا ہے خاکسار
خاک آلودہوں کو اک بردباری دے گئی
آدمی کو یہ ہی مٹی انکساری دے گئی

خاک ہے کیا کچھ نہیں ہے راکھ ہے اور دھول ہے　　　خاک بازی تو ہمارا روز کا معمول ہے
خاک کا پیوند ہے یہ زندگی اک بھول ہے　　　خاک ساری ہے اگر جزبہ تو ہستی پھول ہے
اس سے الفت رکھنے والوں کو جلا مل جائیگی
کربلا کی خاک سے خاک شفا مل جائیگی

آگے کے بندں میں ناشرنقوی امروہہ کی سرزمین کی تعریف کرتے ہوئے کربلا کی خاک کی عظمت بیان کرتے ہیں۔خاک کربلا کوسلام کرتے ہوئے ناشرنقوی کہتے ہیں کہ اے کربلا تجھ میں شہیدوں کا لہوملا ہوا ہے جوتمہاری عظمت کر بڑھاتا ہے۔اس کے بعد ناشرقمر بنی ہاشم حضرت عباسؑ کی عظمت کوتفصیل سے بیان کرتے ہیں جوحسینی لشکر کے علمدار تھے۔پھر وہ حضرت عباسؑ کے گھوڑے کی تعریف کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

اک خنک جھونکا ہے عباسؑ علی کا راہوار　　　ابنِ حیدرؑ کی سواری ہے، یہ اس کا افتخار
اس کی عزت ،ساقیٔ تشنہ لبی کا جاں نثار　　　یوں لچک کر چل رہا ہے جیسے شاخِ لالہ زار
شعلۂ مہرووفا ہے حسن میں طاؤس ہے
تیرگی میں جگمگاتا عشق کا فانوس ہے

اس کے بعدتلوار کی تعریف بیان کرتے ہوئے ناشراس وقت کا بیان کرتے ہیں جب حضرت عباسؑ پانی لانے دریا پر جاتے ہیں جہاں دشمن ان کا انتظار کررہا ہے۔یہ بند دیکھئے۔

نرغۂ اعدا میں ہے شبیرؑ کا رشکِ قمر　　　تاک میں مشک وعلم کے ہے سپاہِ اہلِ شر
بازوئے عباسؑ پر دشمن جمائے ہیں نظر　　　حرملا بیٹھا ہوا ہے اپنے پیکاں جوڑ کر
ایک پیاسا سیکڑوں قاتل عجب اندھیر ہے
دشمنوں کے غول میں شیرِ خدا کا شیر ہے

ناشرنقوی آگے کے بندوں میں حضرت عباسؑ کا دشمنوں میں گھرنے،بازوؤں کے شہید ہونے،مشکیزہ کے چھیدنے کے واقعہ کو بہت مختصرانداز میں بیان کرتے ہوئے انکی شہادت اورحضرت امام حسینؑ کے بھائی کے پاس آنے اور حضرت عباسؑ کی وصیت کو بیان کرتے ہیں۔ناشرنقوی نے اس مرثیہ میں ایک بھائی کے جذبات کو پردردانداز میں بیان کیا ہے۔مرثیہ کی زبان صاف اورسادہ ہے۔اس میں استعارہ،کنایہ اورمحاوروں کا استعمال بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔ناشر نقوی کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹرعظیم امروہوی لکھتے ہیں۔

’’ناشر نے اپنی مرثیہ نگاری میں جس پہلوئے حیات کوخاص طور پر ابھارنے کی کوشش کی ہے وہ ہے ’کردار‘ اور’علم‘۔ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایسے پہلو ہیں جن کی ہر ملت،ہرزمانے کواور ہرملک کوضرورت ہے۔بنیادی طور’کردار اورعلم‘ ہی زندگی کی وہ

کلید ہیں جن سے قفلِ تعمیر کھولے جا سکتے ہیں۔ ناشر نے تقریباً ہر مرثیے میں علم اور

کردار کو اجاگر کیا۔''۳۴؎

دیدہ وری۔ مجموعہ ''دیدہ وری'' کا دوسرا مرثیہ 'دیدہ وری' ہے۔ یہ مرثیہ اس مجموعہ میں اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔اس مرثیہ میں ناشر نقوی نے 'آنکھ' کو موضوع بنا کر اپنی فکر پیش کی ہے۔اس مرثیہ کو ایک کامیاب مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔اس میں ناشر نقوی نے ساٹھ بند تحریر کئے ہیں۔مرثیہ میں ناشر نقوی نے آنکھ کے ایسے ایسے گوشے بیان کئے ہیں جس سے شاید ہی نئی نسل کو واقفیت ہو۔مرثیہ کا آغاز ناشر نقوی نے کچھ اس طرح کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

لکھ رہا ہوں مرثیہ عنواں بنا کر آنکھ کو　　دور رس افکار سے کرنا ہے خوگر آنکھ کو
فکر ہے کیسے بناؤں گا سمندر آنکھ کو　　کچھ اچھوتے کچھ نئے دینے ہیں منظر آنکھ کو
پے بہ پے پردے ہیں ان پردوں کے اندر سوچئے
آنکھ کی گہرائیوں کو زندگی بھر سوچئے

ناشر نقوی آنکھ کو سانس، غنچہ، خوشبو، موتی شبنم، چہرا، شعلہ، بجلی اور آگ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اسکو اخلاص وفا اور رحمت بتاتے ہیں۔ یہاں ناشر نقوی تلمیح کا استعمال کرتے ہوئے حضرت موسیٰ کے واقعہ کا بیان کرتے ہیں۔اس مرثیہ میں آنکھ کے متعلق جملہ محاوروں کا مجموعہ بھی ہے اور آنکھ سے بینائی اور دور اندیشی کا جو پیغام ملتا ہے اس کی توضیح بھی ہے۔آنکھ کے بارے میں ان کا یہ خوبصورت انداز دیکھئے۔

''طوطا چشمی ہو تو چہرے کی ضیا جاتی رہے
آنکھ کا پانی جو ڈھل جائے حیا جاتی رہے''

ایک اور بند ملاحظہ ہو۔

آنکھ لگنا، نیند کا آنا بھی ہے قربت بھی ہے　　آنکھ پھرنا، بے مروت ہونا بھی، نفرت بھی ہے
آنکھ مچنا، موت بھی ہے دہر سے ہجرت بھی ہے　　آنکھ کھلنا، ہوش میں آنا بھی ہے، عبرت بھی ہے
نور آنکھوں سے ہے، ہستی کی جیا آنکھوں سے ہے
آدمی کی عزت و شرم و حیا آنکھوں سے ہے

آنکھ کے موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے ناشر نقوی لکھتے ہیں کہ آنکھ انسان کے جذبوں کو انکسار بخشتی ہے۔ یہاں ناشر نقوی شرون کمار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج بھی تاریخ میں ایسے بہت سے لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے نابینا ہوتے ہوئے بھی بہت سے بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں جو حیران کر دیتے ہیں۔اس کے بعد شاعر موجودہ دور کے ان لوگوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میری نظروں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی نابینا ہیں۔وہ خود تو عیش سے زندگی جیتے ہیں مگر انکو اپنے ہی گھر میں بھوکے بیٹھے ماں باپ

نظر نہیں آتے ہیں ۔وہ ایسے لوگوں پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں سے رشتہ ہی توڑ دینا چاہیئے ۔آگے کے بندوں میں ناشر نقوی ایسے لوگوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سیلِ آنکھوں میں نہیں ایسے بھی ہیں کچھ بدنظر ڈھل چکے ہیں جنکے دیدے جنکی آنکھوں کے گہر
دیدہ و دانستہ اپنے حال سے ہیں بےخبر بےمروت، بے محبت بتنگِ غیرت بے اثر
دامنِ پتلی میں اشکوں کو پرو دیتی ہے آنکھ
اِنکی جانب دیکھتی ہے، خون رو دیتی ہے آنکھ

ان بندوں کے بعد ناشر نقوی بڑے سلیقے سے عہد رسولؐ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے حضرت علی کی عظمتؑ اور پھر کربلا کے میدان تک آتے ہیں۔اور یہاں انھوں نے کربلا کی عظمت کو حق کی آواز اور باطل کی شکست کے طور پر اور ہر دور میں حق کی آفاقی صدا کے طور پر دیکھا ہے۔ناشر نقوی کے اس مرثیہ میں مقصدیت اور پیغام حق کے حوالے سے وہی تیور نظر آتے ہیں جو جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔یہ بند دیکھئے۔

کربلا شمعِ وفا ہے قاتلوں کی بھیڑ میں حوصلہ ہے،ولولہ ہے، بزدلوں کی بھیڑ میں
دیدۂ صبر و رضا ہے غافلوں کی بھیڑ میں حق کی آفاقی صدا ہے باطلوں کی بھیڑ میں
نگہبانِ حریت ہے،فلسفہ ہے کربلا جنگ
صفین و جمل کا آئینہ ہے کربلا

کربلا شمشیر ہے ہر تمکنت کے روبرو اک صدائے حق ہے سرکش سلطنت کے روبرو
روشنی ہے ظلمتوں کی ذہنیت کے رو برو سر جھکاتی ہی نہیں یہ مملکت کے رو برو
یہ شہیدانِ وفا کے سایۂ رحمت میں ہے
اس کی آنکھوں کا ستارہ پردۂ غیبت میں ہے

ناشر نقوی کربلا کی اہمیت وعظمت بیان کرنے کے بعد ایک بار پھر اپنے عنوان ’آنکھ‘ کی طرف لوٹتے ہیں۔اور پھر مصائب کی طرف بڑھتے ہوئے امام حسینؑ کی عظمت کا بیان ان خوبصورت بندوں میں نظم کرتے ہیں۔

کربلا کا سیدِ لشکر، شجاعت کا امام چشمِ احساسات کو دیتا ہے جو کوثر کے جام
زندگی کو بخشتا ہے خلعتِ عمرِ دوام منحصر ہے جسکی آنکھوں، پرمشیت کا نظام
شعلۂ صبرو رضا سے فتنہ پرور جل گئے
کربلا میں تشنگی بھڑکی تو لشکر جل گئے

آگے کے بندوں میں مصائب کے بند تحریر کئے گئے ہیں۔ان بندوں میں کربلا کے ہر شہید کا تذکرہ اشاروں میں مختصر طور پر کیا گیا ہے۔ناشر نقوی کے یہ مصائب کے بند پوری طرح سے جدید فکر کے مظہر ہیں کہ اس میں احساس تو ملتا

ہےلیکن اس میں بے جا بین نہیں ہے۔ناشرنقوی نے یہ مرثیہ آنکھ سے شروع کر کے آنکھ پر ہی ختم کیا ہے۔اس مرثیے میں نئے کنایوں اور استعارے کا استعمال کیا گیا ہے۔لفظیات کا انتخاب اور ان کی جدید معنویت کو بھی سلیقے سے پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔مرثیے میں جہاں سلاست،نفاست،ترنم اور ادبی مٹھاس ہے وہیں ان کے انداز بیان نے آفاقیت کا رنگ اختیار کیا ہوا ہے۔

ادراک وفا۔مجموعہ ''دیدہ وری'' کا تیسرا مرثیہ'ادراک وفا' ہے جو ۵۵ بندوں میں مشتمل ہے۔اس مرثیہ میں ناشرنقوی نے آفات ومصائب کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔جو رسولؐ کے نواسے حضرت امام حسینؑ نے کربلا کے میدان میں برداشت کئے اور کسی بھی مقام پر وفا کے دامن پر دھبّہ نہ آنے دیا۔اس مرثیہ کا ایک ایک بند ناشرنقوی کے شہیدِ کربلا سے محبت اور عقیدت کی گواہی دیتا ہے۔مرثیہ کا آغاز شاعران بندو سے کرتا ہے جس میں وہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کرتا نظر آتا ہے۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

معجزے تحقیق کے خاموش ہیں اعجاز میں　　کوئی سرگم ہی نہیں ہے زندگی کے ساز میں
گونجتی ہے اک صدا سی قوتِ پرواز میں　　آدمی خود کھو گیا ہے اپنی ہی آواز میں
قادرِ باطن، جہانِ علم وحکمت ہے ضرور
ماورائے ذہنِ انساں کوئی طاقت ہے ضرور

حسنِ واجب کی ادا، دھرتی پہ نقشِ ممکنات　　یہ زمین وآسماں یہ آب وگل یہ کائنات
کس سے جا کر پوچھئے کیا ہے اجل کیا ہے حیات　　اک معمہ صبحِ حسرت اک معمہ غم کی رات
موت کیا ہے صبحِ ہستی کی اندھیری شام ہے
زندگی مجبور کی مختاریوں کا نام ہے

آگے کے بندوں میں شاعر علم کی اہمیت کو بتاتے ہوئے علم کو زندگی بتایا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ علم وہ شہ ہے جو زندگی کو فکر عطا کرتی ہے۔زندگی ایک کوشش کا نام ہے جو علم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔علم ایک جستجو ہے جو غیب کے رازوں سے پردہ ہٹاتی ہے،جسکے ذریعہ انسان آج چاند اور سورج کے رازوں پر قابض ہے۔آج وہ اپنے علم کی رسائی سے پوری کائنات کو اپنے مٹھی میں کر چکا ہے۔اس کے باوجود بھی وہ مطمئن نظر نہیں آتا ہے اور اسکی جستجو بڑھتی ہی جارہی ہے۔ناشرنقوی انسان کی علم کے لئے بڑتی ہوئی جستجو کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

آدمی کے ذہن کے زیر اثر سب بالمعلوم　　شہپرِ پرواز میں یہ وسعت ماہ نجوم
ارتقاء کی منزلوں میں اس کی شہرت اسکی دھوم　　کرۂ ارض و سما میں چھا گئے اس کے علوم
تیز رواس درجہ تحقیقات کی منزل میں ہے
مہر کی مخفی توانائی تک اس کے دل میں ہے

شاعر آگے کے بندوں میں انسان کا انسان سے بغض کرنا، اپنے پیسے اور طاقت پر تکبر کرنے کے مسلہ پہ بات کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ آج انسان ایٹمی طاقت کے بھروسے پر غرور کرتا ہے۔ ناشر نقوی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے رسولؐ اکرم کا ذکر کرتے ہیں کہ یثرب میں ایک بشر ایسا ہے جو انسان کو صحیح راہ دیکھا تا ہے، وہ انسان کو توحید کا پیغام دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

کیوں تجھے انسان کی معراج میں وسواس ہے
دیکھ تیرا نقشِ پا عرشِ بریں کے پاس ہے

ناشر نقوی رسولؐ اور علیؑ کی عظمت بیان کرتے ہوئے زندگی کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔ پھر استقامت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ استقامت سکون سے زندگی جینے کا نام ہے، استقامت انسان اور معبود کے رشتے کا نام ہے۔ استقامت بسم اللہ کی تحریر کا نام ہے، سورۂ الحمد کی تفسیر کا نام استقامت ہے۔ آگے کے بندوں میں ناشر نقوی استقامت کا ذکر کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے اپنی بات کا رخ کربلا کی طرف موڑ دیتے ہیں، اور اسکی عظمت وفضیلت کا بیان بہت ہنرمندی سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد شاعر امام حسینؑ کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے ان کی فضیلت کچھ اس انداز سے بیان کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جس نے خوں سے دین کے چہرے کو دھویا وہ حسینؑ   پیاس میں تسلیم کو جس نے سمویا وہ حسین
نہر پر جس نے وفا کا بیج بویا وہ حسین   جو بہتر بار رو کر بھی نہ رویا وہ حسین
بے گھری ایسی تھی ہر ہر دل میں اس کا گھر بنا
اشتہارِ بے گناہی شام کا منظر بنا

اپنے دشمن کو نہ جس نے بددعا دی وہ حسین   حوصلوں کی رہگزر جس نے بنا دی وہ حسین
حُریت کی جس نے اک شمع جلا دی وہ حسین   آگ جس نے قصرِ شاہی میں لگا دی وہ حسین امام
وہ عروسِ زندگی کے سر کا زرّیں تاج ہے
کربلا میں مصطفٰے کی دوسری معراج ہے

ہائے کم علمی بیان کیونکر کروں کیا ہے حسین   زندگی کی ایک ڈھارس اک سہارا ہے حسین
شہپر پرواز میں لفظوں کی سدرا ہے حسینؑ   اک جفاکش ماں کی محنت کا نتیجہ ہے حسین
دے گیا شادابیاں انسان کی آشاؤں کو
کر لیا تھا قید اس نے پیاس کے دریاؤں کو

حسینؑ کی فضیلت کے بیان کے بعد ناشر نقوی مصائب کے بند لکھتے ہوئے کربلا کا بیان کرتے ہیں کہ کربلا کے تپتے ہوئے جنگل میں اہل حرم بھوکے پیاسے ہیں۔ ظالم یہ چاہتا تھا کہ سچائی کے پرستار نہ رہے۔ لیکن کربلا کی جنگ میں سب ایک سے بڑھ کر ایک بہادر تھے چاہے وہ ضعیف ہو، جوان ہو یا طفل۔ شاعر یہاں ناصرانِ امام حسینؑ کی تعریف

کرتے ہوئے شبِ عاشورا امام حسینؑ کی کیفیت کا بیان کرتا ہے۔ ناشر نقوی امام حسینؑ کی نفسیاتی کیفیت کے ذریعہ شب عاشور کربلا کے ہر شہید کا بیان کرتے ہیں۔ پھر شاعر اشاروں میں کربلا کے جنگ اور امام حسینؑ کی شہادت کو بیان کرتا ہے۔ مرثیہ کے آخری بندوں میں ناشر نقوی کربلا کے شہید امام حسینؑ کو سلام کرتے ہوئے مرثیہ کا خاتمہ کرتے ہیں۔ مرثیہ کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ استعاروں اور کنایوں کا استعمال بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ ناشر نقوی کی مرثیہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر عظیم امروہوی لکھتے ہیں۔

''ناشر نقوی نے اگر ایک طرف کربلا کے پیغام کو اپنے اندر بسا کر سانسیں لیں تو ان کا ہر سانس مرثیے کی فکر میں ڈھلتا رہا، جس نے انھیں عہدِ حاضر کا ممتاز مرثیہ نگار بنا دیا۔''۳۵؎

احساس وعباسؑ۔ مجموعہ ''دیدہ وری'' کا چوتھا مرثیہ 'احساس وعباس' ہے جو ایک ذکر مرثیہ ہے۔ یہ مرثیہ ترپن (۵۳) بندوں پر مشتمل ہے۔ اس مرثیہ میں ناشر نقوی نے حضرت عباسؑ کی تعریف وتوصیف کے ساتھ ایثار و قربانی کو بھی بڑے دردمند دل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جو انھوں نے کربلا کے میدان میں پیش کی ہے۔ شاید ایسا جاں نثار بھائی کسی کو بھی میسر نہ ہوا ہوگا، جو امام حسینؑ کو ملا۔ اور وہ محبت اور وفا کی ایسی داستان بن گیا جس کا ذکر تا حشر ہوتا رہے گا۔ مرثیہ کا آغاز ناشر نقوی ان بندوں سے کرتے ہیں۔

دعوتِ فکر ہے عباسِؑ علمدار کا نام — ہم نے نعمت کی طرح پایا ہے یہ پیار کا نام
بھائیوں کے لیے ہے جذبۂ ایثار کا نام — یعنی اخلاق کا، اخلاص کا کردار کا نام
آس بندھ جاتی ہے جذبوں کو فزوں ملتا ہے
سن کے یہ نام بڑا دل کو سکوں ملتا ہے

اس کے بعد ناشر نقوی حضرت عباسؑ سے دعا کرتے ہیں کہ آج زمانے کو آپکی ضرورت ہے۔ آپ آ کے اس زمانے میں محبت کی روشنی بھر دیجئے۔ آج اس دنیا کو آپ کے کردار کی ضرورت ہے۔ آج بھائی ہی بھائی کا دشمن بن بیٹھا ہے۔ آج انسان ہی دوسرے انسان سے بغض کرنے لگا ہے۔ آج حق کے نام پہ فتنہ وفساد ہو جاتا ہے۔ شاعر آگے پھر کہتا ہے کہ یا عباسؑ ہم بھی تیرے چاہنے والے ہیں، آج ہم کو تیرے جاہ وحشم کی ضرورت ہے۔ آج دنیا سے نام محبت ہی مٹ سا گیا ہے، تو آ کے بھائیوں کے دلوں میں محبت کی قندیل جلا دیجئے۔ ناشر نقوی کی اس دعا سن کر حضرت عباسؑ کا علم بول اٹھتا ہے کہ تیری ذات سے شہ والا ناراض ہیں کیونکہ آج انسان صرف کھوکھلی باتیں کرتا ہے۔ وہ صرف عاری جذبات سے مجلس وماتم اور علم اٹھاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بند ملاحظہ ہو۔

رحم کھا کر مری فریاد پہ بولا پرچم — ہے تری ذات سے ناراض شہِ جودو کرم
عاری جذبات سے ہاتھوں میں اٹھائے ہو علم — کھوکھلے لفظوں سے تم بھرتے ہوئے اخلاص کا دم
گر اٹھانا ہے علم، عزم جلی ساتھ میں لاؤ

فخر سے عشق حسینؑ ابن علی ساتھ میں لاؤ

نام شبیرؑ کی، عباس کی عظمت سمجھو　　درمیاں دونوں کے جذبات کی الفت سمجھو
ہر زمانے کے لئے ان کی بصیرت سمجھو　　قلب اسلام میں جذبوں کی حرارت سمجھو
بھائی کے واسطے جو آنکھ بھی بے نور رہے
علمِ حضرت عباسؑ سے وہ دور رہے

آگے کے بندوں میں ناشر نقوی حضرت عباسؑ کے پرچم کے ذریعہ حضرت عباسؑ کی عظمت وفضیلت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عباسؑ جیسے بھائی کی دنیا نظیر دیتی ہے۔عباسؑ شبیرؑ کے وہ بھائی ہیں جس نے کبھی شبیرؑ کو بھائی کہہ کر نہیں پکارا، ہمیشہ ہی وہ خود کو حسینؑ کا غلام کہتے تھے۔انھوں نے کربلا میں وہ قربانی پیش کی جس کی مثال نہیں ملتی۔پھر پرچم غم اور ماتم میں یکسانیت بتاتے ہوئے دونوں کی تعریف بیان کرتے ہیں۔

غم ہے سرمایۂ دل ،طرزِ وفا ہے ماتم　　غم ہے عرفانِ نظر، صبرورضا ہے ماتم
غم ہے ہمت کا بھرم،حسنِ ادا ہے ماتم　　کوفہ و شام ہے غم، کرب و بلا ہے ماتم
غم کے ماحول میں جب دل کہیں گھبراتا ہے
صرف یہ ماتمِ شبیرؑ ہی کام آتا ہے

ناشر نقوی آگے کے بندوں میں مولا عباسؑ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کی عظمت کا بیان کرتے ہیں۔کربلا میں حضرت عباسؑ کو جنگ کرنے کی اجازت نہیں ملی، بلکہ ان کی بھتیجی سکینہ نے ان سے پانی کا سوال کیا۔حضرت عباسؑ تلوار کو چھوڑ کر مشک اور علم کو لیکر فوجوں کے بیچ دریا کی ترائی میں اتر پڑے تھے۔اس منظر کی ناشر نقوی نے حقیقی تصویر پیش کی ہے۔

نصرت رشد و ہدایت کا سمندر نکلا　　فاتحِ مرگ شجاعت میں غضنفر نکلا
مشک کاندھے پہ علم ہاتھ میں لیکر نکلا　　اک بھتیجی کو کلیجے سے لگا کر نکلا
تشنگی بنتی گئی حق کا دلیلوں کا لباس
پیاسی تاریخ نے اوڑھا ہے سبیلوں کا لباس

اس کے بعد ناشر نقوی حضرت عباس کے رجز کا بیان تفصیل سے کرتے ہیں۔پھر حضرت عباسؑ کی جنگ، انکے بازوؤں کے کٹنے، پھر مشک چھدنے اور انکے زخمی ہونے کے بیان کو انھوں نے مختصر طور پر پیش کیا ہے۔پھر بھائی کی لاش پہ حضرت امام حسینؑ کے بین کو ناشر نقوی نے دلخراش انداز میں پیش کیا ہے۔جس کو سن کر سامعین اپنے آنسوؤں کو نہیں روک پاتا ہے۔یہ بین کے بند ملاحظہ ہو۔

جھک کے شہ غم سے یہ بولے ذرا آنکھیں کھولو　　رکھ کے سر زانوئے شبیرؑ یہ بھیّا سولو
دل بھرا آتا ہے سینے سے لپٹ کر رولو　　منھ پہ منھ رکھ کے پکارے شہ والا بولو
تم کو میری ہی قسم میرے فدائی کہہ دو
اے مرے بھائی بس اک بار تو بھائی کہہ دو

آخری بندوں میں شاعر حضرت عباسؑ کی عظمت کو سلام کرتا ہوا مرثیہ کا خاتمہ کرتا ہے۔اس مرثیہ میں ناشر نقوی نے استعاروں اور کنایوں کے علاوہ صنعت توشیح کا بھی استعمال کیا ہے۔

قلم کی شہادت۔ یہ مرثیہ ''دیدہ وری'' کا پانچواں مرثیہ ہے۔یہ انکا موضوعاتی مرثیہ ہے جس میں انھوں نے شاعر کی قلم کو موضوع بنایا ہے۔ان کا یہ مرثیہ اکاون (۵۱) بند پر مشتمل ہے۔یہ مرثیہ اس مجموعہ میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔قلم کو آج تک شاید ہی کسی نے موضوع بنا کر مرثیہ لکھا ہوگا۔ناشر نقوی کے یہاں بالکل نئے اور اچھوتے عنوان مرثیوں میں نظر آتے ہیں۔اس مرثیہ میں ناشر نقوی قلم کی عظمت بیان کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ شاعر کو رحمت حق سے ایسا قلم عطا کیا جائے کہ وہ کسی بھی واقعہ کو بلا کسی خوف وڈر سے سچائی کے ساتھ بیان کر سکے۔ناشر نقوی نے مرثیہ کا آغاز کچھ اس انداز سے کیا ہے۔

مطلعِ فکر پہ ہے ابرِ کرم آج کی رات　　لفظ ومعنی کے سلجھنے لگے خم آج کی رات
مرثیہ لکھنا ہے اے میرے قلم آج کی رات　　تجھ کو رکھنا ہے روانی کا بھرم آج کی رات
سنسناتا ہوا ہر لفظ زباں سے نکلے
اس طرح جیسے کوئی تیر کماں سے نکلے

دیکھ تخئیل وتصور ہیں تیرے دوش بدوش　　علم والوں کی سماعت میں ہے اک جوش وخروش
لے اُٹھا جامِ وِلا ڈوب کے ہو جا مد ہوش　　اپنے اسلوب کے قلزم میں دکھا چہرۂ جوش
گھن گرج لفظوں میں ایسی ہو کہ تمثیل بنے
پھونک مفہوم میں وہ صوٗر کہ قندیل بنے

آگے کے بندوں میں ناشر نقوی قلم کی تعریف وتوصیف رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرے جذبوں کو بیان کرنے والے قلم میں تیرے رقم کئے گئے لہجہ پہ نثار ہوں، کیوں کہ تو جو بھی کچھ لکھتا ہے وہ تاریخ کے صفحوں پر چھا جاتا ہے۔تو کبھی محقق، کبھی مورّخ تو کبھی مصنف بن جاتا ہے۔تیری سہارے سے آج کتنے لکھنے والوں کے مقدر بن گئے ہیں۔شاعر آگے لکھتا ہے کہ جب مجھے تحقیق کرنے کے لئے تیری ضرورت محسوس ہوئی ہے تو نے مدد کے لئے خود کو آگے بڑھا دیا ہے۔اور آج تیرے قلم کے معجزے انیسؔ ودبیرؔ کے مرثیوں کی آواز کی جھنکار میں نمایاں ہوتے ہیں۔آگے کے بندوں میں ناشر نقوی فہیمؔ، کلیمؔ، نسیمؔ اور شمیمؔ جیسے بڑے مرثیہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس قلم کے ہی رشتہ جوڑنے سے ان سب کو اپنے جذبات تحریر کرنے کے مواقع فراہم ہوئے ہیں۔قلم کی عظمت آگے کے بندوں میں شاعر کچھ یوں بیان کرتا

ہے۔

آج آنکھوں میں وفا کے جو یہ پیمانے ہیں تیری حق گوئی کے منھ بولتے افسانے ہیں
جتنے بھی اہلِ خرد ہیں تیرے دیوانے ہیں تیرے کردار کا آئینہ کتب خانے ہیں
ظلم کو شرح کی بستی میں ابھرنے نہ دیا
تو،نے سچ کی کسی تاریخ کو مرنے نہ دیا

شاعر قلم کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تونے ہمیشہ صاف گوئی اور حق کی باتیں ہی لکھی ہیں،تونے حق گوئی سے کتنے ہی چہروں کو بے نقاب کردیا ہے۔آگے ذہین اور جہل کا فرق بتاتے ہوئے شاعر جہل کے بارے میں لکھتا ہے کہ جہاں بھی جہل کی رسائی ہوگی وہاں ہمیشہ ہی بغض اور عناد نظر آئے گا۔آج اسی جہالت نے نہ جانے کتنوں کو برباد کرڈالا ہے۔شاعر آگے قلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اب تو جہل کے چہرے کو بے نقاب کردے،اور انسان کے سوچنے اور سمجھنے کی قوتوں کو بڑھا۔

اے قلم جہل کی ظلمات کو عریاں کر دے مسخ جو چہرے ہیں تو ان کو نمایاں کر دے
سوچنے کے لئے حق گوئی کو میزاں کردے سامنے فیصلے رکھ ذہنوں کو حیراں کردے
علم کے شہر سے جو پائی ہے دولت دیدیں
کیا ابوجہل کو ہم دل سے عقیدت دیدیں

شاعر آگے کہتا ہے کہ اے قلم تو اس سچائی اور روانی سے چل کہ تیری زد میں آکر ظلمتیں دم توڑ دیں۔تو انصاف کے ذریعہ کند ذہنوں کے ستونوں کو کھول دے۔شاعر اس مرثیہ میں اپنے قلم کے ذریعہ انسانیت کا درس دیتا ہے،جو انسان کو جہالت سے نکل کر فلاح و بہبود کے راستہ پر لاتا ہے۔ناشر نقوی قلم کو نادعلی پڑھ کر لفظوں کو نئے پیکر میں ڈھال کر مدحِ علیؑ کرنے کو کہتے ہیں۔یہاں ناشر نقوی قلم کی زبانی حضرت علیؑ کی عظمت بیان کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو۔

میں مخاطب جوقلم سے ہوا یوں بولا قلم میں کہاں اور کہاں مدحِ شہنشاہِ امم
کس کے بس میں ہے جواوصاف علی کردے رقم آیتوں اور حدیثوں میں ہے وہ ذات بہم
وصف اس کالبِ احمدؐ پہ سدا رہتا ہے
لافتیٰ الا علی اس کو خدا کہتا ہے

آگے کے بند میں ناشر نقوی حضرت علیؑ کی تعریف وتوصیف بیان کرتے ہوئے علم عطا کرنے کی دعا کرتے ہیں۔اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس دنیا میں میرا تیرے سوا کوئی مددگار نہیں ہے،یا علیؑ اس مصیبت سے تو ہی نجات دلا۔شاعر پھر کہتا ہے کہ ہم نے تو کبھی کربلا کو سمجھا ہی نہیں،ہم نے کربلا کی جنگ کو صرف ایک ڈرامہ کی طرح ہی پیش کیا ہے،کبھی اس کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی،یا علیؑ تو ہمیں اتنا سلیقہ عطا کر کہ ہم خود کو میزان پر پرکھ سکیں۔اس کے بعد ناشر نقوی کربلا کی عظمت بہت خوبصورتی سے رقم کرتے ہیں۔

کربلا آج بھی اک درسِ عمل دیتی ہے اٹھ کے طوفان کے ہر رخ کو بدل دیتی ہے
سینۂ ظلم کو پیروں سے کچل دیتی ہے سر یزیدوں کے یہ تلووں سے مسل دیتی ہے
جبر کی آگ بجھانے کے لیے حل انکار
صدیوں سے ہے بیعت سے مسلسل انکار

مصائب کے بندوں میں ناشرنقوی شبِ عاشور کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شبیرؑ کا تذکرہ کرتے ہیں جو ایک ایک ناصروں کو بغور دیکھتے ہوئے ان کی شہادت کے متعلق سوچ رہے ہیں۔اور جب صبح عاشورہ نمودار ہوئی تو امام حسینؑ کے سارے جاں نثار ایک کے بعد ایک اپنی قربانی پیش کرتے ہیں۔ناشرنقوی نے واقعہ کربلا کو بہت مختصر انداز میں مصائب کے بندوں میں تحریر کیا ہے۔ناشرنقوی نے اس مرثیہ کو ایک نئی نہج دی ہے،ایک نیا انداز دینے کی کوشش کی ہے۔

وقت۔ہم۔اور حسینؑ۔ یہ مرثیہ ''دیدہ وری'' کا آخری مرثیہ ہے۔جو ۴۸ بندوں پر مشتمل ہے۔اس مرثیہ میں ناشرنقوی نے وقت،ہم اور حسین کو موضوع بناتے ہوئے انسان کی زندگی میں ہونے والے اتار چڑھاؤ پر تبصرہ کیا ہے،کہ کبھی انسان وقت پر قابو پالیتا ہے تو کبھی وقت کی قدر نہ کرنے والوں کو وقت اپنے قدموں تلے روندتا ہوا نکل جاتا ہے۔لیکن کچھ ایسی بھی ہستیاں بھی ہوتی ہیں جنھیں صدیاں گزرجانے کے بعد بھی یہ تاریخ کے صفحوں پر چھائے رہتے ہیں۔میدانِ کربلا میں حق کی سرخروئی کے لئے شہادت پانے والوں کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ناشرنقوی نے 'وقت' کو ظالم،'ہم' کو حق پرست کا استعارہ بنا کر مرثیے کو ترتیب دیا ہے۔

ناشرنقوی مرثیہ کی ابتداء انقلابات زمانہ سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ انقلاب کسی کی زندگی میں تسکین آزماتے ہوتے ہیں تو کسی کے غم کا سبب۔لیکن یہ زندگی کے لئے ایک درس ہوتے ہیں۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

انقلاباتِ زمانہ بھی عجب ہوتے ہیں کبھی تسکین کبھی غم کا سبب ہوتے ہیں
زندگی کے لئے آئینِ ادب ہوتے ہیں جو بھی ہوتے ہیں وہ منجانب رب ہوتے ہیں
عہد در عہد کی تصویر ہوا کرتے ہیں
انقلابات ہمہ گیر ہوا کرتے ہیں

عہدِ ماضی سے نئے دور کی تصویروں تک گوشۂ فہم سے ادراک کی تنویروں تک
آگہی،ذہن رسا،خواب کی تعبیروں تک ظلم کی قید سے مظلوم کی زنجیروں تک
وقت شاہد ہے جو حالات کا انجام ہوا
انقلاب آیا تو خود وقت بھی نیلام ہوا

ناشرنقوی وقت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وقت نے اپنی شکلیں تبدیل کر کے انسان کو ڈرایا ہے،کبھی شیطان تو کبھی فرعون کی صورت میں وہ انسان کو اپنے قابو میں کرنا چاہتا تھا اور جس نے بھی اس کے خلاف آواز بلند کی، وقت نے اسکی آواز دبانے کے لئے انسان کو کبھی سولی پر لٹکا دیا،تو کبھی دیواروں میں چنوا دیا ہے۔ناشرنقوی آگے لکھتے

ہیں اہل نظر ہمیشہ وقت کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جسکے پاس دولت وطاقت ہوتی ہے وقت اسی کا ہوتا ہے۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو چند پیسوں کے خاطر اپنے دین وایمان سے غدّاری کرتے ہیں۔ یہ بند دیکھئے۔

وقت کے چند ٹکوں پر جو بکے ہیں اکثر ان کو شطان کہوں ، یا کہ کہوں ننگِ بشر
جھونک کر آگ میں قرآں کو بنے ہیں رہبر آج یہ دینِ محمد کے ہوئے ہیں خوگر
ہم نے پہچا نا ہے تاریخ کے عیاروں کو
شرم آتی نہیں ان وقت کے مکاروں کو

اس بند کے ذریعہ ناشرنقوی معاشرے کے گھوس خوروں اور غدّار پر اپنے غم وغصے کا اظہار کرتے ہیں۔ شاعر زمانے کے بے ایمان اور غدّار پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ معاشرے پر ظلم وجبر کرنے کے لیے شیطان ہر زمانے میں صورت تبدیل کر لیا ہے۔ کبھی وہ نمرود کی شکل میں حق شناسوں کو آگ میں ڈلواتا ہے تو کبھی فرعون کی صورت میں حق پرستوں کو ستاتا ہے۔ ناشرنقوی بات کا رخ رسولؐ اکرم کے گھر کی طرف موڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھیں لوگوں نے تو نبیؐ اور نبیؐ زادی کے گھر والوں کو بھی اذیت دی ہے۔ انھیں ظالم نے رسولؐ اکرم کے نواسے حضرت حسنؑ کو زہر دیکر شہید کر دیا تو دوسرے نواسے حضرت حسینؑ کو کوفہ سے شام اور شام سے کربلا کے تپتے صحرا میں گھیر کر شہید کر دیا۔ اور یہی نہیں بلکہ آلِ رسول کو رسن بستہ کر کے دیار بہ دیار پھیرایا ہے۔

تمکنت جبر کی ظلمِ اولی سامنے ہیں ظلمت ِ وقت کے آثار جلی سامنے ہیں
گلے بندھوائے ہوئے حق کے ولی سامنے ہیں صابر و شاکر و اصحابِ علی سامنے ہیں
خُلق او رحلم کا کردار تھا آثارِ حیات
وہ بھی اک وقت تھا تب صبر تھا معیارِ حیات

وقت کے بعد ناشرنقوی ہم کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں شاعر 'ہم' کو حق پرستوں کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج وقت کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ آج ہماری ہمتیں ٹوٹ گئی ہے، ہم میں سچائی کو پرکھنے کا ہنر ہی نہیں ہے۔ لیکن ہم کو وقت کے ان وہم کو مٹانا ہوگا اور انکو یہ بتانا ہوگا کہ ہم رسولؐ اور علیؑ کو ماننے والے ہیں۔ ہم اس کے ماننے والے ہیں جس نے وقت پر حکومت کی ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

دین اسلام کی تہذیب وفا ہیں ہم لوگ کعبہ شاہد ہے، عبادت کی ضیا ہیں ہم لوگ
شامیں بتلائیں گی، رنگین قبا ہیں ہم لوگ شاہِ ارباب حوادث کی دعا ہیں ہم لوگ
زندگی والے ہیں، جینے کی دعا دیتے ہیں
موت کو قدموں پہ ہم اپنے جھکا دیتے ہیں

ہم نہ گھبرائے کبھی ظلم کی زنجیروں سے   رنج وآفات سے شیطان کی تدبیروں سے
تازیانوں سے چمکتی ہوئی شمشیروں سے   یہ الگ بات ، نوازا گیا تعزیروں سے
اہل بیت نبویؐ پر یہ ستم ڈھایا گیا
آنکھیں پھوڑی گئیں دیواروں میں چنوایا گیا

اس مرثیہ میں ناشرنقوی 'وقت' اور 'ہم' کے بعد حسینؑ کا ذکر کرتے ہوئے انکی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے حسینؑ تونے دینِ محمدکو حیات بخشی ہے۔تو ہی ہے جس نے وقت کو قابو میں کر کے تاریخ کے صفحوں پر ہمیشہ کے لیے قابض ہو گئے ہو۔تجھ سے ہی آج اسلام کو جلا ملی ہے۔ناشر نقوی اس مرثیہ کے ذریعہ انسان کو وقت کی اہمیت بتاتے ہوئے ،حق کے راہ پر چلنے کا درس دیتے ہیں۔آج کے ہر بشر کو وہ تلقین کرتے ہیں کہ ظلم سے بچے اورحق پر چلے۔

ناشرنقوی نے اپنے ہر مرثیہ میں نئی تشبیب ، نئے رجز، نئے نفسیاتی مصائب سے سجایا ہے۔انھوں نے اپنے مرثیوں میں نئے کنایوں اور نئے استعاروں کا بھی استعمال کیا ہے۔ماشرنقوی کی مرثیہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر ندیم احمد لکھتے ہیں۔

> ''ناشرنقوی کے مرثیے حسّاس ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں جوغم حسین کے بیان سے عالمِ انسانی کا دردوغم سمیٹے ہوئے ہیں۔ان کا انداز بیان ڈھارس بھی بندھا تا ہےاور نیا حوصلہ بھی دیتا ہے۔''۳۶

☆ ناشرنقوی کی مرثیہ نگاری ۔

ناشرنقوی بچپن سے ہی مجالس میں انیسؔ و دبیرؔ وغیرہ کے مراثی سنتے اور پڑھتے تھے۔اوراسی شوق نے انکا شمار جدید مرثیہ نگاری کی دنیامیں ایک منفرد مرثیہ گوکی حیثیت سے کرایا ہے۔ناشر نقوی نے بہت سے مرثیوں کی تخلیق کی جواپنے منفرد اسلوب،انداز بیان اور موضوعات کے بناء پرعمدہ مرثیوں میں گنے جاتے ہیں۔ناشرنقوی نے مرثیوں میں نئے الفاظ، نئے معنی ،اچھوتے عنوانات اور نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے مرثیہ میں پورے مرثیہ کی تاریخ کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔اور جیسے جیسے مراثی میں تبدیلیاں رونماں ہوتی گئیں انھوں نے اسی انداز سے اپنے انداز بیان اورالفاظ ومعنی کوبھی جنبش دی ہے۔یہ بالکل نیا تجربہ ہے۔

مرثیہ کی جائے پیدائش دکن کی سر زمیں   فکر کے اخترؔ سے تابندہ ہوئی اس کی جبیں
اس کا باطن علم، اور ظاہر بنا فکر جبیں   نجمؔ آفندی و باقرؔ جنکا ثانی ہی نہیں
جن فضاؤں میں بھی شاہِ کربلا کی یاد ہے
نام حیدر سے وہ بستی آج بھی آباد ہے
لکھنؤ شہر مہذبؔ ، شاعری جس کا خمیرؔ   ہر زمانے میں دبستانِ ادب اورفکر گیر

فضلؔ وانورؔ اور تعشقؔ، شاہ کے غم میں خبیرؔ　　اوجؔ وثاقبؔ کا اثرؔ شاعر ہوئے ہر دل عزیزؔ
کیسے کیسے ذاخرؔ فن مونسؔ و دلگیرؔ تھے
عہد سازان ادب تھے عاشقِ شبیرؑ تھے

اس کے علاوہ ایک اور خصوصیت ان کے مرثیوں میں یہ ملتی ہے کہ وہ جب کسی مرثیہ نگار کا ذکر کرتے ہیں تو انکی کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ اس مرثیہ گو کے اسلوب بیان اور اس کی انفرادیت کو اپنے الفاظ میں واضح کریں۔ مثلاً ناشرنقوی نے جوشؔ ملیح آبادی کا ذکر کیا ہے تو اسکو پڑھتے وقت ہمارا ذہن جوشؔ کے انتخاب الفاظ کی طرف فوری طور پر منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

غلغلہ، طوفان، تلاطم اور فضائیں سب خموش　　گھن گرج الفاظ کی، غوغا، تڑپ، شورش، سروش
اپنے آہنگ ادا سے منفرد ہے اب بھی جوش　　برچھیاں، بھالے، کٹاریں، سائیں سائیں ہوش ہوش
مرثیے روشن ہیں اب بھی خانۂ ممنون میں
جس کے فقرے دوڑتے ہیں آدمی کے خون میں

موضوع۔ناشرنقوی نے مرثیوں میں نئے اور اچھوتے موضوعات کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے مرثیوں میں آنکھ، وقت اور قلم کو موضوع بنایا ہے۔ 'آنکھ' کو ناشرنقوی نے خاطر خواہ علم و دانش کی مثال بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ آنکھ زبان بھی سکھاتی ہے اور ادب بھی۔ مرثیہ میں انھوں نے آنکھ سے متعلق محاوروں کا مجموعہ بھی پیش کیا ہے۔ آنکھ سے شاعر بینائی اور دور اندیشی کا پیغام بھی دیتا ہے۔

آنکھ کیا ہے سوز و ساز زندگی فصلِ بہار　　آنکھ کیا ہے منظرِ دیدہ وری دل کا قرار
آنکھ کیا ہے رشتہ باد بصیرت کا سنگھار　　آنکھ کیا ہے روشنی ہے روشنی بھی پائدار
دکھ کہیں اعضا پہ ہو بے حال ہو جاتی ہے آنکھ
ڈھال کر ہر غم کو خود میں لال ہو جاتی ہے آنکھ

ان کے مرثیوں کی ایک خاص صفت ان کا درس انسانیت بھی ہے۔ اور انسانیت کے معیار کی صراحت کے لئے انھوں نے اسلام کے اعلیٰ کرداروں کو سامنے رکھا ہے۔ قرآن اور حدیث کی مدد سے ناشرنقوی نے انسانیت کی اسلامی تصویر کو پیش کیا ہے۔ مرثیہ 'قلم کی شہادت' ان کے جدید حسیت اور ذہانت کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو معاشرے ہی نہیں بلکہ پوری تہذیب کی فکر میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر ناشرنقوی کے اس مجموعہ ''دیدہ وری'' کے عنوان کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر وسیم بریلوی لکھتے ہیں۔

''دیدہ وری'' میں شامل مرثیوں میں ناشرنقوی نے چھ عنوات قائم کئے ہیں۔
پہلے، مرثیہ کی تعریف اور تاریخ پر منظوم روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر ''آنکھ''، ''قلم'' اور

''کربلا کو موضوع بنا کر ایسے پہلو نکالے گئے ہیں جن سے مقصدِ مرثیہ کی وضاحت
ہوتی ہے۔ بعد ازاں حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ علمدار کی بے مثال قربانی
کو عصری تقاضوں کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے آخر میں ''وقت ہم اور حسینؑ'' جو
عنوان قائم کیا ہے، وہ زندگی کو نئے چیلینجوں کو قبول کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔''

(پروفیسر وسیم بریلوی، ناشر نقوی اور جدید مرثیہ، پرواز ادب خصوصی شمارہ ناشر نقوی نمبر، ص ۴۳)

اسلوب۔ ناشر نقوی کے مراثی میں محاکات، منظر نگاری، جذبات نگاری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ مصائب کے بیان میں بھی تاثیر کی کمی ہے۔ کربلا کے عظیم واقعے کی عظمت بھی ان کے یہاں اس طرح نمایاں نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ دیگر مرثیہ گو شعراء کے یہاں موجود ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں نئی نہج اور نیا انداز بیان پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مراثی میں ایک نئے تجربہ صنعت توشیح کا بھی تحریر کیا ہے۔ صنعت توشیح وہ فن ہے کہ جب کوئی شاعر اپنے مرثیے کے بندوں یا مسدس میں کسی لفظ جیسے ''عباس'' کو اس طرح سے استعمال کرتا ہے کہ اگر لفظ عباس کے ٹکڑے کر دیئے جائیں تو ہر مصرعے کا پہلا حرف لفظ عباس کا ایک حرف ہوگا۔ مثالاً یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

ع۔ علم شبیرؑ ہے اور علم کا دفتر عباسؑ
ب۔ بخت اسلام ہے قرآں کا مقدر عباسؑ
ا۔ اشک باری کے لئے ساقیٔ کوثر عباسؑ
س۔ سطوت و جاہ و جلالت میں غضنفر عباسؑ
ایک اک حرف ہے عباسؑ کی عظمت کی دلیل
نام میں زیر نہیں یہ ہے شجاعت کی دلیل

اس بند کے حرف اول کو چار مصرعوں سے ترتیب میں دیکھا جائے تو لفظ ''عباس'' بن جائے گا۔ اس کے علاوہ مرثیوں میں ناشر نقوی نے استعارہ، تلمیح، کنایہ اور تشبیہ کا استعمال بھی بہت خوبصورت انداز میں برتا ہے۔ محاوروں کا استعمال بھی انھوں نے نئے انداز سے تحریر کیا ہے۔ مرثیہ ''دیدہ وری'' میں آنکھ کے کئی محاوروں کو انھوں نے ایک ہی بند میں جس خوبصورتی سے برتا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

آنکھ لگنا، نیند کا آنا بھی ہے قربت بھی ہے
آنکھ پھرنا، بے مروت ہونا بھی، نفرت بھی ہے
آنکھ مچنا، موت بھی ہے دہر سے ہجرت بھی ہے
آنکھ کھلنا، ہوش میں آنا بھی ہے، عبرت بھی ہے
نور آنکھوں سے ہے ہستی کی ضیا آنکھوں سے ہے
آدمی کی عزت و شرم و حیا آنکھوں سے ہے

گھوڑے کی تعریف۔ ناشر نقوی نے اپنے مرثیوں میں گھوڑے کی تعریف کی کم کی ہے۔ مرثیہ ''سرچشمۂ افکار'' میں انھوں نے گھوڑے کی تعریف اور تلوار کی تعریف کا استعمال کیا ہے۔ گھوڑے کی تعریف کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

اک خنک جھونکا ہے عباس علی کا راہوار ابنِ حیدرؑ کی سواری ہے، یہ اس کا افتخار
اس کی عزت ساقیٔ تشنہ لبی کا جاں نثار یوں لچک کر چل رہا ہے جیسے شاخِ لالہ زار
شعلۂ مہر و وفا ہے حسن میں طاؤس ہے
تیرگی میں جگمگاتا عشق کا فانوس ہے

تلوار کی تعریف۔ مرثیہ میں تلوار کی تعریف کا بھی یہ بند ملاحظہ ہو۔

آج یہ فرماں روائے صاحبِ لولاک ہے دھوئی ہے آبِ وفا سے صاف ہے اور پاک ہے
ظالموں کے سر پہ بجلی کی طرح سفاک ہے دھوئی ہے آبِ وفا سے صاف ہے اور پاک ہے
نام ہے لاسیف اس کا حیدری شمشیر ہے
خالقِ کون و مکاں کے قہر کی تصویر ہے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ناشر نقوی نے اپنے مرثیوں میں سلاست روانی اور برجستگی کے ساتھ محاورہ بندی، رمز و کنایہ، ایجاز و اختصار اور صنائع بدائع کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام سے اردو مرثیے کو جو جلا بخشی، جو نئے تجربات کئے، جو نئے عنوانات پیش کئے ان سب کو مدّ نظر رکھ کر یہ بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدید اردو مرثیے کے محافظ ہی نہیں بلکہ انکا شمار اردو مرثیہ کی تاریخ میں بلند مرتبہ کے مرثیہ گو میں ہوگا۔

(۲) احسن شکار پوری :

احسن شکار پوری کا تعلق شکار پور دہلی سے ہے لیکن آج کل ان کا قیام حیدرآباد کی سرزمین پر ہے۔ انکی پیدائش شکار پور کے ایک معزز گھرانے میں ۲۸ نومبر ۱۹۵۲ء کو ہوئی۔ والد کا نام جناب انتظار حسین زوّار تھا۔ ان کے بچپن کا بیشتر حصہ علالت میں گزرا۔ ان کے والد کی ایک دلی خواہش یہ تھی کہ ان کا بیٹا نوحہ گو شاعر بنے، اس خواہش کو احسن صاحب نے پوری بھی کی۔ وہ ایک اچھے مرثیہ گو ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین نوحہ بھی کہتے اور پڑھتے ہیں۔ شاعری کا آغاز انھوں نے ۱۹۹۸ء کے آس پاس شروع کیا۔ اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ لہٰذہ اس جذبے کی تشنگی کی سیرابی کے لئے اپنے استادِ محترم آغا انور علی آغا سے اصلاح لی۔ جو کہ ان کے پھوپھی زاد بڑے بھائی بھی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد احسن نے اپنے اصلاح بیت کے لئے علامہ ابراہیم علی حامی صاحب کی شاگردی قبول کی۔

یوں تو احسن شکار پوری نے بیشمار نوحوں کی تخلیق کی ہے، قطعے بھی کہیں ہیں اور منقبت بھی۔ لیکن نوحوں کے بعد ان کی سب سے زیادہ مقبولیت مرثیہ نگاری کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے اب تک ۱۴ مرثیوں کی تخلیق کی ہے جس میں سے چار مطبوعہ مرثیے ہیں اور باقی دس ابھی غیر مطبوعہ ہی ہیں۔ جو اس طرح ہیں۔

☆ مطبوعہ مرثیے

۱) درحال امام حسینؑ ۔ بہ عنوان ''ذکر'' ۲۰۰۲ء

۲) درحال امام حسنؑ ۔ بہ عنوان ''عرش'' ۲۰۰۳ء

۳) درحال جناب علی اکبرؑ ۔ بہ عنوان ''شباب'' ۲۰۰۴ء

۴) درحال حضرت عباسؑ ۔ بہ عنوان ''وفا'' ۲۰۰۵ء

☆ **غیر مطبوعہ :**

۱) درحال جناب زینبؑ ۔ بہ عنوان ''موجِ وفا'' ۲۰۰۷ء

۲) درحال جناب علی اصغرؑ ۔ بہ عنوان ''کمسنی'' ۲۰۰۸ء

۳) درحال جناب قاسمؑ ۔ بہ عنوان ''تشنگی'' ۲۰۱۰ء

۴) درحال حضرت عباسؑ ۔ بہ عنوان ''شجاعت'' ۲۰۱۱ء

۵) درحال امام حسینؑ ۔ بہ عنوان ''امام مبین'' ۲۰۱۲ء

۶) درحال امام سید سجاد۔ بہ عنوان ''دُعا'' ۲۰۱۳ء

۷) درحال امام حسینؑ ۔ بہ عنوان '' آدمؑ کا ورسہ دار'' ۲۰۱۴ء

۸) درحال جناب علی اصغرؑ ۔ بہ عنوان ''فکر'' ۲۰۱۵ء

۹) درحال حضرت عباسؑ علمدار۔ بہ عنوان ''وفا'' ۲۰۱۶ء

۱۰) درحال امام حسینؑ ۔ بہ عنوان ''حق اور اہلِ حق'' ۲۰۱۷ء

ان تمام مرثیوں میں سے میں نے صرف مطبوعہ مرثیوں کا ہی تنقیدی و تجزیاتی جائزہ لیا ہے۔

ذکر۔ یہ احسن کا پہلا مرثیہ ہے جس کو انھوں نے اپنے مجموعہ ''معراج غم'' میں شامل کیا ہے۔ ایک سو دس بندوں میں تحریر کردہ یہ مرثیہ جناب امام حسینؑ کے حال کا ہے۔ مرثیہ میں اہل بیت کے مدینہ چھوڑنے سے لیکر کربلا میں امام حسینؑ کی شہادت تک کا بیان کیا گیا ہے۔ بیانیہ طرز پہ تحریر یہ مرثیہ اپنے آپ میں انفرادیت رکھتا ہے۔ مرثیہ کا آغاز احسن شکارپوری ذکر کی تشریح کر کے کرتے ہیں۔ اس میں ذکر کو جس انداز سے تحریر کیا گیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ یہ بند دیکھئے۔

ہے عبادتِ رب مرتضیٰؑ کا ذکر ہے بحر فضل و رحمتِ حق مصطفیٰؐ کا ذکر دنیا میں
پنہاں ہے ان کے ذکر میں ربِ علیٰ کا ذکر ہے اوجِ انبیاء کی سند فاطمہ کا ذکر
جو ابتداء سے ختمِ نبوتؐ کا چین ہے
وہ ذکر ہے حسنؑ کا وہ ذکرِ حسینؑ ہے

احسن شکارپوری نے مرثیہ میں چہرہ قرآن شریف کو بنایا ہے اور اس کو بے صدا کہا ہے اس کے علاوہ امام حسینؑ کو قرآن کی آواز بنا کر پیش کیا ہے۔ مرثیہ میں قرآن کی عظمت اور اس میں بیان تاریخ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرآن شریف

کے ذکر کا ارتقاء شاعر امام حسینؑ کو بتاتے ہیں۔ اس کے بعد امام حسینؑ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

شبیرؑ ہے نواسۂ سردارِؐ انبیاء! دونوں جہاں میں جس کے برابر ہیں مجتبیٰؑ
جھولا جھولانے آتے ہیں اس کو ملائکہ آئینہ ہے وہ صبرِ علیؑ و بتولؑ کا
مثلِ علیؑ زمانے میں عالی جناب ہے
شبیرؑ ورثہ دارِ رسالت مآب ہے

اس کے بعد شاعر اس وقت کا واقعہ بیان کرتا ہے، جب حاکمِ مدینہ شبیرؑ کو بلا کر بیعت طلب کرتا ہے، جس کے جواب میں حسینؑ مدینہ چھوڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ احسن شکارپوری کو واقعہ نگاری میں مہارت حاصل ہے وہ واقعہ کو اس انداز سے پیش کرنے ہیں کہ واقعہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ مدینہ سے جب قافلہ رخصت ہوا اور سب کنبے والے تیاری کرنے لگے سوائے ایک بیمار لڑکی صغراؑ کے جو کہ امام حسینؑ کی بیٹی ہے وہ سب گھر والوں کو جب رخصت کرتی ہے تو اس کے دل کا جو حال ہے اس کا بیان احسن کے یہاں بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔

کنبے سے دور جانے کا جب وقت آ گیا عباسؑ نے سنایا جو حکمِ امامؑ کا
صغراؑ کو لے نہ جائیں گے ہمراہ جب سنا بچّی نے دست بستہ یہی شاہؑ سے کہا
اے بابا اِس علیل سے یوں منہ کو موڑ کے
کیوں جا رہے ہیں لاڈلی بیٹی کو چھوڑ کے

مرثیہ میں شاعر اس وقت کا بیان بھی کرتا ہے جب حُر نے امام حسینؑ کا راستہ روک کر ان کو کربلا جانے پر مجبور کیا تھا۔ اس وقت حضرت شبّیرؑ نے حر کے پیاسے لشکر کو سیراب کیا تھا۔ اور اسی لشکر نے روز عاشورا اپنے پانی پلانے والے لشکر سے جنگ کی۔ مرثیہ میں احسن شکارپوری نے تشنگی کو بہت عمدگی کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اس صنعت کا استعمال کیا ہے جو کہ مرزا دبیرؔ کے مرثیوں میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ یعنی پہلے مصرعے کے قافیہ سے دوسرا مصرعہ شروع کرنا۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

خیمہ میں اب ایک ایک تھا صحرائے تشنگی صحرا بھی وہ جو بن گیا دریائے تشنگی
دریا کہ جس کے ہونٹوں پہ تھا ہائے تشنگی ہائے وہ دھوپ جس سے جلا پائے تشنگی
پیاسے نہ مضمحل تھے نہ وہ محوِ یاس تھے
سیراب اہلِ شام، مگر بدحواس تھے

اس طرح ایک کے بعد ایک کر کے بند تیار ہوتا ہے۔ یہ التزام ایک مشکل صنعت ہے۔ ان چاروں مصرعوں کے بعد بیت میں بڑی مکمل اور جامع کردار نگاری بھی کی ہے۔ مثلاً پہلے مصرعے میں پیاسوں کا کردار اور دوسرے مصرعے میں سیرابوں کا کردار۔ جو پیاسے تھے وہ نہ مضمحل اور نہ محوِ یاس تھے، اور جو سیراب تھے وہ بدحواس تھے۔ جب کہ عام فطرت

انسانی کے مطابق اس کے بالکل برعکس ہونا چاہئے تھا۔احسن شکار پوری نے مرثیہ میں ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو ہنرمندی کے ساتھ مختصر انداز میں ترتیب دیا ہے۔ چاہے وہ کربلا میں وارد ہونے کا واقعہ ہو یا دریا کے کنارے سے خیمہ ہٹانے کا۔ چاہے وہ شبِ عاشور کی مہلت لینے اور ساری رات بیداری میں گزارے کا قصہ ہو یا صبح صادق کی نماز کا، ان سب کو شاعر نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔روز عاشورہ کے صبح کا یہ واقعہ دیکھئے۔

آئی صدا حسین ؑ کی اکبرؑ اذان دو　　میداں میں جاکے میرے دلاور اذان دو
ہو جائے صبح نو ذرا بڑھ کر اذان دو　　جاگے کسی کا سویا مقدر اذان دو
رشتہ جو تارِ دل کا ہوا اس اذان سے
حُر چل دیا یزیدیوں کے درمیان سے

میدان کربلا میں اذان علی اکبر ایک اطلاع ہے، ایک اعلان ہے اور بلاوہ ہے۔جس کو سن کر نمازی نماز کے لئے آتے ہیں لیکن احسن شکار پوری اس اذان کا مقصد صرف بلاوہ ہی نہیں بتایا ہے بلکہ اس کا مقصد انسان کے مقدر کو جگانا بھی ہے، اور اس کا اثر یہ ہوا کہ حُر باطل کی صفوں سے نکل کر باہر آ گیا۔ جنگ کربلا میں جو کردار سب سے منفرد تھا وہ حُر ہے۔جس نے ہی اہل بیت کو کربلا کے میدان میں جانے پر مجبور بھی کیا اور روز عاشورہ دشمنان اہل بیت کا ساتھ چھوڑ کر امام حسینؑ کی طرف آ گیا۔شاعر نے مرثیہ میں ایک ایک انصار کی شہادت کو مختصراً انداز میں بیان کیا ہے اور سب کے بعد امام حسینؑ کی شہادت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف کا بیان بھی ملتا ہے، اور ساقی نامہ کا بھی۔کہنا یہ ہے کہ مرثیہ میں احسن شکار پوری نے سارے عناصر کو خوبصورتی اور ہنرمندی سے تحریر کیا ہے۔حضرت شبّیرؑ کی شہادت کا یہ بند ملاحظہ ہو جس میں صرف درد ہی درد نظر آتا ہے۔

زخمی جبیں حسینؑ نے رکھی جو خاک پر　　آکر سوارِ پشت ہوا شمرِ بد سیئر
جب کاٹتا تھا وہ پسِ گردن سے شہؑ کا سر　　کہتی تھی فاطمہؑ وہیں سر اپنا پیٹ کر
ائے شمر میرے لختِ جگر پر نہ ظلم کر
ختمِ رسل کے نورِ نظر پر نہ ظلم کر

الغرض احسن شکار پوری کا یہ مرثیہ ہر اعتبار سے قابل توجہ بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔قابلِ تحسین بھی ہے اور قابل قدر بھی۔انھوں نے اس میں تشبیہ، استعارہ اور تلمیح کا استعمال بھی کیا ہے۔مرثیہ کی زبان صاف اور سادہ ہے۔

عرش۔ یہ احسن شکار پوری کا دوسرا مرثیہ ہے۔یہ مرثیہ انھوں نے اپریل ۲۰۰۳ء میں جناب حسین علی سجاد اور جناب نواب آسؔ عابدی صاحب کی بارگاہ شبّیرؑ زہرانگر، حیدرآباد میں برسرِ منبر خطاب فرمایا تھا۔اٹھّاسی (۸۸) بندوں میں مشتمل اس مرثیہ میں حضرت علیؑ کے بیٹے حضرت امام حسنؑ کا احوال بیان کیا گیا ہے۔اور مرثیہ کا چہرہ 'عرش' کو بنا کر پیش کیا ہے۔مرثیہ کو احسن شکار پوری نے پورے لوازمات کے ساتھ ہنرمندی سے تحریر کیا ہے۔مرثیہ کی ابتدا کرتے ہوئے احسن

شکار پوری سخنور کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب بھی مرثیہ گو کسی مرثیہ کی تخلیق کرے تو اس پہ لازم ہے کہ وہ مرثیہ کے ہر فن کی پیروی کرے اس کے ہر جز کو استعمال کرے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

جب قصدِ مرثیہ کبھی اہلِ سخن کریں　　لازم یہ ہے کہ پیروئ اہل فن کریں
صحرا کو لفظ لفظ کی بو سے چمن کریں　　اور فکرِ حق سے متصف اپنا چمن کریں
منسوب اُن کا مرثیہ آلِ عبا سے ہو
آغاز اس کا تذکرۂ کبریا سے ہو

مرثیہ کے چہرہ کے بند میں شاعر اللہ تعالیٰ کی زبانی کہتا ہے کہ میں نے اس عرش کو لاریب مصطفیٰ اور ان کی آل کے لئے خلق کیا ہے، اور روزِ قیامت تک انہیں چودہ کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ اس کے بعد احسن شکار پوری محمدؐ کی منقبت تحریر کرتے ہیں۔ مرثیہ میں شاعر نے دو بار مدح کا بند تحریر کیا ہے، جس میں امام حسنؑ کی تعریف و توسیف کا بیان کیا گیا ہے۔ مرثیہ میں بعدِ رسولؐ مدینہ کے جو حالات تھے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور شاعر نے تذکرہ بھی ایک بیٹے کے جذبات کے ساتھ کیا ہے یعنی جب بعد رسولؐ مدینہ میں حضرت علیؑ کے ساتھ ناانصافی ہوئی تو اس وقت امام حسنؑ کے دل پر جو چوٹ لگی اس کا بیان کیا ہے۔

احساس تھا حسنؑ کو نبیؐ پر جو تھے الم　　اُن کو ملے نہ مانگے سے قرطاس اور قلم
پھر فاطمہؑ پہ ڈھائے گئے کس قدر ستم　　اٹھارہ سال سن تھا، کمر ہو گئی تھی خم
شدّت سے اب مخالفتِ بوترابؑ تھی
یہ حشر تھا اور آلِؐ رسالت مآبؐ تھی

گردن میں بوترابؑ کی جب ریسماں بندھی　　شبّر کے دل پہ ایک قیامت گزر گئی
اللہ رے زورِ ضبطِ جگر گو شئہ نبیؐ　　روکے ہوئے تھا جنگ کے جذبات کو جری
ارمان تھا عدو سے کبھی انتقام لوں
بابا کی طرح تیغ سے اک روز کام لوں

مرثیہ میں آگے شاعر جنگ صفین کا بیان کرتا ہے جس میں حضرت علیؑ اپنی تینوں بچوں حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے ساتھ بادشاہِ شام معاویہ سے جنگ کی تھی۔ مرثیہ میں اس جنگ کے مناظر بہت ہی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ جس میں حضرت علی کی تلوار اور ان کے گھوڑے کی تعریفیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ پھر حضرت امام علیؑ کی شہادت کا بیان مختصر انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد شاعر امامِ حسنؑ کی جانشینی اور معاویہ کے حال کا بیان کرتا ہے۔ بعد وفات علیؑ امام حسنؑ کی جانشینی کے وقت وہاں کا بادشاہ برے اعمالوں میں گرفتار تھا۔ اس دور میں مدینہ میں جو حال تھا اس کا بیان احسن شکار پوری اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

تھے اس کے پاس رقص وشراب وغنا حلال — اس کے لئے تھا خون بھی انسان کا حلال
اس نے حرامِ دینِ نبیؐ کو کیا حلال — کہتا تھا وہ ہے غیبتِ آلِ عبا حلال
مولاؑ پہ سبّ وشتم روا منبروں سے تھے
محوِ فساد اہلِ دغا منبروں سے تھے

اس درجہ محوِ ظلم تھا حاکم وہ شام کا — وہ بن گیا تھا قاتلِ اصحاب، مصطفیؐ
دل میں نہ اس لعین کے تھا خوف کبریا — آماجگاہِ بغض علیؑ اس کا قلب تھا
سرکشی اب اس نے کی حیدرؑ کے لال پر
فرزندِ مصطفیؐ، حسنؑ خوش خِصال پر

اس ظلم اوران سب برائیوں کوروکنے کے لئے امام حسنؑ معاویہ سے جنگ کرتے ہیں۔جنگ کو ہارتے ہوئے دیکھ کر معاویہ ان سے صلح کرتا ہے،لیکن بعد میں تدبیر سے مولا کوان ہی کی ایک زوجہ جُعدہ سے زہر دلوادیتا ہے جس سے ان کے جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر طشت طلا میں گرنے لگے اور آپ نے شہادت پائی۔مرثیہ میں بین کے بند بھی احسن نے پراثر انداز میں بیان کئے ہیں۔اس میں جناب زینبؑ اور امام حسینؑ کے بین تحریر کیے ہیں۔ بھائی کی لاش پہ بہن کے جذبات کی عکاسی بھی نمایاں اور پردرد انداز میں کی گئی ہے۔اس کے بعد احسن شکارپوری امام حسنؑ کے جنازہ پہ تیروں کی بارش کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔یہ بند دیکھئے۔

لے کر چلے جنازہ حسنؑ کا شہِ امم — پہنچے قریب روضۂ سرکارِ ذی حشم
پہلے ہی اہلبیتؑ پہ کچھ کم نہ تھے الم — بارش تھی اس پہ تیروں کی طُرفہ تھا یہ ستم
پیوست سات تیر جو جسمِ حسن میں تھے
زخمی رسولِ دوجہاں اپنے کفن میں تھے

قبرِ نبیؐ سے اٹھا دل و جانِ مرتضیٰ — لیکر گیا بقیع میں اب لاشہ بھائی کا
آنکھوں سے اشک بہتے تھے اور دل ملول تھا — شبیرؑ نے سنی تبھی امّاں کی یہ صدا
مجھ سے رکھو نہ دور تم اِس خوش خصال کو
پہلو میں میرے دفن کرو میرے لال کو

یہ مرثیہ احسن شکارپوری نے بہت عمدگی وکامیابی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔یوں تو جنابِ حسنؑ کا مرثیہ بہت کم مرثیہ گو شعراء نے تحریر کئے ہیں اور جس نے بھی لکھے ہیں وہ مختصر انداز میں ہی لکھے ہیں۔غالباً شعراء اس بات سے بھی کتراتے ہونگے کہ امام حسنؑ خاموشی سے حیات گزاری ہے اور اخلاقِ حسنہ کا تاحیات مظاہرہ کیا ہے۔اس لئے آپ کی زندگی پر کچھ بھی لکھنا دشوار ہے حتیٰ کہ میر انیسؔ کے یہاں بھی امام حسنؑ کے مرثیہ میں اتنی طوالت نہیں نظر آتی جتنی کہ احسن شکارپوری

کے مرثیہ میں ملتی ہے۔۸۸ بند امام حسنؑ کی حیات طیبہ پر لکھنا اپنے اندر کمال ہے۔

شباب۔ یہ مرثیہ اس مجموعہ ''معراجِ غم'' کا تیسرا ہے جس کو جمالِ مصطفیؐ، فرزند امام حسینؑ، علی اکبرؑ کے حال پر تحریر کیا گیا ہے۔اس مرثیہ میں ایک سو ایک بند لکھے گئے ہیں۔مرثیہ اپنے عنوان سے ہی علی اکبرؑ کا پتہ دیتا ہے۔حضرت علی اکبرؑ کی توصیف بیان کرتے ہوئے علامہ نجم آفندی نے کیا خوب لکھا ہے۔

''فلک قابل مٹانے کی نہ تھی تصویرِ اکبرؑ کی

علیؑ کا نام، سن زہرہ کا اور صورت پیمبر کی''

مرثیہ کا آغاز احسن شکارپوری حمد الٰہی سے کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ہر ایک تعریف و توصیف اس پروردگار عالم کے لئے ہے جو بڑا رحمٰن و رحیم ہے۔جس نے ہم کو شعور و فکر عطا کیا ہے۔اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اللہ ایک چھپا ہوا خزانہ تھا اور جب اس پروردگار عالم نے چاہا کہ وہ پہچانا جائے تو اس نے سب سے پہلے نورِ نبیؐ کی خلقت کی اور اس نور سے پانچ پنجتن کو پیدا کیا۔اور ان سب کو عظمت کی بلندی تک پہچایا۔یہ بند دیکھئے۔

چھپا ہوا وہ خزانہ تھا کہہ رہا ہے وُہی جب اس نے چاہا کہ ہو عالمین میں وہ جلی
تو سب سے پہلے کیا خلق اس نے نورِ نبیؐ پھر اس نے نور کو تصویرِ پنجتنؑ بخشی
خدا نے پھر شجرِ طیّبہ کہا اس کو
تصوّرات بشر سے سِوا کہا اس کو

نبیؐ و زہرہؑ ہوں شبّر ہوں یا حسینؑ و علیؑ علیؑ و باقرؑ و جعفرؑ کہ موسیٰؑ مدنی
رضاؑ، تقیؑ و نقیؑ و حسنؑ کہ ہوں مہدیؑ سبھی میں نورِ یگانہ ہے شک نہیں کوئی
انہیں کو زیبا ہے عالم میں کلّنا کی سند
انہی کو حق نے عطا کی ہے اِنّما کی سند

مرثیہ میں احسن شکارپوری نے ''شباب'' کو چہرہ بنا کر پیش کیا ہے۔چہرہ کے بند کو تحریر کرتے ہوئے جن الفاظ کو شباب کی تعریف میں صرف کیا گیا ہے وہ اپنے اندر خود شباب آشکار حسن ہے۔جس سے ان کے کلام کی فصاحت و بلاغت کا خوب اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔شباب کی تعریف بیان کرتے ہوئے شاعر اس کو علی اکبرؑ سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ شباب جس کو نہ تو کوئی حکومت جھکا پائی اور نہ ہی اس کو تکبر جیت پائی۔شباب تو اسرار زیست سے معمور ہوتا ہے، اور اسی شباب کو حضرت علی اکبرؑ کی ذات پر فخر ہے۔اس کو بقا علی اکبرؑ سے ملی۔جس سے سرِ خم دین پیمبرؐ نے اس کی جوانی مانگی ہے۔ملاحظہ ہو۔

شباب کو جو عطا کر چکے بقا اکبر ادب سے دیں نے کہا اے شبیہہؑ پیغمبرؐ
غم والم سے ضعیفی کے ہوں بہت مضطر شباب مانگنے آیا ہوں آپ کے در پر
ا ہے گردشِ دوراں نے ناتواں مجھکو

خدارا لطف وکرم سے کریں جواں مجھکو

آ گے کے بندوں میں احسن شکارپوری نے حضرت علی اکبرؑ کی پرورش، ان کے حسن و جمال اور ان کی سیرت کا تذکرہ ہنرمندی و کاریگری سے کرتے ہیں۔ حضرت علی اکبرؑ کی خوبصورتی کے اعتبار سے وہ لکھتے ہیں کہ حضرت علی اکبرؑ شبیہہ رسولؐ تھے۔ ان میں حضرت علیؑ کا زور اور حضرت عباسؑ کی شجاعت بھری ہوئی تھی۔ ان کو نبیؐ کا حسن ملا اور ساتھ ہی ان کے اطوار بھی نبیؐ جیسے تھے۔ آ گے کے بند میں شاعر مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر زلیخا علی اکبرؑ کے حسن و جمال کو دیکھ لیتی تو یوسفؑ کے حسن کو وہ بھول جاتی تھی۔

مرثیہ میں آ گے احسن شکاپوری امام حسینؑ کے ترک وطن یعنی مدینہ کا ذکر کرتے ہیں، جس میں ان کے قبر رسولؐ اور امّاں فاطمہ ؑزہرہ کی لحد سے رخصت ہونے کا واقعہ رقم کیا گیا ہے۔ یہ اہلِ بیت کا قافلہ دو محرم کو کربلا کی سرزمین پر وارد ہوا۔ شبّیر نے حضرت عباسؑ اور علی اکبرؑ سے خیمے کو دریا کے کنار نصب کرنے کا حکم دیا، لیکن تین محرم کو ہی فوج یزید نے ان خیموں کو دریا کے کنارے سے ہٹوانے کا حکم دے دیا۔ اہلبیت نے کتنے صبر تحمّل سے دریائے فرات کو چھوڑا اس کا بیان احسن شکارپوری بہت پیارے انداز میں کیا ہے۔

غرض کہ چھوڑ دیا اہلِ حق نے دریا کو مسل کے پھینک دیا خود گلِ تمنّاَ کو
بھلادے جیسے پئے عُقبیٰ کوئی دنیا کو جہانِ بالا نے ٹھکرا دیا تھا ادنیٰ کو
فرات چھوڑی انہی نے جو اہلِ کوثر تھے
خموش تھے وہ خطابت میں جو سمندر تھے

خیمے کے ہٹنے کے بعد فوجوں نے نہر پر پہرے بٹھا دئے۔ اور نبیؐ کی آل پر پانی بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد شاعر شبِ عاشور کا ذکر کرتے ہیں یہ وہ رات ہے جس کے لئے امام حسینؑ کے یزید سے مہلت طلب کی تھے، اور اس رات سب خدا کے عبادت گزاری میں مشغول ہو گئے۔ اس رات حضرت شبّیرؑ نے اپنے سارے انصاروں کو بلا کر ان سے کہا کہ کل سب قتل کر دئے جائیں گے لہذہ تم میں سے جو بھی جانا چاہتا ہے جا سکتا ہے میں تم سب سے بیعت اٹھالیتا ہوں۔ اس واقعہ کا اور ان انصاروں کے جذبات کا بیان احسن شکارپوری شاعرانہ انداز میں اس طرح کرتے ہیں۔

کہا حسینؑ نے گُل کر کے پھر چراغوں کو نہیں ہے تاب تو تو تر کر لو اپنے ہونٹوں کو
بچا لو چا ہو بچانا گر اپنی جانوں کو پھر اس طرح سے مخاطب کیا محبوں کو
ہ بیعت اپنی ہر ایک سر سے میں اٹھاتا ہوں
مگر تمہیں خبرِ خلد بھی سناتا ہوں

بہ چشمِ نم بہ سرِخم یہ کہتے تھے انصار   اے سبطؑ احمدؐ مرسل اے سیدِ ابرار
کریں گے آپ پہ سو بار اپنی جانیں نثار   ہمارے جذبوں کو پھر بھی نہ مل سکے گا قرار
عدو کے نرغے میں ہم آپ کو نہ چھوڑیں گے
ادائے اجرِ رسالت سے منہ نہ موڑیں گے

مرثیہ میں احسن شکارپوری صبح عاشور علی اکبرؑ کی اذان کا بیان کرتے ہیں، یہ اذان صرف نمازیوں کو نماز کی صف میں آنے کا بلاوا نہیں تھا بلکہ یہ اذان فوجِ یزید کو راہ حق پر آنے کی دعوت کا اشارہ بھی تھا۔ جسے سن کر یزید کی فوج سے جناب حُرؑ نکل آئے اور ساتھ میں اپنے بیٹے اور غلام کو بھی ساتھ لائے۔ احسن نے مرثیہ میں ہنرمندی اور خوبصورتی کے ساتھ حضرت امام حسینؑ کے ہر ایک انصار واقرو باء کی شہادت کا بیان مختصراً انداز میں کیا ہے۔

علی اکبرؑ کی رخصت اور میدان میں رجز کا پڑھنا، اور جنگ کی تصویرکشی شاعر نے عمدگی کے ساتھ کی ہے۔ جنگ کے مناظر کو پڑھنے سے وہ سارے منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ علی اکبرؑ کی جنگ دیکھ کر دشمنوں کا گھبرانا اور ان کو دھوکے سے شہید کرنے کا منصوبہ بنانے کے واقعہ کو احسن ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بین کا صرف ایک ہی بند تحریر کیا گیا ہے جو آنکھوں میں آنسوں لانے کے لئے کافی ہے۔ مرثیہ کی زبان صاف، عام فہم اور سادہ ہے۔ شاعر نے تشبیہ، استعاروں، کنایوں کے علاوہ صنائع و بدائع کو بھی مرثیہ میں فنکاری کے ساتھ برتا ہے، جس سے اس کے شاعرانہ رنگ میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

وفا۔ یہ اس مجموعہ کا چوتھا اور آخری مرثیہ ہے۔ جو جناب حضرت عباسؑ علی کے احوال کو بیان کرتا ہے۔ ایک سو دس بند پر مشتمل اس مرثیہ میں شاعر حضرت عباسؑ علمدار کی عظمت و وفاداری کو قلمبند کیا ہے۔ جناب عباسؑ کربلا کے وہ واحد شہید ہیں جنکو لڑنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ صرف پانی لانے کی اجازت ملی تھی۔ عباسؑ کو میدان میں جاتے وقت تلوار کی جگہ ایک ٹوٹا نیزہ اور ڈھال کی جگہ بھتیجی سکینہؑ کی مشک ملی تھی۔

مرثیہ کی ابتداء احسن شکارپوری نے تخلیقِ حضرت آدمؑ اور منقبت پنجتن سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب خالق نے عرش پر بشر کی تخلیق کی، تو ساری ملائکہ کو بشر کا سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ معبود عالم نے اس بشر کا نام آدم رکھا اور پھر آدم کو پنجتن کے نور سے روشناس کرایا۔ اور بتایا کہ جب تم ان پانچوں پر ایمان لاؤ گے، تو تم کو نبوت عطا کی جائیگی۔ حضرت آدمؑ پنجتن پر ایمان لاکر اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔ یہاں شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ دینا میں وفاداری کی میراث حضرت آدمؑ سے ہے۔ اپنے چہرے کے بند میں شاعر وفا کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔ یہ بند دیکھئے۔

خلّاقِ کائنات کا انعام ہے وفا   وصفِ بشر کا ایک بڑا نام ہے وفا
اسلام کا زمانے میں پیغام ہے وفا   مردِ جری کے ساتھ ہر اک گام ہے وفا
اس کے بغیر کوئی بھی میدان سَر نہیں
دشوار ہے سفر یہ اگر ہم سفر نہیں

احسن شکارپوری مرثیہ میں حضرت علیؑ کی تمنا کا بھی بیان کرتے ہیں کہ امام علیؑ کی یہ خواہش تھی کہ ان کو ایک ایسا جری بیٹا ہو جو کربلا میں میرے حسینؑ کے ساتھ رہے اور اس کے کام آئے۔ اور اس خواہش کی تکمیل اس وقت ہوئی جب حضرت عباسؑ کی پیدائش ہوئی۔ یہ خبر سن کر امام حسینؑ نے آکر اپنے بھائی کو گودی میں اٹھالیا اور حضرت شبّیر کی گودی میں آنے کے بعد ہی عباسؑ نے اپنی آنکھ کھولی گو یہ حضرت عباسؑ کی وفاداری کا پہلا نمونہ تھا۔ یہ واقعہ حضرت محمدؐ اور حضرت علیؑ کی پیدائش کے وقت کی یاد دلاتا ہے۔ اس واقعہ کو شاعر نے ڈرامائی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

گودی میں لے کے کہتے تھے شبّیرؑ نامور　　دیکھو اے بھائی اب ہمیں آنکھوں کو کھول کر
عباسؑ نے حسینؑ کے رخ پر جو کی نظر　　شرمائے اس نظارے سے خورشید اور قمر
حکمِ حسینؑ سے کی زیارت حسینؑ کی
عباسؑ کر رہے تھے اطاعت حسینؑ کی

دیدی دہن میں بھائی کے شبیرؑ نے زباں　　حسن ِ نگاہ آج ہے پھر تیرا امتحاں
عباسؑ بن گئے ہیں امامت کے رازداں　　یا بحرِ نور بحر وفا پر ہے مہرباں
پھر آج اپنے آپ کو دُہرایا وقت نے
نظّارہ پھر سے کعبے کا دِکھلایا وقت نے

مرثیہ میں مدح عباس اور سیرت عباس کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ پھر حضرت عباسؑ کے سراپہ کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ حضرت علیؑ سے بہت مشابہ تھی۔ مرثیہ میں احسن شکارپوری نے تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے حضرت حسنؑ کے اس دور کا بیان کیا ہے جب حضرت حسنؑ مدینہ سے موصل جا رہے تھے اور راہ میں ایک شخص نے ان پر پیچھے سے پشت پر چوبِ سم سے وار کیا تو حضرت عباسؑ سے نہیں دیکھا گیا اور وہ غیظ میں آکر اسی لکڑی سے اس کو ایسے ضرب ماری کہ وہ وہیں مر گیا۔ حضرت عباسؑ کی وفاداری کا ایک اور واقعہ احسن شکارپوری یہ بیان کرتے ہیں حضرت امام حسنؑ کی لاش پر جب تیر برسائے گئے تب وہ غیظ میں آکر جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ تب امام حسینؑ نے ان کو یوں روکا۔

غیظ و غضب میں اس پہ جو دیکھا حسینؑ نے　　عباسؑ نامدار کو روکا حسینؑ نے
بھائی کو اپنے دل سے لگایا حسینؑ نے　　گویا بجھایا بدلے کا شعلہ حسینؑ نے
فرمایا بھائی موقع نہیں ہے جدال کا
ہے وقت عنقریب عدو کے زوال کا

مصائب کے بندوں میں احسن شکارپوری نے وہی بیان کیا ہے جیسا کہ وہ سارے مرثیوں میں بیان کرتے آئے ہیں۔ وہی امام حسینؑ کے ترک وطن کا بیان، وہی حُر کا لشکر کو روکنا اور امام حسینؑ کا کربلا میں وارد ہونا اور پانی بند ہونا۔ لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ کو انھوں نے الگ الگ انداز سے تحریر کیا ہے۔ مرثیہ میں حضرت عباسؑ کا دریا پہ پانی لانے جانا، نہر پر قبضہ کرنا اور مشک بھرنے کا بیان تفصیلاً مگر خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

مرثیہ میں جنگ کا بیان احسن شکارپوری نے زیادہ نہیں کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت عباسؑ نے باقاعدگی سے جنگ کی ہی نہیں تھی۔ حضرت عباسؑ کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ سید میر ابراہیم علی حامی لکھتے ہیں کہ۔

''اجتماعی جنگ کے موضوع پر احسن صاحب نے کچھ نہیں لکھا کیونکہ چھوٹے حضرت سلام اللہ علیہ جنگ کس سے کرتے جب کہ کوئی فوج اشقیا سامنے نہیں آئی نہ مزاہم ہوئی۔ افواج باطل تو خوف کے مارے بہت دور دور تھیں۔ صرف ماردِ ظالم آپکے مقابلے کے لئے آیا تھا آپکی اس سے انفرادی جنگ ہوئی پہلے اس نے حملے کئے آپ نے دفاع فرمایا اور آخر کار اس ظالم کو واصلِ جہنم کر دیا۔'' ۳۷

بین کے بندوں میں احسن شکارپوری نے جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک بھائی کے لئے دوسرے بھائی کے جذبات کو پردرد انداز میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر بھائی بھائی کے محبت کے ذریعہ موجودہ دور کے لوگوں کو درس بھی دیتے نظر آتے ہیں۔ آج ہر بھائی دوسرے بھائی سے بیزار ہے۔ بھائی بھائی میں انتشار کا ماحول ہے۔ مرثیہ میں تلمیح وصنائع وبدائع کا استعمال کیا گیا ہے اسلوب روایتی اور بیانیہ ہے۔

☆ احسن شکارپوری کی مرثیہ نگاری :

حیدرآباد کے مشہور نوحہ گو شاعر و مرثیہ گو نے اب تک بہت سے مرثیے لکھے اور پڑھے ہیں جو کہ کافی مشہور اور مقبول ہوئے۔ انھوں نے اب تک ۱۴ مرثیے کی تخلیق کی ہے جس میں ۴ مرثیے مطبوعہ اور دس غیر مطبوعہ ہیں۔ میں نے ان کے صرف مطبوعہ مرثیوں کو ہی پڑھا ہے اور اس پر تنقید و تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیہ میں ایک ہی اسلوب استعمال کیا ہے۔ احسن شکارپوری کے سارے مرثیوں میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ اس کو ہم احسن صاحب کی خوبی بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ایک ہی واقعہ کو الگ الگ انداز سے لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

موضوع۔ مرثیہ میں احسن شکارپوری نے وفا، شباب یعنی جوانی، عرش اور ذکر کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں حضرت عباسؑ کی وفاداری کو پیش کیا ہے۔ حضرت علی اکبرؑ کی جوانی کو لکھا ہے۔ علی اکبرؑ جو کہ رسولؐ اکرم سے بہت مشابہ تھے، اور جب بھی امام حسینؑ کو ان کے نانا کی یاد آتی وہ علی اکبرؑ کو دیکھا لیا کرتے تھے۔ مرثیہ میں ایک بچی کے اپنے بھرے گھر کے بچھڑنے کے جذبات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

عباسؑ نے سنایا جو حکمِ امامؑ کا ۔۔۔ کنبے سے دور جانے کا جب وقت آگیا
بچّی نے دست بستہ یہی شاہؑ سے کہا ۔۔۔ صغراؑ کو لے نہ جائیں گے ہمراہ جب سنا
اے بابا اِس علیل سے یوں منہ کو موڑ کے
کیوں جا رہے ہیں لاڈلی بیٹی کو چھوڑ کے

اسلوب۔ مرثیہ میں بیانیہ اسلوب کا استعمال کیا گیا ہے۔ احسن شکارپوری نے مرثیہ میں ہر جز کو بڑی تفصیل اور

عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔آج کل کے زیادہ تر مرثیہ گوشعراء مرثیہ کے سارے لوازم استعمال نہیں کرتے ہیں۔انکی اسی خوبی کو بیان کرتے ہوئے ان کے استاد ابراہیم علی حامؔی لکھتے ہیں کہ۔

''ان کے مراثی میں چہرہ ہوتا ہے۔مدح کے ساتھ ساقی نامہ ہوتا ہے۔گھوڑے کی اور تلوار کی تعریف کے ساتھ رجز، جنگ،اور شہادت کے مضامین پر مرثیہ کا اختتام ہوتا ہے۔متذکّرہ اجزائے مرثیہ کا اکثر مرثیہ گو حضرات خیال نہیں رکھتے۔جو مرثیہ گوئی کی تعریف کے خلاف ہے۔''۳۸

مرثیہ میں تلمیح،تشبیہ،استعارہ اور صنائع و بدائع کا استعمال خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ان کے مرثیہ نگاری کی خصوصیت میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ابیات کو بہتر انداز میں نظم کیا جائے۔یعنی بند کے چاروں مصرعے سے بڑھکر بیت کے دومصرعوں میں زور دیا جائے۔مثلاً

مثلِ علیؑ زمانے میں عالی جناب ہے
شبّیر ورثہ دارِ رسالت مآب ہے

......

تلوار مجتبیٰؑ کی تھی یا ذوالفقار تھی
پیتی تھی خون پیاس مگر برقرار تھی

تلوار کی تعریف۔ احسن شکارپوری نے تلوار کی تعریف خوبصورت انداز میں کی ہے۔

تیغِ حسنؑ در آئی تھی جسموں میں بے خطر برقِ تپاں کی طرح وہ شعلہ تھی سر بسر
دو ہوتے تھے عدو پہ نہ تھی اُن کو کچھ خبر اپنی اجل سے بھاگتے کس طرح بد سیر
قاتل ہزاروں اعدا کی وہ اک دلیر تھی
ا کھا کے اپنے لُقموں کو تلوار سیر تھے

گھوڑے کی تعریف۔ مرثیہ میں حضرت عباسؑ کے رہوار کی تعریف ملاحظہ ہو۔

مہمیز جب جریؑ نے کیا اپنا راہوار کانپ اٹھا اس کے رعب سے میدان کارزار
گھبرا کے ڈھنڈنے لگے ظالم رہِ فرار ٹاپوں سے اسپ ناری کو کرتا تھا ان پہ وار
بزدل کچھ ایسے حال سے بے حال ہوتے تھے
اپنے ہی راہواروں سے پامال ہوتے تھے

ساقی نامہ۔ مرثیہ میں ساقی نامہ کا استعمال بھی خوبصورتی اور تفصیلی انداز میں کیا گیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

ساقی یہی ہے وقت کہ میں میکشی کروں اب غرقِ جام کوثری یہ زندگی کروں
پھر اپنی طبع شعر کو میں زمزمی کروں نشے میں اس کی جھوموں ثنا گستری کروں

وہ دے جو دعبلؔ اور فرزدقؔ بھی پیتے تھے
جس مے کو پی کے میثمِ تمّار جیتے تھے

جذبات نگاری۔مرثیہ میں جذبات نگاری کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔کسی بھی شخص کے دل کا حال ہم اسکے جذبات سے کرتے ہیں۔اوراحسن شکارپوری نے اس جز کا استعمال بھی بخوبی کیا ہے۔مرثیہ''وفا''میں حضرت امام حسینؑ کے لئے ان کے بھائی حضرت عباسؑ کی جذبات کو دیکھئے۔

بولے حسین تم نے رہِ حق پہ جان دی حسرت مگر ہے دل میں ہمارے اک اور بھی
بھائی کہا نہ تم نے ہمیں آج تک کبھی اک بار ہم کو بھائی پکاروں تو اے اخی
ارماں علیؑ کے لال کا وہ پورا کر گئے
مولاؑ کو بھائی کہتے ہی جی سے گزر گئے

اپنی مرثیہ نگاری سے احسن شکارپوری نے یہ ثابت کر دیا کہ ایک اچھے مرثیہ نگار بھی ہے۔انھوں نے مرثیہ کے تمام لوازم کا استعمال بھی کیا ہے۔مرثیہ میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں دبیرؔ کا رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے۔

(۳) ڈاکٹر سید علی امام گوہر''گوہرؔ لکھنوی''

سید علی امام گوہر کا شمار میر انیسؔ اور شدیدؔ کے جانشینوں میں ہوتا ہے۔ان کی ولادت ۲۲/اپریل ۱۹۵۵ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔جو آج لکھنؤ کے کشمیری محلّہ میں مقیم ہیں۔ان کے والد کا نام سید داور حسین زیدی تھا۔گوہر پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد کانپور یونیورسٹی سے (GAMS) کی میڈیکل ڈگری حاصل کی۔انھوں نے ۱۹۸۲ء میں (CIMAP, CSIR) کے انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی اوراب وہ اس ملازمت سے سبکدوش بھی ہو چکے ہیں۔

گوہرلکھنوی نے کمسنی سے ہی سلام کہنے شروع کر دئے تھے اور بیس برس کی عمر سے مرثیہ تخلیق بھی کرنے لگے۔ گوہر نے اپنے نانا سید سجاد حسین شدیدؔ کے زیرِ سایہ تعلیم وتربیت حاصل کی،اور اپنے کلام میں انیسؔ و شدیدؔ کی پیروی بھی کرنے کی کوشش کی ہے،جس کی جھلک ان کے کلام میں صاف دیکھی جا سکتی ہے۔انھوں نے اب تک گیارہ (۱۱) مرثیوں کی تخلیق کی ہے جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔مرثیوں کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔مثلاً سلام،منقبت،مسدس،مخمس،قطع،مثنوی اور نظم۔اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی کتابوں کی تخلیق بھی کی ہے۔

مثنوی کی ایک کتاب''تاریخ اسلام از قرآن'' کی تخلیق بھی کی ہے جس میں انھوں نے قرآن کے واقعات کو مثنوی کی صورت میں پیش کیا ہے۔جو کہ مثنوی نگاری کی دنیا میں ایک انوکھی مثال ہے۔انھوں نے اس بات کا بھی خاص خیال رکھا ہے کہ اس میں وہ روایتیں نظم نہ ہوں جو متصادمِ قرآن ہیں۔گوہر لکھنوی نے اب تک ۳ مسدس، ۱۰۰ سے زاید غزلیں، ۱۰۰، سلام اور ۱۵۰ رباعیات تحریر کی ہیں۔

(۱) مقصود میرا مدحِ شہِ خوش خصال ہے

یہ مرثیہ گوہر لکھنوی کا پہلا مرثیہ ہے جو حضرت امام حسینؑ کے حال کا لکھا ہوا ہے۔اس میں انھوں نے انٹھاون (۵۸) بند تحریر کئے ہیں۔ یہ مرثیہ جدید طرز پر لکھا گیا ہے۔مرثیہ کے آغاز میں شاعر اپنے مقصد کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرا مقصد حضرت امام حسینؑ کی مدح کرنا ہے۔اپنی بات کا اظہار گوہر لکھنوی کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

مقصود میرا مدحِ شہ خوش خصال ہے　　ہر لمحہ صبح شام یہی اک خیال ہے
دل مضطرب ہے شوق میں اب تو یہ حال ہے　　ہر آرزوئے فکرِ سخن پائمال ہے
ہوں مبتلائے کشمکش دہر کیا کروں
کس وقت میں ثنائے شہِ لا فتیٰ کروں

گوہر نے عام زبان میں اپنے شوق کو ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بلا وقت گنوائے مدح شہِ لافتیٰ کرنا ہے۔دنیا کی دلفریبی کو نظر انداز کرتے ہوئے ثنائے شاہ کرنا ہے۔شاعر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے موجودہ عہد کے لوگوں کو جو کہ دنیا میں ایسے کھوئے ہوئے ہیں کہ اپنے دین اپنے مذہب تک سے رشتہ توڑ چکے ہیں یہ پیغام دیتے ہیں کہ یہ دنیا فریبی ہے جو اس سے لپٹنا چاہتا ہے وہ اس سے اور دوری اختیار کرتی جاتی ہے اور جو دنیا سے دور رہتا ہے دنیا اسکے ہی قریب آنا چاہتی ہے۔اس لئے شاعر کہتا ہے کہ دنیا کی دلفریبی سے دور رہ کر ہمیں اپنے دین اور مذہب کی طرف راغب ہونے کی ضرورت ہے۔دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں پیمبرؐ سے پوچھو کہ وہ کس درجہ ذلیل ہے۔

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے گوہر کہتے ہیں کہ مرثیہ نگاری کو مشکل صنف سمجھنے والوں تم کوشش کروگے تو ضرور کامیاب ہوگے۔اگر ہماری ہی طرح ہی حضرت امام حسینؑ کے انصار ہوتے تو وہ کربلا کی جنگ کو کبھی فتح نہیں کر پاتے۔ اور آج دینِ اسلام مٹ جاتا تھا۔اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے گوہر لکھتے ہیں کہ اگر کسی شہ کو پانے کی دل میں جستجو ہو تو وہ کوئی بھی منزل کو پار کر سکتا ہے۔شاعر پھر میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دونوں بھی اپنی کوشش اور محنت اور عشق حسینؑ کی وجہ سے ہی مرثیہ نگاری کے عروج پر پہنچے ہیں۔اس کے بعد گوہر عشقؔ، تعشقؔ، نفیسؔ، شدیدؔ، شہیدؔ اور جدیدؔ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اجداد کی تعریف اور انکی فنکاری کا بیان کرتے ہیں۔

مشکل ہے فنِ مرثیہ گوئی یہ کیا کہا　　عاشق کو قرب و دوریٔ منزل کی فکر کیا
جتنی ہو راہ سخت مزا آتا ہے سوا　　تونے سنا ہے نام، انیسؔ و دبیرؔ کا
کوشش سے دونوں نظم کے سرتاج ہو گئے
منبر ملا تو صاحب معراج ہو گئے

دیکھے ہیں تونے عشقؔ و تعشقؔ کے مرثیے　　محنت کا تھا یہ پھل کہ وہ استادِ فن ہوئے
ہیں دیدنی کلام نفیسؔ و رشیدؔ کے　　باغِ ادبؔ میں سب نے کھلائے ہیں گل نئے
ہے اب بھی چشم شوق میں صورت شدیدؔ کی

آتی ہے مجھ کو یاد شہیدؔ و جدیدؔ کی

اپنے اجداد کی تعریف کرنے کے بعد گوہرلکھنوی امام حسینؑ کا بیان کرتے ہوئے ان کے میدان کارزار میں پہنچنے کا منظر بیان کرتے ہیں۔مرثیہ میں گوہر سارے اجزاء کو بہت انوکھے انداز سے بیان کرتے ہیں۔گوہر مرثیہ میں آمد کا بیان الگ انداز سے کرتے ہوئے رجز کو گھوڑے کی ٹاپوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں۔شاعر نے جنگ کے مناظر کے بیان میں بھی اپنی فنکاری کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔چونکہ گوہرلکھنوی کا شمار میر انیسؔ کے جانشینوں میں ہوتا ہے اس لحاظ سے ان کے کلام میں بھی انیسیت کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔گوہر جنگ کے احوال یوں بیان کرتے ہیں۔

سب میمنہ سے میسرے تک بے خبر گئے بھاگے کبھی ادھر کبھی ڈر سے ادھر گئے
ہر گام پر گمان تھا دل میں کہ سر گئے گہہ میسرے سے قلب میں وہ بدسیر گئے
جاتے تھے جس طرف کو بھی کترا کے راہ کو
ہر مورچے پہ پاتے تھے موجود شاہ کو

دوزخ کے تیغ تیز نے رستے بتا دیئے دم بھر میں شہہ نے کشتوں نے پشتے لگا دیئے
کچھ یوں چلا کہ قبروں کے مردے جگا دیئے رہوار نے بھی چال کے جوہر دکھا دیئے
ہر قلب مضطرب ہوا یہ خوف چھا گیا
بھگدر ہوئی سپاہ میں اک حشر آ گیا

مرثیہ گوئی کے میدان کو وسیع کرنے اور اپنی قوت بیان کے نئے راستے تلاش کرنے کے لئے گوہرلکھنوی نے جنگ کے مناظر پر خاص توجہ کی ہے۔روز عاشورہ کی سب سے اہم سرگرمی جنگ ہے اس کئے لڑائی کے مسلسل بیان کو مرثیوں میں خاص اہمیت دی گئی ہے۔

مرثیہ میں گوہرلکھنوی نے ساقی نامہ بھی تحریر کیا ہے۔ساقی نامہ کے بعد ایک بار پھر وہ جنگ کا بیان کرتے ہیں جس میں بار بار اپنے رقیبوں اور انصاروں کو پکارتے بھی جاتے ہیں۔لیکن جب آواز غیب جنگ کو روکنے کی آئی تو شہ نے تلوار کو میان میں رکھ لیا۔گوہر پھر امام حسینؑ کی شہادت کا بیان کرتے ہیں۔مرثیہ کی زبان عام فہم اور الفاظ سادہ ہیں۔گوہر نے مرثیہ میں صنائع و بدائع کا استعمال بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔

(۲) جلوہ مرے سخن میں ہے کس آفتاب کا

مرثیہ کا آغاز گوہر اپنی فصاحت و بلاغت پر فخر کرتے ہوئے کرتے ہیں اور اس کو مولا حضرت علیؑ کا کرم مانتے ہیں۔یہ مرثیہ ۶۷ بندوں میں تحریر کیا گیا ہے جس کا چہرہ گوہرلکھنوی نے حضرت علیؑ کو بنایا ہے۔شاعر اپنے کلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرے کلام کا مضمون ہی جداگانہ ہے،اسکی زبان صاف اور بہت خوبصورتی سے لفظوں کی ادائیگی کی گئی ہے۔اس کے سارے حرف اوج میں تحریر نظر آتے ہیں۔گوہر کے اس مرثیہ کے مطالعہ سے انیسؔ کے مشہور

مرثیہ ''نمکِ خوان تکلم ہے فصاحت میری'' کی یاد آتی ہے۔حالانکہ دونوں مرثیے الگ الگ طرز میں تحریر کئے گئے ہیں دونوں کا موضوع بھی الگ ہے لیکن پھر بھی گوہر کے مرثیہ میں انیسؔ کی مرثیہ نگاری کا اثر بہت زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔یہ بند دیکھئے۔

یہ روشنیِ نظم یہ مضموں ہی اور ہے — یہ صاف و پاک حسن کا جیوں ہی اور ہے
یہ جوہر اور یہ دُر مکنوں ہی اور ہے — یہ اوج کچھ ہے اور یہ گردوں ہی اور ہے
حرفوں کو دیکھئے تو ضیاء بار سارے ہیں
ہر لفظ جس کا چاند ہے نقطے ستارے ہیں

افضل جو سب سے ہے وہ فضیلت اسی میں ہے — کُرسی کا پایہ عرش کی شوکت اسی میں ہے
چرخِ بریں ہے پست وپ رفعت اسی میں ہے — شامل خدائے پاک کی رحمت اسی میں ہے
دل واصفوں کے محو ہیں اس ذوق شوق پر
پھر کیوں نہ اُس کو فوق ہو عالم کے فوق پر

مرثیہ کے اگلے بندوں میں گوہر حضرت علیؑ کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔اور اس بات پر نازاں بھی نظر آتے ہیں کہ وہ حضرت علیؑ کے غلاموں کے غلام ہیں۔وہ آگے اسم علیؑ (نادِ علی) کے تعلق سے لکھتے ہیں جس طرح سے حضرت مرتضیٰؑ کی شان ہے اسی طرح ہی ان کا اسم گرامی بھی ہے۔جس کے ورد سے سو سو طرح کی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔چاہے کتنی ہی بڑی مصیبتیں کیوں نہ ہو اس کے پڑھنے سے وہ حل ہو جاتی ہیں۔گوہر بڑی عمدگی سے اپنے فن کا استعمال کرتے ہوئے حضرت علیؑ کے القاب کو بیتوں میں تحریر کیا ہے۔یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

لُطفِ خدا عطائے خدا صفوتِ خدا — نور خدا حجاب خدا حجّت خدا
حکمِ خدا صفیِ خدا حکمتِ خدا — علمِ خدا رضائے خدا، رحمتِ خدا
کیونکر نہ سب پہ فوق امیرِ عرب کو ہو
رتبوں پہ جب علیؑ کے مباہات رب کو ہو

حضرت علیؑ کی فضیلت بیان کرنے کے بعد گوہر گیارہ اماموں کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کی دلیری، شجاعت اور بہادری کا بیان بھی کرتے ہیں۔اس کے فوراً بعد وہ مصائب کے بند کو تحریر کرتے ہیں تو مرثیہ کو ربط و تسلسل سے ہٹا دیتا ہے۔مرثیہ میں انھوں نے مرثیہ کے سارے اجزاء کو با قاعدگی سے استعمال کیا ہے۔مصائب کی ابتداء گوہر امام حسینؑ کے خیمہ سے رخصت کے بیان سے کرتے ہیں۔رخصت کے بندوں میں گوہر صنائع و بدائع کا استعمال امام حسینؑ کے گھوڑے کے لئے کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ جب امام حسینؑ خیمہ سے رخصت ہو کر رن کی طرف چلے تو ان کا گھوڑا اپنی دم کو چنور کے انداز میں کئے مثل طاؤس چلا تھا۔اور اس کے اوپر شہ اس انداز سے سوار تھے مانو خود حضرت مصطفیٰؐ گھوڑے پر سوار ہوں۔اور اس وقت امام حسینؑ کا چہرہ اوج، رعب اور جلال کی وجہ سے روشن تھا۔اور وہ ضیا آسمان پہ ایسی لگ رہی تھی جیسے

سورج کی روشنی زمین پر پڑتی ہے۔حضرت شبّیر کے میدان جنگ میں پہنچنے کے مناظر کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

پہنچے مصافِ گاہ میں یوں شاہِ خوش خصال جس طرح جنگِ بدر پہ ضرغامِ کردگار
دیکھا جو سوئے فوج عدو شیر کی مثال پیچھے ہٹے یلانِ قوی صورت شغال
ڈر کر پیادگانِ بد اطوار گر پڑے
بھڑ کے فرس کچھ ایسے کہ اسوار گر پڑے

قبضہ پکڑ کے تیغ کا حضرتؑ نے دی صدا آیا خلف علیؑ کا خبردار اک ذرا
دعویٰ جسے وغا کا ہو نکلے پئے وغا میں وہ جری ہوں جس کا پدر شاہِ لافتیٰ
جو من چلا ہو جرأت و ہمّت دکھائے وہ
جو قابلِ مقابلہ ہو پہلے آئے وہ

مضمون آفرینی کے ساتھ شوکت الفاظ نے ان بندوں میں شان پیدا کی ہے۔گو ہر مرثیہ میں رجز کو فنکاری سے بیان کرتے ہوئے جنگ کے مناظر کی منظر کشی کرتے ہیں کہ جب امام حسینؑ رجز پڑھ چکے تو دشمنوں کی طرف سے جنگ کا طبل بجنا شروع ہو گیا۔گو ہر جنگ میں بجنے والے آلدتِ موسیقی کا بیان بھی کرتے ہیں جس کا ذکر ایک ساتھ بہت کم مرثیوں میں کیا جاتا ہے۔مثلاً طبل،کوس،دف،قرنا اور شہنا وغیرہ۔شاعر نے ان سارے آلدتِ موسیقی کو ایک ساتھ بہت عمدگی سے استعمال کیا ہے۔اس بند پر نظر کیجئے۔

یہ سن کے طبلِ جنگ بجا فوج میں اُدھر تھی صوت زیر و بم کہ ہلے بحر و دشت و در
آواز کوس و دف نے کیا تا فلک گذر قرنا کی ہولناک صدا وہ کہ الحذر
آثار حشر کے ہیں عیاں نفخ صور سے
نزدیک تھا نکل پڑیں مردے قبور سے

آگے کے بندوں میں شاعر حضرت حسینؑ کی دلیری و شجاعت کا ذکر کرتے ہوئے لاکھوں کے سواروں سے اکیلے حسینؑ کی جنگ کا بیان کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ امام حسینؑ نے جب اپنے والد حضرت امام علیؑ کی تلوار میان سے نکالی اور جس بھی غول پہ وہ حملہ کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان سب پر بجلی سی گر گئی ہے۔دشمن جان بچانے کے لئے ادھر اُدھر بھاگتے پھرتے تھے۔جنگ کے بیان کے ساتھ ساتھ گو ہر گھوڑے اور تلوار کی تعریف بھی تحریر کرتے ہیں۔شاعر میدان جنگ میں امام حسینؑ کی تلوار کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں۔

مارا ہوا نے اُس کے جدھر سن سے آگئی ڈھالوں کے پھول برچھیوں کے پھل گرا گئی
ہر بار گاوِ سر کو نوالا بنا گئی گردہ سپر کا خود کے ہمراہ کھا گئی
خالی شکم قتل کے اعداء کی بھوکی تھی
منھ خشک اِس لئے تھا کہ پیاسی لہو کی تھی

مرثیہ کے آخری میں گوہر امام حسینؑ کے اس خطبہ کو بیان کرتے ہیں جس کو انھوں نے وقت آخر دیا تھا۔اس کے بعد شاعر حضرت شبیرؑ کی شہادت کا بیان کرتے ہوئے مرثیہ کا خاتمہ کرتے ہیں۔گوہر کا یہ مرثیہ سادگی سے بھرپور ہے۔لیکن پھر بھی مرثیہ میں صنائع و بدائع کی بھرمار نظر آتی ہے۔یہ صنائع گوہر کے یہاں اتنے فطری طور پر استعمال ہوئے ہیں کہ ان سے گوہر کے کلام کا حسن دوبالا ہو گیا ہے اور کلام کی معنویت بھی بڑھ گئی ہے۔

(۳) ذکر یہ تھا کہ شہِ یثرب و بطحیٰ آئے

گوہرلکھنوی کا یہ مرثیہ اب تک کا سب سے مختصر مرثیہ ہے جس میں انھوں نے صرف اکتالیس(۴۱) بند ہی تحریر کئے ہیں۔اس میں ایک باپ اور بیٹی کے جذبات کی حقیقت مندانہ تصویر کشی گئی ہے۔مرثیہ میں گوہر نے امام حسینؑ کی مدینہ سے رخصت سے لیکر کربلا کے میدان میں دریا کے کنارے سے خیمہ ہٹانے تک کے واقعات کا بیان کیا ہے۔مرثیہ کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب امام حسینؑ اپنی بہن زینبؑ کو ہمراہ لیکر بیٹی جناب صغرا سے ملنے آتے ہیں جو علالت کے سبب بستر مرگ پر ہیں اور ان کے ہمراہ نہیں جا رہی ہیں۔ابتداء کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

ذکر یہ تھا کہ شہِ یثرب و بطحیٰ آئے   گھر میں غمگین و حزیں سیدِ والا آئے
کہا مادر سے سکینہؑ نے کہ بابا آئے   بولی بیمار کہ ہاں میرے مسیحاؑ آئے
شہؑ نے زینبؑ سے کہا اور قلق بڑھتا ہے
آؤ صغراؑ سے میں رخصت ہوں کہ دن چڑھتا ہے

مجھکو حضرت کی محبت سے تعجب ہے مگر   رات سے آپنے پوچھی بھی نہ صغراؑ کی خبر
شہ نے فرمایا کہ سچ کہتی ہو اے جان پدر   خبر اپنی نہیں شب سے ہے یہ تشویشِ سفر
ہیں وہ ہمراہ جو نازوں کے پلے ہیں صغراؑ
دیکھو کس گرمی میں ہم گھر سے چلے ہیں صغراؑ

یہ سنتے ہیں جناب فاطمہ صغراؑ غم زدا ہو جاتی ہیں اور اپنے بابا سے ساتھ چلنے کی اصرار کرتی ہیں۔حضرت شبیرؑ انھیں سمجھتے ہوئے سفر کی تکلیفوں اور پریشانیوں سے انھیں آگاہ کراتے ہیں۔شاعر یہاں ایک باپ اور بیٹی کی گفتگوں کی حقیقت مندانہ انداز میں تصویر کشی کرتے ہیں۔وہ باپ سے بیٹی کا ضد کرنا اور باپ کا منانا۔ایسا لگتا ہے جسے یہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہی ہو رہا ہے۔مرثیوں میں انسانی برتاؤ اور جذباتی ردّعمل کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں۔غم خوشی،شجاعت کے سادہ جذبات ملتے ہیں جو تقریباً سبھی شعراء کے یہاں کامیابی سے پیش کئے گئے ہیں لیکن جب ان جذبات میں مختلف احساسات کی کشمکش رونما ہوتی ہے یعنی کہیں محبت اور حیا،کہیں غصہ،شجاعت اور پاس ادب،کہیں فرض و محبت آپس میں دست گیر نظر آتے ہیں تو شاعر کی مہارت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان ملے جلے الفاظ کی عمومی تصویر کشی وہ کتنی کامیابی سے پیش کرتے ہیں حضرت صغراؑ کی بے بسی،مایوسی اور صبران ملے جلے جذبات کی تصویر کشی بڑی فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے۔حضرت صغراؑ کے دل میں باپ کی اطاعت اور جانے کی خواہش اس دونوں کے تصادم کو پیش کیا گیا

ہے۔اس کے بعد جناب علی اکبرؑ جو کہ صغراؑ کے بڑے بھائی تھے صغراؑ سے رخصت لیکر جاتے ہیں۔آگے کے بندوں میں گوہرامام حسینؑ اوراہلبیت کے رخصت ہونے کے واقعات کا بیان کرتے ہیں۔جب حضرت زینبؑ گھر سے رخصت ہوتی ہیں تو مدینہ کا جو منظر ہے وہ مندرجہ ذیل ہے ملاحظہ ہو۔

آئی ہودج کے جو نزدیک علی کی دختر　　خود عماری کے قریب آئے شہیدیں بڑھ کر
بند آنکھوں کو کئے تھے ملک و جن و بشر　　مہتمم قاسمؑ واکبرؑ تھے اِدھر اور اُدھر
پردہ عباسؑ اِدھر ، عون اُدھر روکے تھے
شاہؑ خاتونِ قیامت کی ردا روکے تھے

اس بند کے بعد شاعراس وقت کی بھی یاد دلاتا ہے جب کربلا میں بعدِ شہادت امام حسینؑ اہلِ حرم کو لوٹا گیا اور سب کی چادریں چھین لی گئی تو جناب زینبؑ کا یہ حال تھا کہ ہاتھ رسّیوں میں بندھے تھے اور بے کجاوا اونٹوں پہ ننگے سر بٹھا کر کوفہ اور شام میں پھرایا گیا تھا۔اہلبیت کی مدینہ سے رخصت کے بعد گوہران لوگوں کے میدان میں پہنچنے کے مناظر کو بیان کرتے ہیں۔کربلا میں جب اہلبیت دریائے فرات کے کنارے خیمہ لگاتے ہیں تو دشمنان فوج آکران کو خیمہ ہٹانے کا حکم دیتی ہے جس سے حضرت عباسؑ کو غیظ آجاتا ہے۔شاعرنے یہاں صنائع و بدائع کا استعمال کرتے ہوئے اپنی فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔حضرت عباسؑ کے غیظ کے عالم کے یہ جملے دیکھئے۔

خیمۂ شاہ ترائی سے ہٹاؤ تو بھلا　　لال کردیں ابھی خوں سے بیابان ِ پلا
ہم وہ ہیں جن سے نہ شیروں کا کبھی زور چلا　　اسکے خادم ہیں جو آغوشِ نبی کا ہے پلا
خیمہ دریا پہ بپا کرنے کو ہم آئے ہیں
تم نہیں جانتے یاں کس کے قدم آئے ہیں

آخری کے بندوں میں گوہر نے امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کی گفتگو کو بیان کیا ہے کہ کس طرح امام حضرت کو سمجھاتے ہیں۔اوراپنے مقصد کو بتاتے ہیں کہ ہم یہاں جنگ کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ حق و باطل کا فیصلہ کرنے آئے ہیں ۔شاعر نے صاف،سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔

(۴) جب نکلا شیر خیمہ سے مشک وعلم لئے

چوّن (۵۴) بندوں میں تحریر یہ مرثیہ گوہر لکھنوی نے حضرت عباسؑ کے حال کا لکھا ہے۔اس مرثیہ میں شاعر نے حضرت عباسؑ کا پانی لانے کے منظر کو بیان کیا ہے۔مرثیہ کی ابتدا اس وقت کے بیان سے ہوتی ہے جب حضرت عباسؑ پانی لانے کے لئے نہر علقمہ کی طرف آتے ہیں اوران کو دیکھ کر فوج یزید میں ایک کہرام سا مچ جاتا ہے۔جناب عباسؑ کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے شیر نہر کی جانب چلا آرہا ہے۔جس کی کمر میں پری کے پر کے مانند دونوں طرف تلواریں لٹکی ہوئی تھیں۔انکو دیکھ کر یہ قیاس ہوتا ہے کہ اگر حضرت عباسؑ نے حملہ کیا تو وہ پل بھر میں ہی ترائی فتح کر لے گیں۔اوراگراس جری کو غیظ آگیا

تو وہ پورے شہرِ کوفہ کو تباہ کر دینگے۔ حضرت عباسؑ شجاعت اور بہادری کے ساتھ ساتھ اپنے جلال کے لئے بھی جانے جاتے تھے۔ دلیر اور غصہ ور جوانوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جب انھیں جلال آ جائے اور مقابل شخص کی گفتگو یا عمل میں اہانت کا پہلو ملے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس جری کو دیکھ کر دشمن کی فوج پر بھی خوف طاری ہو گیا ہے۔ فوج دشمن پر طاری خوف کو گوہر کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

دیتے تھے پیک فوج ستمگر کو یہ صدا ہوشیار باش اے سپہہ قومِ اشقیا
پیاری اگر ہے جان کوئی ڈھونڈ راستہ غیظ و غضب میں آرہا ہے شیر مرتضیٰ
مشک و علم بھی دیکھو ذرا ساتھ ساتھ ہے
اب شک نہیں کہ فتح وظفر اُس کے ہاتھ ہے

غیظ وغضب میں شیر کو دیکھا تو بدشیم چلائے اب تو بچ نہیں سکتے ہیں اس سے ہم
ہیبت وہ ہے جمائے سے جمتے نہیں قدم مرنا ہے ہر طرح سے اب اللہ کی قسم
ٹھہرے تو جانیں جائینگی شمشیر و تیر سے
بھاگے تو قتل ہوینگے حکمِ امیر سے

شاعر نے یہاں حضرت عباسؑ کی تشبیہ شیر سے کی ہے۔ شمر اپنے ہیبت زدہ فوجیوں کو للکار رہا تھا کہ حضرت عباسؑ سے کوئی خوف نہ کھاؤ کیوں کہ وہ تین دنوں کی پیاس کی شدت کے سبب لڑائی نہیں کر سکیں گے۔ لیکن جب جناب عباسؑ ترائی پر پہنچے تو سارے اشقیاء بھاگ کھڑے ہوئے۔ گوہر لکھنوی یہاں جناب عباس کی عظمت اور ان کی دلیری کا بیان فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں۔ آگے کے ایک بند میں شاعر نے حضرت عباسؑ کی تشنگی اور ان کے صبر کا بیان کیا ہے کہ تین دن کے پیاسے ہوتے ہوئے بھی انھوں نے پانی کو ہاتھ نہیں لگایا اور مشکیزہ کا تسمہ بھی چٹکی سے پکڑا کہ کہیں پانی کی تری ہاتھ میں نہ لگ جائے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

شدت تھی تشنگی کی، پر اُف رے وفا شعار خنکی کو چھونا تک بھی سمجھتے تھے گو کہ عار
چٹکی سے تسمہ پکڑے تھے عباسؑ نامدار یہ شانِ صبر دیکھ کے الیاسؑ ذی وقار
بیتاب ہو کے دستِ جری چومنے لگے
اور خضر بھی لگا کے گلے جھومنے لگے

مرثیہ میں گوہر نے ساقی نامہ کا بھی استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد حضرت عباسؑ کی عظمت اور شجاعت کا بیان کرتے ہوئے شاعر حضرت علیؑ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب جناب عباسؑ مشکیزہ میں پانی بھر کے واپس آتے ہیں تو اشقیاء ان پر حملے کرتی ہے جس کے جواب میں حضرت عباسؑ وار کرتے ہیں، اس منظر کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ حضرت علیؑ خود لڑ رہے ہوں۔ اس کے بعد شاعر جناب عباسؑ کے تلوار کی تعریف کرتے ہیں۔ پھر جنگ کا بیان کرتے ہوئے گوہر فوجِ یزید کی ناکامی اور ان کی پشیمانی کو بہت خوبصورتی سے تحریر کیا ہے۔

پامال اپنے کشتوں کو کرتے ہوئے سوار　　گھبرا کے اب تو کر رہے ہیں جنگ سے فرار
تھرّا کے ایک ایک سے کہتا ہے بار بار　　ہم کیا کریں کہ دل کو نہیں ہے ذرا قرار
ضیغم کے نعرے سُن کے جگر منھ کو آتا ہے
گو جانتے ہیں نامِ عرب ڈوبا جاتا ہے

کہتا ہے دوسرا کہ نہیں شرم کا مقام　　سرمست ہم ہیں جن کی محبت کے پی کے جام
گویا عمل سے انکا ہمیں ہے یہ حکمِ عام　　گر جان کا ہو خوف تو اسلام کو سلام
ہم نے سند یہ خندق و خیبر سے پائی ہے
یہ بات تو بزرگوں سے ہی ہوتی آئی ہے

حضرت عباسؑ کی جنگ کے بعد حضرت عباسؑ کے شانے کٹنے ،مشکیزہ کے چھیدنے اور سر پہ گرز لگنے کے واقعات کا بھی بیان کیا ہے۔گھوڑے سے گرنے اور امام حسینؑ کا انکی لاش پہ آنے کا بیان پر درد انداز میں کیا ہے۔ پھر بھائی کی بھائی سے درد بھری گفتگو بھی تحریر کرتے ہیں جس کو سننے کے بعد سامعین اپنے آنسوں کو روک نہیں پاتے۔مرثیے میں گوہر اپنی لفظی ومعنوی خوبیوں کا بھر پور اظہار کرتے ہیں۔جس سے فکر وفن کے ہزاروں چراغ روشن ہوتے ہیں۔ان کے مرثیے کے الفاظ اور ترتیب الفاظ عام فہم ہیں۔

۵) غل یہ ہے سبطِ رسولؐ دوسرا آتے ہیں

لکھنؤ کے جدید مرثیہ نگار گوہر لکھنوی نے یہ مرثیہ رسولؐ خدا کے چھوٹے نواسے حضرت امام حسینؑ کے حال کا تحریر کیا ہے۔یہ مرثیہ اکسٹھ بندوں پر مشتمل ہے جس میں امام حسینؑ اور تمیم کی جنگ کے مناظر کو برتا گیا ہے، جو کہ کربلا کے میدان میں روزِ عاشورہ ہوئی تھی۔مرثیہ میں نیا پن یہ ہے کہ اس میں کربلا کی جنگ میں صرف دو لوگ کو آمنے سامنے لڑنے کی پوری منظرکشی کی گئی ہے۔گھوڑے اور تلوار کے بیانات کے علاوہ جنگ کے بیانات کا ایک پہلو انفرادی لڑائی بھی ہے کہ دو سپاہوں کی لڑائی میں تیسرے کی دخل اندازی نہی ہوتی تھی۔مرثیہ کے دور عروج میں جب رزمیہ عناصر کا اضافہ ہوا تو اس پہلو پر بھی توجہ کی گئی اور اسے وسعت دی گئی۔گوہر کے یہاں داد و پیچ کی تفصیل گیردار کی وضاحت اور بیان کی ہمواری ملتی ہے۔عرب کی جنگ کا یہ ایک عام قاعدہ بھی تھ۔مرثیہ کا آغاز کربلا میں امام حسینؑ کی آمد سے کیا گیا ہے۔ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ امام حسینؑ رسولؐ اکرم کو کس حد تک عزیز تھے۔دوسرے بند میں ان کے والد حضرت علیؑ کی فضیلت کا بیان تحریر ہوا ہے۔اور ساتھ ہی اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ جس کا نانا رسولؐ ہو اور جس کا باپ اس حد درجہ بہادر ہو کہ خیبر کے در کو اپنی انگلیوں سے اکھاڑ دے تو اسکا بیٹا کتنا دلیر اور بہادر ہوگا۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

غل یہ ہے سبطِ رسولؐ دوسرا آتے ہیں　　روح و جانِ تنِ محبوبؐ خدا آتے ہیں
وارثِ تیغ شہِ قلعہ کُشا آتے ہیں　　پسرِ شیرِ خدا بہر وغا آتے ہیں
غیظ اگر آگیا دنیا تہہ و بالا ہوگی
اک اشارے میں قیامت ابھی برپا ہوگی

غیظ اگر آگیا دنیا تہہ و بالا ہوگی
اک اشارے میں قیامت ابھی برپا ہوگی
اُس کے فرزند ہیں یہ جو کہ ہے قتالِ عرب خاک میں مل گیا تلوار سے جس کی مرحب
ضرب تھی نیزۂ سرتیز کی یا حق کا غضب کیوں نہ ہو شیرِ خدا آپ کا ہے ایک لقب
سینے شق کر کے کلیجوں کو بھی پھاڑا جس نے
انگلیوں سے درِ خیبر کو اکھاڑا جس نے

گوہر مرثیہ میں اس سوار یعنی گھوڑے کا بھی ذکر کرتے ہیں جس پہ سوار ہو کر وہ میدان قتال میں آتے ہیں۔ گوہر لکھنوی لکھتے ہیں کہ امام حسینؑ اس انداز سے گھوڑے پر سوار ہیں کہ ان کا مرکب اس بات کو فخر کرتا ہوا جھوم رہا ہے۔ امام حسینؑ کا رہوار اس انداز سے چل رہا تھا مانو براقِ نبوی کی رفتار ہو۔ اس کے بعد شبیرؑ کا میدان میں پہنچنے اور رجز پڑھنے کا بیان کیا گیا ہے۔ مرثیہ میں گوہر لکھنوی نے جنگ کا بیان بہت فنکاری سے ادا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب میدان جنگ میں ہر طرف خون ہی خون نظر آنے لگا اور فوج یزیدی میں بھگدڑ مچ گئی تو پسرِ سعد اپنے فوجیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو جنگ مہم کرے گا وہ جاگیر وزر پائے گا۔ جس کو سن کر لشکر سے تمیم باہر نکلا۔ جو اس قدر بہادر تھا کہ وہ جنگل سے شیر پکڑ کر لاتا تھا۔ گوہر لکھنوی نے مرثیہ میں تمیم کی تصویر کشی عمدہ انداز میں کی ہے۔ تمیم کی شخصیت کو شاعر کچھ اس انداز میں بیان کرتا ہے۔

ایسا دیکھا نہیں انسان عجیب الخلقت سروگردن ہمہ تن پیلِ دماں کی صورت
سرخ انگار اسی آنکھوں میں غضب کی ہیبت بال پھولے ہوئے داڑھی کے وہ کالی رنگت
ایک ایک بال ہواؤں میں جو لہراتا ہے
چہرہ ناری کا دھواں دھار نظر آتا ہے
بھوک سے پیاس سے ہے دھوپ میں حالت تغیر کب تلک فوجِ مخالف سے لڑو گے شبیر
کیا نہیں یاد جو بچپن میں کیا تھا تحریر کارِ امت میں مناسب نہیں اتنی تاخیر
آگیا وقت بس اب فرض ادا ہو بیٹا
میرے بدلے مری امت پہ فدا ہو بیٹا

مرثیہ میں شاعر نے امام حسینؑ اور تمیم کی جنگ کو بہت تفصیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک جنگ میں جو بھی ہتھیار استعمال ہوتے ہیں شاعر نے ان سب کا تذکرہ فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ مرثیہ میں صنائع و بدائع کا استعمال بھی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ مرثیہ کے آخر میں تمیم کی موت کے بعد آواز غیب کا بیان کیا گیا ہے جو کے رسولؐ کی آواز تھی اور یہ آواز سنتے ہی امام حسینؑ اپنی تلوار میان میں رکھ لیتے ہیں۔ گوہر آواز غیب کا بیان یوں کرتے ہیں۔

دور تک بھاگ گئی رن سے جو فوجِ گمراہ — تھم گئے ٹیک کے تلوار شہِ عرش پناہ
دفعتاً آئی یہ آواز رسولِ ذی جاہ — مرحبا اے پسرِ فاطمہؑ اے نورِ نگاہ
اب مقابل ہوں نہیں اہلِ جفا کی طاقت
تیرے ہاتھوں میں ہے سب دست خدا کی طاقت

بھوک سے پیاس سے ہے دھوپ میں حالت تغیر — کب تلک فوجِ مخالف سے لڑو گے شبیر
کیا نہیں یاد جو بچپن میں کیا تھا تحریر — کارِ امت میں مناسب نہیں اتنی تاخیر
آگیا وقت بس اب فرض ادا ہو بیٹا
میرے بدلے مری امت پہ فدا ہو بیٹا

اس مرثیہ میں گوہرلکھنوی نے بہت عمدگی سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔مرثیہ میں انھوں نے تلمیح ،استعارہ، مبالغہ اور تشبیہ کا استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ مرثیہ کی زبان صاف اور سادہ ہے۔

☆ گوہرلکھنوی کی مرثیہ نگاری :

گوہرلکھنوی کا تعلق انیسؔ وشدیدؔ سے ہے تو ظاہر ہے کہ ان کو مرثیہ نگاری وراثت میں ملی ہے۔اور ایسے خاندان سے ملی ہے جس نے مرثیہ نگاری کو عروج پر پہنچا دیا۔گوہرلکھنوی نے چونکہ اپنے مرثیہ کی اصلاح بھی شدیدؔ سے ہی کیا کرتے تھے اس لئے ان کے کلام میں وہ ساری خصوصیت موجود ہے جو شدیدؔ کے مرثیوں میں ملتی ہے۔واقعات کربلا کے مختصر دائرے میں گوہرلکھنوی نے کرداروں کے باہمی میل جول اور مختلف اوقات میں ان کر مختلف جذباتی ردِعمل کی عکاسی کر کے اس میں وسعت پیدا کی ہے۔محدود فضا،محدود وقت اور محدود واقعات میں بھی گوہر نے مختلف لوگوں کے مزاج کے اعتبار سے نفسیات انسانی کے بہت سے باریک پہلو بے نقاب کئے ہیں اگر چہ سبھی مرثیہ گو کا موضوع وہی واقعات اور کردار ہیں لیکن گوہر نے ان مشترک ومعروف واقعات میں ایسے نفسیاتی رخ اور موڑ پیدا کئے جو کہ ان کرداروں کے جذبات و احساسات زندگی سے قریب اور واقعات سے بھر پور نظر آتے ہیں۔ان کے اپنے کلام میں فصاحت وسلاست کے ساتھ ساتھ بلاغت وندرت کی کہیں کمی نظر نہیں آنے دی۔اس میں شک نہیں کہ گوہر ذہین شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی یہ ذہانت مرثیوں میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

موضوع۔اپنے ان پانچوں مرثیے میں گوہرلکھنوی نے الگ الگ موضوع تحریر کئے ہیں۔دو مراثی میں امام حسینؑ ،ایک میں حضرت عباسؑ ،ایک میں کربلا کی سرزمین پہ وارد ہونے اور ایک میں امام حسینؑ اور تمیم کی جنگ موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے ایک باپ اور بیٹی کے جذبات کو موضوع بنا کر سامعین کے سامنے پیش کیا ہے۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

کہہ کے یہ آئے قریں فاطمہ صغرا کے امام — کانپتے ہاتھوں سے بیٹی نے کیا اُٹھ کے سلام

بولے چھاتی سے لگا کے یہ شہ عرش مقام بیٹھو بیٹھو کہ بدن ضعف سے لرزاں ہے تمام

جو مقدر میں ہے بیٹی وہ نہیں ٹلتا ہے
تپ سے تم جلتی ہو غم سے مرا دل جلتا ہے

مجھکو حضرت کی محبت سے تعجب ہے مگر رات سے آپنے پوچھی بھی نہ صغرا کی خبر
شہؑ نے فرمایا کہ سچ کہتی ہو اے جان پدر خبر اپنی نہیں شب سے ہے یہ تشویشِ سفر

ہیں وہ ہمراہ جو نازوں کے پلے ہیں صغراؑ
دیکھو کس گرمی میں ہم گھر سے چلے ہیں صغراؑ

باپ اور بیٹی کے یہ جذبات سامعین کی آنکھوں میں آنسوں لانے کے لئے کافی ہیں۔باپ اور بیٹی کے یہ جذبات انیسؔ کے مرثیوں میں بھی ملتے ہیں۔انیسؔ کے مرثیہ کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

صغراؑ نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار سب کی یہی مرضی ہے کہ مرجائے یہ بیمار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار ایک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب کے ہیں غمخوار

بھولے سے نہ اب خاطر ناشاد کریں گے
ہم قبر میں جب ہونگے تو سب یاد کریں گے

ان دنوں بندوں میں فصاحت وبلاغت موجود ہے۔اس کے علاوہ دونوں کی زبان میں بھی یکسانیت نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ گوہر نے ایک رزمیہ مرثیہ کو بھی موضوع بنایا ہے جس میں انھوں نے دولوگوں کی جنگ کو بڑے ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔اس مرثیہ میں انھوں نے کربلا کے میدان میں ہونے والی تمیم اورامام حسینؑ کی جنگ کی تصویر کشی کو حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔اس میں انھوں نے تمیم کے رجز اوراس کی شخصیت کو بھی بیان کیا ہے جو کہ شاید ہی کسی مرثیہ میں تحریر کیا گیا ہوگا۔تمیم کی شخصیت کا بیان انھوں نے یوں کیا ہے۔

ڈال دے یہ نظر گرم تو جل جائے پہاڑ باغ عالم کو کرے تند نگاہوں سے اجاڑ
ضربت مشت سے ہو کوہ سے سینے میں ڈراڑ صاف درہائے جہنم ہیں کہ چھاتی کے کنواڑ

ذرے لو دیتے ہیں پڑتا ہے جو سایہ اس کا
بھاپ سے منھ کی سیہ فام ہے چہرہ اس کا

اسلوب۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے اس کے ذریعہ سے ہی کسی شاعر یا فن کار کی شناخت ہوتی ہے۔اسلوب کے سلسلے میں زیادہ تر اثر شدیدؔ کا لیا ہے اس کے علاوہ اس میں انیسؔ کے اسلوب کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔جس سے ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت کا حسین امتزاج پیدا ہو گیا ہے۔نفاست،سلیقہ،تناسب وتوزن معاشرت کا بنیادی جز ہے۔یہی خوبیاں گوہر کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔ان کے کلام کی فصاحت صرف الفاظ کی ہمواری اورصوتی

مناسبت تک محدود نہیں بلکہ معنوی توازن وتناسب بھی پایا جاتا ہے۔مثلاً میدان کربلا میں جنگ کے وقت بجنے والے باجے کا بیان انھوں نے عمدہ انداز میں کیا ہے۔

نعروں سے ہل رہی تھی زمیں رن کی ہر طرف　　تھا ہمہمہ کہ ہمہمۂ ضیغمِ نجف
خاموش تھے لڑائی کے باجے میان صف　　تھا رعب شاہؑ ، بندی تھی آوازِ جنگ ودف
انواز کون سا گنگ اور خم نہ تھا
دہلی ہوئی دبل تھی تو قرنا میں دم نہ تھا

چل پھر سے اس کی ہوش سواروں کے بھی ہیں گم　　اڑتا ہے جب تو ان کے سر آتے ہیں زیرِ سُم
گردن اٹھی ہے یال ہے برہم چنور ہے دم　　صحہ یہ ہے کہ روک سکو گے نہ مجھ کو تم
دعویٰ ہے ہر قدم کہ ذرا بڑھ کے روک لو
بجلی اگر رکی ہے تو مجھ کو بھی روک لو

یہاں انھوں نے جنگ میں گھوڑے کی جتنی بھی حرکات کرتے ہیں ان سب کا بیان بڑی فنکاری سے ادا کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ مرثیہ میں تشبیہات واستعارات، تلمیح، مبالغہ اور محاوروں کا استعمال بھی ہنرمندی سے کیا ہے۔

تلوار کی تعریف۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میدان جنگ میں تلوار کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔بلا تلوار کسی انسان کا سپاہی ہونا بعید از عقل تصور کیا جاتا ہے۔چنانچہ تلوار اور اس کی کاٹ کا تذکرہ تو تقریباً مرثیہ گو کے یہاں ملتا ہے۔گوہر نے بھی مرثیہ میں تلوار کی تعریف کچھ اس انداز سے کی ہے۔ملاحظہ ہو۔

دو کرکے گاہ ساعد و بازو نکل گئی　　گہ پہلواں کے کاٹ کے پہلو نکل گئی
جب چاک کرکے سینۂ بدخوں نکل گئی　　مجروح ہوکے روحِ جفا جو نکل گئی
دشمن تھی کافروں کی بھی، اہلِ حسد کی بھی
درپے تھی جان کی بھی ،عدو کے جسد کی بھی

گھوڑے کی تعریف۔ جہاں میدان جنگ میں تلوار کی اہمیت ہوتی ہے، وہی گھوڑا بھی اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔میدان جنگ میں گھوڑا سپاہی کے لئے اس کا رفیق اور مونس ہوتا ہے۔اور اس کی شجاعت کا نقیب بھی۔اگر عرب کی جنگ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ عربی گھوڑے ہر جگہ اپنی چستی پھرتی کی بنا پر مشہور ہیں۔گوہر لکھنوی نے بھی مرثیے میں عربی گھوڑے کی چستی پھرتی کا بیان کرتے ہیں۔ملاحظہ ہوں۔

جاتا ہے سر اٹھائے ہوئے دُم چنور کئے　　طاؤس جیسے جائے بلند اپنے پر کئے
ہے جس طرف سپاہ یہ ہے رخ ادھر کئے　　آقا کے ہے بچانے کو سینہ سپر کئے
غازی ہے تیز ہوش ہے جرأت شعار ہے

رن پر چڑھا ہوا ہے یہ وہ راہوار ہے

ساقی نامہ۔ مرثیہ میں ساقی نامہ کا استعمال گوہرلکھنوی نے اپنے نانا شدیدؔ سے ہی سیکھا ہے۔ان کے ساقی نامہ کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

وہ عطاء ہو شریعت میں جو ہے پاک وحلال　　سرخ ہو رنگ میں جو خونِ کبوتر کی مثال
ساقیا لطف وعطا میں رہے اس دم یہ خیال　　نشہ اتنا تو چڑھے آنکھوں کے ڈورے بھی ہوں لال
چشمِ مست اور بھی رنگینیاں دکھلانے لگے
رنگ یوں پھوٹے کہ رگ رگ سے نظر آنے

جذبات نگاری۔ مرثیہ نگاری میں جذبات نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ یہ انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے اس لئے مرثیہ میں جذبات نگاری کو اس انداز سے بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سامعین جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے آنسوں کو روک نہ سکے۔اور یہی مقام ہے جس کے سبب مجلس کامیاب ہوتی ہے۔عزیزوں،دوستوں اور گود کے پالوں کو آنکھوں کے سامنے شہید ہوتا دیکھ کر متاثر ہونا فطری بات ہے۔آہ و نالہ کرنا آنسوں بہانا بھی فطری ہے۔مرثیوں میں انہیں کیفیت کو پیش کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے صابر ایسے سانحہ کو دیکھ کر رونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی فطری ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ مرقیق القلب ہوتی ہیں اور نسبتہً زیادہ آہ وزاری کرنا ان کی فطرت اور ماحول کے مطابق ہوتا ہے۔لیکن رونے رلانے کے عنصر کو بہت زیادہ بڑھانے سے مرثیہ کی منضبط اکائی مجروح ہو جاتی ہے۔گوہر لکھنوی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے جذباتی کیفیت کو اعتدال کے ساتھ پیش کیا ہے۔رونے اور آنسوں بہانے والے جذبات کو حد سے زیادہ بڑھنے روکا ہے۔انھوں نے جذبات نگاری کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔ایک بھتیجی کے لیے چچا کے دل میں جو جذبات ہیں اس کا بیان دیکھئے۔

کی عرض آرزو ہے میری شاہِ حق شناس　　ہوگی سکینہؑ خیمہ کے در پر لگائے آس
شرمندہ ہوں بجھا نہ سکا آہ اسکی پیاس　　دیکھے گی میری لاش تو ہوگا اُسے ہراس
مولا وہ مضطرب ہے خبر اس کی لیجئے
کیا منھ دکھاؤں، مجھ کو یہیں چھوڑ دیجئے

فرمایا شہ نے تم سے کہوں کیا میں اُس کا حال　　آنسوں رواں ہیں آنکھوں سے دل میں یہ ہے خیال
وہ وعدہ کرکے رن میں گئے ہیں پئے جدال　　پانی ضرور لائیں گے عباسؑ خوش خصال
باقی جو تاب ضبط نہیں قلبِ زار میں
در پر کھڑی ہے کوزہ لئے انتظار میں

گوہرلکھنوی کے مرثیے کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام میں فکری عنصر اور فن علیٰ درجہ کا ہے۔ان میں گہرائی اور گیرائی بھی ہے اور تغزل کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔منظر کشی،مکالمہ نگاری،جذبات نگاری اور واقعات نگاری کے بیان میں خوش اسلوبی،سادگی اور برجستگی موجود ہے۔گوہر کی مرثیہ نگاری میں کہیں کہیں انیسؔ کا رنگ بھی جھلکتا دیکھائی دیتا ہے۔

(۴) باقرمحسن۔

مرثیہ نگاری کی دنیا میں باقرمحسن بھی ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔جدید مرثیہ نگاری میں باقرمحسن نے نئے تجربے کر کے اس کو وسعت بخشی ہے۔ان کی پیدائش ۱۴مارچ ۱۹۵۶ء کو حیدرآباد کے ایک معزز خاندان میں ہوئی تھی۔ان کے والد کا نام سید انصار مہدی رضوی تھا جنکا تعلق زید پور سے تھا۔نوکری کے سلسہ میں یہ حیدرآباد آئے اور یہیں رہ گئے۔والدہ سیدہ ثریا بانو رضوی ذی وقار خاتون تھی۔

باقرمحسن چونکہ بچپن سے ہی بہت ذہین تھے،انھوں نے بچپن سے ہی اشعار کہنے شروع کر دئے تھے لیکن شاعری کا باقاعدی سے آغاز ۱۶ سال یعنی ۱۹۷۲ء سے کیا۔اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد یہ صحافت کی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔روزنامہ،منصف،سہارہ جیسے اخبار سے یہ جڑے اور نام بھی کمایا۔اپنی شاعری کے بیت کی اصلاح کے لئے انھوں نے ''حضرت عادل نجمی''اور ان کے بعد''حضرت عازم رضوی'' کی شاگردی اختیار کی،یہ دونوں''نجم آفندی'' کے شاگرد تھے۔

باقرمحسن اپنی شاعری کی ابتداء غزل سے کی اور اردو کے علاوہ انھوں نے ہندی میں بھی غزل لکھی ہے۔غزل کے علاوہ انھوں نے نعت،حمد،رباعی،جدید نظم،مسدس،مثنوی،منقبت،قصیدہ اور مرثیہ جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔نظموں میں یہ ایک سطری،دوسطری اور سہ سطری نظمیں بھی کہیں ہیں۔مرثیہ کی بات کریں تو انھوں نے اب تک ۱۲ مرثیوں کی تخلیق کی ہے جن میں سے صرف تین ہی شائع ہوئے ہیں۔یہ مرثیے کم ہونے کے باوجود مرثیہ نگاری کی دنیا میں اپنا علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔

کربلائے تشنگی

یہ مرثیہ باقرمحسن کا پہلا مرثیہ ہے۔جس کو انھوں نے ۶۷ بندوں میں ترتیب دیا ہے۔اس مرثیہ میں تشنگی جیسے اہم لیکن انوکھے موضوع کو منتخب کیا گیا ہے۔یہ تشنگی دراصل فتح کا استعارہ ہے۔مرثیہ کی تمہید میں باقرمحسن تشنگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ سانحۂ کربلا سے پہلے تشنگی کا کوئی وجود ہی نہیں۔تشنگی کو اہمیت دلائی تو کربلا والوں نے۔وہ لکھتے ہیں کہ کربلا سے پہلے تشنگی کی کوئی عزت واہمیت نہ تھی۔آغاز کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

تشنگی پہلے کبھی واجب تعظیم نہ تھی　　جزو فطرت تھی مگر لائق تکریم نہ تھی
مدح کے باب میں وہ قابلِ ترقیم نہ تھی　　تھی اک احساس فقط، درد کی اقلیم نہ تھی

تشنگی کچھ نہ تھی کرب و بلا سے پہلے
ربطِ لب ہائے شہیدانِ جفا سے پہلے

آگے کے بندوں میں باقر محسن لکھتے ہیں کہ تشنگی کو کربلا میں امام حسینؑ کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا گیا تھا۔تشنگی کربلا میں امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کا امتحان لینے کے لئے آئی تھی جس کو امام حسینؑ نے اللہ کی مرضی سمجھ کر قبول کیا اور یہ دکھلا دیا کہ خدا والے کسی بھی امتحان سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔تشنگی جب شبیرؑ کی خدمت میں آئی تو اسکو عظمت ملی۔اس سے پہلے تشنگی صرف ایک احساس تھا اسکو شبیرؑ نے جلا بخشی۔باقر محسن آگے کے بندوں میں تشنگی کو حضرت علی اکبرؑ کی اذان سے تشبیہ دیتے ہیں۔تشنگی کو بیان کرنے کے لئے شاعر نے اپنی فنکاری کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

تشنگی ظلم کے ماحول میں اکبرؑ کی اذاں بے زباں اصغرؑ بے شیر کے جذبے کی زباں
قلب سرور میں نہاں چہرۂ سرورؑ سے عیاں بن کے سجدوں کا اثر خاکِ شفا میں پنہاں
تشنگی جذبۂ ایثار کی سترنگی دھنک
تشنگی ہمت پیکار کی پاکیزہ چمک

تشنگی غربت شبیرؑ کی عینی شاہد حُرؑ کی تبدیلیِ تقدیر کی عینی شاہد
جرأت اصغرؑ بے شیر کی کی عینی شاہد ہمت ِ زینبؑ دلگیر کی عینی شاہد
گیسوئے بنتِ پیمبرؐ کو بکھرتے دیکھا
کربلا میں رخ ایمان کو نکھرتے دیکھا

باقر محسن نے رخصت کے بندوں کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔اس میں امام حسینؑ کا خیمہ میں بیبیوں سے رخصت آخر کے لئے آنا اور ایک ایک بی بی سے اجازت طلب کرنے ،حضرت زینبؑ کو ہدایت کرنے ، بیٹے سید سجادؑ کو ملنے کے بیان کو جذبات نگاری کے انداز میں تحریر کیا ہے۔ان مرثیوں میں سطحیت نہیں بلکہ نفسیاتِ انسانی کی قابل ذکر تصویریں ہیں اور معاشرت کا نقشہ بھی۔جب حضرت امام حسینؑ بی بیوں سے رخصت ہوکر گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے آئے تو ان کو وہ وقت یاد آ گیا کہ جب بھی وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے ان کو حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ بازو پکڑ کر سوار کراتے تھے اور آج وہ شہید ہوکر کربلا کے مقتل میں سو رہے ہیں، آج ان کو کوئی سوار کرنے والا نہیں ہے۔ بھائی کی مظلومی کو دیکھ کر بہن زینبؑ خیمہ سے نکل پڑی اور بھائی کو شانہ پکڑ کر سوار کرایا۔یہ وہ واقعہ ہے کہ جس کے بیان سے ہی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔بند دیکھئے۔

سب سے رخصت ہوئے اور نذد فرس آئے حسین یاد آئے کبھی اصحاب کبھی نورالعین
اک قیامت تھی بپا قلب و جگر کے مابین نہر کی سمت نظر اٹھی ہوا دل بے چین
یاد بھائی کی جو آئی تو جگر خون ہوا
غم میں عباسؑ کے، دل بارِ دگر خون ہوا

سن کے سرورؑ کی صدا، دوڑتی آئی زینبؑ پہنچی شبیرؑ کی ماں جائی قریب مرکب
دیکھا حسرت سے سراپائے شہنشاہ عرب بولی قسمت سے ملا بھائی مجھے یہ منصب
فرض ادا مثلِ علمدار کرے گی زینبؑ
آپ کو گھوڑے پہ اسوار کرے گی زینبؑ

شاعر نے مرثیہ میں اس وقت کا بیان بھی کیا ہے جب امام حسینؑ کے گھوڑے کی سُم سے لپٹ کر ان کی چھوٹی بیٹی حضرت سکینہؑ گھوڑے سے بابا کو مقتل میں نہ لے جانے کے لئے فریاد کرتی ہیں۔ یہی وہ عناصر ہوتے ہیں جنکے بیان میں شاعر اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرتا ہے اور سامعین کو گریہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ دیکھئے یہ بند۔

چشم خونبار سے سرورؑ نے یہ دیکھا منظر پاؤں سے گھوڑے کی لپٹی ہے چہیتی دختر
چشم حسّاس میں ضو بار ہیں اشکوں کے قمر دیکھی بیٹی کی یہ حالت تو بڑھا سوزِ جگر
دل میں اک ٹیس اٹھی رونے لگے شاہِ اُمم
ننھی شہزادی کے نزدیک گئے شاہِ امم

پوچھا بیٹی کہو بات ہے کچھ کہنا ہے جوڑ کر ہاتھوں کو بولی یہ خیال آتا ہے
صبح سے جو گیا رن کو وہ نہیں آتا ہے آپ بھی لوٹ کے آئیں گے بھروسہ کیا ہے
آخری بار مجھے سینے پہ سونے دیجے
آپ کے بعد جو قسمت میں ہے ہونے دیجئے

باقر محسن نے مرثیہ میں ہر اجزاء کو بڑی تفصیلی سے ساتھ بیان کیا ہے۔ چاہے وہ رخصت کے بند ہوں، رجز ہو، گھوڑے و تلوار کی تعریف ہو، جنگ ہو یا شہادت، ان سبھی اجزاء میں انھوں نے اپنی فنکاری کے رنگ کو بھرپور طور پر پیش کیا ہے۔ مرثیہ میں انھوں نے موازنہ کے رنگ کو بھی تحریر کیا ہے۔ یہاں انھوں نے رسولؐ خدا کی سواری براق اور امام حسینؑ کی سواری دلدل میں موازنہ پیش کیا ہے۔ جنگ کے مناظر کی بھی باقر محسن نے ڈرامائی انداز میں منظر کشی کی ہے۔ وہ دو کرداروں کے انداز گفتگو میں ان کی گہری محبت، وقت کی نزاکت کا احساس، معاملہ فہمی سب پہلو مدّ نظر رکھتے ہیں۔ زبان میں بے تکلفی اور روانی ہے۔ شہادت اور بین میں بھی ان کا کارنامہ صاف نظر آتا ہے۔

جب کٹا ظلم کے خنجر سے سر شاہِ زمن آندھیاں چلنے لگیں اور ہوا سورج کو گہن
جانور تک ہوئے مصروف بکا و شیون چہرۂ کفر پرستی پہ ابھر آئی تھکن
دینِ اسلام نے کونین میں عزّت پائی
دے کے سر شاہ نے معراجِ شہادت پائی

شاعر نے مرثیہ میں ساقی نامہ کا بیان آخر میں یعنی بین کے بعد اور دعا سے پہلے کیا ہے۔ اس کے بعد وہ انسانیت کو درس دینے والے کچھ بند تحریر کرتے ہیں۔ 'جان رسکن' آرٹ کے اخلاقی پہلو کا بڑا مبلّغ تھا اس کے نزدیک فنون لطیفہ کی

غایت یہ ہونا چاہئے کہ وہ ماضی کی اچھائیوں اور بلندیوں اور موجودہ حیات انسانی کی خوبیوں کواور حسن کوعیاں کر کے ان کی تعلیم دیں باقر محسن کے مرثیوں میں اخلاق کا یہی پہلو نمایاں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب بھی کبھی انسان ظلم سے پریشان ہو جائے تو اسکو امام حسینؑ کو یاد کر لینا چاہئے کہ یہ وہ شخصیت ہے کہ جس نے ایک ہی دن میں اپنے بھرے گھر کو اجڑتے دیکھا ہے، بھائی اور بیٹوں کا لاشہ خود اپنے ہاتھوں سے اُٹھایا ہے اور ان مظلومی کے عالم میں آخر میں اس نے شہادت بھی پائی ہے۔ مرثیہ کے آخر میں باقر محسن دعایہ بند لکھتے ہوئے کربلا کی زیارت کی دعا کرتے ہیں۔اس مرثیہ میں تشبیہ، استعارہ، موازنہ اور تلمیح کا بیان خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ مرثیہ کی زبان صاف اور عام فہم زبان ہے۔ مرثیہ کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر سید مجاور حسین رضوی لکھتے ہیں۔

> ''کربلائے تشنگی میں اگر عنوان ہے، ہر بند کے پس منظر میں تشنہ لبی کا صحرا ملتا ہے تو مرثیے کی جو کلاسکی روایت ہے اس کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے مسدس کا ہی فارم اختیار کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اپنی فکر اور اپنے شعری رویّے کی انفرادیت کو برقرار رکھیں۔'' ۳۹

شہدِ شہادت

''کلُّ نفسٍ ذَآئقۃُ الموت'' یعنی ہر نفس کو موت کا مزا چکھنا ہے۔ یہی وہ موضوع ہے جس پر باقر محسن نے اپنا مرثیہ تحریر کیا ہے۔ ۶۹ بندوں میں مشتمل یہ مرثیہ حضرت قاسمؑ کے حال پر تحریر کیا گیا ہے۔ مرثیہ میں موت کو چہرہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ باقر محسن نے مرثیہ میں موت کا تعارف بہت اچھے ڈھنگ سے سمجھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ موت ہی دنیا میں وہ واحد شئے ہے جس پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ یہ وہ شئے ہے جس نے کسی کو بھی اپنے چنگل سے نہیں چھوڑا۔ باقر محسن مرثیہ کا آغاز تعارفی انداز میں کرتے ہیں، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ مرثیہ حضرت قاسمؑ کے حال کا لکھا جا رہا ہے جسے موت شہد سے بھی زیادہ شیریں لگتی ہے۔ مرثیہ کا تمہیدی بند ملاحظہ ہو۔

لو مرثیہ سناتا ہو قاسم کے حال کا　　دلبندِ شاہ صلح کا فرواٗ کے لال کا
بے باک سورما کا شجاعت خصال کا　　یا یوں کہوں کہ چرخِ وغا کے ہلال کا
نوشاہِ شہرِ عشق کے سہرے کے واسطے
عنواں چُنا ہے موت کا چہرے کے واسطے

وہ شئے ہے موت جس سے کسی کو مفر نہیں　　پہنچی نہیں جہاں یہ کوئی ایسا گھر نہیں
مسرور اس کے آنے پہ کوئی بشر نہیں　　اس سے بچاؤ کی کوئی صورت مگر نہیں
بے وقت چاہے کچھ بھی ہو آتی نہیں ہے یہ
اور آ گئی سرہانے تو جاتی نہیں ہے یہ

باقر محسن لکھتے ہیں کہ موت پر کسی طاقت ور یا زوردار شخص کا زور نہیں چلتا، یہ جسے چاہتی ہے اسے اسکی سانسوں

سے جدا کر دیتی ہے۔ یہ بلا کسی فرق کے ہر نفس پر قابض ہو جاتی ہے۔شاعر تلمیح کا استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ موت نے رستم جیسے پہلوان سے بھی اس کی سانسیں چھین کر اس کو قبر کے کونے میں ڈال دیا ہے۔ یہ کسی پر بھی ترس نہیں کھاتی اور ہر کسی کے اپنے پنجے میں جکڑ ہی لیتی ہے۔اس کے بعد شاعر مومن اور منافق کی موت میں فرق بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ جب کسی مومن کو موت آتی ہے تو وہ ایک الگ ہی روپ میں آتی ہے۔ وہ اس مومن سے اس کی روح قبض کرنے کی اجازت طلب کرتی ہے اور بنا تکلیف کے روح ایسے نکالتی ہے جیسے پھول سے خوشبو نکل جاتی ہے۔اور جب یہ موت کسی منافق کو آتی ہے تو وہ اسے اتنی اذیت دیتی ہے جیسے کہ کسی خاردار درخت پر کپڑا ڈال کر کھینچ لیا جائے۔مومن کی موت کا خلاصہ باقر محسن کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

مومن کی موت نازشِ اقدار زندگی چرخِ بقاء پہ طالع بیدار زندگی
ردّ فنا ہے طرّۂ دستارِ زندگی بد لیں نہ بعد مرگ بھی اطوار زندگی
عام آدمی نہیں علیؑ والا کچھ اور ہے
مر کے بھی رزق پاتا ہے یہ اسکا طور ہے

موت کیا ہے اور اس کا ذائقہ کیسا ہے اس بات کو واضح کرنے کے لئے شاعر حضرت قاسمؑ کا ذکر کرتے ہیں جس کو کربلا کے سلگتے بن میں بھی موت شہد سے زیادہ شیرین لگتی ہے۔آگے کے بند میں باقر محسن اس وقت کا بیان کرتے ہیں جب کربلا میں امام حسینؑ کے انصار و اقرباء شہادت کا جام پی چکے ہیں۔حضرت قاسمؑ بار بار چچا سے اذن وغا مانگتے ہیں لیکن امام حسینؑ اپنے بھائی حسنؑ کی اس نشانی کو جنگ کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔قاسمؑ پریشان ہیں کہ اجازت کیسے حاصل کی جائے،تب ان کو یہ خیال آتا ہے کہ ان کے والد امام حسنؑ نے وقت شہادت ان کے بازوں میں ایک تعویز باندھی تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ جب بھی کوئی سخت وقت آئے تو اسے کھول کر پڑھ لینا۔قاسمؑ اس تعویز کی شبیرؑ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جس میں امام حسینؑ کے نام ایک خط ہے۔اس خط کا بیان باقر محسن نے بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔ یہ بند دیکھئے۔

تعویز اپنا کھول کے قاسمؑ نے جب پڑھا سرورؑ کے نام اس میں یہ لکھا ہوا ملا
فرواؑ کے دل کا چین نمائندہ ہے مرا جب کربلا میں ظلم و ستم کا ہو سامنا
اکبرؑ سے پہلے بھیجنا فرزند کو مرے
دے دینا اذن جنگ کا دلبند کو مرے
تعویز لے کے خدمتِ شہؑ میں گیا جری تحریر پڑھ کے بھائی کی سرورؑ نے آہ کی
بولے ملے گی خاک میں صورت یہ پھول سی یہ کہہ کے شاہزادے کی پیشانی چوم کی
اب کیا کروں ہے نامے میں تحریر بھیج دوں
مٹنے کو اپنے بھائی کی تصویر بھیج دوں

دکن کے ادبی مزاج اور عزاداری میں انہماک نے مرثیہ کو وسعت کی طرف مائل کیا اور اس کا ایک ڈھانچہ مقرر ہوا۔تحت اللفظ خوانی کے رواج نے لمبے مرثیوں کے لئے راستہ نکالا۔واقعات تفصیل سے بیان ہونے لگے،سامعین کے مزاج سخن کے اعتبار سے ادبی محاسن اور ادبی شاعرانہ نزاکتیں پیدا کی جانے لگیں۔باقر محسن کے مرثیے ان ہی خوبیوں سے مالا مال ہیں ۔ایک بھائی کی تحریر دوسرے بھائی کے نام ہے جس میں اپنے ہی نورِ نظر کی موت کی اجازت طلب کی گئی ہے۔اس بیان کو سننے کے بعد کوئی بھی بھائی اپنے آنسوں نہیں روک پائیگا۔اس کے بعد حضرت قاسمؑ کے بیاہ کا بیان بھی ملتا ہے۔اس کے بعد قاسمؑ کی میدان وغا میں جانے کے لیے اماں اور نئی دلہن سے رخصت کا بیان بہت جذباتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔مرثیہ میں رخصت کا بند اس طرح تحریر کیا گیا ہے۔

قاسمؑ پلٹ کے ماں سے یہ بولے کہ اب نہ رؤ   ثابت قدم رہوں میں بس اب یہ دعا کرو
کیوں بیقرار ہوتی ہو ہمت سے کام لو   دل کو قرار آئے گا نادِعلی پڑھو
کبراؑ سے بولے چھٹتا ہے اب ساتھ الوداع
جنت میں ہوگی تم سے ملاقات الوداع

مرثیہ میں باقر محسن نے تمام اجزاء کا بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ مضمون آفرینی،مناظر اور واقعات کے بیان میں تسلسل کے ساتھ ایک اندرونی ربط اور گہرائی بھی موجود ہے۔جذبات نگاری کی طرف توجہ دی اور رخصت اور شہادت میں نفسیاتی ردّعمل پیش کیا ہے۔باقر محسن نے مرثیہ میں حضرت قاسمؑ کی میدان جنگ میں آمد کو ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔حضرت قاسمؑ کی جنگ اور خاص کر ارزق شامی اور اسکے بیٹے کے ساتھ قاسمؑ کی جنگ کو بڑے موثر انداز میں تحریر کیا ہے۔مرثیہ میں حضرت قاسمؑ کی شہادت اور انکے پامال ہونے کی منظر کشی دردناک انداز میں بیان کی گئی ہے۔قاسمؑ کے پامال ہو جانے کے بعد جب سرورؑ ان کی لاش کی ٹکڑے اٹھانے آتے ہیں،اس وقت کی تصویر کشی ملاحظہ ہو۔

پہنچے جری کے لاشے پہ جب شاہِ ممکنات   عباسؑ اور اکبرِ مہرو تھے ساتھ سات
محشر سموئے خود میں ملی جائے واردات   تیورا گئے یہ دیکھ کے شبیرؑ خوش صفات
نوشاہ کے لباس کے پرزے تھے جا نجا
ابنِ حسنؑ کی لاش کے ٹکڑے تھے جانجا
سر کو پکڑ کے بیٹھ گئے شاہِؑ مشرقین   اعضائے جسم چننے لگے اٹھ کے پھر حسین
باندھے عبا میں لاش کے ٹکڑے یہ کر کے بین   رخصت ہوئی حسنؑ کے گلستاں کے زیب وزین
خیمے میں پہنچے لاشۂ قاسمؑ لئے ہوئے
روتے تھے پھوٹ پھوٹ کے سرخم کئے ہوئے

مرثیہ میں بین کے بند بھی بہت پر اثر انداز میں لکھے گئے ہیں۔مرثیہ کی زبان صاف اور سادہ ہے۔مرثیہ میں صنائع وبدائع کا استعمال بڑی فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔مرثیہ روایتی انداز میں لکھا گیا ہے۔

دجلۂ وِلا

باقرمحسن کا اکسٹھ (۶۱) بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ تیسرا ہے۔یوں تو انھوں نے ۱۲ مرثیوں کی تخلیق کی ہے لیکن اس میں صرف تین ہی مطبوعہ ہیں۔ان مرثیوں میں انھوں نے قدرت کلام اور زورطبیعت اور شاعرانہ نزاتوں کے نمونے دکھائے ہیں۔''دجۂ ولا'' ان کا تیسرا مرثیہ ہے۔مرثیہ کا موضوع ''دجلہ'' کو بنایا گیا ہے۔دجلہ کربلا کی وہ نہر ہے جس کو کئی ناموں سے جانا جاتا ہے، مثلاً علقمہ، فرات وغیرہ۔مرثیہ کا چہرہ حضرت عباسؑ کو بنایا گیا ہے، جب کی وجہ حضرت عباسؑ کی نہرفرات سے وِلا ہے۔اور یہی وہ نہر ہے کہ جس کے کنارے ان کے شانے کٹنے کے بعد ان کو شہادت ملی۔یہی وہ نہر ہے جہاں یہ پانی لانے گئے تھے اور اس پانی کو بچانے کی کوشش میں ان کو اپنے دونوں بازوں کے ساتھ ساتھ اپنی جان بھی گنوانی پڑی۔شاعر نے مرثیہ کی تمہید مدح سے باندھی ہے۔اور لکھتے ہیں کہ مدح سانی کوئی آسان نہیں ہے اس میں لفظوں کے منتخب کردہ گوہر پرونے پڑتے ہیں، تب کہیں جا کر مدح معصومؑ ہو پاتی ہے۔مدح کے سلسلے میں یہ بند ملاحظہ ہو۔

مدح ایسی ہو طبیعت میں روانی آئے مدح کے فیض سے لفظوں پہ جوانی آئے
مدح سے لطفِ زبانی و بیانی آئے چاہے مدح تو کوثر سے بھی پانی آئے
نخل طوبائے تخیل پہ بہار آ جائے
فکرِ مداح پہ خالق کو بھی پیار آ جائے

خالقِ لفظ و بیاں کرتا ہے تائیدِ ثناء سورۂ حمد کی توجیح ہے تمہید ثناء
وحدتِ فکر کی عکاس ہے توحید ثناء پاک طینت سے ہی ہو سکتی ہے امیدِ ثناء
مدح گوئی ہے ہنر کھیل نہیں حرفوں کا
دخل اس میں نہیں بے اصلوں کا کم ظرفوں کا

مدح کو بیان کرتے ہوئے باقرمحسن قرآن شریف کی سورۂ حمد کا ذکر کرتے ہیں جس کے معنی بھی مدح کے ہیں۔ اس سورۂ میں بہت عمدگی سے اللہ کی تعریف اور حمد وثناء کی گئی ہے۔آگے کے بندوں میں وہ نہر دجلہ کی مدح کے ساتھ حضرت عباسؑ کی مدح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مولا عباسؑ کی حمد وثناء کرنا ایک عبادت ہے۔حضرت عباسؑ کی مدح کا شرف کعبہ، نجف اور فردوس کی عظمت جیسا ہے۔مدح وثناء کی تشبیہ شاعر اس پانی سے کرتا ہے جس کی اہمیت ایک پیاسہ ہی سمجھ سکتا ہے۔پھر باقرمحسن حضرت عباسؑ کی مدح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب یہ دنیا میں آئے اور پہلی بار اپنی آنکھیں کھولی تو سب سے پہلے حضرت شبّیر کے چہرے کی زیارت کی۔امِ کلثوم کی آغوش میں یہ کھیلے ہیں اور حضرت زینبؑ اور حضرت امام حسینؑ کی محبت میں پلے ہیں۔حضرت عباسؑ کی مولا علیؑ اور امام حسینؑ کی زندگی میں جو اہمیت تھی اس کا بیان شاعر کچھ اس انداز سے کرتا ہے۔

مدح کا لفظوں نہ ہونٹوں سے بیاں ممکن ہے مدحتِ دستِ یداللہ کہاں ممکن ہے
ہو مدح شاہِ ولایت کی کہاں ممکن ہے بعد امداد کھلے میری زباں ممکن ہے
باپ کے دل میں تھے عباسؑ تمنا بن کر
ساتھ سرورؑ کے رہے دھوپ میں سایہ بن کر

دین اسلام کا صورت گر قسمت عباس نازشِ حرف وفا پیکر الفت عباسؑ
بیکس و تشنہ دہن بھائی کی ہمت عباس مرکزِ نورِ یقیں شمعِ صداقت عباس
باپ نے کی جو وصیت وہ بھلائی نہ گئی
جسم سے جان گئی وعدہ وفائی نہ گئی

حضرت عباسؑ حضرت امام حسینؑ کے بھائی تھے جس کو حضرت علیؑ نے نماز تہجد میں دعا کر کے خدا سے مانگا تھا، کہ میرے حسینؑ کو ایک وفادار بھائی ملے جو کربلا میں اس کے کام آئے۔ حضرت عباسؑ بھی حضرت شبیرؑ کے اس قدر وفادار تھے کہ انھوں نے کبھی خود کو امام حسینؑ کا بھائی نہیں سمجھا ہمیشہ انکو آقا ہی سمجھا۔ وہ کبھی بھی امام حسینؑ کو بھائی کہہ کر نہیں مخاطب کرتے تھے۔ مولا عباسؑ کی اسی وفاداری کو بیان کرتے ہوئے باقر محسن کربلا میں شبِ عاشور کا بیان کرتے ہیں کہ حضرت عباسؑ خیمہ کا طواف کرتے ہوئے اس سوچ میں ہیں کہ کل کی جنگ کیسی کرنی ہے، اس اثنا میں انکی نظر تلوار پر پڑتی ہے جس کو دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے اس کو مخاطب کرتے ہیں کہ اے تلوار یہ فوج شقی جو تیرے نام سے تھرّاتے ہیں کل انھیں تجھے صفین کی جنگ کی یاد دلانی ہے۔ اس کے بعد وہ ذوالجناح کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو بھی تین روز سے پیاسہ ہے، مگر کل ایسی جنگ کرنی ہے کہ فوجوں کو اپنے پاؤں تلے کچلنا ہے۔

آگے کے بندوں میں شاعر روز عاشورہ کے اس وقت کا بیان کرتا ہے کہ جب ایک ایک کر کے سارے انصار و اصحاب شہید ہو رہے تھے۔ روز عاشور کی شہادت کو باقر محسن نے بڑی ہنر مندی سے ایک ہی بند میں سموتے ہوئے کچھ یوں پیش کیا ہے۔

چشمِ عباسؑ نے حالات کی صورت دیکھی اپنے شاگردوں کی بے مثل شجاعت دیکھی
صبر سے عونؑ و محمدؑ کی شہادت دیکھی لاش قاسمؑ کی بصد یاس بہ حسرت دیکھی
تر بہ تر خون میں ایماں کے گلِ تر دیکھے
خون آنکھوں میں اتر آیا وہ منظر دیکھے

مرثیہ میں مضمون آفرینی کے ساتھ شوکت الفاظ اور علمیت کے رنگ نے ایک الگ شان پیدا کی ہے۔ اس کے بعد باقر محسن اس منظر کا بیان کرتے ہیں کہ جب بچے پیاس سے بلکتے ہیں اور سکینہؑ نڈھال ہے۔ حضرت سکینہؑ ان سے پانی لانے کی درخواست کرتی ہے۔ جناب عباسؑ خیمہ سے سب سے رخصت ہو کر مشک و علم لیکر اور اپنی تلوار سکینہؑ کے حوالہ کر کے

صرف ایک نیزہ لیکر چلے تو تلوار حضرت عباسؑ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اے حق کے نگہبان آپ بنا میرے ان ظالموں سے کیسے لڑیں گیں۔ اگر میں تیرے ہاتھ میں ہوتی تو تا قیامت ان ظالموں کو نیست و نابود کرتی رہتی۔ باقر محسن کا یہ تلوار کا اپنے مالک حضرت عباسؑ کو رخصت کرنا ایک نیا تجربہ ہے جس کو اب تک کسی بھی مرثیہ گو شاعر نے نہیں بیان کیا ہے۔ شاعر مرثیہ میں دو بار رخصت کے بند کو تحریر کرتا ہے۔ ایک اس وقت جب کہ جناب عباسؑ میدان میں جانے کے لئے اپنی بہنوں سے ملنے خیمہ میں آتے ہیں، اور دوسری تب جبکہ عباسؑ اپنی تلوار سکینہ کو دے دیتے ہیں اس وقت تلوار نیزہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے کہ تو بہت خوش قسمت ہے کہ تو حضرت عباسؑ کے ساتھ ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ آرزو تھی کہ میں جناب عباسؑ کے ساتھ میدان میں رہوں اور دشمنان دین کو تہِ تیغ کروں لیکن میری تمنّا پوری نہ ہوسکی لیکن اے نیزہ آج میری اس آرزو کو تجھے پورا کرنا ہے۔ تلوار کی نیزہ سے یہ گفتگو ملاحظہ ہو۔

آج تو میری جگہ دست علمدار میں ہے آج چلنا تجھے افواجِ ستمگار میں ہے
جو تری نوک میں ہے بات مری دھار میں ہے وہ چمک تجھ میں ہے جو طالعِ بیدار میں ہے
میرے ارمانوں کو پورا تجھے کرنا ہوگا
بن کے بجلی دل اعدا میں اترنا ہوگا

باقر محسن نے مرثیہ میں جنگ کے مناظر کو نہایت ہی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ مرثیہ کی کامیابی کا دارومدار جنگ کے مناظر پر ہوتا ہے، باقر محسن نے اپنی فنی مہارت سے ان مناظر میں جان ڈال دی ہے۔ قوت متخلیہ کی مدد سے دونوں طرف کی صف آرائی، یزیدی فوج کی کثرت، مبارزطلبی کا شور کے بیان سے میدان کارزار کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مرثیہ میں باقر محسن نے مبالغہ کا استعمال کم کرتے ہوئے مشاہدے کی وسعت سے کمانوں کو کڑکنا، ڈاڑھیاں منھ میں دابنا اور گھوڑوں کا بھڑکنا جیسے خطوط سے جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ میدان میں گھوڑے کی حرکت اور اس کے جنگی مظاہرے کو بھی شاعر ڈرامائی انداز میں تحریر کرتا ہے۔ میدان میں گھوڑے کی جنگ دیکھئے۔

غیظ میں ہو کہ الف توڑا سر دشمن کو سر کی ٹکر سے کیا زخمی کسی کے تن کو
دے دیا حشر کا ماحول الٹ کر رن کو آئی دوزخ سے صدا بھیج مرے ایندھن کو
شور اٹھا مرکبِ عباسِ دلاور سے بچو
غیظ میں بپھرے ہوئے اسپِ غضنفر سے بچو

مرثیہ میں باقر محسن نے حضرت عباسؑ کے بازو کٹنے اور شہید ہونے کے بیان کو بہت غمگین انداز میں پیش کیا ہے۔ لاش عباسؑ پر امام حسینؑ کا آنا اور جناب عباسؑ کا لاشہ خیمہ میں نہ لیجانے کی وصیت کرنا اور جناب شبّیر کا عباسؑ سے یہ کہنا کہ آخری وقت میں ہی سہی مجھے بھائی کہہ کر پکاروں، ایسی باتیں ہیں جنھیں سن کر خود بہ خود آنکھوں میں پانی آجاتا ہے۔ مرثیہ میں استعمال کردہ اسلوب، تشبیہات اور استعارے بہت عمدہ ہیں۔ زبان صاف اور عام فہم ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو نئے تجربہ پیش کئے ہیں وہ بہت عمدہ ہیں۔

☆ باقرمحسن کی مرثیہ نگاری :

اردو میں مرثیہ سماجی تقاضوں کے ماتحت پروان چڑھا اور سامعین کی پسندیدگی اور ردعمل سے ترقی کی منزلوں پر پہنچا۔اس طرح اس کا ارتقاء فارسی کے اثر سے بہت حدتک محفوظ رہا۔اردو میں اس کے اصول معین نہیں تھے۔مرثیہ کے ناقدین نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔شبلی نعمانی کے اپنی کتاب ''موازنہ انیس ودبیر'' میں پہلی بار مرثیہ کے اجزاء کا بیان اور اس کے ارتقاء کا خاکہ پیش کیا۔موجودہ عہد میں مرثیہ میں سارے اجزاء کا استعمال نہیں کیا جاتا،اس کے علاوہ کچھ ایسے بھی مرثیہ گوشعرا ہیں جو مرثیہ میں سارے اجزا خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور صحیح مرثیہ بھی اسی کو مانتے ہیں جس میں سارے اجزا ترتیب کے ساتھ پیش کئے گئے ہو۔اوران مرثیہ نگاروں میں ایک نام باقرمحسن کا بھی ہے۔

سرزمین حیدرآباد میں باقرمحسن کا نام ابھرتے ہوئے مرثیہ گو کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔جن کے نزدیک صحیح مرثیہ نگاری وہ ہے جس میں اس کے پورے اجزاء کا صحیح استعمال کیا جائے۔چاہے وہ کربلا کے بعد کے واقعات کے بیان میں لکھا گیا مرثیہ ہو یا کربلا کے پہلے کا،لیکن اس میں مرثیہ کے پورے عنصر ہونا ضروری ہے۔اوراس لہاظ سے ان کے مرثیے مرثیہ نگاری کے معیاراورفن پر کھرے اترتے ہیں۔انھوں نے اپنے مرثیے میں تمام عناصر مرثیہ کو بہت خوبصورتی کے ساتھ مع صنائع وبدائع کے تحریر کیے ہیں۔انکے بارہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مرثیوں میں سے میں نے صرف مطبوعہ مرثیوں کا تجزیہ کیا ہے۔اس لئے صرف ان تین مرثیوں کے ہی فن پر بات ہوگی۔

موضوع۔مرثیہ میں باقرمحسن نے تشنگی،موت اور فرات کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔جو حضرت امام حسینؑ ،حضرت قاسمؑ اور حضرت عباسؑ کے حال پر تحریر کیا گیا ہے۔باقرمحسن کا اسلوب،ان کا انداز بیان اور زبان حد درجہ فطرت کے قریب نظر آتا ہے۔ان کے مرثیوں میں بیانیہ اور روایتی انداز ملتا ہے۔مرثیہ میں تلمیح،استعارہ،اورتشبیہ کا استعمال بہت عمدگی سے کیا گیا ہے۔مثلاً

دردِ دل بن کے یمِ تشنہ دہانی آیا
مشک سے پانی بہا آنکھوں میں پانی آیا

......

گرمی وہ تھی کہ جلتا تھا سینہ فرات کا
ریتی پہ بہہ رہا تھا پسینہ فرات کا

گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے باقرمحسن اس کا موازنہ رستم وسہراب سے کرتے ہیں،جوکہ اپنے وقت کا نامور اور بہادر بادشاہ تھا۔باقرمحسن نے امام حسینؑ کے گھوڑے ذوالجناح کو ان سے بھی زیادہ بہادر بتایا ہے۔یہ بند دیکھئے۔

ہے سواء رستم و سہراب سے میرا کس بل — میرے ماتھے سے ضیا مانگے فضائے مقتل
عشقِ مولا سے ہری ہے مرے دل کی کونپل — زیبِ گردن ہے مرے نصرت شہ کی ہیکل

صدقہ آل نبی ہے یہ مرا حسن و جمال
ہیں مرے سم کے نشاں دامنِ گیتی کے ہلال

مرثیے میں باقر محسن نیا سلامی تاریخ اور سیرت معصومینؑ کا ذکر کر کے اسلام سے اپنی گہری واقفیت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

جسم فولاد کا لوہے کا جگر رکھتا ہوں
جس میں سودائے مودت ہے وہ سر رکھتا ہوں

تلوار کی تعریف۔ کربلا کی جنگ پہلی صدی ہجری کے تقریباً وسط کا واقعہ ہے۔اس وقت آلاتِ حرب میں عموماً تیر،خنجر،تلوار، نیزہ،گرز،تبراور کمند کا استعمال ہوتا تھا،لیکن جنگی مہارت اور داؤ پیچ کے لئے شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا رواج تھا۔اس لئے جنگ کے بیان میں یوں تو عموماً ان سب حربوں کا بیان ہوتا ہے لیکن شمشیر زنی پر خاص زور دیا جاتا ہے۔باقر محسن کا تعلق موجودہ دور سے ہے اور اس دور میں قدیم جنگ کا تصور کرنا مشکل ہے اس کے باوجود انھوں نے تخیل کی جولانی سے واقعہ نگاری کے شرائط ملحوظ رکھ کر کربلا کے میدان کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اسی ماحول میں پہنچ جاتا ہے۔باقر محسن نے مرثیے میں تلوار کی تعریف کو خاص مقام دیا ہے اور بڑی تفصیل سے اس کی تعریف کی ہے۔مرثیہ ''دجلۂ وِلا''میں انھوں نے تلوار کی تعریف اسی کی زبانی کروائی ہے۔ملاحظہ ہو۔

ہوں تری تیغ مرا فرض ہے باطل شکنی　　شہہ رگِ کفر ہے واقف کہ ہے کیا کاٹ مری
کیوں نہ ہو میرے بزرگوں میں ہے شمشیرِ علی　　جنگِ صفین کو عرصہ ہوا مدت گزری
اب بھی ہے مجھ میں ترے لمس کی جدت باقی
آج تک ہے مرے قبضہ میں حرارت باقی

گھوڑے کی تعریف۔ باقر محسن نے مرثیہ میں گھوڑے کی تعریف بھی علیحدہ انداز میں پیش کی ہے۔اس میں انھوں نے کہیں اس کی تعریف بیان کی ہے تو کہیں اسپ کی جنگ کی منظر کشی کی ہے۔

بے خوف بے مثال بہادر تھا وہ سمند　　ضیغم شبیہہ، تیز،حیادار ہو شمند
شائستہ ، شاندار ، وفا خو، وغا پسند　　قامت مثالی ،چال سبک اور سر بلند
نازک مزاج وہ کہ مگس اُس پہ بار ہو
اس کے غضب پہ شیر کا غصہ نثار ہو

گھوڑے کی جنگ کا بیان بلاحظہ ہو۔

سمٹا کبھی ،کبھی کیا کاوے کو یوں دراز　　جیسے شکار کرتا ہے قمری کا شاہباز
یکساں تھی چال کیسا نشیب اور کیا فراز　　جوش وغا میں تھا حدِ میداں سے بے نیاز
فوجوں کو روند راند کے آگے نکل گیا
پیاسا فرات پھاند کے آگے نکل گیا

ساقی نامہ۔ساقی نامہ کا بیان ہر مرثیہ میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔یہ بند دیکھئے۔

اب جنگ نظم کرنا ہے ساقی شراب دے پینا ہے بے حساب مجھے بے حساب دے
صدقہ حسنؑ کے لال کا اۓ بوترابؑ دے وہ مئے عطاء ہو جو مجھے فکری شباب دے
قاسمؑ بڑھے ہیں تیغِ دوپیکر کو چوم کے
دیکھوں میں جنگ نشہِ مدحت میں جھوم کے

جذبات نگاری۔مرثیہ کو کامیاب بنانے میں سب سے اہم کردار واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کا ہوتا ہے۔ شاعری ایک سماجی عمل ہے۔فنکار اپنے تصورات، تجربات اور محسوسات اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری تک اس کے تجربے کی نوعیت پہنچ جائے۔دوسرے الفاظ میں فن کی کامیابی میں ترسیل وابلاغ کا بہت بڑا ہاتھ سمجھا جاتا ہے،خصوصاً شاعری میں الفاظ کا استعمال صرف معلومات مہیا کرنے کے لئے نہیں بلکہ ذہنی تصویریں اور جذباتی کیفیتیں پیدا کرنے کے لئے ہیں۔اظہار میں مناسب مفہوم کے لئے اگر مناسب لفظ نہ استعمال کئے جائے تو فن کو بلندی نہیں حاصل ہوسکتی۔باقر محسن نے مناسب الفاظ کے استعمال سے جذبات کشی کو پرتاثیر بنادیا ہے۔جذبات نگاری کے جز میں شاعر ایک بھائی، بیٹے، بہن اور زوجہ کے جذبات کو اس انداز سے تحریر کرتا ہے کہ سامعین اپنے آنسوں کو بہنے سے روک نہیں پاتا۔مرثیہ میں باقر محسن نے جناب قاسمؑ اور ان کی نئی دلہن جناب کبراؑ کے جذبات کا نہایت ہی ہنرمندی سے بیان کیا ہے۔حضرت قاسمؑ کی شہادت کے بعد جب ان کی لاش کے ٹکڑے خیمہ میں لائے جاتے ہیں تو دلہن کے یہ بیان ملاحظہ ہو۔

کہتی تھی ماں سے کبراؑ میں اب کیا کروں بتاؤ کس دل سے کس جگر سے یہ صدمہ سہوں بتاؤ
اماں بغیر اُن کے بھلا کیا جیوں بتاؤ زندہ رہوں تو کیسے میں زندہ رہوں بتاؤ
راحت حیات کی نہ مسرت کی چاشنی
راس آئی اُن کو شہدِ شہادت کی چاشنی

رؤوں تو کیسے رؤوں نہ رؤوں تو کیا کروں پرسہ اگر دیں لوگ تو اماں میں کیا کہوں
اللہ مجھے بتاؤ انھیں کیا جواب دوں تہذیب کے خلاف ہے رونا تو چپ رہوں
اماں مجھے بتاؤ کہ تہذیبِ غم ہے کیا
وہ بھی بتادو نسخۂ ضبطِ الم ہے کیا

مرثیہ کے مطالعہ سے باقر محسن کی فنکاری اور ان کی ہنرمندی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔انھوں نے صنف مرثیہ نگاری میں نئی روح پھونکنے کی بخوبی کوشش کی ہے،اور مرثیہ میں روایتی انداز کے ساتھ ساتھ ایک نئی راہ بھی ہموار کی ہے۔انھوں نے مرثیہ کو صرف اظہار عقیدت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اس کو شعری خوبیوں سے بھی آراستہ کیا ہے۔آج اردو شاعری ہیئت،اسلوب،تکنیک اور موضوعات میں کئی نئے تجربات کا سفر طئے کرچکی ہے۔مرثیہ کی ادبی اور فنی حیثیت کو پیش

نظر رکھ کر طبع آزمائی کرنا شاعر کی وسیع النظر کی دلیل ہے۔ باقر محسن نے شاعری کے بلند ترین خصوصیات کو اپنایا اور اپنی خودداری، بلند بینی، خاندانی روایت پرستی اور وضع داری کے وسیلے سے ایسا شعری نظریہ اختیار کیا ہے جس نے ان کے وجدان اور تڑپ، ذوق وشعور، احساس حس اور احساس فن سے مل کر شاعری کے بلند ترین نمونے پیش کئے اور جدید مرثیہ گوئی میں منفرد مقام حاصل کیا۔

☆☆☆

حواشی :

۱) مطلع حیات: احسن رضوی داناپوری، ص ۱۶۔

۲) مطلع حیات، احسن رضوی داناپوری، ص ۱۷۔

۳) پیش لفظ، پتھروں کا مغنی، ڈاکٹر واحید اختر، ص ۱۰۔

۴) کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر، ص ۱۱۔

۵) کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر، ص ۲۷۔

۶) کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر، ص ۵۸۔

۷) کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر، ص ۸۴۔

۸) کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر، ص ۱۳۰۔

۹) پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، مرثیے کی سماجیت، ص ۱۳۸۔

۱۰) کربلا تا کربلا۔ ڈاکٹر وحید اختر، ص ۱۵۹۔

۱۱) وحید اختر، کوثر مظہری، ص ۶۵۔

۱۲) کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر، ص ۱۹۴۔

۱۳) کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر، ص ۲۳۰۔

۱۱) وحید اختر، کوثر مظہری، ص ۶۵۔

۱۲) کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر، ص ۱۹۴۔

۱۳) کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر، ص ۲۳۰۔

۱۴) غیر مطبوعہ مقالہ، ص ۱۵۵، بحوالہ وحید اختر، کوثر مظہری، ص ۶۵۔

۱۶) تقسیم کے بعد جدید اردو مرثیے کا تہذیبی و تاریخی مطالعہ، ڈاکٹر سید قمر عابدی، ص ۱۵۴

۱۷)مراثی عظیم،ڈاکٹرعظیم امروہوی،ص ۲۵۱

۱۸)پروفیسر گوپی چند نارنگ،سلامِ عظیم،ڈاکٹرعظیم امروہوی،ص ۱۵۔

۱۹)پروفیسر اکبر حیدری،مراثیِ عظیم،ص ۲۰۔

۲۰) سید معروف حسین نقوی،انجمن وظیفہ سادات ومومنین،ص ۵۱۔

۲۱)سید معروف حسین نقوی،انجمن وظیفہ سادات ومومنین،ص ۵۱۔

۲۲)ڈاکٹرعظیم امروہوی،مراثی عظیم،ص ۱۷۔

۲۳)مراثی عظیم،ڈاکٹرعظیم امروہوی،ص ۲۳۔

۲۴)مراثی عظیم،ڈاکٹرعظیم امروہوی،ص ۱۳۱۔

۲۵)مراثی عظیم،ڈاکٹرعظیم امروہوی،ص ۱۷۳۔

۲۶)مراثی عظیم،ڈاکٹرعظیم امروہوی،ص ۱۴۔

۲۷)مراثی عظیم،ڈاکٹرعظیم امروہوی،ص ۳۲۴۔

۲۸)گوپی چند نارنگ،ادبی تنقید اور اسلوبیات،ص ۱۴۔

۲۹)مراثی عظیم،ڈاکٹرعظیم امروہوی،ص ۱۸۔

۳۰)یوسفِ کربلا،ظہیر جعفری،پیش لفظ 'نجم آفندی'۔

۳۱)یوسفِ کربلا،ظہیر جعفری،پیش لفظ 'ڈاکٹر سید اختر احمد۔

۳۲)وجود کا محاصرہ،ڈاکٹر ناشر نقوی،پروازِ ادب خصوصی شمارہ 'ناشر نقوی نمبر' جولائی اگست ۲۰۰۹،ص ۲۱۔

۳۳)ناشر نقوی کی فنی شخصیت،پروفیسر سید محمد سیادت فہمی،پروازِ ادب خصوصی شمارہ 'ناشر نقوی نمبر' جولائی اگست ۲۰۰۹،ص ۱۳

۳۴)ڈاکٹرعظیم امروہوی،پیش لفظ،لالہ زارِ صبح،ص ۱۴۔

۳۵)ناشر کی غزل اور درسِ حیات،ڈاکٹرعظیم امروہوی،پرواز ادب خصوصی شمارہ ناشر نقوی نمبر،ص ۳۵۔

۳۶)نیا اردو مرثیہ اور ناشر نقوی،ڈاکٹر ندیم احمد،پرواز ادب خصوصی شمارہ ناشر نقوی نمبر،ص ۴۵۔

۳۷)معراجِ غم،احسن شکارپوری،علامہ سید میر ابراہیم علی حامی ص ۱۷۔

۳۸)معراجِ غم،احسن شکارپوری،علامہ سید میر ابراہیم علی حامی ص ۷۔

۳۹)کربلائے تشنگی،باقر محسن،ص ۱۴۔

☆☆☆

باب پنجم

مرثیوں کا تنقیدی مطالعہ

۱۹۷۰ء کے بعد بہت سے مرثیہ گوشعراء نے اپنی تخلیقات سے مرثیوں میں اضافہ کیا اور تجربات بھی کئے۔ کسی نے جدیدیت کی راہ پکڑی تو کسی نے روایت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ مقالے کے منتخب مرثیہ نگاروں کا بھی یہی رجحان ہے، قدیم اور جدید کا ملا جلا انداز ہے۔

اس باب میں منتخب مرثیہ نگاروں کے ایک ایک مرثیے کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے، اور مرثیہ کی زبان اس کی ہیئت، اسلوب اور اس کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مرثیہ سے اس کا تقابل بھی کیا گیا ہے۔ مرثیہ گوشعراء کے تمام مرثیوں کے مطالعہ سے ان کا معیار معلوم ہوتا ہے۔ احسنؔ کے مرثیے قدیم طرز پر تحریر کئے ہوئے ہیں اور اس کے اسلوب، زبان، صنائع وبدائع اور انداز بیان میں دبیرؔ کا رنگ نظر آتا ہے، اور یہی بات وحیدؔ اختر کے مرثیہ کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے لیکن ان کے مرثیوں میں قدیم رنگ کے ساتھ ساتھ جدید رنگ بھی نمایاں ہے۔ اس کے باوجود وحیدؔ اختر کی زبان عام فہم زبان نہیں ہے۔ گوہرؔ لکھنوی چونکہ انیسؔ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لحاظ سے ان کے مرثیوں میں انیسؔ کے مرثیوں کی جھلک بہت حد تک نمایاں ہے۔ ناشرؔ نقوی نے اپنے مرثیے میں صنعت ''توشیح'' کو جگہ دیکر ایک نئے تجربہ کو انجام دیا۔ ان کے علاوہ باقرؔ محسن نے ''جہاد'' جیسے پیچیدہ مسائل کو اٹھایا، احسنؔ شکار پوری اور ظہیرؔ جعفری کے مرثیہ جدید طرز کے مراثی ہیں، لیکن انھوں نے مرثیے میں کوئی تجربہ نہیں کیا بلکہ روایتی طرز کے ہی مرثیے تحریر کئے ہیں۔

احسن داناپوری۔ احسن رضوی داناپوری نے علمی وادبی دنیا میں اپنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے بے شمار غزلیں، قصائد اور نوحے وسلام تحریر کئے لیکن بدقسمتی سے آج سب ضائع ہو چکے ہیں۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ان کے مراثی کا مجموعہ موجود ہے۔ جس میں ان کے چودہ (۱۴) مرثیے شامل ہیں۔ یہ مرثیے روایتی طرز پر مبنی ہیں لیکن اس میں جدید رنگ بھی نظر آتا ہے۔ مرثیے کے مطالعہ سے ان کی ذہانت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے آخری دور میں مرثیہ کی تخلیق کی تھی۔ اور اس دور میں وہ اپنے فن میں پختہ ہو چکے تھے، یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیہ میں وہ تمام ترباتیں موجود ہیں جو ایک اچھے مرثیہ گوشعراء میں ہونی چاہیے۔ میں یہاں ان کے ایک مرثیہ کا تنقیدی جائزہ پیش کرونگی۔

☆ اے چشمِ شوق جلوۂ حق سے نقاب اٹھا

اس مرثیہ میں محمدؐ کو چہرہ بنا کر ان کی عظمت وفضیلت کا بیان کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی چونکہ حضرت امام حسینؑ کے فرزند علی اکبرؑ رسولؐ سے مشابہ تھے اس لئے مصائب میں ان کا بیان کیا گیا ہے۔ پورے مرثیہ میں شاعر نے اشاروں اور کنایوں میں اپنی بات کو قاری کے سامنے رکھا ہے۔ مرثیہ کے بیت اتنی خوبصورتی سے برتے گئے ہیں جسکی نظیر نہیں ملتی۔

موضوع۔ اس مرثیہ میں امام حسینؑ کے بیٹے حضرت علی اکبرؑ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور مرثیہ کا چہرہ حضرت

رسولؐ اکرم کو بنایا گیا ہے۔ مرثیہ میں رسولؐ اکرم کی فضیلت کو شاعر نے مختلف انداز میں بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس زمین و آسمان میں محمدؐ کا ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ یہ سورج، یہ چاند، یہ انجمن میں محمدؐ کا ہی نور ہے۔ زمین اور آسمان کو آئینوں سے تشبیہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اس ارض و سما میں جتنے بھی نظارے نظر آتے ہیں ان سب میں محمدؐ کے نور کا جمال نظر آتا ہے۔ رسولؐ کی فضیلت کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

جلوہ اسی کا طلعتِ شمس و قمر میں ہے — رنگِ جمال پردۂ شام وسحر میں ہے
ہے روشنی نظر میں تو سب کچھ نظر میں ہے — ضو اسکی فکر ودانش و علم وہنر میں ہے

ہر صاف آئینے سے نمائش ضرور ہے
طینت اگر ہے پاک تو چہرے پہ نور ہے

حضرت رسولؐ اکرم کی عظمت کا بیان کرتے ہوئے احسن دانا پوری لکھتے ہیں کہ گو کہ محمدؐ دنیا میں آخری رسول بن کر آئے لیکن عرش پر اللہ تعالیٰ نے ان کی خلقت سب سے پہلے کی تھی اور اس طرح یہ عرش پر پہلے رسولؐ بنے اور دنیا میں آخری۔ شاعر مرثیہ کے آغاز میں حضرت موسیٰ اور کوہ طور کے واقعہ کا بیان کرتے ہیں اور بعد میں اس بات کی تصدیق بھی کرتے ہیں کہ طور پر حضرت موسیٰ جس برق کو دیکھ کر بے ہوش ہوئے تھے وہ دراصل محمدؐ کا ہی نور تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو دیکھایا تھا۔ یہ بند دیکھئے۔

عرش بریں پہ انجمن آرا بنا ہوا — اتنا بلند جیسے ستارا بنا ہوا
جبرئیل کی نگاہ کا تارا بنا ہوا — خلقت کی روشنی کا منارا بنا ہوا

جو بعد میں چراغِ سر نخل طور تھا
قندیلِ عرش میں محمدؐ کا نور تھا

یہ مرثیہ رسولؐ اور ہم شبیہ رسولؐ (حضرت علی اکبرؑ) کے حال پر لکھا گیا ہے۔ رسولؐ کے فضائل اور ہم شبیہ رسولؐ کے مصائب تحریر کئے گئے ہیں۔ حضرت محمدؐ اور حضرت علی اکبرؑ کی مشابہت کو احسن دانا پوری نے اس انداز سے تحریر کیا ہے۔

جھلکا ہوا جمالِ فباریز مصطفیٰؐ — چھلکا ہوا ہے بادۂ سرتیز مصطفیٰ
حل ہے فضا میں رنگ سحر خیز مصطفیٰ — پھیلی ہے بن میں بوئے دل آویز مصطفیٰؐ

سر خاک پا پہ آہوئے صحرا دھرے ہوئے
عشق نبی کی مشک سے نافے بھرے ہوئے

رحمت کی طرح عام ہے تاثیر مصطفیٰ — چھڑکی ہوئی ہے خاک پہ اکسیر مصطفیٰؐ
دست رضا میں حلقۂ زنجیر مصطفیٰؐ — کھینچی ہوئی نگاہوں میں تصویر مصطفیٰؐ

ہر خطّ صبح نقش منور لئے ہوئے
پو پھٹتی ہے جمال کا منظر لئے ہوئے

اسلوب۔ اردو شاعری میں اسلوب کا ایک الگ رنگ، مقام اور اہمیت ہوتی ہے۔ اسلوب ہی وہ شہ ہے جس سے شاعر کی شاعری کا معیار جانچہ جاتا ہے۔ احسن داناپوری نے مرثیہ میں بیانیہ اسلوب کا استعمال بھی کیا ہے اور ڈرامائی انداز کا بھی۔ مرثیہ میں ربط و تسلسل کہیں بھی ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ کلام میں انھوں نے نہایت ہی غم انگیز حالات کو نہایت ہی سادہ مگر پراثر انداز میں بیان کیا ہے۔ مرثیہ میں فضائل کے سارے بند اشاروں اور کنائیوں میں لکھے گئے ہیں۔

رحمت ہے عام پھر بھی نظارہ محال ہے   جلوے کی سمت آنکھ اٹھے کیا مجال ہے
مثلِ بشر یہ نورِ خدا بے مثال ہے   رنگِ جمالِ مظہر شان جلال ہے
بزم جہاں میں اور حدِ ممکن سے دور ہے
دنگ آئینہ ہے جلوے سے ہر شیشہ چور ہے

کردار نگاری۔ شاعری، ناول نویسی اور ڈرامہ نگاری کا کردار اگر تاریخی ہو تو فنکار کی پابندیاں بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اگر کردار تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی حیثیت بھی رکھتے ہوں تو ایسی حالات میں قلم کار کی دشواریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ مرثیہ کے کرداروں کے ساتھ یہی دشواری ہوتی ہے کہ مرثیہ نگار ایسی کوئی بات نہیں لکھ سکتا جس سے تاریخ اور مذہبی وقار مجروح ہو۔ احسن داناپوری کی ایک خوبی یہ بھی ہے وہ اتنی احتیاط سے قلم چلاتے ہیں کہ ان ہستیوں کا احترام پامال نہ ہو۔ مرثیہ میں انھوں نے علی اکبرؑ کے کردار کو ایک فرمابردار بیٹے کی حیثیت سے پیش کیا کہ جب روز عاشورہ سب شہید ہوگئے تب علی اکبرؑ امام حسینؑ کے پاس اذنِ وغا کے لئے آتے ہیں۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

سر کو جھکا کے کہتے ہیں اکبر یہ بار بار   بابا یہ غم ہے کیوں کہ نہیں کوئی غمگسار
باقی ابھی ہے حضرت والا کا جاں نثار   کیا چیز ہے ہمارے لئے فوج نابکار
ہم دیکھ لیں گے اذن وغا دے کے دیکھئے
کہتے ہیں کس کو جنگ وغا دے کے دیکھئے

مرثیہ میں حضرت علی اکبرؑ کے علاوہ ضمنی کردار میں حضرت رسولؐ کا کردار بھی پیش کیا ہے۔ مرثیہ میں احسن داناپوری نے علی اکبرؑ کو حضرت رسولؐ سے ہو بہ ہو مشابہ بتایا ہے اور دونوں کی ایک ہی صفات بتائی ہے۔ احسن داناپوری کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے ان دونوں کرداروں کو بڑی خوبصورتی سے مرثیہ میں پیش کیا ہے۔

جذبات نگاری۔ انسانی زندگی میں رونا، ہسنا اور خوش ہونا فطری ہوتا ہے۔ جب انسان کو کوئی بات اچھی لگتی ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے، لیکن جب کبھی کوئی بات بری لگتی ہے یا جب دل کو ٹیس لگتی ہے تو اپنے آپ آنکھوں سے آنسوں نکل پڑتے ہیں۔ ان جذبات کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن بنا دیکھے سمجھا نہیں جا سکتا۔ ان جذبات کو مرثیہ کے ذریعہ دوسروں کو محسوس کرانا بہت مشکل ہوا ہے لیکن احسن داناپوری کو جذبات نگاری میں بھی مہارت حاصل ہے۔ یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

پھر شہ سے کچھ کہانہ گیاسر جھکالیا — اب جیسے الوداع بھی کہنامحال تھا
لیلیٰ قریب آگئیں اکبر ہوئے جدا — اہلِ حرم کو جیسے کہ سکتہ ساہوگیا
شبیرؑ یہ نہیں تھا کہ بے ہوش ہو گئے
ہاں ایک آہ کھینچ کے خاموش ہو گئے

زبان وبیان۔ مرثیہ میں واقعات کے بیان میں اس کے انداز بیان اور بلاغت کا ایک بڑا ضروری اصول یہ ہے کہ مرثیہ میں کہیں بھی تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ جب کوئی واقعہ مختلف اور ایک سے زیادہ واقعات پر مشتمل ہوتا ہے تو ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف منتقل ہوتے ہوئے اکثر بیان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ احسن داناپوری کے مرثیہ میں انداز بیان کی تمام خوبیاں نظر آتی ہے۔ مرثیہ میں کہیں بھی تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا۔ ان کا مرثیہ بیان کرنے کا انداز روایتی ہے اور قدیم رنگ میں تحریر کیا ہوا ہے۔ مرثیہ میں فصاحت و بلاغت کا استعمال بھی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

اس لہجہ پر دورود اس آواز پر سلام — صدقے اگر قعود تو قربان ہے قیام
ذکر خدا کے بعد جو لب پر ہیں دو کے نام — کرتا ہے دل نمازِ زیارت کا اہتمام
حیراں ہے آئینۂ علی اکبرؑ ہیں سامنے
خود جھک رہے ہیں سر کہ پیمبرؐ ہیں سامنے

اک آفتاب ہے کہ درخشاں قمر میں ہے — روشن ہے چشم، نورتولا نظر میں ہے
دل محو، طوف حضرت خیرالبشر میں ہے — سودائے عشق سرور کونین سر میں ہے
راہِ وفا میں سب کے قدم استوار ہیں
ہاں آخری اذان ہے دل بے قرار ہیں

تشبہات واستعارات کا استعمال۔ کلام میں حُسن پیدا کرنے کے لئے تشبہات واستعارات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ احسن داناپوری نے مرثیہ میں تشبہات واستعارات کے ساتھ ساتھ تلمیح اور کنایہ کا استعمال بھی بخوبی کیا ہے۔ مرثیہ کے ایک بند میں شاعر نے زمین و آسمان کو دو آئینوں سے تشبیہ دیتے ہوتے حضرت محمدؐ کے نور کا بیان کیا ہے کہ ان کا نور کا عکس دونوں آئینوں میں نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پرتو قمر میں مہر میں جلوہ اسی کا ہے — ہر انجمن میں رنگ تماشا اسی کا ہے
تارے ہوں یا چراغ اجالا اسی کا ہے — مطلق ہے جس کا نور کرشمہ اسی کا ہے
ارض و سما پہ نقش ہے رنگِ کمال کا
دو آئینوں میں عکس ہے برق جمال کا

مرثیہ کے مطالعہ کے بعد یہ بات صاف طور سے واضح ہوجاتی ہے کہ احسن داناپوری کا تخیل اور انکا انداز بیان نرالا

اور دوسروں سے منفرد ہے۔مرثیہ میں سلاست اور روانی بھی صاف نظر آتی ہے۔مصائب کے بند روایتی ہے اس کے علاوہ مصائب بہت ہی جدت اور پر اثر انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ان کے مرثیے میں انیس کا رنگ بہت نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر انکا یہ بند ملاحظہ کیجئے جو بالکل انیسؔ کے مرثیہ ''جس دم نگین خاتم پیغمبر اگرا'' کے بند کی طرح ہے۔

شہؑ کہہ رہے تھے خالق اکبر کا واسطہ بولو کہاں ہے لاش پیمبر کا واسطہ
مارا ہے جس کالا ل اسی مادر کا واسطہ تم کو حسینؑ کے دلِ مضطر کا واسطہ
ہنس ہنس کے دیکھتے تھے لعیں اضطراب کو
پورا گہن لگا ہوا تھا آفتاب کو

اب ذرا اس ذیل میں میر انیسؔ کا یہ بند دیکھئے۔

ائے شمر تجھ کو خالق اکبر کا واسطہ ائے شمر تجھ کو روح پیمبرؐ کا واسطہ
ا ئے شمر تجھ کو حیدرؑ صفدر کا واسطہ کو ننھے سے اصغرؑ کا واسطہ
للّٰہ کر نہ ذبح شہؑ مشرقین کو
میں بھیک مانگتی ہو مجھے دے حسینؑ کو

احسن دانا پوری کے مرثیہ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غزل کے لب ولہجہ میں کس طرح مرثیہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔اور انھیں خوبیوں کی بنا پر انکا نام دوسرے مرثیہ گو شعرا سے ممتاز ہے۔

وحید اختر :

یہ وہ شاعر ہیں جنھوں نے بچپن سے ہی شعر خوانی اور قطعہ خوانی شروع کر دی تھی۔اور اپنی اس بات کا تذکرہ بھی وحید اختر نے اپنی کتاب ''کربلا تا کربلا'' میں کیا ہے۔

''میں نے ہوش کی آنکھ کھولی اور زبان نے الفاظ کی ادائیگی سیکھنی شروع کی تو ماں باپ کی گفتگو کے ساتھ کان آشنا ہوئے اور زبان شناسا ہوئی عزاداری کی مجلسوں میں ذکر حسینؑ اور شہدائے کربلا کے نثری و شعری بیان سے۔''[1]

وحید اختر کی تربیت مرثیہ خوانی اور مرثیہ نگاری کے ادارے میں ہوئی تھی۔اس لئے فطری طور پر اس صنف سخن سے ان کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔وحید اختر نے دس سال کی عمر سے ہی سلام اور نوحے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔لیکن مرثیہ نگاری لکھنے میں انھوں نے تھوڑی تاخیر کی ہے۔انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ چھبیس سال کی عمر میں لکھا،جسکی تصدیق وہ اپنی کتاب 'کربلا تا کربلا' میں کی ہے۔

☆ شہید عطش

کربلا تا کربلا میں ان کا تیسرا مرثیہ ''شہید عطش'' ہے۔لیکن اصل میں یہ وحید اختر کی زندگی کا پہلا مرثیہ ہے جسکو

انھوں نے ۱۹۶۱ء میں تحریر کیا تھا۔ یہ مرثیہ کربلا کے ننھے مجاہد حضرت علی اصغرؑ کے حال پر تحریر کیا گیا ہے۔اس مرثیہ میں ۹۵ بند شامل کئے گئے ہیں۔ جو کہ ان کے اور مرثیوں سے کم ہیں۔ وحید اختر نے اس مرثیہ میں پیاس کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ جدید شاعری میں علی اصغرؑ کی شہادت کو مظلومی کا وہ آخری نقطہ سمجھا جاتا ہے جس پر تمام کربلا والوں کی پیاس سمٹ آئی تھی۔ مرثیہ کا ذکر وحید اختر ''کربلا تا کربلا'' میں کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

> ''یہ مرثیہ پیاس اور شیر خوارگی کے خون کی داستان ہے۔اسی لحاظ سے گھٹاؤں کے نہ برسنے کی شکایت سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ قحطِ باراں وآب ہمارے دور میں جنگ کے تباہ کن ہتھیاروں کی کثرت اور امیدِ امن کے فقدان کا بھی استعارہ ہے۔ ہماری صدی نے جو مصائب اور جنگیں جھیلی ہیں، وہ پوری انسانی تاریخ نے اپنی طویل عمر میں کبھی تصور بھی نہ کی تھیں۔ مرثیے کا چہرہ اسی عالم آشوب سے عبارت ہے۔''[۲]

موضوع۔ یہ مرثیہ امام حسینؑ کے ننھے مجاہد حضرت علی اصغرؑ کے حال کا لکھا گیا ہے۔ یہ کربلا کا وہ شہید ہے جو طفلی یعنی چھ مہینے کے سن میں ہے تیر سے شہید ہوا۔ مرثیہ میں موجودہ عہد کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کا حل بھی بتایا ہے۔ آج ہر بشر ایک دوسرے سے بغض رکھتا ہے، انسان دوسرے انسان کا خون بہانے سے نہیں چوکتا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ اس بات کو وحید اختر اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

یہ عہدِ پرآشوب کہ ہم کو جو ملا ہے　　اس بانیِ بیدار کا انداز نیا ہے
دن نکلے تو معلوم ہو دل ڈوب رہا ہے　　شام آئے تو بجھتا ہوا مرقد کا دیا ہے
ہر ایک نفس عمرِ عذابِ دو جہاں ہے
دھڑکن بھی مزاجِ دلِ نازک پہ گراں ہے

وحید اختر لکھتے ہیں کہ جہاں ایک طرف انسان ترقی کی طرف گام زن ہے وہ سورج اور چاند پر قابض ہو چکا ہے، وہ آسمان و زمین کے ہر راز سے پردہ اٹھا چکا ہے۔ تو دوسری طرف بشر پر ہر گھڑی موت کے سائے منڈلاتے رہتے ہیں۔ زندگی سے چین و سکون کا نام و نشان مٹا جا رہا ہے۔ وحید اختر کی فکر میں ایک تسلسل ہے جو ان کی غزل، نظم اور مرثیے میں قائم ہے۔ ان کے ذہن میں اپنے زمانے کی شہر آشوبیت جاگزیں تھی۔ وحید اختر نے مرثیوں میں حالات حاضرہ کو بطور چہرہ پیش کرنے کے چلن کو مستحکم کیا ہے۔ اور ان کی یہ خوبی انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ انسانی تشدّد اور فتنہ فساد کو شاعر اس طرح بیان کرتا ہے۔

اور دوسری جانب ہیں غمِ زیست کے سائے　　اندیشۂ جاں سے نہ یہاں نیند بھی آئے
اس آگ کے طوفاں میں کوئی چین نہ پائے　　آنکھوں کے لیے خواب بھی اپنے ہیں پرائے
ذرّے کا بھی دل ٹوٹے تو ہل جاتی ہے دنیا
پرساں نہیں کوئی دلِ انساں کی تڑپ کا

''ذرے کا بھی دل ٹوٹے تو ہل جاتی ہے دنیا'' سے وحید اختر کی مراد ائٹم بم کے دہانے پہ بیٹھی دنیا سے ہے۔ اگر ایک بم بھی پھٹ جائے تو پورا ملک تباہ ہوسکتا ہے۔ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وحید لکھتے ہیں کہ آج کے انسان کو سمجھنا بہت محال ہے کہ کون اپنا ہے اور کون پرایا۔ انسان ایک دوسرے کی صحبت کے بچتا نظر آتا ہے۔ آج کسی میں نہ مروت بچی ہے اور نہ کسی میں ایمان باقی ہے۔ ہر کوئی اپنے میں پریشان نظر آتا ہے۔

وحید اختر لکھتے ہیں کہ ہر عہد میں ظالموں کی حکمرانی رہتی ہے۔ کم ظرفوں سے ہی حاکموں کی سخاوت منسوب رہتی ہے۔ اور جو بھی ان کو نہیں مانتا، جو ان کے قید ستم سے نہیں ڈرتا اسی کو قدم قدم پہ اذیت پہچائی جاتی ہے اور سچ بولنے پہ زبانوں کو کٹوا دیا جاتا ہے لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہر ظلم و تشدّد کا سامنا دلیری سے کیا جائے، حضرت علی اصغرؑ کی طرح ظلم سے لڑا جائے اب ضرورت ہے کہ اس عہد کے فرعون سے لڑا جائے، نمرود کی آگ سے گزر جایا جائے، شدّاد کی جنّت کو ٹھکر مار کر تخریب کو تعمیر کے آداب سکھائیں۔ وحید اختر جدید لب ولہجہ میں ایک بار پھر ظلم سے ٹکرانے کی بات کرتے ہیں۔ اور حوصلہ حسینؑ ابن علیؑ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

لازم ہے کہ اس دور کے فرعونوں سے ٹکرائیں واجب ہے کہ نمرودوں کے دوزخ سے گزر جائے
مل جائے جو شدّادوں کی جنّت بھی تو ٹھکرائیں تخریب کو تعمیر کے آداب بھی سکھلائیں

ہر رنگ میں موجود یزیدانِ زماں ہیں
دنیا متلاشی ہے کہ شبیرؑ کہاں ہیں

اسلوب۔ انھوں نے مرثیہ میں بیانیہ اسلوب استعمال کیا ہے اور ڈرامائی انداز بھی۔ مرثیہ میں ربط اور تسلسل کہیں نہیں ٹوٹتا ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نہایت غم انگیز اور اندوناک واقعات کو نہایت بڑے سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔ دنیا کی پرآشوبی کو نہایت فنکارانہ انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔

تاریخ کے ہر صفحے پہ ٹوٹا ہے نیا قہر بن باس ملے رام کو، گوتم کو غم دہر
عیسیٰ تو چڑھے دار پہ، سقراط پیئے زہر پیاسا پسر ساقی کوثر ہو لب نہر

مہتاب شبِ چار دہم چاندنی مانگے
چوکھٹ پہ اندھیروں کی سحر روشنی مانگے

خسرو کا محل دولت شیریں سے غنی ہو فرہاد کے تیشے کو غم خودشکنی ہو
جو شخص سرفراز ہے گردن زدنی ہو بوئے گل تر وقف غریب الوطنی ہو

کانٹے تو لہو پی کے ہوں سیراب و سرفراز
شاہین فلک سیر ہو صید غمِ پرواز

کردار نگاری۔ وحید اختر نے مرثیہ میں ایسے کردار کو پیش کیا ہے، جس نے اپنی جنگ پہ تو تلوار سے لڑی نہ تیر

سے بلکہ صرف ایک مسکراہٹ سے سارے فوج اشقیاء میں ہلچل مچا دی۔ وہ کردار کوئی اور نہیں بلکہ امام حسینؑ کے چھوٹے فرزند حضرت علی اصغرؑ ہیں۔ کربلا کے تمام شہیدوں میں حضرت علی اصغرؑ کو افضلیت حاصل ہے اور انکی شہادت کو شہادت حسینؑ کی تمہید کہا جاتا ہے۔ علی اصغرؑ کی شہادت مظلومی کا وہ آخری نقطہ ہے جس پر کربلا کی پیاس تمام ہوتی ہے۔ انھیں کی ایسی شہادت ہے جہاں حسینؑ جیسے صابر کے ہاتھ سے شکر کا دامن چھوٹتا نظر آتا ہے۔

اصغرؑ نے بڑے چاؤ سے دیکھا رخ شبیر　　ہو داد طلب جیسے شجاعت کا وہ بے شیر
تھی خون میں ڈوبی ہوئی وہ چاند سی تصویر　　ہونٹوں پہ تبسم کی چمکتی ہوئی تحریر
ہونٹوں پہ تبسم کی چمکتی ہوئی تحریر
پیروں سے نہ چل سکتے تھے گودی میں سوار آئے

جذبات نگاری۔ وحید اختر نے مرثیہ میں واقعات کا ذکر کرنے کے علاوہ ایسے غم انگیز جذبات پیش کئے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط دل والے بشر کا بھی دل پگھل جائے۔ اور معصومین کے غم میں اشک بہانے پر مجبور ہو جائے۔ مثلاً جب علی اصغرؑ پیاس کی شدت سے پریشان ہوتے ہیں تو امام حسینؑ ان کو خیمے سے لیکر میدان میں جاتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید لشکر اعدا میں سے کسی کو بھی اس شش ماہِ پر ترس آجائے اور وہ اس کو پانی پلا دے۔ مگر جب اصغرؑ شہید ہو جاتے ہیں تو امام حسینؑ ان کو لے کر خیمے میں نہیں جا پاتے ہیں کہ جب اصغرؑ کی ماں پوچھے گی تو ان کو کیا جواب دیں گے۔ امام حسینؑ کی اس وقت کی بے بسی کو وحید اختر اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

ماں سے کوئی کہہ دے کہ نہ اب آئیں گے اصغر　　اب دودھ کی ضد کر کے نہ تڑپائیں گے اصغرؑ
کپڑے بھی نہ اب ماں سے بدلوائیں گے اصغرؑ　　آرام سے اب قبر میں سو جائیں گے اصغرؑ
روتی رہو تا عمر یہ گوہر نہ ملے گا
صغرا سے تو مل لوگی پر اصغر نہ ملے گا

زبان و بیان۔ مرثیہ کی زبان صاف سادہ مگر تخیل زبان ہے، الفاظ میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کا بھی استعمال ملتا ہے۔ انداز بیان میں تسلسل برقرار ہے۔ مرثیہ میں موجودہ حالات کو حقیقت مندانہ انداز میں تحریر کیا ہے اور سامعین کو درس دیتے ہیں۔ وحید اختر کے مرثیہ میں اخلاقی پہلوں بھی نظر آتا ہے جس میں انیسیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ انیسؔ کے مرثیہ میں جس طرح وہ حضرت حُر کا امام حسینؑ سے ملنے بیان کرتے ہیں تو اس اخلاقی جرأت کی بنا پر ان کی سیرت اور نکھر جاتی ہے اسی طرح کا بیان مجھے وحید اختر کے مرثیے میں بھی ملتے ہیں۔ انیسؔ کا اخلاقی پہلو ملاحظہ ہو۔

عمل نیک ہے بہکانہ مجھے او ابلیس　　یہی کونین کا مالک ہے یہی راس و رئیس
کیا مجھے دے گا ترا حاکم ملعون و خسیس　　کچھ تردد نہیں کہہ دے کہ لکھیں پرچہ نویس
ہاں سوئے ابن شہنشاہ عرب جاتا ہوں
لے ستم گر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

اب ذرا وحیداختر کے اخلاقی پہلو کو دیکھئے۔

ہر چند نہ کر پایا ہمیں کوئی نگوں سار　　لیکن ہیں ابھی راہ میں حائل کئی کہسار
طوفانوں سے لڑنا ہے برائے دُر شہوار　　دے دیں نہ رہِ حق میں تو سرتن پہ گراں بار
انصاف سے معمور زمیں گر نہیں ہوگی
تسخیر دو عالم کی مہم سر نہیں ہوگی

دونوں بندوں کو دیکھنے سے دونوں میں کافی یکسانیت نظر آتی ہے۔

تشبہات واستعارات کا استعمال۔ مرثیہ لکھتے وقت اسکو خوبصورت اور دلچسپ بنانے کے لئے کلام میں تشبہات واستعارات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مرثیہ میں وحیداختر نے جگہ جگہ تشبہیات، استعارات کے ساتھ ساتھ کنایہ اور ایہام کا استعمال کیا ہے۔

یہ عہد پرآشوب کہ ھم کو جو ملا ہے　　اس بانیِ بیداد کا انداز نیا ہے
دن نکلے تو معلوم ہو دل ڈوب رہا ہے　　شام آئے تو بجھتا ہوا مرقد کا دیا ہے
ہر ایک نفس عمر عذابِ دو جہاں ہے
دھڑکن بھی مزاجِ دلِ نازک پر گراں ہے

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں ڈاکٹر وحیداختر جدید مرثیہ اور جدید فکر کے ایک اہم ستون ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے گا کہ مرثیہ میں جدید کے ساتھ قدیم رنگ بھی ہے یا دونوں کا سنگم ہے۔ قدیم ان معنوں میں کہ یہاں منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری، سراپا، رجز، رخصت، آمد، جنگ اور شہادت کا ذکر بخوبی کیا گیا ہے اور جدید معنوں میں یوں کہ انھوں نے مرثیہ میں حالات حاضرہ، سیاسی وسماجی زبوں حالی اور طبقائی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ یہ مرثیہ ان کے تمام مرثیے میں اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔

عظیم امروہوی

اردو ادب کے عظیم مرثیہ نگاروں میں عظیم امروہوی کا نام خصوصی طور پر لیا جاتا ہے۔ عظیم نے اب تک ۲۴ مرثیہ تحریر کر چکے ہیں، جو اپنے موضوع، انداز فکر، اسلوب اور لب ولہجہ کی انفرادیت کی بنا پر اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مرثیوں میں جدید فکر اور عصری تقاضے واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ زیادہ تر یہ مرثیے موضوعاتی ہیں، مثلاً حسینؑ اور اتحاد، فاتحِ نفس، حسینؑ اور رسول، حسینؑ اور قرآن، ہوا اور چراغ، اسلام اور فسادات، اسلام اور وقت شناسی، قرآن وفا، فرض اور کربلا اور عظمت علم وغیرہ۔

☆ **حسینؑ اور حرّیت**

حرّیت یعنی آزادی، انسان آزاد ہی پیدا ہوتا ہے اور آزاد ہی رہنا چاہتا ہے جو کہ اس کا حق بھی ہے لیکن صحیح معنیٰ

میں حرّیت کیا ہے؟ اس کی تشریح عظیم امروہوی نے اس مرثیہ میں تحریر کی ہے۔ یہ مرثیہ ۸۴ بندوں میں مشتمل ہے جو حضرت حُرؑ کے حال کا ہے۔

موضوع۔ مرثیہ میں عظیم امروہوی نے آزادی کو موضوع بنایا ہے جو کہ جدید طرز کا موضوع ہے اور اس سے پہلے اس موضوع پر شاید کسی نے بھی مرثیہ میں قلم نہیں آزمایا ہے۔ یہ مرثیہ حضرت حُرؑ کے حال کا اس لئے ہے کہ حُرؑ جو کہ باطل کی قید میں تھا صبح عاشورہ اس کو آزادی ملی اور وہ حق (امام حسینؑ) کی طرف آ گیا۔ مرثیہ میں آزادی کی صحیح معنیٰ میں تشریح کی گئی ہے اور مختلف مفکرین اور دانشوران کے تصور آزادی کو بیان کیا گیا ہے۔

یہ کر گیا ہے بیاں صاف ایڈمنڈ بر کی　　مجردات کے صف کی ہے چیز آزادی
کسی کو بھی یہ زمانے میں مل نہیں سکتا　　یہ روسیو نے کہا ہے کہ آج تک جو بھی
جہان خاک میں آیا وہی ہوا آزاد
بشر کو دہر میں پیدا کیا گیا آزاد

خیال تھا رَن کا یہ ہے کہ حریت کے لئے　　یہ لازمی ہے کہ قانون کی گرفت رہے
یہ حریت کے لئے کہہ گیا ہے میکالے　　کہ آدمی کو میسر ہے سخت کوشش سے
کسی پہ جبر نہ کرنے کا نام، آزادی
رہِ رضا سے گزرنے کا نام ، نام آزادی

ساتھ ہی اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ آزاد رہنے کے لیے عقل کا ہونا کتنا ضروری ہے۔ عقل کی حقیقت اور اس کی کارفرمائیاں کیا ہیں اور ساتھ ہی اسلام میں تصور آزادی کیا ہے ان سب باتوں کا ذکر مرثیہ میں ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پیام دیں کا ہے ، کوئی یہاں غلام نہیں　　قوی غلام نہیں، ناتواں غلام نہیں
نشان والا ہو ، یا نے نشاں غلام نہیں　　بحکمِ رب ، کوئی پیرو جواں غلام نہیں
نہیں ہے کو یہ بھی آقا، یہاں کسی کے لئے
مگر نظام ضروری ہے، زندگی کے لئے

اسی نظامِ مکمل کا نام ، ہے اسلام　　جہاں میں امن و اخوّت کا جام ، ہے اسلام
اک اتحاد کا گویا پیام، ہے اسلام　　نوید زیست ہے، حق کا نظام ہے اسلام
اسی نے دہر میں ، اک تازہ انقلاب کیا
اسی نے زیست کا ہر راز ، بے نقاب کیا

اسلوب۔ عظیم کا اسلوب اور طرز ادا فطرت سے حد درجہ قریب ہی نہیں بلکہ اس سے ہم آہنگ بھی ہے۔ عظیم کا یہ مرثیہ کئی اسلامی واقعات کی یاد دلاتا ہے۔ اجزائے ترکیبی کی بندشیں اس میں نظر نہیں آتیں مگر مرثیہ میں جدید رنگ صاف

طور سے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بند دیکھئے۔

وہ رات درسِ اخوّت کی رات تھی گویا　　پیامِ حق وصداقت کی رات تھی گویا
نبیؐ کے دین کی نصرت کی رات تھی گویا　　وہ کربلا میں شہادت کی رات تھی گویا
اس ایک رات میں تاریخ میں وہ باب آیا
کہ جس سے دہر میں اک تازہ انقلاب آیا

کردارنگاری۔ نثر ہو یا نظم، کہانی ہو یا افسانہ، مثنوی ہو یا مرثیہ ہر صنف میں کئی کردار پیش کئے جاتے ہیں جس کے اردگرد اس کا پلاٹ گھومتا ہے۔ مرثیہ نگاری میں بھی ہیرو کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے مرثیہ نگار اس کے رخصت، رجز، جنگ اور شہادت کا بیان کرتا ہے۔ اس مرثیہ میں عظیم امروہوی نے حضرت حُر کے کردار کو پیش کیا ہے۔ حُر کربلا کی جنگ کے ایک ایسے سپاہی تھے جو شبِ عاشور تک تو یزید کے پرستار تھے۔ لیکن جب صبح عاشور نمودار ہوئی تو کائنات کے ساتھ ساتھ حُر کا ضمیر بھی جاگ اٹھا۔ حُر نے یزید کی غلامی کی زنجیروں سے خود کو آزاد کیا۔ حُر آزاد ہوکر پلٹے اور اکیلے نہیں پلٹے بلکہ اپنے ساتھ اولاد اور غلام کو لے کر پلٹے۔ اور شبیرؑ کی خدمت میں جانثاری کا جذبہ لیکر حاضر ہوئے۔

وہ ہاتھ جوڑ کے بولا، خطا شعار ہوں میں　　علیؑ کے لال! معافی کا خواستگار ہوں میں
عمل پہ اپنے حقیقت میں شرمسار ہوں میں　　حضور بحرِ کرم ہیں، گناہگار ہوں میں
بڑا کرم ہو جو دھل جائیں اب گناہ مرے
جہاں میں آقا و مولا ہیں خیرخواہ مرے

تھا کل میں باعث غم اور جاں نثار ہوں آج　　جدا ہو تن سے یہ سر جلد بیقرار ہوں آج
جو کل خطا ہوئی مجھ سے تو شرم سار ہوں آج　　نگاہِ لطف و کرم کا، امیدوار ہوں آج
جو میل دل میں ہو میری طرف سے صاف کریں
ہے شاہِ دیں سے گزارش مجھے معاف کریں

جذبات نگاری۔ جذبات انسان کا فطری جز ہوتا ہے۔ اور اسے دوسروں کو محسوس کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ جز مرثیہ نگاری میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہی وہ جز ہے جس کی وجہ سے مرثیہ پائے تکمیل تک پہنچتا ہے۔ یعنی رونا اور رولانا ہی مرثیہ کا اصل مقصد ہوتا ہے جو بنا جذبات کے ممکن ہی نہیں ہے۔ مرثیہ میں عظیم امروہوی نے حضرت حُر کے جذبات کے ساتھ ساتھ امام حسینؑ کے انصار واقرباء کے جذبات کو بھی پیش کیا ہے۔ جب شبِ عاشورا امام حسینؑ اپنے دوست واحباب سے چھوڑ کر جانے کو کہتے ہیں تو وہ انکار کردیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کریں گے جان کو قرباں یہ عزمِ محکم ہے　　بہائیں جتنا بھی ہم اپنا خوں تو وہ کم ہے
نکلنے کے لیے بے چین دل میں اب دم ہے　　ہزار بار قلم ہو یہ سر، تو کیا غم ہے

مگر نبیؐ کے نواسے کی جان بچ جائے
پیمبروں کا بھی ، نام و نشان بچ جائے

زبان و بیان۔ان کے یہاں ہندوستانی مزاج اور طرز معاشرت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ روزمرہ اور عوام الناس کی زبان کا برمحل استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

یہ جب نہ تھا ،تو جہاں کا چلن نرالا تھا   غلام چپ تھا اور آقا کا بول بالا تھا
خرید تا تھا کوئی، کوئی بکنے والا تھا   زبان تھی،مگر آقا کا اس پہ تالا تھا
جہاں سے رسم غلامی مٹائی ہے اس نے
جو حُریت کی ہے منزل دکھائی ہے اس نے

تشبہات واستعارات کا استعال۔مرثیہ میں تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے عظیم امروہوی نے حریت کا مفہوم بیان کیا ہے۔جس سے زندگی میں آزادی کی قیمت واہمیت معلوم ہو سکے۔مرثیہ کے ذریعہ شاعر نے عوام کو آزادی سے زندگی گزارنے کا درس دیا ہے۔مرثیہ میں بتایا گیا ہے کہ حریت کے لئے عقل کی کیا اہمیت ہے۔ملاحظہ ہو۔

ہے عقل گلشن ہستی کا اک مہکتا پھول   ہے عقل منکر باطل، ہے عقل حق کا رسول
وہ عقل جس نے بنائے ہیں زندگی کے اصول   بغیر اس کے یہ انساں کی زندگی ہے فضول
اسی کی وجہ سے ہے قلب اور نظر زندہ
اسی کے دم سے تو مر کے بھی ہے بشر زندہ

عظیم کے مرثیہ میں غنائیت، جذباتیت،سوز گداز موجود ہے۔عظیم کے موضوع کا انتخاب بہت منفرد ہے۔وہ موجودہ حال کے مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ان کے مرثیہ میں تبلیغی نظریات اور قوم کے اصلاحی مضامین ملتے ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ عظیم امروہوی جدید مرثیہ نگاری کے روشن چراغ کی مانند ہے جو اپنے مرثیہ کے ذریعہ عوام کو درس دے رہے ہیں۔عظیم امروہوی کے مرثیہ کا تقابل انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں سے کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ کیوں کہ انیسؔ روایتی اور قدیمی انداز میں مرثیہ کہتے تھے لیکن عظیم جدیدیت کے حامل ہیں اس کے باوجود انیسؔ کے مرثیہ کی سلاست اور روانی عظیم کے مرثیوں میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔یا عظیم امروہوی کا نام موجودہ دور کے انیس کی حیثیت سے لیا جاسکتا ہے۔

سید مسعود الحسن ''ظہیرؔ جعفری''

مدراس سے تعلق رکھنے والے ظہیر جعفری جو کہ حیدرآباد میں مقیم ہیں جدید طرز کے مرثیہ نگار ہیں۔ان کے والد سید نورالحسن جعفری ''ظاہر دہلوی'' خود ایک اچھے شاعر تھے،اور یہی ذوق شاعری ظہیر جعفری کو ورثہ میں ملی۔انھوں نے اب تک تین مرثیوں کی تخلیق کی ہے،جس میں بصیرت ان کا سب سے عمدہ مرثیہ ہے۔باقی کے مرثیے اجزاء کی حیثیت سے

کمزور نظر آتے ہیں۔

☆ **بصیرت**

حضرت حرؑ کے حال کا لکھا ہوا یہ مرثیہ بصیرت یعنی دل کی آنکھ کو بیان کرتا ہے۔مرثیہ میں حضرت حُر کی بصیرت کا جاگنا اورفوجِ یزید سے حق کی طرف آنے کا بیان بہت عمدگی اور ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔

موضوع۔ظہیر جعفری بصیرت کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بصیرت بشر کو تہذیب سے روشناس کراتی ہے۔بھٹکے ہوئے ذہنوں کو راہ پر لا کر ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتی ہے۔پھر شاعر قبل رسولؐ مکہ کا احوال بیان کرتے ہیں کہ قبل عہد رسولؐ بشر میں بصیرت نہ تھی۔بصیرت کیا ان میں ایمان کی بصارت بھی نہ تھی۔پھر وہاں محمدؐ کا نزول ہوا اور انھوں نے بشر کو حیوان سے انسان بنایا۔جاہلیت کو مٹایا یہی سبب ہے کہ ابوجہل ان کا دشمن ہو گیا۔

مرثیہ میں ظہیر جعفری نے بصیرت کو سلسلہ در سلسلہ بیان کیا ہے۔محمدؐ کے بعد علیؑ اور فاطمہؑ کی بصیرت کا بیان کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ بعد وفاتِ رسولؐ فاطمہؑ کا حق چھین لیا گیا۔انکے رونے پر پابندی لگائی گئی، پہلو پر دروازہ گرایا گیا،جس سے ان کے شکم میں محسن کی شہادت ہوگئی۔لیکن انھوں نے حق کو چھوڑا نہیں بصیرت کو کم نہیں ہونے دیا۔حضرت علیؑ کی گلے میں رسّی ڈال کر کھینچا گیا لیکن انھوں نے بصیرت کے دامن کو نہیں چھوڑا۔شاعر جنگِ صفین کے واقعہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔اس کے بعد حضرت امام علیؑ کی شہادت کی سازشوں اور ان کے قتل کا بیان کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

مشہور حریفانِ بصیرت کی ہے سازش ۔۔۔ تا حدِ نظر درہم و دینار کی بارش
مسجد کی فضا ، خونِ بصیرت کی وہ تابش ۔۔۔ کردار وہ دشمن بھی کرے جس کی ستائش

قاتل پہ کرم اپنے کیا ،حق کے ولی نے
شربت سے نواز ابنِ ملجم کو علیؑ نے

اسلوب۔ظہیر جعفری کے مرثیہ کا اسلوب بیانیہ ہے۔مرثیہ میں بصیرت کو استعارہ بناتے ہوئے حضرت محمد مصطفیؐ سے امام حسینؑ کی بصیرت کا بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ مرثیہ میں حضرت حُر کی بصیرت کا جاگنا اور فوجِ یزید سے حق کی طرف آنے کا بیان ظہیر جعفری نے بہت عمدگی اور ہنرمندی سے کیا ہے۔حُر کی تعریف اور شجاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے شبِ عاشور حضرت حُر کی حالت اضطراب کا بیان یوں کرتے ہیں۔

وہ رات کہ جو حُر کی طبیعت پہ گراں تھی ۔۔۔ تنویرِ سحر جس کے حجابوں میں نہاں تھی
دل سینے میں بے چین تھا اور سانس رواں تھی ۔۔۔ تا خیرِ سحر حُر کے لئے آفتِ جاں تھی

کب تک رہی یہ شورشِ جذبات نہ پوچھو
کس کرب کے عالم میں کٹی رات نہ پوچھو

لہجے میں علیؑ کے وہ اذانِ علیؑ اکبر ۔۔۔ سنتے ہی جسے جاگ اٹھا حُر کا مقدر
نکلا وہ جری چھوڑ کے جب شام کا لشکر ۔۔۔ ہمراہ تھے فرزند و غلام اور برادر

لشکر میں مچاتے ہوئے ہلچل سی چلا حر
سورج تھا، صفیں چیر کے بادل کی چلا حُر

کردارنگاری۔ ظہیر جعفری نے مرثیہ میں حضرت محمدؐ سے لیکر حضرت علیؑ ،حضرت فاطمہؑ،حضرت حسنؑ اور حسینؑ کے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔اس کے علاوہ ہر کردار کی زندگی میں پیش آنے والے واقعہ اوراس سے خدا کی خشنودی کے ساتھ ہر مشکل کا حل نکالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انھوں نے مرثیہ کے سارے کردار کو بہت ہنرمندی سے تحریر کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے مرثیہ کا مرکزی کردار حضرت حُرؑ کو بناتے ہوئے ان کی بصیرت کا ذکر کیا ہے۔جس کے مقدر کو صبح عاشور امام حسینؑ نے سنوار دیا۔یہ بند ملاحظہ ہو۔

تھا ذکر حبیب اور خیال آ گیا حُر کا حُر جسکی بصیرت کے مقامات ہیں عنقا
حُر جسکو جہنم سے شہؑ دیں نے بچایا ہے آج اسی حر کا مجھے مرثیہ کہنا
وہ حر جسے شہزادئ کونین دعا دیں
شبیرؑ جسے زندۂ جاوید بنا دیں

جذبات نگاری۔ اردو شاعری کی تمام اصناف سخن میں ری کو مثلاً مثنوی،نظم اور خصوصاً مرثیہ میں جذبات نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔چونکہ یہ انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔دیکھا جائے تو ہر انسان اپنے دل میں مختلف قسم سے جذبات سموئے رہتا ہے اور اگر دل جذبات سے عاری ہو تو انسانی دل مردہ اقرار دے دیا جاتا ہے۔انسانی دل میں سب سے زیادہ جذبۂ غم کو اہمیت دی جاتی ہے۔اور جذبات میں غم اور درد کا جذبہ اور جذبات سے قوی تر ہوتا ہے۔

ظہیر جعفری نے مرثیہ میں انسانی جذبات کی بہت سی عکاسی پیش کی ہے۔جو کہ اقتضائے حال سے مناسبت بھی رکھتی ہیں۔مرثیہ میں امام حسینؑ کے لئے حُر کے جذبات اور حُر کے لئے امام حسینؑ کے جذبات کی عکاسی تو ہے ہی لیکن اس کے علاوہ حضرت محمدؐ،حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ کے جذبات کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔مرثیہ کا وہ بند ملاحظہ ہو جس میں بعد رسولؐ جناب فاطمہؑ کے جذبات کی عکاسی پر اثر انداز میں کی گئی ہے۔

ڈھائے گئے کیا کیا نہ ستم بنتِ نبی پر دروازے تک آئے ہوئے وہ ظلم کے اژدر
اسلام کو گودی میں لئے فاتحِ خیبر تھا باپ کا غم تازہ کہ پہلو پہ گرا در
اولادِ علیؑ میں ہے یہی پہلی شہادت
پہلو پہ گرا در ہوئی محسن کی شہادت
گریہ وہ شب و روز کا فرقت میں پدر کی اک موجۂ جاں سوز کہ آنکھوں سے رواں تھی
وہ دن کے اجالے میں بھی راتوں سیاہی امت کے ستم باپ کا وہ داغِ جدائی
جینے سے جو بیزار بہت ہو گئیں زہراؑ
رونے کی صدا بند ہوئی سو گئیں زہراؑ

زبان و بیان۔مرثیہ کی زبان سادہ اور طرز بیان روایتی ہے۔ مرثیہ میں کوئی بھی نیا پن نظر نہیں آتا۔ مرثیہ میں تفصیل و طوالت ہونے کے باوجود کہیں بھی تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا۔ مرثیہ میں تمام عناصر کو باقاعدگی سے برتا گیا ہے۔ مرثیہ میں حضرت حُرؑ اور فوج یزید کے مکالموں کو بھی ہنرمندی سے بیان کیا گیا ہے۔

پروردۂ آغوشِ رسولِ عربی ہیں   یہ مثلِ علیؑ دیں کے حصارِ ازلی ہیں
اک بولتا آئینۂ کردارِ علیؑ ہیں   جنت کے یہ سردار ہیں کوثر کے دھنی ہیں
چرچا سرِ افلاک ہے سلطانِ زمن کا
یہ علقمہ ورثہ ہے حسینؑ اور حسنؑ کا

تشبہات واستعارات کا استعمال۔مرثیہ میں تشبیہ کا استعمال کم ہوا ہے۔لیکن بصیرت کو استعارہ بنا کر پورہ مرثیہ تحریر کیا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

مشہور حریفانِ بصیرت کی ہے سازش   تا حدِ نظر درہم و دینار کی بارش
مسجد کی فضا ، خونِ بصیرت کی وہ تابش   کردار وہ دشمن بھی کرے جس کی ستائش
قاتل پہ کرم اپنے کیا حق کے ولی نے
شربت سے نواز ابنِ ملجم کو علیؑ نے

مرثیہ میں سارے عنصر خوبصورتی سے بُنے ہوئے ہیں، جنگ کی تصویر کشی ظہیر جعفری نے حقیقت مندانہ انداز میں کی ہے جس سے جنگ کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔شہادت کے بعد بین کے بیت بھی ظہیر جعفری نے اچھے تحریر کئے ہیں۔اس کے علاوہ مرثیہ میں صنائع و بدائع کا استعمال بھی ملتا ہے۔ مرثیہ کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس میں قبل رسولؐ اور پھر عہد رسولؐ اور پھر بعد رسولؐ مدینہ والوں کا حال واحوال انکی سوچ اور حضرت رسولؐ کی بیٹی اور ان کی اولادوں نے جو جو ظلم اٹھائے ان سب کو خوبصورت مگر مختصر انداز میں بیان کیا ہے۔ جو کہ شاید ہی کسی مرثیہ میں تحریر کیا گیا ہو۔

ناشر نقوی

ناشر نقوی کو بچپن سے ہی قصیدہ اور سلام پڑھنے کا شوق تھا اور اسی شوق نے انکا شمار جدید مرثیہ نگاری کی دنیا میں ایک منفرد مرثیہ گو میں کرایا ہے۔ ناشر نقوی نے بہت سے مرثیوں کی تخلیق کی جو اپنے منفرد اسلوب، انداز بیان اور موضوعات کے بناء پر عمدہ مرثیوں میں گنے جاتے ہیں۔ ناشر نقوی نے مرثیوں میں نئے الفاظ، نئے معنی، اچھوتے عنوانات اور نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے مرثیہ میں پورے مرثیہ کی تاریخ کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اور جیسے جیسے مراثی میں تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں انھوں نے اسی انداز سے اپنا اپنے انداز بیان اور الفاظ و معنی کو بھی جنبش دی ہے۔ یہ بالکل نیا تجربہ ہے۔

☆ دیدہ وری

یہ مرثیہ ان کا مشہور مرثیہ ہے، اور اپنے عنوان کے تحت اس کو امتیاز بھی حاصل ہے۔ مرثیہ کے تعلق سے نقوش نقوی لکھتے ہیں کہ۔

''اس مرثیہ میں انکھوں کے ایسے ایسے گوشے بیان کئے گئے ہیں جس سے شاید نسلِ نو کو واقفیت بھی نہ ہو مثلاً یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

تابِ نظارہ کہاں جو آنکھ کے منظر لکھوں آنکھ کو شعلہ لکھوں یا موجۂ کوثر لکھوں
سوز لکھوں ساز لکھوں ،اس کو نغمہ گر لکھوں آبدیدہ پتلیوں کو روشنی کا گھر لکھوں
بلبلا اٹھتی ہے اکثر اک ذرا سی پھانس سے
بند ہو جائے تو رشتہ ٹوٹ جائے سانس سے ؎

موضوع۔ مرثیہ میں ناشر نقوی نے 'آنکھ' کو موضوع بنا کر اپنی فکر پیش کی ہے اور ساتھ ہی حضرت عباسؑ کا احوال بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ناشر نقوی نے ساٹھ بند تحریر کئے ہیں۔ مرثیہ کا آغاز ناشر نقوی نے کچھ اس طرح کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

لکھ رہا ہوں مرثیہ عنواں بنا کر آنکھ کو دور رس افکار سے کرنا ہے خوگر آنکھ کو
فکر ہے کیسے بناؤں گا سمندر آنکھ کو کچھ اچھوتے کچھ نئے دینے ہیں منظر آنکھ کو
پئے بہ پئے پردے ہیں ان پردوں کے اندر سوچئے
آنکھ کی گہرائیوں کو زندگی بھر سوچئے

ناشر نقوی آنکھ کا تشبیہ سانس، غنچہ، خوشبو، موتی شبنم، چہرا، شعلہ، بجلی اور آگ سے کرتے ہوئے اسکو اخلاص وفا اور رحمت بتاتے ہیں۔ یہاں ناشر نقوی تلمیح کا استعمال کرتے ہوئے حضرت موسیٰ کے واقعہ کا بیان کرتے ہیں۔ اس مرثیہ میں آنکھ کے متعلق جملہ محاوروں کا مجموعہ بھی ہے اور آنکھ سے بینائی اور دور اندیشی کا جو پیغام ملتا ہے اس کی توضیح بھی ہے۔

آنکھ انسان کے جذبوں کو انکسار بخشتی ہے۔ ناشر نقوی مرثیہ میں شرون کمار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج بھی تاریخ میں ایسے بہت سے لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے نابینا ہوتے ہوئے بھی بہت سے بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں جو حیران کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد شاعر موجودہ دور کے ان لوگوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرے نظروں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی نابینا ہیں۔ وہ خود تو عیش سے زندگی جیتے ہیں مگر انکو اپنے ہی گھر میں بھوکے بیٹھے ماں باپ نظر نہیں آتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں سے رشتہ ہی توڑ دینا چاہیئے۔ آگے کے بندوں میں ناشر نقوی ایسے لوگوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سیلِ آنکھوں میں نہیں ایسے بھی ہیں کچھ بد نظر ڈھل چکے ہیں جنکے دیدے جنکی آنکھوں کے گھر
دیدہ و دانستہ اپنے حال سے ہیں بے خبر بے مروت، بے محبت بتنگِ غیرت بے اثر
دامنِ پتلی میں اشکوں کو پرو دیتی ہے آنکھ
اِنکی جانب دیکھتی ہے، خون رو دیتی ہے آنکھ

اسلوب۔ ناشر نقوی کے مراثی میں محاکات، منظر نگاری، جذبات نگاری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ مصائب کے بیان میں بھی تاثیر کی کمی ہے۔ کربلا کے عظیم واقعے کی عظمت بھی ان کے یہاں اس طرح نمایاں نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ دیگر مرثیہ گو شعراء کے یہاں موجود ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں نئی نہج اور نیا انداز بیان پیش کیا ہے۔ شاعر آنکھ کے ذریعہ موجودہ حال کی تصویر کشی کی ہے۔

حادثاتی طور پر جن کو نہیں ہے دِکھتا صاحب بینا ہیں وہ رکھتے نہیں آنکھوں میں وفا
لیکن ایسے آنکھ والے بھی ہیں جو ہیں بے حیا ہم نے وہ آنکھوں کے بھی دیکھے ہیں اندھے بارہا
جن کو اپنے خون کے رشتے نظر آتے نہیں
دوسروں کی جو خوشی دل میں سما پاتے نہیں

ہیں مرے پیشِ نظر ایسے بھی کچھ دیدہ وراں کور جنکی آنکھ ہے غیرت ہے جنکی نوحہ خواں
عیش خود کرتے ہیں اور بھوکی ہے گھر میں انکی ماں اس پہ یہ دعوہ تمدن کے ہیں میرِ کارواں
ایسے بے غیرت سے رشتہ توڑ دینا چاہیئے
بے حیا آنکھوں کو بڑھ کر پھوڑ دینا چاہیئے

کردار نگاری۔ مرثیہ میں ناشر نقوی نے آنکھ کو کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ آنکھ جس نے کربلا کے ہر مناظر کی شاہد ہے۔ وہ آنکھ جس نے زندگی کے ہر رنگ کو دیکھا ہے۔ وہ رشتوں کو بنتے اور بگڑتے ہوئے بھی دیکھتی ہے۔ وہ بھائی بھائی میں انتشار پیدا ہوتے ہوئے بھی دیکھتی ہے۔ آنکھ سوتے جاگتے زندگی کو رنگ بدلتے ہوئے دیکھتی ہے۔ اس نے کربلا کی ہر جنگ کو دیکھ ہے۔ اس نے کربلا میں امام حسینؑ کی بے بسی اور غریبی کو بھی دیکھا ہے اور ان کی شجاعت کو بھی جانا ہے۔ آنکھ امام حسینؑ کی شخصیت کو یوں بیان کرتی ہے۔

جسکے پیکر میں ڈھلی تھی حق نوائی وہ حسین آسمانوں تک وہی جس کی رسائی وہ حسین
جسکی واقف کا رتھی مشکل کشائی وہ حسین نوبت میں جسکے تھی ساری خدائی وہ حسین
شعلۂ بینائی رکھتا تھا حواس و ہوش میں
کتنے دریا سو رہے ہیں پیاس کی آغوش میں

زبان و بیان۔ مرثیہ کی زبان سادہ اور عام فہم زبان ہے۔ اپنی بات کو قاری کے سامنے رکھنے کے لئے شاعر صنعتوں کے علاوہ محاوروں کا بھی بخوبی استعمال کرتا ہے۔ محاوروں کا استعمال بھی انھوں نے نئے انداز سے تحریر کیا ہے۔ مرثیہ ''دیدہ وری'' میں آنکھ کے کئی محاوروں کو انھوں نے ایک ہی بند میں جس خوبصورتی سے برتا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

آنکھ لگنا، نیند کا آنا بھی ہے قربت بھی ہے — آنکھ پھرنا، بے مروت ہونا بھی، نفرت بھی ہے
آنکھ مچنا، موت بھی ہے دہر سے ہجرت بھی ہے — آنکھ کھلنا، ہوش میں آنا بھی ہے، عبرت بھی ہے
نور آنکھوں سے ہے ہستی کی ضیا آنکھوں سے ہے
آدمی کی عزت و شرم وحیا آنکھوں سے ہے

تشبیہات واستعارات کا استعمال۔ تشبیہات واستعارات کا استعمال ناشر نقوی نے مرثیہ میں بھرپور اور خوبصورت انداز سے کیا ہے۔ مرثیے میں نئے کنایوں اور استعارے کا استعمال کیا گیا ہے۔ لفظیات کا انتخاب اور ان کی جدید معنویت کو بھی سلیقے سے پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ مرثیے میں جہاں سلاست، نفاست، ترنم اور ادبی مٹھاس ہے وہیں ان کے انداز بیان نئی آفاقیت کا رنگ اختیار کیا ہوا ہے۔

لکھ رہا ہوں مرثیہ عنواں بنا کر آنکھ کو — دوررس افکار سے کرنا ہے خوگر آنکھ کو
فکر ہے کیسے بناؤں گا سمندر آنکھ کو — کچھ اچھوتے کچھ نئے دینے ہیں منظر آنکھ کو
پئے بہ پئے پردے ہیں ان پردوں کے اندر سوچئے
آنکھ کی گہرائیوں کو زندگی بھر سوچئے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ناشر نقوی نے اپنے مرثیوں میں سلاست روانی اور برجستگی کے ساتھ محاورہ بندی، رمز و کنایہ، ایجاز واختصار اور ضائع بدائع کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ مرثیوں میں محاورہ بندی، رمز و کنایہ تو انیس اور دبیرؔ کے مرثیوں میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن جس سلاست وروانی اور گہرائی وگرائی کے ساتھ محاروہ بندہ کرتے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ناشر نقوی نے جدید مرثیہ نگاری میں نئے نئے تجربات کر کے مرثیہ کو نئی روش دی ہے۔

احسن شکارپوری

حیدرآباد کے مشہور نوحہ گو شعر اور مرثیہ گو نے اب تک بہت سے مرثیے لکھے اور پڑھے ہیں جو کہ کافی مشہور اور مقبول ہوئے ہیں۔ انھوں نے اب تک ۱۴ مرثیے کی تخلیق کی ہے جسمیں کی ۴ مرثیے مطبوعہ اور دس غیر مطبوعہ ہیں۔ میں نے ان کے صرف مطبوعہ مرثیوں کو ہی پڑھا ہے اور اس پر تنقید و تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیہ میں ایک ہی اسلوب استعمال کیا ہے۔ احسن شکارپوری کے سارے مرثیوں میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ ایک ہی واقعہ کو الگ الگ انداز سے پیش کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، اور اس مشکل کو احسن شکارپوری نے بڑی آسانی سے اپنے مرثیہ میں بیان کیا ہے۔

☆ شباب

شباب یعنی جوانی۔ یہ مرثیہ کربلا کے جوان شہید حضرت علی اکبرؑ کے حال کا تحریر کیا گیا ہے جس میں شباب کو دین اسلام کا چہرہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ حضرت علی اکبرؑ کو شباب دین بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

کھولے ہیں آج نبیؐ کے صفات صحرا میں　　عروج پر ملے عزم و ثبات صحرا میں
فضیلتوں کی ہے اک کائنات صحرا میں　　شباب دین ہے اکبرؑ کی ساتھ صحرا میں
بلائیں لیتی ہے گیسو کبھی سنوارتی ہے
بٹھا کے سامنے اکبرؑ کو ماں نہارتی ہے

موضوع۔ خدا کی تعریف وتوصیف بیان کرتے ہوئے پنجتن کی عظمت کا بیان کرتے ہوئے احسن شکارپوری لکھتے ہیں کہ اللہ ایک چھپا ہو خزانہ تھا اور جب اس پروردگار عالم نے چاہا کہ وہ پہچانا جائے تو اس نے سب سے پہلے نورِ نبیؐ کی خلقت اور اس نور سے پانچ پنجتن کو پیدا کیا۔ اور اس کے چودہ معصومینؑ کی خلقت کی، اور ان سب کو عظمت کی بلندی تک پہنچایا۔ یہ بند دیکھئے۔

چھپا ہوا وہ خزانہ تھا کہہ رہا ہے وُہی　　جب اس نے چاہا کہ ہو عالمین میں وہ جلی
توسب سے پہلے کیا خلق اس نے نورِ نبیؐ　　پھر اس نے نور کو تصویرِ پنجتنؑ بخشی
خدا نے پھر شجرِ طیّبہ کہا اس کو
تصوّرات بشر سے سِوا کہا اس کو
نبیؐ وزہرہؑ ہوں شبّر ہوں یا حسینؑ وعلی　　علیؑ و باقرؑ و جعفرؑ کہ موسیٰؑ مدنی
رضاؑ، تقیؑ و نقیؑ وحسنؑ کہ ہوں مہدی　　سبھی میں نورِ یگانہ ہے شک نہیں کوئی
انہیں کو زیبا ہے عالم میں کلّنا کی سند
انہی کو حق نے عطا کی ہے اِنّما کی سند

مرثیہ میں احسن شکارپوری ''شباب'' کو چہرہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ چہرہ کے بند کو تحریر کرتے ہوئے جن الفاظ کو شباب کی تعریف میں صرف کیا گیا ہے وہ اپنے اندر خود شباب آشکار حسن ہے۔ جس سے ان کے کلام کی فصاحت و بلاغت کا خوب اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شباب کی تعریف بیان کرتے ہوئے شاعر اس کو علی اکبرؑ سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ شباب جس کو نہ تو کوئی حکومت جھکا پائی اور نہ ہی اس کو تکبر جیت پائی۔ شباب تو اسرار زیست سے معمور ہوتا ہے، اور اسی شباب کو حضرت علی اکبرؑ کی ذات پر فخر ہے۔ اس کو بقا علی اکبرؑ سے ملی۔ جس سے سرِخم دین پیمبرؐ نے اس کی جوانی مانگی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

شباب کو جو عطا کر چکے بقا اکبرؑ　　ادب سے دیں نے کہا اے شبیہؑ پیغمبرؐ

غم والم سے ضعیفی کے ہوں بہت مضطر　　شباب مانگنے آیا ہوں آپ کے در پر
کیا ہے گردشِ دوراں نے ناتواں مجھکو
خدارا لطف وکرم سے کریں جواں مجھکو

اسلوب۔ مرثیہ میں بیانیہ اسلوب کا استعمال کیا گیا ہے۔ احسن شکار پوری نے مرثیہ میں ہر اجزاء کو بڑی تفصیل اور عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ آج کل کے زیادہ تر مرثیہ گو شعراء مرثیہ کے سارے لوازم استعمال نہیں کرتے ہیں۔ لیکن احسن شکار پوری نے اس روایت کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس کو مرثیہ میں قائم رکھا ہے۔ مرثیہ کے سارے عناصر خوبصورتی اور ہنرمندی سے تحریر کئے گئے ہیں۔ مرثیہ میں رجز کا بیان ملاحظہ ہو جس میں حضرت علی اکبرؑ اپنا تعارف شاہانہ انداز سے کرتے ہیں۔

گرج کے بولا یہ شہزادہ اے سپاہ سقر　　نبیؐ کے لال کا دلبر ہوں، نام ہے اکبر
حسنؑ ہیں تایا مرے، دادا ہیں مرے حیدرؑ　　بزرگ میرے عرب کے ہیں سید وسرور
یہ جان لو کہ نبیؐ زادی میری دادی ہے
جو فضلِ باری سے جنت کی شاہزادی ہے

کردار نگاری۔ سامعین کو متاثر کرنے کے لئے مرثیہ گو کربلا کے افراد کو بطور کردار پیش کرتا ہے۔ جس سے ذہنی اور جذباتی طور پر اشخاص مرثیہ سے قاری کا خاص تعلق پیدا ہو جائے۔ مرثیہ میں اس کی کافی اہمیت ہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر مرثیہ گو نے مرثیہ میں ڈرامائیت کا وہ عنصر پیدا کیا جس سے ان کے سامعین خود کو واقعہ کے قریب محسوس کرنے لگتے ہیں۔ احسن شکار پوری نے مرثیہ میں حضرت علی اکبرؑ کا کردار پیش کیا ہے۔ حضرت علی اکبرؑ جو کہ شبیہ رسولؐ بھی تھے، یہ امام حسینؑ کے بڑے بہادر بیٹے تھے، جن کے نام سے ہی فوج عشقیہ کا نپ اٹھتی تھی۔ ان کے اندر حضرت رسولؐ کے ساری صفات موجود تھی۔ اس لئے جب بھی امام حسینؑ کو اپنے نانا کی یاد آتی تو وہ حضرت علی اکبرؑ کے چہرے کی زیارت کر لیا کرتے تھے۔ مرثیہ میں احسن شکار پوری حضرت علی اکبرؑ کی شجاعت اور بہادری کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

تھی شہؑ کے پاس جو اس قافلہ کی سرداری　　سپردِ اکبرؑ و عباسؑ تھی نگہداری
نظر انھیں کی تو اعدا پہ ضرب تھی کاری　　شجاعتوں کے جہاں میں تھی ان کی سالاری
انھیں سے گردشِ دوراں بھی تھرتھراتی تھی
ہوا بھی ان کی جلالت سے خوف کھاتی تھی

شبیہہؑ حضرت سردارؐ انبیاؑ اکبر　　سکونِ قلب شہنشاہِ کربلا اکبرؑ
شکوہِ پردۂ ناموس ِ مصطفیٰؐ اکبر　　مزاج و ہیبت و انداز ِ مرتضیٰؑ اکبر
ہے سب کو علم اجل کا پیام اکبرؑ ہے
عدو کے آگے علیؑ کے حُسام اکبرؑ ہے

جذبات نگاری۔ مرثیہ نگاری میں ایک جذبات نگاری کا بھی ہوتا ہے جو کہ کافی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔اس کا اثر انسان کے جذبات واحساسات پر سیدھا ہوتا ہے۔ایک شخص نے واقعہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن جب وہ کسی دوسرے کی زبان سے اسے سنتا ہے تو ان کے ذہن پر وہی تصویر ابھر کر آجاتی ہے اور وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا ہوگا۔مرثیہ کے کسی مثلاً جنگ کے واقعات کو ہی لے لیجیئے۔ہم مرثیہ پڑھتے ہیں تو جنگ کے سارے مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔یا جب کوئی ماں اپنے بیٹے کو جنگ کے لئے رخصت کرتی ہے تو اس ماں کے جذبات کو قاری بخوبی محسوس کرتا ہے۔مرثیہ میں احسن جناب زینبؑ کے جذبات واحساسات کو پیش کرتے ہیں جو کہ علی اکبرؑ کی پھوپھی ہیں انھوں نے اکبرؑ کو پیدا تو نہیں کی تھی لیکن ماں بن کر انکو پالا تھا۔ان کے جذبات ملاحظہ ہو۔

لگا کے سینے سے اکبرؑ کو یہ پھوپھی نے کہا   اے بیٹا تا بہ سحر میرے سامنے رہنا
ہر ایک سمت ہے میداں میں موت کا سایا   دعا ہے عمر مری بھی تجھی کو دیدے خدا
علی کے لال کی آنکھوں کا تو اجالا ہے
بڑے ہی نازوں سے زینبؑ نے تجھ کو پالا ہے

زبان وبیان۔ مرثیہ کی زبان صاف اور سادہ اور روایتی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔اس میں موضوع تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔پورا مرثیہ کہیں بھی اپنے عنوان سے ہٹتا نظر نہیں آتا۔مرثیہ میں برتا گیا ایک اک الفاظ انفرادیت کا حامل ہے۔یہ بند ملاحظہ کیجیئے۔

یہ رن میں شہؑ نے پکارا ، نظر نہیں آتا   صدا دو پھر سے اے بیٹا، نظر نہیں آتا
ہوا پدر وہ صدمہ ، نظر نہیں آتا   ہوا ہے چھلنی کلیجہ نظر نہیں آتا
دئے جو یوسفِؑ دوراں کو زخم امّت نے
تو ساتھ چھوڑا تھا شبیرؑ کی بصارت نے

تشبیہات واستعارات کا استعمال۔ شاعر نے مرثیہ میں تشبیہ،استعاروں،کنایوں کے علاوہ صنائع و بدائع کو بھی مرثیہ میں فنکاری کے ساتھ برتا ہے،جس سے اس کے شاعرانہ رنگ میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

زمانے بھر میں بہت ارجمند ہے اکبر   ستم ہے زہرِ ہلاہل تو قند ہے اکبرؑ
سبھی کے درد میں اک دردمند ہے اکبرؑ   ہے گلستاں کی ضرورت سگند ہے اکبر
یہ گل صفت ہے یہ گل فام وگل بداماں ہے
سکونِ قلب نبیؐ کا ازل سے ساماں ہے

اپنی مرثیہ نگاری سے احسن شکارپوری نے یہ ثابت کر دیا کہ ایک اچھے مرثیہ نگار بھی ہے۔انھوں نے مرثیہ کے تمام لوازم کا استعمال بھی کیا ہے۔مرثیہ میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں دبیرؔ کا رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے۔لیکن پھر

بھی ان کا تقابل مرزا دبیرؔ کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ جولوازمات، اسلوب، ہیئت اور سلاست وروانی دبیرؔ اور میر انیسؔ کے یہاں ملتی ہے وہ ان کے مرثیوں میں نہیں ملتی۔

ڈاکٹر سید علی امام گوہر ''گوہرؔ لکھنوی''

اردو مرثیہ نگاری کے نایاب گوہر اور انیسؔ وشدیدؔ کے جانشین گوہرؔ لکھنوی آج لکھنؤ میں اپنی مرثیہ نگاری کا جادو بکھیرے ہوئے ہیں۔ گوہرؔ لکھنوی چونکہ اپنے مرثیہ کی اصلاح بھی شدیدؔ سے ہی کرتے تھے اس لئے ان کے کلام میں وہ ساری خصوصیت موجود ہے جو شدیدؔ کے مرثیوں میں ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں فصاحت وسلاست کے ساتھ ساتھ بلاغت وندرت کی کہیں کمی نظر نہیں آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گوہر ذہین شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی یہ ذہانت مرثیوں میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

☆ غل یہ ہے سبطِ رسولؐ دوسرا آتے ہیں

قدیم طرز پر لکھا ہوا یہ ایک جدید مرثیہ ہے جس میں شاعر نے کربلا کے میدان میں دو بہادر سپاہوں کے درمیان ہونے والی معرکہ آرائی کو تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ مرثیہ اکسٹھ بندوں پر مشتمل ہے جس میں امام حسینؑ اور تمیم کی جنگ کے مناظر کو برتا گیا ہے، جو کہ کربلا کے میدان میں روزِ عاشورہ ہوئی تھی۔

موضوع۔ مرثیہ میں امام حسینؑ کا مقابل فوج میں تمیم سے آمنے سامنے جنگ کرنے کے تمام مناظر حرکات و سکنات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ مرثیہ کی جدّت ہے، جو کہ شاید ہی کسی نے کی ہو۔ مرثیہ کا آغاز کربلا میں امام حسینؑ کی آمد سے کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ امام حسینؑ رسولؐ اکرم کو کس حد تک عزیز تھے۔ دوسرے بند میں ان کے والد حضرت علیؑ کی فضیلت کا بیان تحریر ہوا ہے۔ اور ساتھ ہی اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ جس کا نانا رسولؐ ہو اور جس کا باپ اس حد درجہ بہادر ہو کہ خیبر کے در کو اپنی انگلیوں سے اکھاڑ دے تو اسکا بیٹا کتنا دلیر اور بہادر ہوگا۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

غل یہ ہے سبطِ رسولؐ دوسرا آتے ہیں   روح و جانِ تنِ محبوبؐ خدا آتے ہیں
وارثِ تیغ شہ قلعہ کُشا آتے ہیں   پسرِ شیرِ خدا بہر وغا آتے ہیں
غیظ اگر آگیا دنیا تہہ و بالا ہوگی
اک اشارے میں قیامت ابھی برپا ہوگی

اُس کے فرزند ہیں یہ جو کہ ہے قتّالِ عرب   خاک میں مل گیا تلوار سے جس کی مرحب
ضرب تھی نیزۂ سر تیز کی یا حق کا غضب   کیوں نہ ہو شیرِ خدا آپ کا ہے ایک لقب
سینے شق کر کے کلیجوں کو بھی پھاڑا جس نے
انگلیوں سے درِ خیبر کو اکھاڑا جس نے

مرثیہ میں شاعر نے ہیرو کے تعارف کے ساتھ ساتھ ان کے مقابل میں آنے والے دشمن کا بھی تعارف بیان کیا ہے۔حضرت امام حسینؑ سے جنگ کرنے والے تمیم کا تعارف جو ہر لکھنوی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ جو اس قدر بہادر تھا کہ وہ جنگل سے شیر پکڑ کر لاتا تھا۔ بند ملاحظہ ہو۔

ایسا دیکھا نہیں انسان عجیب الخلقت سرو گردن ہمہ تن پیلِ دماں کی صورت
سرخ انگار اسی آنکھوں میں غضب کی ہیبت بال پھولے ہوئے داڑھی کے وہ کالی رنگت
ایک ایک بال ہواؤں میں جو لہراتا ہے
چہرہ ناری کا دھواں دھار نظر آتا ہے

گوہر لکھنوی نے ان بہادر سپاہوں نے جو ہتھیار استعمال کئے ان کی تفصیل لکھی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گوہر لکھنوی آلات حرب اور ان کے جوہر سے بھی واقف تھے۔

اسلوب۔ اسلوب کے سلسلے میں زیادہ تر اثر شدیؔد کا لیا ہے اس کے علاوہ اس میں انیسؔ کے اسلوب کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔جس سے ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت کا حسین امتزاج پیدا ہو گیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ میدان جنگ میں تلوار کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ بلا تلوار کسی انسان کا سپاہی ہونا بعید از عقل تصور کیا جاتا ہے۔اسی طرح میدان جنگ میں گھوڑا بھی اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔میدان جنگ میں گھوڑا سپاہی کے لئے اس کا رفیق اور مونس ہوتا ہے اور اس کی شجاعت کا نقیب بھی۔ان دونوں کا بیان گوہر لکھنوی نے مرثیہ میں ہنرمندی سے کیا ہے۔انھوں نے میدانِ جنگ کی منظر کشی جس انداز سے کی ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتی۔ملاحظہ ہو۔

وہ اٹھیں بانگیں وہ چلنے لگے تلواروں کے وار وہ مچلنے لگے گھوڑے وہ اڑا گرد غبار
لڑکے تیغوں سے وہ آنے لگی پیہم جھنکار دونوں باگوں پہ وہ مڑنے لگے دونوں رہوار
گھٹ گئی تاب و تواں ڈر سے جگر داروں کی
وہ زمیں ہلنے لگی ٹاپوں سے رہواروں کی

کردار نگاری۔ عام طور سے مرثیہ نگار اپنی مرثیہ میں ہیرو حضرت امام حسینؑ یا انکی اولاد یا پھر انکے کسی انصار و اقرباء کو بناتے ہیں اور ان کے کردار کی تصویر پیش کرتے ہیں۔لیکن ان کے علاوہ مرثیہ میں منفی کردار بھی ہوتے ہیں جیسے شمر، یزید بن معاویہ، عبیداللہ ابن زیاد، حرملہ بن کاہل، حارث اور تمیم وغیرہ۔ یہ ایسے منفی کردار ہیں جو کہ کربلا کی جنگ میں اپنی الگ انفرادیت رکھتے ہیں۔اگر یہ نہ ہوتے تو مرثیہ کی تشکیل ممکن ہی نہ ہو۔کربلا کی حق اور باطل کی لڑائی میں انھیں بطور منفی علامت کے پیش کیا جاتا ہے۔

مرثیہ میں گوہر لکھنوی نے اہم کردار کے ساتھ ساتھ منفی کردار کو بھی پیش کیا ہے۔انھوں نے امام حسینؑ کے کردار پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ تمیم کے کردار کی بھی تصویر کشی کی ہے۔گوہر امام حسینؑ کی کردار کشی انکے والد کے کردار کو بیان

کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس کے فرزند ہیں یہ جس کا لقب ہے حیدرؑ — جس نے گہوارے میں دوٹکڑے کیا ہے اژدر
جولڑے لشکرِ جنّہ سے وہ ہیں ان کے پدر — نہ چھپے زیرِ زمیں تیغ کے جن کی جوہر
دیو مخالف تھے انھیں آپ نے فی النّار کیا
جنگ میں بیرِ الم کے بھی کنواں پار کیا

اب ذرا منفی کردار تمیم کے اُپر بھی نظر کیجیئے جو شجاعت کا دھنی تھا لیکن بہت ہی لالچی اور بدکردار تھا۔اس کی تصویر کشی گوہران الفاظ سے کرتے ہیں۔

سن کے انعام گراں مایہ و بے حدوشمار — آ گیا اور بھی لالچ میں شقی و مکار
دل میں کچھ سوچ کے جلدی بہ غضب وغدار — نکلا لشکر سے تمیم ستم آرا یک بار
جو کہ بدخو ہو مزاج اپنا وہ کیوں کر بدلے
پیلِ بدمست نے چنگھاڑ کے تیور بدلے

زبان وبیان۔ گوہرلکھنوی کی مرثیہ میں انداز بیان اوراسکی زبان پرنظر ڈالی جائے تو اسمیں بھی شدید کی زبان کا رنگ نظر آتا ہے۔لیکن جس طرح گوہر نے ایک رزمیہ مرثیہ کو بھی موضوع بنایا ہے جس میں انھوں نے دوافراد کی جنگ کو بڑے ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔جس میں انھوں نے کربلا کے میدان میں ہونے والی تمیم اورامام حسینؑ کی جنگ کی تصویر کشی کو حقیقی انداز میں پیش کی ہے، وہ بےنظیر ہے۔انھوں نے مرثیہ میں جس طرح تمیم کے رجز اوراس کی شخصیت کو بھی بیان کیا ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے مرثیہ گوشاعر کے یہاں تحریر کیا گیا ہوگا۔تمیم کی شخصیت کا بیان انھوں نے یوں کیا ہے۔

ڈال دے یہ نظر گرم تو جل جائے پہاڑ — باغ عالم کو کرے تند نگاہوں سے اجاڑ
ضربت مشت سے ہو کوہ سے سینے میں ڈراڑ — صاف درہائے جہنم ہیں کہ چھاتی کے کنواڑ
ذرے لو دیتے ہیں پڑتا ہے جو سایہ اس کا
بھاپ سے منھ کی سیہ فام ہے چہرہ اس کا

تشبیہات واستعارات کا استعمال۔ اس مرثیہ میں گوہرلکھنوی نے بہت عمدگی سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔مرثیہ میں انھوں نے تلمیح،استعارہ،مبالغہ اورتشبیہ کا استعمال کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

پہنچا جنگاہ میں جس وقت وہ مردودِ خدا — تھم کے اشعار رجز پڑھنے لگا اہل دغا
تھا یہ مطلب کہ میں ہوں رستمِ میدانِ وغا — زور وقوت میں ہوں سہرابؔ وتہمتنؔ سے سوا
یوں ہنر اپنی شجاعت کے میں دکھلاتا ہوں

گوہرلکھنوی کے مرثیہ کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے کلام میں فکری عنصر اور فن علیٰ درجہ کا ہے۔ان میں گہرائی اور گیرائی بھی ہے اور تغزل کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔مرثیہ میں کہیں کہیں انیسؔ کا رنگ بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔انیسؔ کی فصاحت و بلاغت کی جھلک ان کے مرثیہ میں بھی نظر آتی ہے۔ملاحظہ ہو۔

پہنچا جنگاہ میں جس وقت وہ مردود خدا　　تھم کے اشعار رجز پڑھنے لگا اہل وغا
تھا یہ مطلب کہ میں ہوں رستم میدان وغا　　زور قوت میں ہوں سہرابؔ و تہمتنؔ سے سوا
یوں ہنر اپنی شجاعت کے میں دکھلاتا ہوں
شیر کو باندھ کے جنگل سے پکڑ لاتا ہوں

انیسؔ کی فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح الفاظ کا استعمال ایسے کرتے ہیں جیسے الفاظ خود ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں اور یہی خوبی گوہر کے مرثیہ میں بھی نظر آتی ہے۔

باقرمحسن

مرثیہ نگاری کی دنیا میں باقرمحسن بھی ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔جدید مرثیہ نگاری میں باقرمحسن نے نئے تجربے کر کے اس کو وسعت بخشی ہے۔انکی حیثیت حیدرآباد کے ابھرتے ہوئے شاعر کی ہے اور جدید مرثیہ نگار کی حیثیت سے انھیں پہچانا جاتا ہے۔باقرمحسن نے مرثیہ کے تمام اجزاء کو برتا ہے اور اس صنف میں طبع آزمائی کا کمال بھی یہی ہے کہ مرثیہ گو اجزائے مرثیہ سے واقفیت رکھتا ہو اور اس کا لفظ قلم پیش کشی کا ہنر رکھتا ہو۔

☆ **جہاد**

جہاد ایک ایسا نام ہے جسکا موجودہ دور میں غلط بیانی سے کام لیا جارہا ہے۔جہاد کو دہشت گردی کے نام سے پہچانا جارہا ہے۔اسی غلط فہمی کو مٹانے کے لئے باقرمحسن نے اس سلگتے ہوئے موضوع کو مرثیہ کی بنیاد بنایا ہے، اور صحیح معنیٰ میں جہاد کا مفہوم بتایا ہے۔

موضوع۔سماج کا باشعور طبقہ جانتا ہے کہ جہاد بہت حساس موضوع ہے، جہاد اصل میں کیا ہے اور اسے کیا بنادیا گیا ہے اسی اہم موضوع کی طرف باقرمحسن نے توجہ دلائی ہے۔ باقرمحسن کا یہ مرثیہ غیر مطبوعہ ہے، جس کو انھوں نے ۶۳ بندوں میں تحریر کیا ہے۔اچھوتے موضوع پر لکھا گیا یہ مرثیہ ہمیں موجودہ حالات کے ایک بڑے مسئلہ سے روبرو کراتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے پروپگنڈے کی وجہ سے عام لوگوں کے ذہن میں جہاد یہ لفظ دہشت گردی سے منسلک ہوگیا ہے۔مرثیہ کے آغاز میں جہاد کے وجود میں آنے کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے قاری کو اصل جہاد سے روشناس کرایا ہے۔مرثیہ کا چہرہ باقرمحسن نے جہاد کو بنایا ہے۔مرثیہ کا آغاز وہ یوں کرتے ہیں۔

اک عجب انداز سے دنیا میں جاری ہے جہاد　　شکل میں دہشت کی اب ذہنوں پہ طاری ہے جہاد
ہر دلِ مومن پہ گویا ضربِ کاری ہے جہاد　　اہلِ حق کو باعثِ توہین و خواری ہے جہاد

جس کو نازوں سے جری اذہان میں پالا گیا
اس عبادت کو بہت بدنام کر ڈالا گیا

مرثیہ میں جہاد کے پیدا ہونے کے وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے باقر محسن لکھتے ہیں کہ جہاد پیدا ہونے کا سبب نفرت ،بغض اور بھائی بھائی میں انتشار ہے۔ ہر ملک میں شورش ہے جسکی وجہ سے جہاد پیدا ہو جاتا ہے۔اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے باقر محسن کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ چاہے وہ ملک عراق ہو یا پاکستان یا ہندوستان ہو جہاد پھیلا ہوا ہے۔لیکن اصل جہاد ہوتا کیا ہے،اصل میں جہاد کہتے کس کو ہیں اس کا علم آج کسی کو نہیں ہے۔باقر محسن لکھتے ہیں۔

بے قصور انسانوں پر حملہ نہیں ہوتا جہاد   لازمہ جبر و تشدد کا نہیں ہوتا جہاد
زندگی پر موت کا سایا نہیں ہوتا جہاد   جیسا جاری آج ہے ویسا نہیں ہوتا جہاد
ہے جو تعریف جہاد اس کا خلاصہ چاہئے
نام پر اس کے تشدد کا جانا چاہئے

جذبۂ صبر و رضائے حق کا مظہر ہے جہاد   صبرِ آدمؑ قتل پر بیٹے کے یکسر ہے جہاد
نوح کا وہ اضطرابِ قلبِ مضطر کا جہاد   دیکھنا بیٹے کی غرقابی کا منظر ہی جہاد
عزم ابراہیمؑ کا باطل سے ٹکرانا جہاد
آتشِ نمرود سے ڈرنا نہ گھبرانا جہاد

اسلوب۔مرثیہ میں بیانیہ اور ڈرامائی اسلوب کا استعمال کیا گیا ہے۔مرثیہ میں علی اصغرؑ کی شہادت کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔شہادت کے بعد علی اصغرؑ کو خیمہ میں لانے اور ماں کے بین سے اشک اپنے آپ آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں۔مرثیہ میں ایک بین ذوالفقار کا بھی بیان کیا گیا ہے۔جب امام حسینؑ ذوالفقار سے ننھی سی قبر کھود رہے تھے تو تلوار کچھ اس طرح بین کرتی نظر آئی۔ملاحظہ ہو۔

دست حیدرؑ میں رہی جب تک کیا میں نے قتال   توڑ دیں تیغیں کئی آیا نہ مجھ پر ایک بال
آج شہ نے کام وہ مجھ سے لیا جو تھا محال   قبرِ اصغرؑ کھود کر میں ہو گئی یا رب نڈھال
شاہ نے تو صبر کا یہ معجزہ دکھلا دیا
فرض کی تکمیل نے لیکن مجھے پگھلا دیا

مرثیہ کو باقر محسن تبھی مرثیہ مانتے ہیں جب تک اس میں مرثیہ کے پورے عناصر نہ تحریر کئے جائے۔اس لئے انھوں نے مرثیہ میں تمام عناصر مرثیہ کا استعمال بخوبی کیا ہے۔عام طور سے حضرت علی اصغرؑ کے مرثیہ میں رخصت کے بندوں میں گھوڑے کی تعریف نہیں بیان کی جاتی ہے کیوں کہ وہ امام حسینؑ کی گود میں میدان میں گئے تھے۔اور نہ ہی تلوار کا بیان ملتا ہے۔لیکن باقر محسن نے عنصر مرثیہ کو پورا کرنے کے لئے امام حسینؑ کے ہاتھ کو رہوار اور حضرت علی اصغرؑ کی زبان کو

تلوار سے تشبیہ دی۔گھوڑے کی تعریف کا یہ بند دیکھئے۔

ہاں وہ مرکب راکبِ دوشِ رسول پاکؐ ہے شیرِحق کا شیر دلدارِ شہہؐ لولاک ہے
جس پہ صدقے جرأت و ہمت یہ وہ بے باک ہے سرمۂ صبر و رضا اس کے قدم کی خاک ہے
جس کو راس آئے یہ سرمہ ہیں وہ آنکھیں بے مثال
جو عطا کردہ ہوں اس کی وہ نگاہیں بے مثال

تلوار کی تعریف ملاحظہ ہو۔

پھر دہن کے میان سے تیغِ زباں باہر ہوئی جائزہ لشکر کا لیکر خشک ہونٹوں پر رکی
صرف اس کو دیکھ کر فوجوں پہ چھائی مردنی کیا نرالی تیغ تھی نہج بلاغہ کی کلی
کر گئی اعدا کو پسپا ایک حلقہ گھوم کر
بزدلوں کو خاک چٹوا دی ادا سے جھوم کر

کردار نگاری۔مرثیہ میں حضرت علی اصغرؑ کو ایک ننھے مجاہد کے کردار میں پیش کیا گیا ہے۔وہ ننھا مجاہد جس کی عمر ابھی صرف چھ ماہ ہی کی ہے۔جو نہ کہ میدان میں جا سکتا ہے اور نہ ہی تلوار اٹھا سکتا ہے۔لیکن پھر بھی اس نے ایسی جنگ کی جو کہ کربلا کی تاریخ میں درج ہوگئی۔ان کے علاوہ مرثیہ میں امام حسینؑ کا کردار بھی پیش کیا ہے۔حضرت امام حسینؑ کا کردار مرثیہ میں تمام تر شجاعت کے باوجود ایک بے بس و مجبور باپ کی صورت میں ابھرتا ہے۔

ان انسانی کرداروں کے علاوہ باقر محسن نے مرثیہ میں جھولے اور تلوار کو بھی کردار کی شکل میں ابھارا ہے۔ان کے یہ کردار بولتے،بات کرتے اور روتے بھی ہیں اور ساتھ ہی اپنے جذبات کی عکاسی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔مرثیہ میں تلوار کا اس وقت کا بیان دیکھئے جب امام حسینؑ اپنے ننھے شیر خوار کی قبر تلوار سے بناتے ہیں۔

دستِ حیدرؑ میں رہی جب تک کیا میں نے قتال توڑ دیں تیغیں کئی آیا نہ مجھ پر ایک بال
آج شہؑ نے کام وہ مجھ سے لیا جو تھا محال قبر اصغرؑ کھود کر میں ہوگئی یا رب نڈھال
شاہؑ نے تو صبر کا یہ معجزہ دکھلا دیا
فرض کی تکمیل نے لیکن مجھے پگھلا دیا
ریت میں شہؑ نے اتارا میں لرز کر رہ گئی سینۂ گیتی میں دوبارہ بحکم شہؑ گئی
میں یہ سمجھی ڈھ گئی کاؤ زمیں اب ڈھ گئی المدد یا حیدرؑ کرار کہہ کر سہہ گئی
کانپتے دیکھا فضاؤں میں پر جبرئیل کو
شاہؑ آمادہ ہوئے پھر دفن کی تکمیل کو

جذبات نگاری۔باقر محسن کے مرثیہ میں جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔جذبات نگاری کے ضمن میں

ہمیں ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ جذبات نگاری میں صرف گریہ و ماتم کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وہ جز ہے جس سے قاری کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے۔ مبکی یا غمزدہ کے مرتبہ کا لحاظ بہت کم رکھا جاتا ہے۔ حضرت حسینؑ جیسے عالی مرتبت اور پیکر صبر و تحمل والی شخصیت کو اا اپنے ششماہِ بیٹے کو جسکی شہادت خود ان کے ہاتھوں میں ہو، قبر میں لٹاتے ہوئے ان کے جذبات کا بیان کیا گیا ہے۔

غم رسیدہ باپ کے ہاتھوں پہ تھی لاش صغیر　　لاش کے لب پر تبسم اور گلے میں زخمِ تیر
خشک لب اس بات کے مظہر کہ تھا محروم شیر　　اک نرالی شان سے سوتا تھا وہ میداں کا میر
ٹیک کر گھٹنے لحد میں ننھا لاشہ رکھ دیا
باپ نے جلتی زمیں پر دل کا ٹکڑا رکھ دیا

زبان و بیان۔ باقر محسن کی زبان مرثیہ کے لئے انتہائی موزوں ہے۔ انکی زبان صاف، سادہ اور عام فہم زبان ہے۔ اور اسی سادہ زبان میں انھوں نے جہاد کا مفہوم سمجھاتے ہوئے نہایت ہی کڑوی بات کہی ہے۔

ہے کہیں اس کا سبب نفرت کہیں بغض و نفاق　　امن کے خوگر دلوں پر یہ بہت گزرے ہے شاق
ہر جگہ شورش ہے ہندوپاک ہوں یا وہ عراق　　اور جہادِ واقعی کو رکھ دیا بالائے طاق
پیروی حق کی نہیں ہے ظلم کی ضد وہ نہیں
جو ستم پیشہ عناصر ہیں مجاہد وہ نہیں

تشبہات و استعارات کا استعمال۔ تشبیہات و استعارات اور دیگر صنعتوں کا استعمال حسن کلام کے زیور کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اور باقر محسن نے ان زیورات سے بھی اپنے کلام کو سجایا ہے۔

زیر لب وہ مسکراہٹ وہ تیری کلکاریاں　　جن پہ صدقے طائرانِ خلد کی اٹھکھیلیاں
تیری بیداری طلوع صبح کی ضوٗ پاشیاں　　نیند پر تیری تصدق دہر کی بیداریاں
مجھ کو تڑپائے جو میرا خالی پن تو کیا کروں
لوٹ کر آئے نہ اے غنچہ دہن تو کیا کروں

مرثیہ کے مطالعہ سے باقر محسن کی فنکاری اور ان کی ہنرمندی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے صنف مرثیہ نگاری میں نئی روح پھوکنے کی بخوبی کوشش کی ہے، اور مرثیہ میں روایتی انداز کے ساتھ ساتھ ایک نئی راہ بھی ہموار کی ہے۔ انھوں نے مرثیہ کو محض اظہار عقیدت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اس کو شعری خوبیوں سے بھی آراستہ کیا ہے۔ جس سے ان کے تخیل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان منتخب مرثیہ نگاروں کے مرثیہ کا مطالعہ کرنے سے میں اس نتیجہ پہ پہنچی ہوں کہ ۱۹۷۰ء کے بعد بھی بہت سے ایسے مرثیہ گو شعراء ہیں جنھوں نے جدیدیت کے رنگ کو قبول نہ کرتے ہوئے اسی پرانے طرز پر چلنے کی کوشش کی ہے جو

انیسویں صدی کی دین تھی۔ روایت کی پاسداری کرنے کے ساتھ شعراء نے اپنے مرثیوں میں جدیدیت کا رنگ بھی بھرا ہے اور نئے نئے تجربات سے مرثیہ کو وسعت بخشی ہے۔

☆☆☆

حواشی :

۱) ڈاکٹر وحید اختر، کربلا تا کربلا، ص ۹۔

۲) کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر، ص ۸۴۔

۳) نقوش نقوی، پرواز ادب، ص ۵۰۔

☆☆☆

ماحصل

مرثیہ عربی لفظ 'رثاءٔ' سے بنا ہے جس کے معنی کسی کی موت پر اپنے غم کا اظہار کرنا ہے۔ یوں تو عربی میں مرثیہ کی ابتداء متمم بن نوؔیرہ اور حنساء نے کی۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو اسکی ابتداء حضرت آدم نے اپنی بیٹے ہابیل کی موت پر کی تھی۔ فارسی میں مرثیہ کو رواج فارسی کے مشہور شاعر فردوؔسی نے سراب کی موت پر اپنا اظہارِ غم لکھ کر کیا۔ فارسی کے بعد اردو ادب میں مرثیہ خوانی کی ابتداء ہوئی۔ سب سے پہلے مرثیہ کی ابتداء کس نے کی اس امر کا صحیح پتا لگانا دشوار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو میں مرثیہ کی ابتداء دکن میں ہوئی۔ کیونکہ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے حکمراں کا تعلق شعیت سے تھا اور دونوں سلطنتوں میں مجلس عزا منعقد ہوا کرتی تھی۔ یہ بھی قیاس لگایا جاتا ہے کہ دکن میں مرثیہ کی بنیاد قلی قطب شاہ کے اجداد نے کی ہوگی۔

دکن میں مرثیہ لکھنے والوں میں خود محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطبؔ شاہ، عبداللہ ملاّ وجہؔی، ابراہیؔم قطب شاہ وغیرہ نے مرثیہ نگاری کو رواج دیا۔ دکنی شعراء نے زیادہ تر غزل کی ہیئت میں مرثیے کہے ہیں۔ بیجاپور میں جاتؔم، ملک خوشنوؔد اور مقیؔمی کے مرثیے غزل کے فارم میں موجود ہیں۔ گولکنڈہ کے اکثر شعراء نے بھی مرثیہ کے لئے غزل کے سانچے کو منتخب کیا۔ بیدر، بیجاپور اور گولکنڈہ میں تمام صنف سخن میں سے غزل سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ادبی روپ تھا اور دکنی مرثیہ ایجاز و اختصار کا عمدہ نمونہ تھا۔ بہرحال دکن میں مرثیہ گوئی کا آغاز غزل کی ہیئت میں ہوا۔

شمالی ہند میں مرثیہ کی ابتداء میں کافی تاخیر ہوئی۔ اس کی وجہ وہاں شاعری کا دیر سے وجود میں آنا تھا۔ شمالی ہند میں مرثیہ کی ابتداء قائمؔ چاند پوری نے کی، اور وہاں مرثیہ کی ابتداء ۱۸ ویں صدی کے تقریباً پچاس سال پہلے ہوئی تھی۔ اس وقت مرثیہ کہنے والوں میں میر عبداللہ مسکیؔن، سکندر، سوؔدا، میر گھاسی، قائمؔ چاند پوری، مصحفؔی، جرأت اور اشرفؔ جیسے شاعر شامل تھے۔ اس دور میں مرثیہ نظم کی شکل میں لکھی جاتی تھی اور اس دور کے ختم ہوتے ہوتے اس نے مربع اور مسدس کی شکل اختیار کر لی۔ مگر زیادہ جھکاؤ مسدس ہی کی طرف رہا۔ پہلا مسدس مرثیہ لکھنے کا سہرا عام طور پر سوؔدا کے سر جاتا ہے۔ لیکن نورالحسن اپنے مضمون ''مرثیہ نگاری کا فن'' میں اس بات سے انحراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سوؔدا سے پہلے دکن میں بھی مسدس کی ہیئت میں مرثیہ لکھے گئے ہیں۔

مرثیہ نگاری کے فن کا اصل تقاضہ یہ ہے کہ مرثیہ میں جذبات نگاری اور واقعات کی تصویر کشی پر خاص طور پر زیادہ زور دیا جائے۔ واقعات میں سب سے زیادہ اہمیت رزم آرائی کو حاصل ہے اور مرثیہ نگار شعراء نے اس پر خاص توجہ بھی کی ہے، لیکن اگر سانحۂ کربلا کے سلسلے میں پیش آنے والے واقعات کو دیکھا جائے تو ان واقعات کی تعداد کافی زیادہ ہے اور یہ واقعات بھی ایک خاص ترتیب سے پیش آئے ہیں۔ اس لئے مرثیہ نگاری میں اس ترتیب پر خاص طور پر توجہ دی گئی

ہے۔اوراس طرح رفتہ رفتہ مرثیہ کے اجزاء متعین ہوتے گئے۔ میر ضمیر کے زمانے تک جب مرثیہ نگاری پہنچی تو مرثیہ کے اجزاء حسب ذیل قائم ہو چکے تھے۔ چہرہ،سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم،شہادت اور بین۔

انیسویں صدی شمالی ہندوستان میں مرثیہ کے عروج کی صدی مانی جاتی ہے اس صدی میں مرثیہ لکھنے والوں کی تعداد کافی تھی۔ان میں میر ضمیرؔ، ناظمؔ، گداؔ، دلگیرؔ، خلیقؔ اور فصیحؔ ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ میر انیس کے عہد تک پہنچتے پہنچتے اردو مرثیہ کا ڈھانچہ مکمل ہو چکا تھا اور اس کے جزائے ترکیبی بھی متعین ہو چکے تھے۔مرثیہ کے خاکے کی اس تکمیل میں میر ضمیر کا بڑا ہاتھ تھا۔اب تک کے مرثیے کے اجزا میں واقعات، روایات، رخصت، جنگ اور بین شامل تھے۔ چہرہ کا استعمال مرثیہ نگاری میں کم ہی ملتا تھا۔اب جب مرثیہ کا نیا ڈھانچہ وجود میں آیا تو چہرہ سب سے پہلے لکھا جانے لگا، پھر سراپا، اس کے بعد گھوڑے اور تلوار کی تعریفیں، جنگ کے بیانات اور آخر میں بین کو جگہ دی گئی۔

مرثیہ میں میر انیس نے چہرہ سے پہلے تمہید کو جگہ دی۔ پھر رخصت اور آمد کو مستزاد کیا۔ جنگ کے ضمن میں رجز ،تعارف اور مبارزطلبی کو ضروری کیا۔اور آخر میں شہادت اور بین کو الگ الگ رکھنے کی صورتیں پیدا کیں۔انیس کو ان موضوعات کے علاوہ جہاں کوئی اور رنگ قابلِ تحریر معلوم ہوا اس کو ترتیب سے جوڑ لیا ہے۔مثلاً صبح کا منظر، گرمی کی شدت، کسی منظر یا ماحول کی تصویر، کردار نگاری یا مکالمے وغیرہ سبھی موضوع کو بڑی فنکاری سے انیس اپنے مرثیے میں سمو دیتے ہیں۔

انیسؔ کے ہی عہد میں مرزا دبیرؔ کا نام بھی آتا ہے۔ دبیر نے جہاں ایک طرف اپنے مرثیوں کو لفظی اور معنوی رعایتوں سے آراستہ کیا وہیں دوسری طرف موضوع کے اعتبار سے ان کے مراثی واقعات وروایات کا خزانہ ہے۔ دبیر کے مرثیوں کی خصوصیت انہیں موضوعات کی رنگارنگی ہے۔انھوں نے جہاں تاریخی روایت اخذ کیے ہیں وہیں اپنے مرثیوں میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مناقب بھی پیش کئے ہیں۔انیسؔ و دبیرؔ ہی کی طرح عشقؔ نے بھی بہت عمدہ مرثئے لکھے اور اپنا ایک الگ دبستان بنایا۔اس کے علاوہ واجد علی شاہ اخترؔ کے مرثیے شاعری کے اعتبار سے نہیں بلکہ فن عروض کے لحاظ سے بہت عمدہ مرثیے ہیں۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد کے مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کی ساخت میں کوئی خاص تبدیلی نہ کی اور نہ ہی مضامین میں کوئی خاص وسعت پیدا کی۔ان کے زمانے میں مرثیہ ویسا ہی رہا جیسا کہ انیس کے زمانے میں لکھا جاتا تھا۔یعنی مرثیہ کی ابتداء چہرے سے شروع ہوکر رخصت، رجز، جنگ کے مدارج طے کرتا ہوا شہادت اور بین پر ختم ہوتا تھا۔انیس کے نواسے پیارے صاحب نے مرثیہ میں ساقی نامہ کا اضافہ کیا۔اس کے علاوہ ہادیؔ لکھنوی، نفیسؔ لکھنوی اور شادؔ عظیم آبادی وغیرہ نے اپنے مرثیوں میں ساقی نامہ کا استعمال کیا ہے، مگر یہ بھی بہت دنوں تک نہ چل سکا۔انیس کے بعد مرثیہ کا ایک نیا دور شروع ہوا ،اور اس دور میں مرثیہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔لیکن ان میں جو نام اہم ہیں وہ

تعشقؔ، نفیسؔ، سلیسؔ، وحید، مہدی حسن ماہرؔ اور اصغر حسین فاخرؔ وغیرہ کا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام تر مرثیہ گو شعراء کا موضوع واقعہ کربلا ہی ہوتا ہے۔ صرف ان کے اظہار بیان میں انفرادیت نظر آتی ہے۔ اور وہ انفرادیت یہ ہوتی ہے کہ کسی مرثیہ گو نے اپنے مرثیہ میں کسی پہلو پر زیادہ روشنی ڈالی ہے تو کسی نے دوسرے پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ انس نے جس پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے وہ حضرت عباسؑ ہے۔ انس نے حضرت عباسؑ کے میدان میں جانے کی اجازت سے لیکے بازوں کے کٹنے اور شہید ہونے تک کے سبھی واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔

مضامین کے اعتبار سے ان مرثیہ نگاروں کے مرثیے قریب قریب انیس کے انداز پر ہی لکھے گئے، لیکن انیس کی قادرالکلامی کے آگے یہ مرثیے بالکل پھیکے اور کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ مرثیہ کے رزمیہ عناصر بھی انیس کے بعد ہلکے پڑنے لگے۔ عشق نے اپنی مرثیہ نگاری کو انیس کی مرثیہ نگاری سے علیحدہ رکھا۔ عشق میں قوت اور اظہار دونوں کی کمی نہ تھی مگر پھر بھی وہ انیس کی طرح استعاراتی اور پیکری ذہن نہ رکھتے تھے، اس کے باوجود وہ جزئی صورت حال کا احاطہ محض بیانیہ کے بل بوتے پر کر لیتے تھے۔ عشق نے اپنے مرثیوں میں بہت زیادہ قید و بند اختراع کئے۔ ان کے مرثیوں میں غنائیت، جذباتیت ،سوز گداز اسر نازک خیالی موجود ہے۔ ان کے مرثیوں کے موضوع بھی گھوڑوں، تلوار اور زعفر جن کو بنایا ہے۔ ان کے مراثی کے گھوڑے عام گھوڑوں کے مقابلے کافی مختلف ہے، وہ اپنا درجہ و اعزاز بخوبی سمجھتا ہے اور فخر کرتا ہے۔ جب وہ سوار کو اپنی پشت پر بٹھا کر روانہ ہوتا ہے تو اس کے حرکات و سکنات میں شان دل ربائی پیدا ہوتی ہے جس سے سامعین محو ہو جاتے ہیں۔

تعشقؔ کی مرثیوں میں اکثر جگہوں میں غزلیت کے ساتھ حسن و عشق کی باتیں قلم بند نظر آتی ہیں۔ وہ ہجر و فراق، وصال وغیرہ کا تذکرہ بھی بڑی بے تکلفی سے کرتے ہیں۔ تعشق کی سب سے بڑی انفرادیت تغزل اور مرثیت کے امتزاج سے ایک ایسا دل عزیز رنگ اختیار کرنا ہے جسے آج تک پسند کیا جاتا ہے۔ لیکن اس امتزاج سے ان کی مرثیت میں کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ واقعات کربلا کو تغزل کے آنکھوں سے دیکھتے ہیں، جسکی وجہ سے انکے رزم میں بھی بزم کا عنصر ملتا ہے۔ نفیسؔ نے بھی اپنے مرثیوں میں انیسؔ و دبیرؔ دونوں ہی کی پیروی کی۔ انھوں نے اپنے مرثیے میں امام حسین کے مرتبے، مقصد حیات، جذبہ ایثار اور عشق خدا کو موضوع بنایا ہے۔ اگر چہ وہ انیسؔ و دبیرؔ کی طرح مرثیہ نگاری کو بلند مرتبہ پر فائز دیکھنا چاہتے تھے لیکن وہ ان کی ہمسری نہ کر سکے۔ پھر بھی وہ اپنی ذمہ داریوں کو خوبصورتی سے انجام دیا۔ رشیدؔ کے مراثی دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بہار اور ساقی نامہ میں اس قدر کھو گئے کہ مراثی کی ضروریات کو نظر انداز کر دیا۔ اور رنج و غم، شجاعت و بہادری، ایثار و قربانی وغیرہ کے جذبات مشتعل کرنے کے بجائے خوش کن مضامین کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ مرثیہ نگاری کو اس کی روح سے الگ کر دیتے ہیں۔

اوجؔ کے مرثیوں میں پوری طرح سے دبیریت مسلط تھی۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں دبیریت کے تمام تر لسانی

،فنی، علمی اور شعری صفات کو برتا ہے۔ وہ مرثیے میں موضوع کے انتخاب اور بندش میں دبیر ہی کی مماثلت رکھتے تھے۔ مگر بعد میں انھوں نے دھیرے دھیرے دبیریت کو خیرآباد کر کے انیسیت اپنا لیا۔ شاؔد نے اپنے مرثیے کو ایک نئے انداز بیان سے پیش کیا۔ اس میں تفکر اور تصوّف کی چاشنی ملائی، اور اس طرح اسے ایک نئے انداز سے سنوارا۔ ان کے کلام میں فن کے حسن اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ بیان کی خوبی بھی نظر آتی ہے۔ شاؔد کے مرثیہ اردو مرثیہ نگاری میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی مرثیوں میں تاریخ احادیث کے بیان۔ تبلیغی نظریات اور قوم کے اصلاحی مضامین ملتے ہیں ۔جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ وہ روایت پسند نہیں بلکہ روایت شناس تھے۔

دلّو رام کوثرؔی ایک غیر مسلم ہونے کے باوجود جدید لب ولہجہ کا 'قرآن اور حسین' جیسے عنوان کے تحت مرثیہ کہا ہے۔ انھوں نے 'قرآن اور حسینؑ' جیسا مرثیہ لکھ کر اپنے عہد کے حوالے سے ایک جرآت مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ یہ مرثیہ روایتی مرثیوں کے انداز سے ہٹ کر لکھا گیا ہے۔ اس میں مرثیہ کے اجزاء جیسے سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ اور شہادت کا بیان نہ کر کے قدیم مرثیہ کی روایت کو توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آرزؔو کے مرثیوں میں میر انیسؔ کی شعوری طور پر تقلید ملتی ہے۔ ان کا ایک مرثیہ 'توبہ' کے نام سے ملتا ہے، جو قدیم رنگ کے مرثیوں سے مختلف نظر آتا ہے۔ نسیؔم امروہوی کے مرثیے موضوعاتی ہیں۔ انھوں نے مرثیوں میں مختلف موضوعات پر بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ واقعہ کربلا کے مخصوص کرداروں کو بھی موضوع کی کسوٹی میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ نسیؔم امروہوی نے اپنے مرثیوں میں رزمیہ عناصر کو ترک نہ کرتے ہوئے مرثیے کی کلاسیکی روایت کو برقرار رکھا۔ اس کے علاوہ جدید قومی مسائل کو بھی بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

نجم آفندی کے مرثیوں میں سیاسی اور عصری رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے امام حسینؑ کی قربانی کے مقصد کو غریب قوم کے جینے کے حق سے جوڑ کر شخصیت امام حسینؑ کو آفاقی پیمانے تک پہنچایا ہے۔ علامہ جمیل مظہری نے دس مرثیوں کی تخلیق کی ہے جو کہ جدیدیت کے حامل ہیں۔ جمیؔل مظہری کے مرثیوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سے پہلے صرف تین ہی ایسے مرثیے ملتے ہیں جو جدید مرثیے کہے جا سکتے ہیں۔ ایک دلّو رام کوثرؔی کا مرثیہ ''قرآن اور حسینؑ''، دوسرا جوشؔ ملیح آبادی کا مرثیہ '' آوازۂ حق''، اور تیسرا نسیؔم امروہوی کا مرثیہ ''گل خوش رنگ''۔ اگر صحیح معنیٰ میں دیکھا جائے تو صرف دلورام کوثرؔی کا مرثیہ ''قرآن اور حسینؑ''، ہی قدیم روایت سے بغاوت کرتا نظر آتا ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی کا مرثیہ 'آوازۂ حق'' چونکہ ان کا پہلا مرثیہ تھا اس لئے اس میں کچھ رنگ انقلابی نظر تو آتے ہیں لیکن اسکو پوری طرح سے جدید نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے علاوہ نسیؔم امروہوہ کا مرثیہ ''گل خوش رنگ'' کے ابتدائی چند بند میں ہی جدیدیت کا رنگ نظر آتا ہے۔

قلؔی قطب شاہ کے دور سے لے کر میر انیسؔ و دبیؔر اور عشؔق تک مرثیے نے بہت سے مرحلے طے کئے اور پھر مرثیہ

ایک مخصوص ہیئت اور فکر پر آ کر ٹھہر گیا۔ لیکن بعد انیسؔ و دبیرؔ مرثیہ میں تحقیق کی ہوا چلی جس نے ہر کسی کو مرثیہ لکھنے اور اور اس میں کچھ نہ کچھ نیا کرنے کی کوشش میں مشغول کر دیا۔ اور آج مرثیہ اس مقام پر پہنچ گیا کہ ان مرثیہ میں مرثیہ نگاری کے نام پر آخر میں چند اشعار ہی بیان کر دئے جاتے ہیں۔ اور مرثیہ نگاری کے مقصد کو پورا کر دیا جاتا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان کے علاوہ کچھ ایسے مرثیہ نگار شعراء بھی موجود ہیں جنھوں نے مرثیہ کو ہیئت بخشنے کے ساتھ ساتھ نئی فکر کا جامہ پہنایا۔ ۱۹۷۰ کے بعد یوں تو بہت سے شعراء نے اپنی پہچان بنائی مگر میں نے اپنی تحقیق کے لئے کچھ خاص مرثیہ نگاروں کا انتخاب کیا ہے۔ اور ان لوگوں کو میں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول میں احسنؔ دانا پوری، وحیدؔ اختر، عظیم امروہوی اور ظہیر جعفری اور حصہ دوم میں ناشرؔ نقوی، احسنؔ شکارپوری، گوہرؔ لکھنوی اور باقرؔ محسن کے مرثیوں کے تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کی فن مرثیہ گوئی پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ ۱۹۷۰ء سے لے کر موجودہ دور میں ابھی بھی بہت سے ایسے مرثیہ نگار موجود ہیں جن کے مرثیوں میں انیسؔ و دبیرؔ کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ آج بھی ایسے مرثیہ گو شعرء اہیں جو اپنی تخلیق کے ذریعہ مرثیہ نگاری میں نیا رنگ بھر رہے ہیں۔ میں نے اپنی تحقیق جن آٹھ مرثیہ نگاروں پر کی وہ شعراء اپنی الگ انفرادیت رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے میں نے احسنؔ دانا پوری کی مرثیے کو پڑھا۔ ان کے مرثیہ کا مجموعہ ''مطلع حیات'' ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ میں احسن رضوی کے چودہ (۱۴) مرثیے شامل ہیں، جسکو ان کے فرزند مشہور رضوی نے ان کی موت کے بعد شائع کیا۔ ان مرثیوں میں احسن رضوی کے فن میں پختگی، فصاحت زبان اور بلاغت بیان کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ اس مجموعہ کے پہلے مرثیے میں حضرت علیؑ کی غم گین کیفیت پیش کی گئی ہے۔ جس کی ابتدا فطرت کے مناظر کی عکاسی سے ہوتی ہے۔ یہ مرثیہ ۵۵ بندوں پر مشتمل ہے۔ احسن نے اپنے کسی مرثیہ کو عنوان نہیں دیا جو کی روایتی مرثیے کی نشانی ہے۔ احسن نے اس خوبصورت منظر نگاری کے ذریعہ مرثیہ کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں موت اور حیات کے فلسفہ کا بیان سفر اور منزل کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ موت برحق ہے جو ہر کسی کو آنی ہے، ہر عروج کو پست ہونا ہے، ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور جو باقی رہنے والا ہے وہ بلا شبہ واحد خدا کی ذات ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ احسن غزل گو شاعر ہیں اسلئے ان کے مرثیوں میں بھی غزل کا رنگ صاف طور سے نمایاں نظر آتا ہے۔

احسن رضوی نے دوسرے مرثیہ میں بھی حضرت علیؑ کا حال لکھا ہے جو کہ ۷۷ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس مرثیہ میں بھی شاعر نے موت و حیات کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اس مرثیہ میں شاعر زندگی کی حقیقت کو روشناس کرانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ زندگی ایک راز کے مانند ہے اور جو اس کے بھید سے واقف ہو جائے گا وہ اس کے اصل مقصد کو بھی سمجھ لیگا۔ زندگی کی حقیقت کے بعد شاعر دنیا کے فلسفے کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس کی حقیقت سے آشنا کراتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہاں اپنا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی یہ انسان کی منزل ہے۔

اپنے تیسرے مرثیہ میں حضرت علیؑ کو بائے بسم اللہ سے علامت دی ہے۔اور لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی ولادت سے ہی نور کو فروغ ملا ہے اور اس اظہار کا ضامن بھی خود علیؑ ہی ہیں۔علیؑ ’ب‘ کے نیچے کا وہ نقطہ ہیں جس کے ہٹا دینے سے ’ب‘ کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے اور بنا ’ب‘ کے بسم اللہ لکھا ہی نہیں جا سکتا۔اپنے چوتھے مرثیہ میں احسن دانا پوری حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کی گفتگو کے ذریعہ سے کربلا کے تمام واقعات کو بیان کرتے ہیں۔یہ مرثیہ ان کے تمام مرثیوں سے مختلف اور مختصر ہے۔اس میں نہ تو رخصت و آمد کا ذکر ہوا ہے اور نہ ہی کسی جنگ و شہادت کا۔اس مرثیہ کو احسن رضوی نے صرف ایک واقعہ پر ہی ختم کر دیا ہے۔ان کے مرثیوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں اقبال کی سوچ اپنا سر اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

غرض کہ احسؔن دانا پوری نے اپنے بیشتر مرثیوں میں حضرت علیؑ اور جناب محمدؐ کی ہی اوصاف بیان کئے ہیں۔اپنا ایک مرثیہ انھوں نے انقلابی رنگ میں لکھا ہے۔جس کی ابتدا میں بدلتے زمانہ کے ذکر سے کیا ہے۔جہاں وہ نور اور ظلمت کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ نور یعنی کسی کی اچھائی سے برائی میں فرق کیا جاتا ہے،ضد سے بشر کی فطرت کا امتیاز سمجھا جاتا ہے،اگر آنکھوں سے آنسوں نہ نکلے تو انسان کے درد وغم اور اس کی خوشی نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔اس کے بعد کے بندوں میں پروردگار عالم کی خوشنودی اور ان کی ریاضت کا ذکر تے ہیں پھر ان سے یہ دعا طلب کرتے ہیں کہ مجھے نہ تو بے زری کا غم ہے اور نہ ہی دولت کی آرزو ہے،نہ ہی مجھے نام اور شہرت چاہئے،مجھے تو بس اپنے امام کی خدمت کرنے کی تمنّا ہے۔احسن دانا پوری کے تمام مرثیے موضوعاتی ہیں۔کسی میں انھوں نے زندگی اور ان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے تو کہیں وہ مرثیہ میں انقلاب کو جگہ دیتے ہیں۔کسی مرثیے میں عمر اور حیات کی بات کرتے ہیں تو کہیں عورت کو ہی موضوع بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے کچھ ایسے بھی مرثیے تحریر کئے ہیں جس میں بلا کسی موضوع سیدھے مصائب کا بیان ہے۔

احسن دانا پوری نے مرثیے میں بیانیہ اسلوب کا استعمال بھی کیا ہے اور ڈرامائی انداز کا بھی۔ان کے مرثیے میں ربط و تسلسل کہیں بھی ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔کلام میں انھوں نے نہایت ہی غم انگیز حالات کو نہایت ہی سادہ مگر پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ان کی زبان بھی عام فہم زبان ہے۔مرثیے میں محاورہ،کنایہ اور صنائع و بدائع کا استعمال بھی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔اس کے علاوہ احسن کا تخیل اور ان کا انداز بیان بہت ہی عمدہ ہے۔مرثیہ کے مطالعہ کے بعد یہ بات صاف طور سے واضح ہو جاتی ہے کہ احسن دانا پوری کا تخیل اور ان کا انداز بیان نرالا اور دوسروں سے منفرد ہے۔مرثیہ میں سلاست اور روانی بھی صاف نظر آتی ہے۔مصائب کے بند روایتی ہے اس کے علاوہ مصائب بہت ہی جدت اور پر اثر انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ان کے مرثیے میں انیؔس کا رنگ بہت نظر آتا ہے۔ان کے مرثیوں میں بھی فصاحت و بلاغت کا رنگ نمایاں ہے جو کہ انیؔس کے مرثیہ کی نشان دہی کرتا ہے۔

زیرِ تحقیق شعراء میں دوسرے مرثیہ نگار وحیدؔ اختر ہیں جن کی تربیت مرثیہ خوانی اور مرثیہ نگاری کے ادارے میں ہوئی تھی ۔اس لئے فطری طور پر اس صنف سخن سے ان کی ذہنی ہم آہنگی تھی ۔وحید اختر نے دس سال کی عمر سے ہی سلام اور نوحے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔لیکن مرثیہ نگاری لکھنے میں انھوں نے تھوڑی تاخیر کی ۔انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ چھبیس سال کی عمر میں لکھا،جسکی تصدیق وہ اپنی کتاب 'کربلا تا کربلا' میں خود کرتے ہیں ۔وحیدؔ اختر کے مرثیے کی تعداد ۱۶ تک پہنچتی ہے۔لیکن مجھے ان کے صرف وہی آٹھ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جو کہ کربلا تا کربلا میں شامل ہیں۔ جو اپنے منفرد اسلوب

وحیدؔ اختر کا پہلا مرثیہ ''چادرِ تطہیر'' جو درحال جناب فاطمہؑ کا ہے۔ یہ مرثیہ ۱۶۸ بندوں میں مشتمل ہے۔اس مرثیہ میں ''چادر'' کو عصمت اور عفت کا استعارہ بنایا گیا ہے وحید اختر نے اس مرثیہ میں وضاحت کی ہے کہ آیۂ تطہیر کی شان نزول حدیث کساء میں بیان کی گئی ہے،جس کے مطابق رسولؐ نے بیٹی کے گھر تشریف فرما ہو کر آپ کی چادر اُڑھی تو اس میں صرف فاطمہ،علیؑ ،اور حسن وحسینؑ کو جگہ ملی ،اور جبریل ان پانچ نفوس قدسیہ کے لئے ہر رجس سے پاک ہونے کی نوید لائے ۔اس کے علاوہ وحید اختر اس بات کا بھی بیان کرتے ہیں کہ اقبال نے جناب سیدہؑ کے نسبتوں کی بنا پر حضرت مریمؑ سے افضل مانا ہے۔رسولؐ اسلام ،حضرت علیؑ اور حسین سے جنہیں صرف حضرت عیسیٰؑ کی ماں ہونے کا شرف حاصل تھا۔قلعہ کشا اس مجموعہ کا دوسرا مرثیہ ہے۔ جو حضرت علیؑ کے حال میں لکھا گیا ہے۔وحید اختر کردار حضرت علیؑ اور ان کے القاب کے ذیل میں آج کے چیلنجز اور تہذیب وسیاست کو پیش کرتے ہیں اور اس جدید فکر کو مرثیہ میں بخوبی برتنے کی کوشش کرتے ہیں ۔اس مرثیہ میں موجودہ دور کے حالات کی عکاسی صاف صاف نظر آتی ہے۔سیاست کی آندھیاں ، ملک کا بٹوارا،ظلم وتشدد سب کو وحید نے اس مرثیہ کا موضوع بنایا ہے۔

وحیدؔ اختر نے مرثیوں میں حالات حاضرہ،امن،نطق، پیاس اور چادر تطہیر کو موضوع بنایا ہے۔اس کے علاوہ واقعات کربلا کے متعلق کرداروں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔جس میں حضرت عباسؑ کا دریا پر جانا،سکینہ کا پانی کے لیے فریاد کرنا،علی اصغر کا پیاس سے بے تاب ہونا،علی اصغر کا مسکرا کر گلے پر تیر کھانا ، نیز اہل حرم کی قید اور رہائی کو شامل کیا گیا ہے۔شہادت امام حسین کے بعد یزیدی فوج کا غیر انسانی برتاؤ یعنی اہل حرم کو قید کر کے کوفہ بازار میں گھومانا ، جہاں تماشائیوں کا ایک ہجوم تھا۔اس موقع پر جناب زینبؑ کا خطبہ دینا اور تماشائیوں کو صاف لفظوں میں بتادینا کہ آج تم لوگوں کے سامنے مجبور اور قیدی بنا کر ہمیں جس طرح پیش کیا جارہا ہے ان میں کوئی بھی غیر معروف شخصیتیں نہیں ہیں بلکہ وہ سب تمہارے نبیؐ کی آل ہی تو ہیں۔

وحیدؔ اختر چونکہ ایک وقت میں دانشور،مفکر،ادیب،نقاد اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مرثیہ گو شاعر بھی تھے اس لیے ان کی مثبت سوچ مرثیہ میں بھی نظر آتی ہے۔ایک بات اور جو ان کے مرثیہ میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ ان کی سوچ کا دائرہ جوشؔ کے دائرہ سے بہت ملتا ہے۔ جہاں جوشؔ کا کہنا ہے کہ ''لازم ہے کہ ہر شخص حسینؑ ابن علیؑ ہو''۔اس بات کو وحیدؔ اختر

لکھتے ہیں کہ ''دنیا متلاشی ہے کہ شبیرؑ کہاں ہیں''۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ جوشؔ حالات سے جوجھتے ہوئے ہر شخص کو حسینؑ بننے کی تاکید کرتے ہیں تو وحیدؔ پر آشوب حالات سے بیزار ہو کر صرف ایک شخص کی تلاش کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو آزادی کے بعد ہندوستان میں ڈاکٹر وحید اختر جدید مرثیہ اور جدید فکر کے ایک اہم ستون ہیں۔ ان کے تمام مرثیے اپنے آپ میں ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مرثیوں میں حالات حاضرہ، سیاسی وسماجی زبوں حالی اور طبقاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ ان کی زبان قدیم مرثیوں کی زبان اور طرز ادا سے کافی مماثلت رکھتی ہے۔ اس کے باوجود کہیں کہیں زبان میں کھردرا پن بھی ظاہر ہوتا ہے۔

تحقیق مقالے میں وحیدؔ اختر کے بعد عظیمؔ امروہوی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے اب تک ۲۵ مرثیے ملتے ہیں جو اپنے موضوع، انداز فکر، اسلوب اور لب ولہجہ کی انفرادیت کی بنا پر اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مرثیوں میں جدید فکر اور عصری تقاضے واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ زیادہ تر یہ مرثیے موضوعاتی ہیں، مثلاً حسینؑ اور اتحاد، فاتحِ نفس، حسینؑ اور رسول، حسینؑ اور قرآن، ہوا اور چراغ، اسلام اور فسادات، اسلام اور وقت شناسی، قرآن وفا، فرض اور کربلا اور عظمت علم۔

ڈاکٹر عظیم امروہوی نے مرثیہ نگاری کی ابتدا ۱۹۷۲ء میں ''حسین اور زندگی'' سے کی۔ اور یہ پورا مرثیہ ۱۹۷۵ء میں انجمن جاں نثاران حسینؑ امروہہ کے زیر اہتمام روہیلہ پرنٹ رامپور سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ انھوں نے اس مرثیہ میں حقیقت زندگی سے رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی واقفیت کو بیان کیا ہے۔ پھر مدح امام حسین، پیغام حسین اور پھر مختصر طور پر کربلا میں دیگر شہیدوں کی جنگ کو بیان کرتے ہوئے امام حسینؑ کی میدان وغا میں جانے کی رخصت کو بیان کیا ہے۔ رخصت کے بندوں میں ایک باپ اور بیٹی کے بچھڑنے کو پر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مرثیہ میں جنگ اور پھر امام حسینؑ کی شہادت بیان کی گئی ہے۔ عظیمؔ امروہوی اپنے مرثیوں میں اتحاد کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ آج موجودہ عہد میں بدلتے ہوئے وقت اور حالات میں جب اقوام مسلم ہر طرف سے ظلم وستم کا نشانہ بن رہی ہے اس عالم میں عظیمؔ کا یہ پیغام اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیہ ''حسینؑ اور اتحاد'' کے ذریعہ یکجہتی کا پیغام دیا ہے۔ ان کا یہ مرثیہ جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیہ ''حسینؑ اور انقلاب'' کے طرز کا نظر آتا ہے۔ عظیمؔ نے ایک مرثیہ کا موضوع طب کو بھی بنایا ہے یہ ایک اچھوتا موضوع ہے۔ انھوں نے اس میں ائمہ کے طب کے حوالے سے کہے گئے اقوال کا بیان کیا ہے۔ جو ان کو انفرادیت بخشتا ہے۔

عظیمؔ امروہوی کا اسلوب اور طرز ادا فطرت سے حد درجہ قریب ہی نہیں بلکہ اس سے ہم آہنگ بھی ہے۔ ان کے یہاں ہندوستانی مزاج اور طرز معاشرت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ روزمرہ اور عوام الناس کی زبان کا برمحل استعمال ملتا ہے۔ عظیمؔ کے مرثیے بیانیہ اور علامتی طرز سے لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے واقعات کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

ظہیؔر جعفری عمدہ شاعر ہیں ان کی غزلیں ،ان کے قصیدے بہت عمدہ ہیں ۔انھوں نے آزاد نظموں کی بھی ہنرمندانہ انداز میں تخلیق کی ہے۔لیکن جس صنف سے انھوں نے اپنی پہچان بنائی وہ غزل ہے۔ان کی اب تک تین سو سے بھی زائد غزلیں بہت مشہور ہوئیں ہیں۔مرثیہ انھوں نے بہت نہ لکھتے ہوئے صرف تین ہی کہے ہیں۔ان مرثیوں میں بصیرت ان کا سب سے اچھا مرثیہ ہے۔جو عناصر ایک نظم کو مرثیہ میں تبدیل کرتے ہیں وہ سارے عناصر ان کے پہلے اور دوسرے مرثیہ میں نظر نہیں آتے لیکن ان کے تیسرے مرثیہ میں سارے عناصر خوبصورتی سے استعمال ہوئے نظر آتے ہیں۔ مرثیہ میں علی اکبرؑ ،حضرت حُرؓ اور حضرت عباسؑ ابن علیؑ کو موضوع بنایا گیا ہے۔مرثیے میں پانی اور بصیرت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔پانی جو کہ موجودہ عہد کا ابھرتا ہوا مسلہ بنتا جا رہا ہے، پانی کی قلّت آنے والی نسل کیلئے خطرہ بن سکتی ہے۔اسی پانی کی قیمت کو ظہیر جعفری نے مرثیہ میں بتانے کی کوشش کی ہے۔ساتھ ہی ہر ذی شعور کے لئے پانی کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔مرثیہ نگاری ظہیر جعفری کو ورثہ میں ملی۔اسلاف کی خوبیاں ان کے مرثیوں میں نظر بھی آتی ہے جو کہ نعمت سے کم نہیں۔مرثیہ میں تلمیح ،تشبیہ اور استعارہ کا استعمال بہت عمدگی اور فنکارانہ انداز سے کیا ہے۔ظہیر جعفری نے مرثیہ میں کوئی نیا کارنامہ نہیں انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر ناشر نقوی کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔یہ میری تحقیق کے پانچویں مرثیہ نگار ہیں۔ناشر نقوی اپنی صلاحیت کی بنا پر پتھروں کے انبار سے ہیرا تلاشنے کا فن رکھتے ہیں۔اور ایسے فنکار کا ہمارے ادب میں ہونا باعث فخر ہے۔ناشؔر نقوی کے تین مجموعہ مراثی کے منظر عام پر آ چکے ہیں ،جن میں آفاقیت ۱۹۸۴ء، لالہ زار صبح ۱۹۸۷ء اور دیدہ وری ۲۰۰۵ء قابل ذکر ہیں۔’آفاقیت‘ ایک ایسا مرثیہ ہے جس نے جدید اردو مرثیہ نگاری میں نیا سنگ میل قائم کیا ہے۔اس مرثیہ میں ناشر نقوی نے آغاز سے انجام تک لہجے کا نیا آہنگ اور اسلوب کا استعمال کیا ہے۔’’لالہ زار صبح‘‘ مجموعہ میں ناشر نقوی کے سات مراثی شامل ہیں۔اپنے تیسرے مجموعہ ’’دیدہ وری‘‘ میں ناشؔر نقوی نے چھ مرثیہ شامل کیے ہیں۔انھوں نے اپنے مرثیوں کو نئے معنی دینے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے مرثیے کے عنوان بالکل نئے اور اچھوتے رکھے ہیں مثلاً وہ ’آنکھ‘ کو عنوان بنا کر یوں مرثیہ کہتے ہیں کہ ان کا مرثیہ نہ صرف مراثی کی خصوصیت کو ہی پورا نہیں کرتا ہے بلکہ خاطر خواہ علم و دانش کی مثال بھی معلوم ہوتا ہے۔

ناشر نقوی نے بہت سے مرثیوں کی تخلیق کی جو اپنے منفرد اسلوب،انداز بیان اور موضوعات کے بناء پر عمدہ مرثیوں میں گنے جاتے ہیں۔انھوں نے مرثیوں میں نئے الفاظ، نئے معنی ،اچھوتے عنوانات اور نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے مرثیوں میں پورے مرثیہ کی تاریخ کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔اور جیسے جیسے مراثی میں تبدیلیاں رونماں ہوتی گئیں انھوں نے اسی انداز سے اپنے انداز بیان اور الفاظ و معنی کو بھی جنبش دی ہے۔یہ بالکل نیا تجربہ ہے۔ان کے مرثیوں کی ایک خاص صفت ان کا درس انسانیت بھی

ہے۔اورانسانیت کے معیار کی صراحت کے لئے انھوں نے اسلام کے اعلیٰ کرداروں کوسامنے رکھا ہے۔قرآن اور حدیث کی مدد سے ناشرنقوی نے انسانیت کی اسلامی تصویر کو پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنے مرثیوں میں ایک نئی نہج اور نیا انداز بیان بھی پیش کیا ہے۔ناشرنقوی نے اپنے مراثی میں ایک نئے تجربہ ''صنعت توشیح'' کو بھی تحریر کیا ہے۔''صنعت توشیح'' وہ فن ہے کہ جب کوئی شاعر اپنے مرثیے کے بندوں یا مسدس میں کسی لفظ جیسے ''عباس'' کو اس طرح سے استعمال کرتا ہے کہ اگر لفظ عباس کے ٹکڑے کردیئے جائیں تو ہر مصرعے کا پہلا حرف لفظ عباس کا ایک حرف ہوگا۔

احسنؔ شکار پوری حیدرآباد میں مقیم ہیں اپنے سلام اور نوحوں کی بنا پر بہت ہی مشہور ہیں۔شاعری کی دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ ان کو مرثیہ نگاری کا بھی بے حد شوق ہے۔انھوں نے اب تک ۱۴ مرثیوں کی تخلیق کی ہے جس میں ۴ مرثیے مطبوعہ اور دس غیر مطبوعہ ہیں۔میں نے ان کے صرف مطبوعہ مرثیوں کو ہی پڑھا ہے اور اس پر تنقید و تجزیہ کیا ہے۔انھوں نے اپنے مرثیہ میں ایک ہی اسلوب استعمال کیا ہے۔احسن شکار پوری کے سارے مرثیوں میں یکسانیت نظر آتی ہے۔اس کو ہم احسن صاحب کی خوبی بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ایک ہی واقعہ کو الگ الگ انداز سے لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔مرثیہ میں احسن شکار پوری نے وفا، شباب یعنی جوانی، عرش اور ذکر کو موضوع بنایا ہے۔اور ان چاروں کرداروں کے مرثیوں کو ایک ہی اسلوب کے تحت تحریر بھی کیا ہے۔

انیسؔ و شدیدؔ کی جانشینی رکھنے والے لکھنؤ کے نایاب گوہر ''گوہرؔ لکھنوی'' نے بھی مرثیے لکھ کر انیسؔ و شدیدؔ کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔واقعات کربلا کے مختصر دائرے میں گوہر لکھنوی نے کرداروں کے باہمی میل جول اور مختلف اوقات میں ان کر مختلف جذباتی ردعمل کی عکاسی کر کے اس میں وسعت پیدا کی ہے۔محدود فضا، محدود وقت اور محدود واقعات میں بھی گوہر نے مختلف لوگوں کے مزاجوں کو پہچانا ہے اور پیش کیا ہے۔اور واقعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو نفسیات انسانی کے بہت سے باریک پہلو بے نقاب کئے ہیں اگر چہ سبھی مرثیہ گو کا موضوع وہی واقعات اور کردار ہیں لیکن گوہر نے ان مشترک و معروف واقعات میں ایسے نفسیاتی رخ اور موڑ پیدا کئے جو کہ ان کرداروں کے جذبات و احساسات زندگی سے قریب اور واقعات سے بھر پور نظر آتے ہیں۔ان کے اپنے کلام میں فصاحت و سلاست کے ساتھ ساتھ بلاغت و ندرت کی کہیں کمی نظر نہیں آتی۔اس میں شک نہیں کہ گوہر ذہین شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی یہ ذہانت مرثیوں میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔گوہر لکھنوی کے مرثیے کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام میں فکری عنصر اور فن اعلیٰ درجہ کا ہے۔ان میں گہرائی اور گیرائی بھی ہے اور تغزل کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔مرثیہ میں کہیں کہیں انیسؔ کا رنگ بھی جھلکتا دیکھائی دیتا ہے۔انیسؔ کی فصاحت و بلاغت کی جھلک ان کے مرثیہ میں بھی نظر آتی ہے۔گوہرؔ لکھنوی نے اسلوب کے سلسلے میں زیادہ تر اثر شدیدؔ کا لیا ہے ان کے مرثیے میں فصاحت و بلاغت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

میری تحقیق کے آخری مرثیہ نگار باقر محسن ہیں جو کہ حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں۔یوں تو ان کے والد کا تعلق زید

پور سے تھا،لیکن چونکہ ان کی ولادت حیدر آباد میں ہوئی اس لحاظ سے ان کو یہاں سے بے حد لگاؤ ہے۔وہ خود کو حیدر آبادی کہتے ہیں۔انھوں نے اب تک ۱۲ مرثیوں کی تخلیق کی ہے جن میں سے صرف تین ہی شائع ہوئے ہیں۔یہ مرثیے کم ہونے کے باوجود مرثیہ نگاری کی دنیا میں اپنا علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔''کربلائے تشنگی'' باقر محسن کا پہلا مرثیہ ہے۔جس کو انھوں نے ۷۶ بندوں میں ترتیب دیا ہے۔اس مرثیہ میں تشنگی جیسے اہم لیکن انوکھے موضوع کو منتخب کیا گیا ہے۔یہ تشنگی دراصل فتح کا استعارہ ہے۔مرثیہ کی تمہید میں باقر محسن تشنگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ سانحۂ کربلا سے پہلے تشنگی کا کوئی وجود ہی نہیں۔تشنگی کو اہمیت دلائی تو کربلا والوں نے۔باقر محسن نے مرثیہ میں تشنگی،موت اور فرات کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔جو حضرت امام حسینؑ،حضرت قاسمؑ اور حضرت عباسؑ کے حال پر تحریر کیا گیا ہے۔باقر محسن کا اسلوب،ان کا انداز بیان اور زبان حد درجہ فطرت کے قریب نظر آتا ہے۔ان کے مرثیوں میں بیانیہ اور روایتی انداز ملتا ہے۔مرثیہ میں تلمیح،استعارہ،اور تشبیہ کا استعمال بہت عمدگی سے کیا گیا ہے۔صنف مرثیہ نگاری میں نئی روح پھونکنے کی بخوبی کوشش کی ہے،اور مرثیہ میں روایتی انداز کے ساتھ ساتھ ایک نئی راہ بھی ہموار کی ہے۔انھوں نے مرثیہ کو صرف اظہار عقیدت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اس کو شعری خوبیوں سے بھی آراستہ کیا ہے،اور اس میں نئے نئے تجربات کر کے صنف مرثیہ کو بلندی تک پہنچایا ہے۔

باقر محسن نے شاعری کے بلند ترین خصوصیات کو اپنایا اور اپنی خودداری،بلند بینی،خاندانی روایت پرستی اور وضع داری کے وسیلے سے ایسا شعری نظریہ اختیار کیا ہے جس نے ان کے وجدان اور تڑپ،ذوق وشعور اور احساس فن سے مل کر شاعری کے بلند ترین نمونے پیش کئے اور جدید مرثیہ گوئی میں منفرد مقام حاصل کیا۔

گزشتہ صفحات میں یہ جائزہ لیا گیا کہ ابتداء سے سفر کرتے ہوئے اردو مرثیہ انیسؔ و دبیرؔ کے عہد میں آکر متعین ہیئت کے ساتھ تحریر ہونے لگا۔انیسؔ و دبیرؔ نے اردو مرثیے کو بلندی کی آخری سطحوں پر پہنچا کر کئی مثبت اور عمدہ پہلوؤں سے روشناس کیا۔چنانچہ آنے والی نسل کے مرثیہ گوشعرا کے لئے ایک سخت مرحلہ یہ تھا کہ وہ کس طرح انیسؔ و دبیرؔ سے ہٹ کر مرثیہ کو ایک نیا موڑ دیں۔اور اس مرحلہ کا حل جوشؔ،نسیمؔ اور جمیلؔ مظہری نے جدید مرثیہ لکھ کر نکالا۔جدید مرثیہ بہت مقبول ہوا کیوں کہ اس میں موجودہ دور کے معاشرتی وسماجی مسائل کی عکاسی کی جاتی تھی۔لیکن جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا گیا ،مرثیہ لکھنے والے شعرا کی تعداد میں کمی آتی گئی۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء تک آتے آتے اردو مرثیہ نگاری کم ہوتی گئی اور ساتھ ہی اس کے رواج میں بھی کمی آئی۔جس کے سبب لوگوں میں یہ منفی رائے بننے لگی کی صنف مرثیہ نگاری کو زوال آ گیا۔اور موجودہ عہد میں مرثیہ نگاری ختم سی ہوگی ہے۔لوگوں کی اسی منفی رائے کے سبب میں نے اپنے تحقیقی مقالے کے لئے مرثیہ نگاری کا انتخاب کیا۔اور تحقیق کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ آج بھی مرثیہ نگاری کی روایت قائم ہے۔آج بھی مجلسوں میں مرثیہ پڑھنے کا رواج موجود ہے۔عظیمؔ امروہوی،ناشرؔ نقوی،گوہرؔ لکھنوی اور باقر محسن یہ ایسے مرثیہ نگار شعرا ہیں جو اپنے مرثیہ کہتے ہی نہیں ہے بلکہ مجلسوں میں پڑھتے بھی ہے۔موجودہ دور میں بہت سے ایسے مرثیہ نگار

ہیں جنکے مرثیوں میں انیسؔ ودبیرؔ کے مرثیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔تو بہت سے ایسے بھی مرثیہ گو ہیں جنھوں نے مرثیہ میں نئے نئے تجربات کرکے اس کو ایک نئی جہت بخشی ہے۔آج کے مرثیے نہ صرف مذہبی عقیدت کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ شاعرانہ حسن واوصاف سے مزیّن بھی ہیں۔مرثیہ نگاری کی روایت شمالی ہندوستان کے علاقے لکھنؤ،امروہہ میں بھی جاری ہے اور جنوبی ہندوستان کے شہر حیدرآباد، مدراس اور مہاراشٹر میں بھی پوری آب وتاب کے ساتھ ادب کے قارئین،مجلسوں کے سامعین کو سکونِ قلب اور جمالیاتی حِس کو فمانیت بخش رہی ہے۔

کتابیات

☆بنیادی ماخذ☆

سلسلہ نمبر	کتاب کا نام	مصنف کا نام	پبلیشر
۱)	معراجِ غم	احسن شکارپوری	دفتر علیؑ ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ)، شکارپور و دہلی
۲)	انٹرویو	باقر محسن	گھر جا کر ملاقات
۳)	انٹرویو	گوہر لکھنوی	گھر جا کر ملاقات
۴)	انٹرویو	ظہیر جعفری	بذریعہ فون
۵)	انٹرویو	احسن شکارپوری	بذریعہ فون
۶)	انٹرویو	ناشر نقوی	بذریعہ فون
۷)	دیدہ وری	ڈاکٹر ناشر نقوی	سخنور پبلیکیشنز، کراچی پاکستان
۸)	دجلہء ولا و شہدِ شہادت	باقر محسن رضوی	رضوی پرنٹرس، چھتہ بازار حیدرآباد
۹)	کربلا تا کربلا	ڈاکٹر وحید اختر	-
۱۰)	مطلع حیات	احسن داناپوری	ایڈشاٹ پبلیکیشنز، ممبئی
۱۱)	مراثیٔ عظیم	ڈاکٹر عظیم امروہوی	پیشکش: عالمی سینٹر دہلی

☆ثانوی ماخذ☆

سلسلہ نمبر	کتاب کا نام	مصنف کا نام	پبلیشر
۱)	انیس شخصیت اور فن	ڈاکٹر فضل امام رضوی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ
۲)	اردو مرثیہ نگاری	اُمِ ہانی اشرف	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
۳)	اودھ میں اردو مرثیہ	ڈاکٹر ریاض الہاشم	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی
۴)	انتخاب مراثی	مجلس مشاورت	اتر پردیش اردو اکادمی

	کتاب	مصنف	ناشر
۵)	اردو مرثیے کا سفر	سید عاشور کاظمی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس
۶)	اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
۷)	اردو مرثیہ	شارب ردلوی	اردو اکیڈمی دہلی
۸)	اردو مرثیہ کا سفر	سید عاشور کاظمی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۹)	اردو مرثیہ	سفارش حسین رضوی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۱۰)	اردو شاعری میں ہیئت کے تجربات	عنوان چشتی	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی
۱۱)	اردو مرثیہ انیس کے بعد	ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی	ایرانین آرٹ پرنٹرس دہلی
۱۲)	اردو مرثیہ کا ارتقا	ڈاکٹر مسیح الزماں	کتاب نگر دین دیال روڈ، لکھنؤ
۱۳)	اردو مرثیہ کی سرگزشت	اسد اریب	عاکف بک ڈپو، دہلی
۱۴)	اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات	شمشاد حیدر زیدی	این، سی، پی، یو، ایل
۱۵)	اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقا	ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری	نظامی پریس، لکھنؤ
۱۶)	انتخاب مراثی انیس و دبیر	رشید حسن خان	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۱۷)	انتخاب محمد قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۱۸)	انیس کے ۳۳ غیر مطبوعہ مرثیے	انیس صدی کمیٹی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۱۹)	انتخاب ادبی مراثی	مرزا یوسف	ایڈوینچر پریس انڈیا لکھنؤ
۲۰)	اردو میں شخصی مرثیہ نگاری کی روایت	ڈاکٹر عابد حسین حیدری	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۲۱)	انیس و دبیر سیمینار	گوپی چند نارنگ	ساہتیہ اکادمی نئی دہلی
۲۲)	بیسوی صدی اور جدید اردو مرثیہ	ہلال نقوی	محمد ٹرسٹ، لندن و کراچی
۲۳)	تاریخ اردو ادب	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی
۲۴)	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	خاتون مشرک، اردو بازار دہلی
۲۵)	تاریخ مرثیہ گوئی	حامد حسن قادری	ہمالیہ بک ہاؤس دہلی
۲۶)	تذکرہ شعراء اردو	میر حسن، مرتب شیروانی	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ
۲۷)	تذکرہ مرثیہ نگاران اردو	امیر علی بیگ جونپوری	سرفراز قومی پریس لکھنؤ
۲۸)	تلاش دبیر	کاظم علی خاں	نصرت پبلشرز لکھنؤ

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۲۹)	تنقیدی جائزے	سید احتشام حسین	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد
۳۰)	جائزہ انیس	ڈاکٹر عسکری صفدر	تخلیق کار پبلشرز
۳۱)	جدید اردو مرثیہ	محمد کاظم رضا	مکتبۂ ادب، کراچی
۳۲)	جسارت	اسود گوہر	عرشیہ پبلی کیشنز دہلی
۳۳)	جوش کے مرثیے	مرتبہ: ضمیر اختر نقوی	عالمگیر پکچرز، کراچی
۳۴)	حضرت رشید	آغا اشہر	مطبع تھوئی ٹولہ لکھنؤ
۳۵)	حیدرآباد میں اردو مرثیہ آزادی کے بعد	ڈاکٹر سیدہ زہرہ بیگم	سام کمپوٹر اینڈ ٹنگ پرس حیدرآباد
۳۶)	حدیث غم	عظیم امروہی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۳۷)	خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں	صالحہ عابد حسین	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۳۸)	داستان دبیر	ذاکر حسین فاروقی	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ
۳۹)	داستان عشق کی مرثیہ گوئی	ڈاکٹر جعفر رضا	نیشنل کتاب گھر، الہ آباد
۴۰)	دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی	نامی پریس، لکھنؤ
۴۱)	دکن میں مرثیہ اور عزاداری	ڈاکٹر رشید موسوی	ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۴۲)	دہلوی مرثیہ گو	علی جواد زیدی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۴۳)	روح انیس	سید مسعود حسن رضوی ادیب	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۴۴)	رزم نگاران کربلا	ڈاکٹر سید سفدر حسین	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۴۵)	ساز حریت	نسیم امروہوی	نرولی ہاؤس لکھنؤ
۴۶)	سرمایۂ تحسین	بہار حسین آبادی	بہار فاؤنڈیشن، عظیم آباد
۴۷)	عرفان جمیل	جمیل مظہری: مرتب سید ارشد حیدر	اصغریہ پبلکشنز الہ آباد
۴۸)	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ابواللیث صدیقی	مکتبہ علم و فن
۴۹)	مرثیہ خوانی کا فن	نیّر مسعود	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ
۵۰)	مراثی شاد کا فکر پہلو	پروفیسر اظہار احمد	تخلیق کار پبلیشرز
۵۱)	مراثی جوشؔ ملیح آبادی	علامہ ضمیر اختر نقوی	عباس بک ایجنسی

۵۲)	موازنہ انیس و دبیر	شبلی نعمانی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ
۵۳)	میر انیسؔ سے تعارف	صالحہ عابد حسین	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی
۵۴)	میر انیسؔ	سفارش حسین رضوی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی
۵۵)	مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	جاوید پبلشرز، نشیمن، الہٰ آباد
۵۶)	مرثیہ بعد انیس	ڈاکٹر صفدر حسین	سنگ میل پبلکیشنز لکھنؤ
۵۷)	مرثیہ کی سماجیات	ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی	نصرت پبلشرز لکھنؤ
۵۸)	مرزا محمد جعفر اوج حیات اور کارنامے	سکندر آغا	نظامی پریس لکھنؤ
۵۹)	مطالعۂ انیس	ناظم کاکوروی، شجاعت علی سندیلوی	شانتی پریس، الہٰ آباد
۶۰)	معراج فکر	نجم آفندی	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ
۶۱)	موازنۂ انیس و دبیر	شبلی نعمانی، مرتب ڈاکٹر مسیح الزماں	رام نارائن لال بنی مادھو، الہٰ آباد
۶۲)	مہدی نظمی، فن اور شخصیت	مرتبہ: ناشر نقوی	غازی آباد پبلشرز پرینٹرس
۶۳)	نوائے رضا	سید آل رضا	نظامی پریس لکھنؤ
۶۴)	نئے تنقیدی گوشے	ممتاز حسین	آزاد کتاب گھر، دہلی
۶۵)	والفجر	پیام اعظمی	تنظیم المکاتیب، لکھنؤ
۶۶)	قدیم دکنی شاعری	ڈاکٹر انوری بیگم	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی
۶۷)	واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات،	کوکب قدر سجاد علی مرزا	این سی پی یو ایل، دہلی
۶۸)	سخنورانِ حیدر آباد	ڈاکٹر سید بشیر احمد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
۶۹)	رہنمائے ادب	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی	شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ
۷۰)	انیس الشعرا	سید سبطِ حسین نقوی	اردو کتاب گھر لکھنؤ

☆رسائل☆

۱)	کل	انیس نمبر	دہلی	جون ۱۹۷۵ء
۲)	کتاب نما	مرزا دبیر نمبر	عبدالقوی دسنوی	عبدالقوی دسنوی
۳)	کتاب نما	میر ببر علی انیسؔ نمبر	مرتبہ غلام حیدر	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی
۴)	العلم		بمبئی	فروری ۱۹۹۲
۵)	پیام اسلام	محرم نمبر ۱۳۶۸ھ	لکھنؤ	
۶)	ترجمان		پٹنہ	جنوری ۱۹۹۹ء
۷)	زبان و ادب	شادؔ نمبر		فروری۔ مارچ ۱۹۷۹ء
۸)	سب رس		حیدرآباد	جنوری ۱۹۷۷ء
۹)	سہیل	جمیل مظہری نمبر	گیا	مارچ ۱۹۸۵
۱۰)	کتاب نما			ستمبر ۱۹۷۷
۱۱)	شاعر، شمارہ ۱		بمبئی	۱۹۸۲
۱۲	شب خون		الہ آباد	اگست ۱۹۸۹
۱۳)	ہما	، جوش ملیح آبادی، نمبر	دہلی	جولائی ۱۹۸۲

☆☆☆